تاریخ امروہہ

امروہہ

# کشورِ اولیا



احمد حسین صدیقی


AERIAL VIEW OF AMROHA
Shah Nasiruddin
Bansdeo Park
Vasudeo Mandir
Shah Abdul Hadi
Road to Akbarpure
Road to Kanth
Garden
Qutab Shah
Takia Husain Shah
Afghanan
Sheo Dwara
18
Katkoi
Rajoo Sarai
Ahmed Nagar
2
Shah Ali Sarai
Gher Pachayyan
Qureshi
Karbala
Muhammadi Sarai
7
Kala Kuan
15
Bazar Jat
Gashtian
5
Silavali
20
Derveshali
Haf.Abbasali
Nawab Vaqarul Mulk
Road to Dhanora
Shahi Chabutra
Katra Bakhtawar singh
17
Chowk
Tehseel
Niazian
19
Koocha Khatrian
22
10
Police Station
Kali Pagn
Machratta
Mandi Chob
DARBAR
Eidgah
Karka Shah
Lakra
Gher Karamali
21
Haqqani
Naubat Khana
Tirpolia
13
Guzri
Samman Shaheed
Shah Vilayat
Naugaza
Satti
Qazizada
Pachdra
Hindu Int. College
Hindu Deg. College
Field
Bijnor Road
Chah Shore
Chakli
Basawan Ganj
Muradabadi Darwaza
Saddo
Mullana
Katra Ghulamali
Embat .Park
3
Sh.Azauddin
Nabbu Shah
K. K.
Panwari
Naugayyan
Gher Munaf
9
Pirzada
25
Chah Mulla Aman
Sh.Chahan
Chah Ghori
Begum Sarai Kalan
Chewra
Sh.Ghasi
Sari Kohna
6
24
Begum Sarai Khurd
Aggarwal Dharam Shala
23
Majapota
Bagla
Post Office
I.M.Int. College
Bazar Kot
Municipality
Takia Moti Shah
Bijnor Road
16
Nal
Chilla
11
Danishmandan
1
Lal Masjid
Masjid Nathey Khan
Bijnor Road
New Abadi
Batwal
8
Pirgarh
Highway to Atashi
New Abadi
Shah Abban
Govt. Int. College
Govt.Int. College Field
14
Railway Line
Railway From Delhi to Muradabad
Sugar Mill
Railway Station
RAILWAY LINE
Bhoorey Khan Shaheed
Note:
This map is prepared by Ahmed Husain Siddiqi for his book"KISHWAR-E-AULIA"AmrohaThe entire drawing is not based on accurate scale

# کشورِ اولیا
## امروہہ

مؤلف / مصنف
احمد حسین صدیقی

ناشر:

**محمد حسین اکیڈمی**

C-161 بلاک 6 فیڈرل "B" ایریا کراچی

ٹیلیفون: 6364504, 6342609

**تقسیم کار**

**فضلی بک سپر مارکیٹ**

۳ ماما پارسی بلڈنگ، اردو بازار، کراچی

فون: 5-2629720 فیکس: 2633887

E-mail : fazlee@cyber.net.pk

قیمت 700 روپے

# انتساب

اپنی والدہ مرحومہ **متینہ خاتون** کے نام کہ جن کے سایۂ عاطفت سے میں بچپن ہی
میں محروم ہو گیا تھا مگر ان کی دعاؤں نے میری زندگی کو سہارا دیا اور سنوارا

اپنے والد مرحوم **محمد تحسین صدیقی** کے نام کہ جن کی
شفقت و محبت نے مجھے پروان چڑھایا

اور

اپنی شریک حیات **ممتاز فاطمہ** کے نام کہ جنہوں نے مجھے زندگی کا
حوصلہ دیا اور قدم قدم پر مجھے سہارا دیا

# فہرست



-☆☆-



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

یہ بتانے سے پہلے کہ ''کشورِ اولیاء'' کی ابتدا کیسے ہوئی' میں اپنا تعارف کرادوں جو ہر مصنف، مولف، مورخ کا فرض ہوتا ہے- مجھے احمد حسین صدیقی کہتے ہیں جیسا کہ آپ سرورق پر پڑھ چکے ہوں گے- میرے تین فرزند عادل عمر صدیقی' آصف عمر صدیقی' زاہد عمر صدیقی اور سب سے چھوٹی بیٹی فرح ناز ہیں- عادل عمر نے داؤد انجنیرنگ سے .B.Arch کی ڈگری حاصل کی اور اب برسر کار ہیں- آصف عمر اور زاہد عمر نے پہلے NED University سے .B.E کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد دونوں نے اسکاٹ لینڈ جاکر .M.S کیا- بیٹی فرح ناز نے بھی داؤد انجنیرنگ کالج سے .B.Arch کی ڈگری حاصل- تعلیم کے بعد فرح ناز کی شادی ڈاکٹر عاصم علی حیدر سے ہوئی جو لاہور میں پریکٹس کرتے ہیں- اس طرح دو بچے انجنیر اور دو آرکیٹیکٹ ہیں- بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں میری شریک حیات ممتاز فاطمہ کا بڑا ہاتھ ہے- اللہ تعالیٰ کا شکر ہے سب بچے نیک اور بڑے سعادتمند ہیں- میرا تعلق امروہہ کے صدیقی خاندان سے ہے- ۲ر جنوری ۱۹۳۷ء کو میں امروہہ میں پیدا ہوا- میرے دادا محمد ابراہیم صدیقی اور ان کے برادر خورد محمد یعقوب صدیقی کی جائے سکونت محلہ چاہ شور میں تھی- یہ محلہ امروہہ کے بلند ترین علاقہ میں واقع ہے- اس بلند علاقے میں بھی چار پانچ مکان' جن میں ہمارے بھی کئی مکان تھے' سب سے زیادہ اونچائی پر واقع تھے- میرے دادا محمد ابراہیم صدیقی کے تین فرزند محمد یٰسین صدیقی، میرے والد محمد تحسین صدیقی، محمد سلطان صدیقی اور تین دختران رئیسہ خاتون، نفیسہ خاتون اور حسینہ خاتون تھیں- میرے دادا محمد ابراہیم صدیقی کے برادر خورد محمد یعقوب صدیقی کے ایک فرزند محمد ایوب ہیں جو امروہہ میں عبدالکریم خاں انٹر کالج کے منیجر اور بیڑی کے ایک بڑے کارخانے کے مالک ہیں-

میری پیدائش کے وقت میرے دادا بسلسلۂ روزگار اپنے تینوں فرزندوں کے ساتھ تقسیم ہند سے پیشتر پاکستان میں صوبہ سرحد کے ایک شہر ضلع بنوں میں مقیم تھے- میرے والد صاحب کے پہلی بیوی سے تین اولادیں، ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے جن میں میرے برادر مرحوم محمد حسین صدیقی، پسر خورد میں اور ہمارے درمیان ہمشیرہ مقبول فاطمہ ہوئیں- دوسری بیوی سے تین لڑکے مجاہد حسین، محمد وسیم اور رئیس احمد ہوئے-

میری پیدائش کے فوراً بعد میرے والد صاحب نے میری والدہ صاحبہ کو بھی بنوں بلا لیا تھا- میری پیدائش کو سوا سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم تینوں بہن بھائی آغوشِ مادری سے محروم ہو گئے -والدہ محترمہ کی وفات کے بعد ہمارے دادا صاحب اور دادی صاحبہ ہم تینوں بہن بھائیوں کو ساتھ لیکر امروہہ آ گئے -امروہہ آکر دادا صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو پہلے تو قرآن کریم پڑھایا- اس کے بعد ہمیں اسکول میں داخل کرا دیا- میں امام المدارس ہائی اسکول میں تیسری کلاس اور میرے بھائی محمد حسین نویں کلاس میں پڑھ رہے تھے کہ دادا صاحب کا انتقال ہو گیا- پاکستان بننے سے پہلے بسلسلۂ روزگار ہمارے سارے عزیز و اقارب پشاور، بنوں اور کراچی میں مقیم تھے - دادا صاحب کے انتقال کے بعد امروہہ میں صرف دادی صاحبہ اور ہم دو بھائی تھے - سنہ ۱۹۴۷ء میں بھائی صاحب بھی پاکستان چلے گئے تو صرف میں اور دادی صاحبہ امروہہ میں رہ گئے - ہماری معاشی حالت بھی دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی -زندگی کا یہ دور اس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا کہ اس کے نقش آج تک میرے ذہن سے نہ مٹ سکے -اماں اپنی اولاد کو یاد کرتیں اور رو رو کر اکثر کہا کرتی تھیں کہ یہ تقسیم کیسی ہوئی، میری تو اولاد ہی مجھ سے جدا ہو گئی- اسی غم میں وہ گھلتی رہیں -میں ابھی آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا کہ اماں نے بھی داغ مفارقت دیتے ہوئے ملک عدم کو کوچ کیا- دیکھتے ہی دیکھتے سارے عزیز و اقارب نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور میں بالکل ہی تنہا رہ گیا- ایک اماں کا دم تھا تو امروہہ میں میرا سب کچھ تھا، جب وہ نہ رہیں تو میرا کچھ بھی نہ رہا- اب امروہہ میں نہ کوئی ہمدم تھا نہ کوئی غمگسار اور نہ مجھے کوئی پوچھنے والا، بس اپنے ہی شہر میں ایک اجنبی بن کر رہ گیا تھا- ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہر طرف لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا- افراتفری، نفسا نفسی اور خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا- پاکستان میں اپنے عزیز و اقارب سے بھی رابطہ ٹوٹ چکا تھا- نہ مجھے ان کی کوئی خبر تھی نہ وہ میرے حال سے واقف تھے -دن رات کرب میں گزرنے لگے -دن نکلتا تو نا معلوم آس کی آس میں گزر جاتا، رات ہوتی تو نا معلوم خوف کے خوف میں گزر جاتی تھی- ایسی تنہائی اور پھر اپنے گھر کی ایسی ویرانی کو دیکھتا تو دم گھٹنے لگتا تھا- میرا حال کچھ اس طرح تھا جس کی عکاسی جونؔ ایلیا کے ان دو شعروں سے بہتر ہو سکتی ہے ؎

اب وہ گھر اک ویرانہ تھا بس ویرانہ زندہ تھا — سب آنکھیں دم توڑ چکی تھیں اور میں تنہا زندہ تھا
ساری گلی سنسان پڑی تھی بادِ فنا کے پہرے میں — ہجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا

بے کسی اور تنہائی نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی- تعلیم کا سلسلہ بھی بار بار منقطع ہوتا رہا- ایسے حالات میں

امروہہ میں رہنا نہ تو میرے لیے ممکن تھا اور نہ ہی اس کا کوئی جواز تھا- آخر حالات نے اسقدر مجبور کیا کہ ایک دن سرزمین امروہہ کے گہرے نقوش ذہن میں لے کر مجھے اپنے آباواجداد کی اس بستی کو خیر باد کہنا پڑا- امروہہ کی زندگی کے یہ حالات میں نے "سیاحت ماضی" میں بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں-

پاکستان آکر اپنی تعلیم کو' جو بار بار منقطع ہوتی رہی تھی' دوبارہ جاری کیا- سنہ ۱۹۵۵ء میں پنجاب بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا- میٹرک کے فوراً ہی بعد کراچی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ آرکیٹیکٹ میں ملازمت کا آغاز کیا- دوران ملازمت آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کی- .G.D.Arch کرنے کے بعد سنہ ۱۹۶۸ء میں میری ترقی ہوئی اور اسی محکمہ میں Asstt.Achitect مقرر ہوا- سنہ ۱۹۷۸ء میں مجھے کنٹرولر آف بلڈنگ کے عہدے پر فائز کیا گیا- اس کے بعد کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں چیف کنٹرولر آف بلڈنگ کے عہدہ پر فرائض انجام دیے- پندرہ سال کنٹرولر' چیف کنٹرولر آف بلڈنگ کے عہدوں پر رہنے کے بعد سنہ ۱۹۹۴ء میں کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں Director General کے اہم ترین عہدہ پر فائز ہوا اور یہیں سے ۱۹۹۷ء میں ریٹائر ہوا-

اتنے حساس اداروں کی بے انتہا ذمہ داریوں اور کراچی کی بیکراں فضاؤں میں سانس لینے کے باوجود امروہہ کے گلی کوچوں کے نقوش ذہن سے نہ مٹ سکے- حالانکہ میں نے اس بستی میں بڑے کرب کی زندگی گزاری اور برداشت نہ ہونے والی اذیتیں اٹھائیں- لیکن یہ تکلیفیں بھی میرے دل سے امروہہ کے نقش نہ مٹا سکیں- مجھے کل بھی اس بستی سے پیار تھا' آج بھی پیار ہے اور زندگی رہی تو آنے والے کل میں بھی پیار رہے گا- کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں اپنی زندگی میں گزرے ہوئے حالات سناتا تو ان کی یہ خواہش ہوتی کہ میں ان کو رقم کردوں- لیکن میں ان کی اس فرمائش کو ہمیشہ ٹال ہی دیا کرتا تھا- اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ میں اپنے حالات لکھتے ہوئے ایک جھجک محسوس کرتا تھا- بہر حال ان کے بہت اصرار پر میں نے اپنے عہد ماضی کو ایک کتاب کی شکل دے کر "سیاحتِ ماضی" تصنیف کر ہی دی- ''سیاحت ماضی'' لکھنے سے پہلے مجھے یہ قطعی احساس نہ تھا کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو اسقدر پسند کیا جائے گا جیسا کہ اس کی پذیرائی ہوئی- دہلی میں جب میری ملاقات نثاراحمد فاروقی صاحب سے ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ''سیاحت ماضی'' پر انہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے تبصرہ بھی کیا تھا- بہر حال یہی تصنیف میری دوسری تصنیف ''گوہر جزیرۂ عرب'' کا سبب بنی جو کراچی شہر کی تاریخی' سماجی' علمی' ثقافتی اور طرز تعمیر وغیرہ وغیرہ کی عکاسی کرتی ہے-

چونکہ میں بنیادی طور پر ایک Architect ہوں لہذا Town Planning اور Architec-ture سے میرا ہمیشہ واسطہ رہا ہے۔ دوران ملازمت مجھے کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ کراچی پر اب تک کوئی ایسی تفصیلی کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں اس کی تاریخ، پلاننگ، تعمیرات اور اس کے ترقیاتی مراحل کی عکاسی ہوتی ہو۔ لیکن کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن میں خود ہی لکھنے بیٹھ جاؤں گا۔ "سیاحتِ ماضی" کے بعد مجھے خیال آیا کہ کراچی پر ایک کتاب میں خود ہی کیوں نہ لکھوں۔ ۳۷ سال تک میں ایسے اداروں میں کام کر چکا تھا جن کا براہ راست تعلق کراچی شہر اور اس کی ترقیاتی منصوبوں سے تھا۔ جس کی وجہ سے میں اس شہر سے متعلق خاصہ تجربہ اور اس کے ہر گلی کوچے سے واقفیت رکھتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کراچی شہر سے متعلق ریکارڈ کہاں کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی کے پرانے اور نئے لوگوں سے بھی بہت واقفیت تھی جو ایسی کتاب لکھنے میں بڑے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ "سیاحتِ ماضی" کے فوراً بعد میں نے اس کام کا آغاز کر دیا۔

اس زمانے میں، میں کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں Chief Controller of Building کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چنانچہ دفتری اوقات کے بعد میں نے اس کام کو شروع کیا اور مستقل جاری رکھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تقریباً دو ڈھائی سال میں اس کتاب "گوہرِ بحیرۂ عرب" کے لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کتاب کی اشاعت اس وقت ہوئی جب میں کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں بحیثیت ڈائریکٹر جنرل کام کر رہا تھا۔ "گوہرِ بحیرۂ عرب" کی تقریبِ اجراء ہوٹل پرل کونٹی نینٹل میں منعقد ہوئی۔ مقررین میں جناب ہاشم رضا صاحب کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر، سپریم کورٹ آف پاکستان کے جسٹس دوراب پٹیل (مرحوم)، کراچی میٹروپولیٹن کے سابق میئر جناب عبدالستار افغانی، ڈائریکٹر جنرل قائداعظمؒ اکیڈمی ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور جناب عبداللہ جے میمن، سابق مرکزی وزیر تھے۔ اس شاندار تقریب کے بعد میری کتاب "گوہرِ بحیرۂ عرب" منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے انگلش ورژن کی اتنی مانگ ہوئی کہ اب تیسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی میں پورے ملک اور بیرون ملک سے اتنے خطوط موصول ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں کہ جن کا ذکر بوجہ طوالت مشکل ہے۔

سنہ ۱۹۹۵ء میں، میں نے یہ کتاب UNO کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل ڈاکٹر ویلین ڈائنکوان کے دورۂ کراچی پر پیش کی تو اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور بہت سے سوالات کیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں استنبول میں ایک بین الاقوامی کانفرنس (Habitat Confrence) منعقد کرنے کے انتظامات کر رہا ہوں، یہ کتاب اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے کسی حد تک مناسبت رکھتی ہے۔ استنبول میں جب یہ کانفرنس منعقد ہونے

گئی تو انہوں نے "گوہر بحیرۂ عرب" کا انگلش ورژن Karachi-The pearl of Arabian Sea کی دو سو کاپیاں حکومت پاکستان سے منگوا کر اس بین الاقوامی کانفرنس میں تقسیم کرائیں۔

جس زمانے میں میں Architecture کا طالب علم تھا تو اس وقت ہندوستان میں اجنتا اور الورا کے غار اور احرامِ مصر دیکھنے کی بڑی خواہش تھی لیکن اس وقت ایسے حالات نہ تھے کہ میں اپنی اس خواہش کو پورا کر سکتا۔ یہی سوچا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان دونوں جگہ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ جب ریٹائر ہو گیا تو میں نے پہلے ہندوستان جانے کا قصد کیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے پانچ چھ دن امروہہ رہوں گا جہاں اپنے ایک دوست اعجاز صاحب کی بیٹی کی شادی میں شرکت کروں گا۔ اس کے بعد تین چار دن کے لیے دہلی اور پھر پندرہ دن کے لیے اجنتا الورا کے غار دیکھنے حیدر آباد دکن چلا جاؤں گا۔ لیکن میرے یہ گمان میں بھی نہ تھا کہ ہندوستان کا یہ سفر "شہرِ اولیاء" لکھنے کا سبب بن جائے گا۔

۲۴ر اکتوبر ۹۸ء کو کراچی سے روانہ ہو کر تقریباً ڈھائی بجے میں دہلی پہنچا۔ دوستوں کو میرے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ پروگرام کے مطابق امروہہ سے کچھ دوستوں کو مجھے لینے کے لیے دہلی ایئرپورٹ پر آنا تھا۔ لیکن جب میں ایئرپورٹ سے باہر آیا تو کسی کو نہیں پایا۔ بہر حال میں دہلی شہر سے بخوبی واقف تھا لہٰذا ٹیکسی کر کے اپنے ایک دوست سردار احمد کے پاس بستی نظام الدین چلا گیا۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو مجھے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی تو دن باقی ہے مجھے کوئی ٹیکسی منگوا دیں تاکہ میں دن ہی دن میں امروہہ پہنچ جاؤں۔ انہوں نے کہا، ایسی کیا جلدی ہے، رات یہیں گزارو صبح ہوتے ہی چلے جانا۔ لیکن میری ضد دیکھ کر وہ ٹیکسی لینے چلے گئے۔ ان کے جانے کے فوراً ہی بعد میرے دوست ارمان مہدی اور نواب انتقام علی مجھے ڈھونڈتے ہوئے بستی نظام الدین آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ امروہہ سے آتے ہوئے ٹریفک کی وجہ سے راستہ میں دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ امروہہ روانہ ہوا اور رات کے تقریباً آٹھ بجے امروہہ پہنچا۔ امروہہ کے بہت سے لوگ ملنے آئے جن میں چند ہی لوگ ایسے تھے جن سے میری بالمشافہ ملاقات تھی باقی سب حضرات مجھ سے میری کتابوں کی وجہ سے غائبانہ متعارف تھے۔ ان سے ملتے ہوئے میں سوچ رہا تھا یا اللہ! کل تو میں اسی شہر میں ایک اجنبی بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن آج اسی شہر کے لوگ اس طرح مل رہے ہیں جیسے وہ مجھے بچپن سے جانتے ہوں۔ رات گئے تک دوستوں کی یہ محفل جمی رہی۔ دوسرے دن میں امروہہ گھومنے نکلا۔ جس گلی سے گزرا تو وہاں کے قدیم در و دیوار کو یاس و حسرت میں ڈوبے دیکھا۔ وہ آج بھی اپنے ان مکینوں کو یاد کرتے ہوئے نظر آتے تھے جو انقلاب

زمانہ سے مجبور ہو کر انہیں لاوارث چھوڑ گئے۔ ان میں بیشتر اس صدمہ سے ڈھے گئے تھے اور جو باقی تھے وہ اپنی خستہ حالی سے بدحال تھے۔

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کا سناٹا　　مکاں یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

امروہہ کے اطراف میں گیا تو ندی اور تالابوں کا بھی یہی حال دیکھا جو خشک ہو چکے تھے۔

امروہہ پہنچنے کے بعد تیسرے دن دربار کلاں حسن محلہ بنگلہ میں ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ کھانے کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں مجھے مہمان خصوصی اور شمیم ہادی صاحب کو صدارت کے لیے کہا گیا۔ مشاعرہ کی کمپیئرنگ جناب عظیم حیدر صاحب کر رہے تھے۔ مسلمان شعراء کے ساتھ ہندو شعراء بھی آئے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوئی جب بھونیش شرما صاحب نے میری کتاب "سیاحتِ ماضی" کا مکمل منظوم ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ یہ بڑی خوبصورت محفل تھی جس سے ہم بڑے لطف اندوز ہوتے رہے۔

رات کو تین بجے جب یہ محفل اختتام کو پہنچی تو عظیم حیدر صاحب نے تمام سامعین اور شعراء کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مجھے ان سے متعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ شہر احمد حسین صدیقی کا مولد ہے۔ انہوں نے دو کتابیں "سیاحت ماضی" اور "گوہر بحیرۂ عرب" تصنیف کی ہیں۔ "سیاحت ماضی" میں احمد حسین صاحب نے اپنی نوعمری کے ان حالات اور دنوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے امروہہ میں گزارے تھے۔ دوسری کتاب "گوہر بحیرۂ عرب" ہے جو انہوں نے اپنے وطن ثانی کراچی پر لکھی ہے۔ اب ہماری بھی یہ گزارش ہے کہ جس خوبصورت انداز میں احمد حسین صاحب نے اپنے وطن ثانی کراچی پر کتاب لکھی ہے اسی انداز سے ایک کتاب اپنے مولد امروہہ پر بھی لکھیں۔ اس کے لیے امروہہ اور اہل امروہہ دونوں ہی ان پر حق رکھتے ہیں۔ عظیم حیدر صاحب کی اس اچانک فرمائش پر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔ دوسرے دن میں نے دوستوں سے کہا کہ میں نے تو کبھی امروہہ کو پوری طرح دیکھا بھی نہیں کتاب کیسے لکھ سکتا ہوں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک دو بار آیا بھی تو ایک مرتبہ دو دن رہا اور دوسری بار تو صبح سے شام تک ہی رہا اور اب چار پانچ دن کے لیے آیا ہوں۔ جو شخص امروہہ کے الف سے واقف نہ ہو وہ امروہہ پر قلم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ جہاں تک کراچی کی کتاب کا تعلق ہے تو وہاں کی بات کچھ اور ہے۔ عظیم حیدر صاحب نے تو میری معذرت سے قطعی اتفاق نہیں کیا اور بار بار مجھے مجبور کرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کتاب ان ہی کے اصرار پر لکھی گئی۔

آخر کار مجبور ہو گیا تو میں نے حیدر آباد وغیرہ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا-اس کام کے لیے امروہہ کی مساجد، مزارات اور تاریخی عمارتوں کی تصاویر بھی درکار تھیں لہذا دہلی سے Transparency Films منگوائیں اور اس کام کی ابتدا کر دی-کیمرہ میرے پاس تھا-چوبیس دن تک صبح سے شام تک امروہہ کا کونہ کونہ چھانا مختلف مقامات 'مزارات 'مساجد 'مندر اور تاریخی عمارتوں کی تصاویر کھینچیں اور امروہہ سے متعلق مواد اکھٹا کرنے لگا-

بدقسمتی سے مجھ ایسے کم علم کو امروہہ سے متعلق کبھی کوئی کتاب پڑھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا-اب "کشور اولیا" لکھنے کی کوشش کی تو امروہہ کی کتابوں کی تلاش ہوئی-حیرت ہے کہ اب اس علم وادب کے گہوارے میں امروہہ پر لکھی جانے والی کوئی کتاب بھی آسانی سے دستیاب نہیں-اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ دکھانا بھی پسند نہیں کرتا- بہرحال امروہہ میں تو مجھے کچھ نہ مل سکا مگر کراچی آکر میں نے کچھ کتابیں جن میں "تاریخ اصغری"'"تواریخ واسطیہ"'"تاریخ سادات امروہہ"'"تاریخ امروہہ"'رسائل 'قدیم گلدستے اور کچھ امروہہ کے شعراء کے کلام وغیرہ جمع کیے-اس کے بعد امروہہ کے بزرگ جو کراچی میں مقیم ہیں ان سے مل کر معلومات حاصل کیں-یہ مواد اکھٹا کرنے کے بعد بھی یہ پریشانی پیش آئی کہ ان کتابوں میں شجرے اور خاندانوں کے ذکر کے علاوہ امروہہ شہر سے متعلق بہت کم معلومات تھیں-چند ہی کتابیں ایسی ملیں جن میں خاندان اور شجروں کے ساتھ مختصر امروہہ کی تاریخ بھی ہے-مولانا محمود احمد عباسی کی تالیف "تاریخ امروہہ" ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں امروہہ سے متعلق خاصی تحقیقی معلومات موجود ہیں لیکن اب یہ کتاب بھی مشکل سے ہی دستیاب ہوتی ہے-

"کشور اولیاء" کی تصنیف کے سلسلے میں 'میں نے امروہہ اور دہلی میں بہت سے لوگوں سے ملاقات کی-کچھ نے تو میرے ساتھ بڑا تعاون کیا لیکن کچھ نے یہ کام مجھے کرتے دیکھا تو مجھے under estimate کرتے ہوئے ٹال بھی دیا-ان کے ایسے سلوک سے مجھے اپنی کمتری کا بھی بہت احساس ہوا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ان قد آور شخصیتوں کے سامنے میری کیا حقیقت تھی-اس وقت مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ جب یہ کام میرے بس کا نہیں تو میں نے اسے اپنے ہاتھ میں کیوں لے لیا اور میری ذات کو کیا فائدہ پہنچے گا-ان سب باتوں کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا کام جاری رکھا-اس سلسلے میں صرف ڈھائی مہینہ کے بعد مجھے دوبارہ امروہہ جانا پڑا-

"کشور اولیاء" میں اولیائے کرام کا باب زیادہ تر محمود احمد عباسی کی کتاب "تذکرۃ الکرام" سے ماخوذ ہے اس

کے علاوہ امروہہ کے قدیم حالات لکھتے وقت بھی ان ہی کی دوسری کتاب "تاریخ امروہہ" سے استفادہ کیا ہے۔ یہ ایک بڑا کام تھا، میں خود کو ہرگز اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے "کشورِ اولیاء" میں اس بات کا بے حد خیال رکھا ہے کہ کسی مذہب، کسی فرقے یا کسی پیشہ ور کی دل شکنی نہ ہونے پائے۔ "کشورِ اولیاء" میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ جن واقعات کو میں ضبطِ تحریر میں لایا ہوں وہ منظم و مربوط نہ ہوں۔ میری تحریر میں زبان کی بھی غلطیاں ملیں گی۔ شخصیات کے باب میں ہو سکتا ہے کہ میری لاعلمی یا تفصیلات میسّر نہ آنے کے سبب کسی نامور شخصیت کا ذکر بھی رہ گیا ہو جس کے لیے میں معذرت خواہوں۔ "کشورِ اولیاء" کی تصنیف و تالیف کا مقصد اپنی شہرت بھی نہیں، صرف امروہہ کے اپنے دوستوں کی خواہش کی تکمیل کی محض ایک کوشش ہے۔ یہاں قارئین حضرات کو یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ یہ مکمل کتاب میں نے براہ راست کمپیوٹر پر لکھی اور خود ہی کمپوز کی ہے۔ تمام تصاویر بھی کمپیوٹر پر بنائیں اور انہیں اپنی Orignal حالت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً ایک سال دو ماہ کی جدوجہد کے بعد مجھے خوشی ہے کہ میری پہلی کتاب "سیاحتِ ماضی" جو میرے ماضی کی ادھوری سیاحت تھی آج "کشورِ اولیاء" کی صورت میں مکمل ہو گئی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے اس کام کو بخیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں     ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

آخر میں، میں عظیم حیدر صاحب، سرفراز عثمانی صاحب، پنڈت رام ناتھ شرما صاحب، بھونیش کمار شرما صاحب، محمد ایوب صاحب صدیقی، شارق سعید صاحب جعفری جو امروہہ کی تصویریں لینے میں میرے ساتھ ساتھ رہے اور پاکستان میں جناب امان علی نقوی (گھڑیال والے)، سید قمر رضی، سید تقی رضا رضوی، محترمہ بادشاہ بیگم بنت مولانا احمد حسین خاں (مرحوم)، سید حیات النبی رضوی، برادر عزیز راحیل انور جو امروہوی تو نہیں ہیں لیکن امروہہ کی بابت سن سن کر آدھے امروہوی ہو چکے ہیں، اور ان تمام حضرات کا تہہ دل سے ممنون و متشکر ہوں کہ جنھوں نے مجھے معلومات فراہم کیں، میرے ساتھ تعاون کیا اور میری بڑی رہنمائی فرمائی۔

احمد حسین صدیقی

-☆☆☆-

## ''کشورِ اولیا''............ایک نیا سنگ میل

اہل امروہہ کی خواہش پر احمد حسین صدیقی نے ایک ایسے مشکل' دشوار' صبر آزما اور مشقت طلب کام کی ذمہ داری قبول کی جس کو عام حالات میں قبول کرنا آسان نہ تھا- بیسویں صدی کے ان آخری ایام میں بھی امروہے کے بارے میں خصوصاً اس کی تاریخ کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے وہی موانع موجود ہیں جو ماسبق کے صاحبان تاریخ کے سامنے تھے- یونان کا دیومالائی کردار ہرقلیس Hercules اپنے بارہ محیر العقول کارناموں کی وجہ سے مشہور و مقبول ہے جن میں اس نے اپنی شہہ زوری کے جوہر دکھائے تھے- اسی لیے نہایت دشوار کام کو انگریزی میں Herculean Task کہا جاتا ہے- ہرقلیس اور اس کتاب کے مصنف میں کوئی مماثلت موجود نہیں- نہ وہ ہرقلیس کی طرح تنومند' گٹھیلے جسم والا آدمی ہے نہ اس کے قودے گٹھے ہوئے مضبوط' نہ تنے ہوئے عضلات مچھلیاں بن کر ابھرے ہوئے ہیں' نہ وہ کسی کا پنجہ مڑوڑ سکتا ہے ہاں وہ ہرقلیس کی طرح مشکلوں اور دشواریوں کو خاطر میں نہ لانے والا انسان ضرور ہے- اس کی انگلیاں جب قلم پکڑتی ہیں یا کمپیوٹر پر کمپوزنگ کرتی ہیں تو "سیاحت ماضی"' "گوہر بحیرۂ عرب" اور "کشور اولیاء" جیسی کتابوں کو منصۂ شہود پر لے آتی ہیں- میری ایک کتاب "امروہہ -- ماضی و حال کے ائینہ میں" زیر تصنیف ہے- میں اس پر کافی کام کر بھی چکا ہوں- جون ایلیا بھی اس پر قلم اٹھانا چاہتے تھے- مگر ہم دونوں تو ارادے باندھتے ہی رہ گئے اور احمد حسین گوئے سبقت لے گیا-

احمد حسین صدیقی پیشہ ورانہ حیثیت سے ایک آرکیٹیکٹ ہیں- کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے سربراہ بھی رہے ہیں اور حال میں کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل کے اعلیٰ ترین عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں- اگر وہ فن تعمیر پر قلم اٹھائیں تو اپنے علمی پس منظر' فنی مہارت' اس میدان میں طویل تجربے اور اپنی بہترین تحقیقی صلاحیتوں سے حسین مرقعے اور نقش و نگار پیش کر سکتے ہیں- کیا عجب کہ عنقریب ان کا قلم اپنے پیشہ ورانہ موضوعات کو بھی اپنی گرفت میں لے لے- ویسے کراچی اور اس کی عمارتوں پر حال ہی میں "گوہر بحیرۂ عرب" لکھ کر وہ تاریخ ساز کام انجام دے چکے ہیں- کراچی ایک قدیم شہر ہے- اس سے متعلق دستاویزات اور تاریخی شواہد پہلے سے موجود تھے مگر انہیں قرطاس و قلم کے سپرد کوئی ان سے پہلے نہ کر سکا- "گوہر بحیرۂ عرب" بلاشبہ احمد حسین کا یادگار کارنامہ ہے جس کی بجا طور پر بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ہوئی- یہ کتاب یقیناً اس کی مستحق بھی تھی-

امروہہ کی مرزبوم ہمیشہ سے مردم خیز رہی ہے۔ مگر اس کی بدقسمتی تو دیکھیے کہ صدیوں تک یہ شہر تاریخ کی گمنامیوں میں کھویا رہا اور اس کے بارے میں کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی جس کو محققانہ حیثیت حاصل ہو سکتی۔ اس بستی کو تقریباً دو ہزار پانچ سو سال سے آباد بتایا جاتا ہے مگر حیرانی ہے کہ اس بستی کے باسیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی تاریخ کو قلم بند کرنے کی ذمہ داری پوری کرتا۔ البتہ بیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں مولانا محمود احمد عباسی نے پہلی بار باضابطہ انداز سے قلم اٹھایا اور "تاریخ امروہہ" اور "تذکرۃ الکرام" لکھ کر ایک بڑی خدمت انجام دی۔ ان کے تذکروں، تبصروں، پیش کردہ شواہد پر تنقید تو کی جا سکتی ہے، ان کے تجزیوں سے اختلاف بھی ممکن ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے معروضات کو ثابت کرنے کے لیے جن حوالوں کو اساس بنایا ہے وہ خود معتبر نہ تھے غرض کہ کہنے کو تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جائے گا مگر ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ انہوں نے اپنی ہمت اور صلاحیتوں کے مطابق جو کچھ اپنی تاریخ اور تذکروں میں لکھا وہ ان سے پہلے اتنی جستجو اور تحقیق کے ساتھ کبھی نہیں لکھا جا سکا۔ وہ ابن خلدون ہوں یا ایچ۔ جی ویلز، تاریخی معیار کے لیے جو اصول انہوں نے پیش کیے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو خود انہوں نے ان کی پیروی اکثر مقامات پر نہیں کی ہے۔ روزمرہ پیش آنے والے واقعات اور حالات کے تغیرات اپنے وقت میں خبروں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ تاریخ بن جاتے ہیں۔ رطب و یابس کو تحقیق کی چھلنی میں چھان کر ضبط تحریر میں لانا تاریخ نویسی ہے۔ امروہہ والوں میں سے کتنوں نے ایسا کیا ہے اگر ماضی میں دور تک چلے جائیں تو ہمیں خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔

یوں تو امروہے کا نام حضرت امیر خسرو کی مثنوی میں بھی ملتا ہے۔ آئین اکبری، طبقات اکبری، توزک جہانگیری، اقبال نامۂ جہانگیری دو دربار اکبری، تاریخ فرشتہ میں بھی ملتا ہے۔ عمدۃ الطالب، منتخب التواریخ، "ثرات القدس، اسراریہ، مقاصد العارفین، آئینۂ عباسی، تاریخ اصغری، نخبۃ التواریخ، تواریخ واسطیہ، تاریخ سادات امروہہ، شجرات سادات امروہہ اور گلدستہ سادات امروہہ جیسی کتابیں شائع بھی ہوئی ہیں مگر ان سب کتابوں کو امروہے کی مستند اور معیار پر اترنے والی تاریخ کا درجہ شاید ہی دیا جا سکے چونکہ یہ سب کی سب کتابیں محدود مقاصد کے تحت لکھی گئی ہیں۔ مثلاً عبدالقادر کی منتخب التواریخ اور سندھ کی انگریزی کی تاریخ Sind Under Moghul Rule میں امروہہ کا تذکرہ صرف عہد اکبری کے قاضی القضاۃ اور سندھ کے اس عہد کے گورنر سید محمد میر عدل سے نسبت میں ہوا ہے۔ یا ابن بطوطہ نے جو سنہ ۷۴۱ھ (۱۳۴۰ء) میں امروہہ آیا تھا، امروہہ کے

ذکر میں لکھا ہے (ترجمہ) "پھر ہم امروہہ پہنچے جو ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے حکام میرے استقبال کو آئے۔ یہاں کے قاضی سید امیر علی اور شیخ زادیہ نشین نے مجھ سے ملاقات کی اور انہوں نے میری بہترین ضیافت کی" اس قسم کے تذکرے، ظاہر ہے اس شہر کی اہمیت اور یہاں کے بارے میں مفید معلومات تو فراہم کرتے ہیں۔ مگر ان کو تاریخ کے زمرے میں بہر حال شامل نہیں کیا جا سکتا۔

امروہے کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس بستی کا نام کس نے رکھا، یہ بستی کب آباد ہوئی، یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب میں زبانی روایات اور قیاسات کے علاوہ تاریخی شواہد اور دستاویزات فی الحال ہمارے پاس نہیں ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے بلا تحقیق اپنی آراء کا اظہار کر دیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ راجہ پرتھی سنگھ کی بہن امبا رانی کے نام سے یہ شہر آباد ہوا (نخبتہ التواریخ) بعض کا خیال ہے کہ آموں کے باغات کی کثرت کی وجہ سے یہ بستی امروہہ کہلائی اور اس کا سنسکرت نام "امرودنم Amrowvanam" یعنی آموں کی جگہ اور اس سے "امر وہا" ہو گیا۔ Journal of the Historical Society Vol.III جب کہ مولانا محمود احمد عباسی نے ہستنا پور کی ریاست کے راجاؤں میں امر جودھ نام کے راجہ کو، جو ۴۴۷ ق۔م میں تخت نشین ہوا تھا امروہے کا بانی بتایا ہے اور ان راجاؤں اور کورو پانڈو کی ایک طویل داستان سے اپنی کتاب کی ضخامت بڑھائی ہے (تاریخ امروہہ جلد اول) اور اس روایت کو کہ حضرت شرف الدین شاہ ولایتؒ نے اس بستی کو آم اور روہو مچھلی جو ان کو اس بستی میں ان کی آمد کے وقت پیش کیے گئے تھے، کے حوالے سے امروہہ نام دیا" محض لغو اور مہمل" بتایا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ آپؒ کی آمد سے پہلے ہی اسلامی تاریخوں اور فرامین میں انبروہہ فارسی ترکیب کے ساتھ لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس موقع پر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم تاریخ کے حوالے سے ان روایتوں کا صحیح یا غلط ہونے پر حکم لگانا زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ تاریخی شواہد کی ناموجودگی میں ایسی اجتماعی زبانی روایات کو ہی قبول کر لیا جاتا ہے اور امروہے کے بارے میں بھی ایسا ہوا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کی لائبریریوں میں ایسے ٹھوس شواہد مل بھی سکیں گے کہ نہیں جن کے ذریعہ اس قدیم شہر کے بارے میں ٹھوس اور حقیقی معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

امروہے کی تاریخ کی مفقودالخبری کے پس منظر میں دیکھا جائے تو احمد حسین صدیقی کی کتاب "کشورِ اولیا" ایک نیا سنگ میل ہے۔ ہر چند کہ اس کو محض تاریخ کی کتابوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ضرور قرار دی جا سکتی ہے۔ تقریباً سات دہائیوں کے بعد ایک ایسی کتاب ہم تک پہنچی

ہے جس کی اہمیت اور افادیت کو تادیر تسلیم کیا جاتا رہے گا- فاضل مصنف نے مستند حوالوں کی تلاش میں بھی بڑی تگ و دو کی ہے -انہوں نے تاریخ کی ایسی کتابیں بھی حاصل کیں جو اب تقریباً ناپید ہیں -انہوں نے تمام ایسی معلومات کو یکجا کرنے کی سعئ بلیغ کی ہے جس کو وہ امکانی طور پر کر سکتے تھے - لیکن یہ بھی واضح ہے کہ فاضل مصنف کی رسائی ایسے ممکنہ شواہد تک جغرافیائی فاصلوں اور دیگر موانع کے باعث ہو بھی نہیں سکتی تھی جس کی ان کو ضرورت ہو سکتی تھی -چونکہ ایسا سارا مواد توارض ہند کے کتب خانوں کی سیر سے حاصل ہو سکتا تھا-اس تناظر میں ہم کو ان سے کسی تحقیقی انکشاف کی توقع بھی نہیں ہونی چاہیئے -سر سید احمد خاں نے جب "آثار الصنادید" لکھی تھی تو انہیں تمام تاریخی حوالے مہیا تھے -مگر احمد حسین کو ماسوا غیر محققہ مواد پر مبنی تصنیفات کے جو صدیوں بعد لکھی گئی ہیں اور میسر بھی کیا آیا ہو گا- چنانچہ اس ضمن میں ہم ان کی ہمت کو داد ہی دے سکتے ہیں اور یہ دعا کر سکتے ہیں کہ مستقبل میں اللہ ان کا حوصلہ اور بلند کرے اور وہ یہ کام زیادہ ٹھوس انداز سے کر سکیں بلکہ یہ بھی دعا کرنی چاہیے کہ امروہہ کے صاحبانِ علم وفضل جن میں عزیزان گرامی ڈاکٹر منظر عباس' ڈاکٹر امام مرتضیٰ 'ڈاکٹر محمد سیادت اور ڈاکٹر عظیم امروہوی ہیں 'آگے بڑھیں اور امروہہ کا وہ قرض ادا کریں جو ہمارے اسلاف کے وقتوں سے واجب الادا ہے -سچ تو یہ ہے کہ اگر احمد حسین صدیقی کو وہاں موجود لوگوں کا عملی تعاون زیادہ مثبت اور بہتر طریقے سے حاصل ہوا ہوتا تو یقیناً "کشور اولیا" اور بھی وقیع حیثیت حاصل کر سکتی تھی-

مجھے اس کا بخوبی علم ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی تدوین میں جتنی محنت شاقہ کی ہے نیز جتنا وقت اور سرمایہ صرف کیا ہے وہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں اب سے کئی سال پہلے اپنی کتاب کو مکمل کر لیتا لیکن اب تو میں اپنی عمر اور صحت کے بارے میں جانتا ہوں کہ شاید اتنی مہلت نہ ملے کہ وہ ارادہ جو برسوں پہلے کیا تھا اور جس کے پورا کرنے کی شدید خواہش و تمنا تھی کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے -اے بسا آرزو کہ خاک شدہ-

احمد حسین صدیقی نے ایک آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے مہارت نامہ کا ثبوت دیا ہے -انہوں نے امروہے کی تاریخی عمارتوں کی تصاویر جن زاویوں سے لی ہیں وہ ایک عام کیمرہ مین کے بس کا کام بھی نہ تھا- پھر عہد جدید کے گرافکس کے فن کو انہوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ جس طرح استعمال کیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے -طباعت کے لیے ان تکنیکی معلومات اور مہارت نے ان تصاویر کی فوٹوگرافی کی خامیوں کو دور کر کے وہ رنگ و کشش عطا کی کہ اصل کے حسن میں اضافہ ہو گیا-اس کتاب میں ان بوسیدہ عمارتوں کو محفوظ کر دینا ہی ایسا کارنامہ ہے جس کے لیے

اہالیانِ امروہہ کو ان کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ امتدادِ زمانہ سے یہ عمارتیں منہدم ہوتی جارہی ہیں اور اب صورت حال کچھ ایسی نظر آتی ہے کہ نہ جانے کتنی عمارتیں مستقبل میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی اور بہت سی دوسری تاریخی عمارتوں کی طرح ان کا نام و نشان بھی نہ ملے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ نہ وہاں کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو ان سے دلچسپی ہے اور نہ اہالیانِ امروہہ کو ہی اپنے تاریخی ورثے کے تحفظ کا خیال آتا ہے۔ ہماری اجتماعی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہم ان عمارتوں اور یادگاروں کے بارے میں شاید ہی کبھی سوچتے ہوں۔ یہی نسلاً بعد نسلاً ہوتا چلا آرہا ہے۔

وطنِ مالوف کے تاریخی در و دیوار کا جب میری پیدائش سے پہلے یہ حال تھا تو احمد حسین کی زیرِ نظر کتاب میں محفوظ ان نادر تصاویر سے ہماری آنے والی نسلوں کو کم از کم اپنی تاریخ کی وہ نشانیاں تو نظر آتی رہیں گی جن کے آثار بھی شاید اس وقت انہیں نہ ملیں۔

"کشورِ اولیا" احمد حسین صدیقی کی نہایت مخلصانہ کوششوں کی آئینہ دار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب امروہے کے ہر باشندے اور وطنِ مالوف سے محبت کرنے والے ہر قاری کے لیے معلومات اور دلچسپی کا مواد رکھتی ہے۔ احمد حسین کا اسلوب نہایت سادہ اور بیان ژولیدگی سے پاک ہے۔ انہوں نے بلا تفریق مذہب و عقاید مثبت رویہ رکھا ہے۔ ان کی بہترین کوششوں کے لیے ان کو سراہا جاسکتا ہے اور دعا ہی دی جاسکتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

-☆☆-

سید قمر رضی نقوی

کراچی

## "کشورِ اولیا"............ایک تحلیق

امروہے میں کئی پشتوں سے ایک حدیث متواتر سنائی اور سنی جاتی رہی ہے- نہ جانے یہ حدیث متواتر کس نفسِ قدسی کی ہے- بہر حال وہ کوئی بھی نفسِ قدسی ہو وہ بنواسرائیل کے کسی نبی سے مرتبے میں کچھ زیادہ کم نہیں تھا- حدیث میں آیا ہے اور یہ حدیث متفق بین الفریقین ہے کہ "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" یعنی میری امت کے علماء بنواسرائیل کے ہم مرتبہ ہیں-

جو حدیث امروہے سے متعلق ہے وہ یہ ہے "امروہہ شہر تخت ہے- گذران یاں کی سخت ہے جو چھوڑے وہ کم بخت ہے" میں اس حدیث کے اس حصے کو کسی منافق کا الحاق سمجھتا ہوں کہ گذران یاں کی سخت ہے- کیا فلسفیوں کے شہر ایتھنس، "استاجرا" اور ایشیائے کوچک کے شہر ایلیا کی گذران سخت نہیں تھی- اگر نہ ہوتی تو کیا مشہور فلسفی زینو اور پارمینائیڈیز خودکشی کرتے- کیا سقراط ایتھنس میں پھٹے پرانے چپل پہنے ہوئے نہیں پھرتا تھا؟ کیا وہ اپنی چڑیل بیوی "زن تیپی" کے ڈر سے کبھی بارہ بجے سے پہلے گھر جاتا تھا؟ اور وہ یوں کہ وہ پوچھے گی کہ او نکھٹو کچھ کما کے بھی لایا کہ نہیں؟ بہر حال اس حدیث کا یہ حصہ کہ گذران یاں کی سخت ہے، اشتعال انگیز حد تک ہیچ اور پوچ ہے-

ہائے میرا "شہر دل" میرا "دل شہر" امروہہ- واویلا صد واویلا ہے-

"شہر دل" میں عجب محلے تھے ان میں اکثر نہیں رہے آباد<br>
آگ "دل شہر" میں لگی جس دن سب سے آخر میں واں سے ہم نکلے<br>
اس سمندر پہ تشنہ کام ہوں میں "بان!" تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا؟

صاحبو! بائیس خواجہ کی چوکھٹ دلّی کی گذران کیا سخت نہیں تھی؟ اگر دلّی کی "گزران سخت" نہ ہوتی تو میرے دادا استاد حضرت سید محمد میر تقی میرؔ جیسے دلّی کے انتہا پسند قوم پرست کیا دلّی کو چھوڑ کر لکھنوٴ جاتے؟ اگر دلّی کی گذران سخت نہ ہوتی تو کیا مرزا نوشہ دلّی کے بارے میں یہ شعر موزوں فرماتے؟

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ<br>
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

اس نے بے مہری یاران وطن" کا نفس مفہوم "گذران" کے سوا کیا اور کچھ ہے؟

حقیقت امر یہ ہے کہ جن لوگوں نے امروہے کو چھوڑ کر دوسرے شہروں کی وطنیت قبیحہ اختیار کی وہ کسی بھی شک وارتیاب کے بغیر دوسرے درجے کے لوگ تھے۔وہ چاہے پرانے تھانے آگے کے غلام ہمدانی ہی کیوں نہ ہوں۔

عزیزی احمد (احمد حسین) نے امروہے کے بارے میں "کشوراولیا" لکھ کر مجھے جس قدرمات اور مبہوت کیا ہے میں اس کے اظہار میں اپنے آپ کو یک سر قاصر اور عاجز پاتا ہوں دراں حالیکہ مجھے لغت کے لغت حفظ ہیں۔ مجھ سے احمد کی تحقیق آگین تالیف پر کسی مربوط اور منجم گفتگو کی توقع نہ کی جائے ایک تو یوں کہ میں حالت سفر میں ہوں اور مجھے مشرق و مغرب میں بھٹکتے ہوئے پھرنا ہے دوسرے یوں کہ میرے ساتھ دواؤں کا ایک ڈھیر ہے اور میں سخت بیمار ہوں۔

ہے مجھے کرب کا سفر در پیش　　　　اور چاروں طرف ہے گھر درپیش

گھر؟" یعنی وہی امروہہ۔

مجھ غریب نے، غریب الغرباء نے اپنی اس بستی کو جتنا چاہا اتنا قیس عامری نے لیلیٰ کو، عربی کے رومانی شاعر جمیل نے بثینہ کو اور اسپین کے فرنام اور سرنام شاعر "عشق عذری" (Platonic love) کے شاعر ابن زیدون اپنی شاعر محبوبہ شہزادی ولادہ کو بھی نہیں چاہا ہوگا۔

نہ جانے کون ناہنجار اور نابکار تھا جس نے اردو کی ایک طبی لغت میں Nostalgia کا ترجمہ "مرض حب وطن" کیا ہے۔اس کی تو ایسی کی تیسی۔جانا جائے کہ وہ مردم آزار مسلمان تھا اس کے باوجود اس علیہ ماعلیہ نے آں حضرت کی ایک کیفیت قلبی کیساتھ نہایت کم تر درجے کا بھی انصاف نہیں کیا۔اگر میں ایسے مسلمان کا منہ نہ نوچ لوں تو اور کیا کروں؟ قمر رضی مجھے! بتا احمد! مجھے بتا کہ میں آخر اور کیا کروں؟

مروی ہے کہ جب آں حضرت نے مکے سے حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ہجرت اختیار کی تو فرمایا "اے مکے اگر میں مجبور نہ کر دیا جاتا تو تجھے ہرگز نہ چھوڑتا" اور یہ حدیث تو مشہور عام ہے حب الوطن من الایمان۔

میں برادر بہ جاں برابر احمد حسین کی تالیف "کشوراولیا" کو امروہے کی صرف تاریخ نہیں بلکہ "تخلیق" قرار دیتا ہوں۔میں جانتا ہوں کہ کسی یونیورسٹی اور کالج کا کوئی حلال خور لیکچرر میری یہ بات سن کر ہونق ہو جائے گا۔ اس خصوص میں معلم اوّل ارسطو کا یہ قول، قول فیصل ہے کہ شاعری سب سے بڑی تاریخ ہے۔ارسطو کے اس جملے پر شاید برٹرینڈ رسل یہ فقرہ چست کرتے کہ آخری زمانے میں ارسطو کی اپنے استاد افلاطون سے چل گئی تھی اور

یوں کہ افلاطون نے اپنے بعد اپنی جگہ اپنی اکیڈمی کا جانشین اپنے داماد کو قرار دیا تھا جو ارسطو کی توقع کے یکسر برخلاف تھا۔ سوارسطو نے شاید جھونجھل میں آکر اپنے استاد پر دو حملے کیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ افلاطون اپنی نوجوانی میں ایک شاعر تھا۔ مگر اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں اپنی نظموں کے مسوّدے کو جلا دیا تھا اور کہا تھا کہ اے آگ آکہ میں تجھ سے کوئی کام لوں۔ یہ شاعری کے خلاف افلاطون کا پہلا اقدام تھا۔ اس کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ اس نے اپنی ''ریپبلک'' میں شاعروں کو ایک سانس لینے کا بھی حق نہیں دیا تھا۔

سوارسطو نے اپنے استاد سے کنائے کے انداز میں انتقام لینے کے لیے یہ مشہور عالم جملہ کہا کہ شاعری تاریخ سے بڑی تاریخ ہے اور دوسرے یہ کام کیا کہ بوطیقا (Poetics) لکھی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ احمد حسین کی تالیف ''کشورِ اولیا'' صرف تاریخ نہیں بلکہ تخلیق ہے تو میں اس کتاب کی ایک ماجرانا ک جہت کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنی اس کتاب کے مواد کے لیے جس تحقیق اور تدقیق سے کام لیا ہے اس کی مثالیں شاذ و نادر ہیں۔

احمد حسین ایک آدی کا نام نہیں ہے۔ شخص مذکور دو آدمیوں سے عبارت ہے۔ ایک تو وہ احمد حسین ہے جس کے چہرے سے یتیمی، شرافت اور شرم ٹپکتی ہے۔ وہ بے حد پابندی کے ساتھ وقت پر دفتر جاتا رہا ہے۔ حالانکہ وہ قریب قریب میری ہی طرح کا ایک ڈھیلا ڈھالا شہری دکھائی دیتا ہے۔ وہ عام حالات میں محض ایک رائے دہندہ نظر آتا ہے۔ وہ لباس کے معاملے میں کم و بیش میری ہی طرح کا پھوہڑ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ بے ضرر ہے اور آپ اس کی طرف سے اپنی شخصیت کو بالکل محفوظ سمجھیں۔ ہرگز نہیں کیوں کہ دوسرا احمد حسین بلا کا حادثہ کوش واقع ہوا ہے۔

ہر منفرد عالم، محقق اور ادیب کے اندر ایک شیطانِ خلاق یا ایک عزازیل الوہی پایا جاتا ہے۔ یہ ماجرا طلب، ماجرانا ک ہم جو، احساس آگیں اور واقعہ پرور عزازیل الوہی ہے دوسروں سے مختلف اپنے ہی طور و طراز کا ہوتا ہے۔

احمد حسین کا دوسرا احمد حسین میرے لیے کئی برس سے ایک مسئلہ بن رہا ہے۔ وہ قلم و قرطاس کا نہایت صاحب دل واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے قلم سے کوئی بھی ''پرمایہ فتنہ'' بپا کر سکتا ہے۔ میں جن بزرگوں، اپنی پیڑھی کے لوگوں اور اپنے بعد آنے والے مصنفوں سے واقف ہوں ان میں یہ شخص مجھے اب تک وہ پہلا اور آخری مصنف دکھائی دیتا ہے جو اپنی پہلی ہی تصنیف ''سیاحت ماضی'' میں ایک نام بُردہ اور صاحب اسلوب، صاحب

اسلوب، صاحب اسلوب یگانہ مصنف کے طور پر شہود میں آیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی ادیب اور عالم نے اپنے چھوٹے سے شہر پر ایسی کتاب قلم بند کی ہو گی جو یکسر زائیدۂ تحقیق بھی ہو اور ایک "بیش از تخلیق" بھی۔
کوئی بھی قاری یہ سوچ سکتا ہے کہ جونؔ ایلیا "کشورِ اولیا" کو تخلیق کہنے پر آخر کیوں مصر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ احمد حسین نے اپنے کمپیوٹر سے امروہے کی متعدد عمارتوں کے وہ بام و در، وہ رواق، اطاق اور ستون تعمیر کیے ہیں جو میرے بابا کی ولادت سے بہت پہلے منہدم اور مسمار ہو چکے تھے۔ یہ آدمی عجب آدمی ہے جس نے اینٹوں کے بغیر، گارے کے بغیر عمارتوں کی عمارتیں تعمیر کر دیں۔
مجھے ہوائی اڈے پہنچنا ہے اور میں مجبور کن عجلت کے ساتھ ایسی کتاب پر قلم فرسائی کر رہا ہوں جو بے حد گہرا مطالعہ چاہتی ہے۔ اچانک مجھے ایک سخن کرنے کا خیال آ گیا ہے اور وہ یہ کہ تاریخ اور افسانے میں آخر کیا فرق ہے؟ میرے گمان کے مطابق مطالعہ طلبی کے اعتبار سے ایک معتبر، زندہ اور حساس تاریخ اور ایک معروضی معیاری اور خیال انگیز افسانے میں بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا اس لیے کہ دونوں چار بُعدی (Four dimensional) ہوتے ہیں۔ مگر یہاں میں ان دونوں کے باہمی فرق کو بھی بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے دنیا کے سب سے مشہور مورخ ہیروڈوٹس کی مشہور عالم تاریخ کی ایک عبارت یاد آ گئی ہے۔ وہ بُرج بابل کے بارے میں لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے" یہاں بابل میں ایک سات منزلہ بُرج ہے اور اس کی سب سے اوپر کی منزل (یعنی ساتویں منزل) میں ایک چپر کھٹ ہے۔ یہاں تک تاریخ ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ چپر کھٹ پر خداوند خدا آرام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ ہے تاریخ نہیں ہے۔ یاد آتا ہے کہ شاید ہیروڈوٹس نے یہی کچھ لکھا ہے۔ احمد حسین کی تالیف نہایت بیش قدر تالیف "کشورِ اولیا" میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ تاریخ ہے اور افسانہ افسانہ۔ دونوں ایک خاص حد تک چل سکتے ہیں لیکن پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ میں اس کتاب کے ساتھ ذرا بھی انصاف نہیں کر سکا کیونکہ میں شدید عجلت اور بدحواسی کی صورت حال سے دوچار ہوں۔ قمر! (قمر رضی) یار، تو میری طرف سے احمد حسین کے ماتھے کی مٹھی لے لینا۔

خدا حافظ

جونؔ ایلیا

۲۳ویں فروری سنہ ۱۹۹۹ء

## کشورِ اولیاء میں تین وقفوں کا قیام

"سیاحت ماضی" سے لیکر "گوہر بحیرہ عرب" تک کا سفر احمد حسین صدیقی نے جس پامردی اور استقلال سے طے کیا ہے وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ہر لحاظ سے ایک 'مثالی' ہے۔ "سیاحت ماضی" میں احمد حسین صدیقی ہمیں مغربی یوپی کی اس قدیم بستی کی سیر کراتے ہیں جو ایک زمانے میں مشرقی تہذیب و معاشرت کا مکمل نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی قدیم بستی کے ایک گھر میں احمد حسین نے جنم لیا۔ یہاں کی سگندھ بھری فضاؤں میں ان کے وجود نے سانسیں لیں اور اسی دھرتی کی بوباس میں پل کر ان کے بچپن نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ لیکن اس دھرتی پر قدم جمانے کا انہیں موقع میسر نہ آسکا۔ حالات ان کے قدموں کو ایک طویل سفر کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ احمد حسین صدیقی کے اس طویل سفر کا اختتام بحیرہ عرب کے کنارے بسی ہوئی اس بستی پر ہوا جو آج کراچی کے نام سے دنیا میں معروف ہے۔ جس کو احمد حسین بڑے پیار سے گوہر بحیرہ عرب کے نام سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دوسری تصنیف کا سرنامہ بھی "گوہر بحیرہ عرب" ہی رکھا ہے جس میں کراچی کی داستان بیان کی ہے۔ بظاہر ان دونوں بستیوں میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی الا یہ کہ دونوں داستانوں کا مصنف ایک ہی ہے۔ ایک بستی (امروہہ) اگر اس کا مولد ہے تو دوسری (کراچی) اس کا مسکن یا وطن ثانی۔ احمد حسین صدیقی دونوں کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں انہیں اپنی یہ دونوں بستیاں عزیز ہیں اور پیاری لگتی ہیں۔

ایک مدت پہلے احمد حسین صدیقی نے جب امروہہ کی سرزمین سے ناتہ توڑ کر اجنبی منزلوں کی طرف قدم بڑھائے ہونگے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کیفیت سے ضرور دوچار ہوئے ہونگے

میں نے جب دشت غریبی میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

میرے اس یقین کی وجہ ان کی پہلی تصنیف "سیاحت ماضی" اور موجودہ تیسری تصنیف "کشورِ اولیاء" ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ احمد حسین امروہہ سے ناتہ توڑنے میں کبھی کامیاب نہ ہوپائے۔ احمد حسین پر ہی کیا منحصر..... کوئی بھی اس ناتے کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اردو کا سب سے بڑا غزل گو جب پورب دیس کی اجنبی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے یہ کہتا ہے 'کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو' اور اپنی بات کا اختتام جب ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ اس مصرعہ پر کرتا ہے 'ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے' تو ان چھ مصرعوں میں

دراصل اس کے ماضی کا کرب پوشیدہ ہے یا فانی جب دکن کے تہذیبی اور ادبی مرکز میں بیٹھ کر یہ کہتے ہیں

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

تو دراصل یہ صرف میرؔ اور فانیؔ کی آوازیں نہیں ہیں بلکہ ہر اس حساس فنکار کا کرب ہے جو ماضی سے اپنا پیچھا چھڑانے میں ناکام رہتا ہے- عام آدمی تو حال کی آسائشوں اور سرمستیوں میں اپنے ذہن و وجود کو گم بھی کر دیتا ہے لیکن ایک سچے فنکار، حساس فنکار کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی اور حال، دونوں زمانوں میں بیک وقت سانس لینے پر مجبور ہوتا ہے- میرؔ ہوں یا فانیؔ انتظار حسین ہوں یا قرۃ العین...... یا احمد حسین صدیقی یا ان جیسے اور بے شمار فنکار- ان سب کا المیہ وہ نسٹالجیا ہے جو اختر الایمان کے ایک لڑکے کی صورت میں قدم قدم پر ان کا دامن تھام کر یہ سوال کرتا ہے

یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

فنکار یہ (Nostalgia) اگر صحت مند ہوتا ہے تو ماضی کے بہترین ورثے کو کھوج کھوج کر حال اور مستقبل کی نسلوں کے سپرد کرتا رہتا ہے اور جب مرض کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو فنکار کو ماضی کی غم گساری اور آہ وزاری کے لیے وقف کر کے رکھ دیتا ہے-

شکر ہے احمد حسین صدیقی کے (Nostalgia) میں ماتم گساری کی کوئی علامت نہیں ملتی- انہوں نے ایک صحت مند ذہن کے ساتھ ماضی کی سیاحت کی ہے اور ماضی کے بیش قیمت ورثے کو بہت تلاش و تجسس کے بعد "کشورِ اولیاء" کی صورت میں محفوظ کر دیا ہے- کشور اولیا اپنی ابتدائی صورت (مسودے) میں میرے سامنے ہے- جوں جوں میں نے اس کا مطالعہ کیا میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ احمد حسین صدیقی جتنے اچھے مصنف ہیں اس سے کہیں زیادہ اچھے محقق ہیں- انہوں نے جتنے کم عرصے میں اپنے وطن امروہہ کے بارے میں یہ مواد جمع کیا وہ یقیناً ایک کارنامہ ہے- امروہہ چھوڑے انہیں ایک مدت ہو گئی تھی- فاصلے کی دوری اور وقت کی گرد نے بہت سی چیزوں کو ذہن سے محو بھی کر دیا ہو گا اور دھندلا بھی دیا ہو گا- وہ صرف تین بار امروہہ آئے اور نہایت ہی کم کم وقفے کے لیے ان کا قیام رہا-

قیام کا پہلا وقفہ تو شاید ڈیڑھ ہی دن تھا جو نہایت تشنہ تھا- یہ تشنگی ہی ان کی پہلی تصنیف "سیاحت ماضی" کا محرک بنی جو قدم قدم پر اس تصنیف میں نظر آتی ہے- باقی دو دوروں میں بھی انہیں امروہہ میں ٹھہرنے کا موقع

زیادہ نہیں ملا- یہ تین وقفوں کا قیام بہ مشکل تمام ایک مہینے پر محیط ہے جس کو زیادہ مدت نہیں کہہ سکتے- لیکن اتنی کم مدت میں اتنا ڈھیر سارا تحقیقی مواد ایک اعلیٰ درجے کا ریسرچ اسکالر بھی جمع نہیں کر سکتا- کیونکہ تحقیق کا کام کرنے والے برسوں کی پتہ ماری اور جگر کاوی کے بعد کہیں جاکر گوہر مقصود حاصل کرپاتے ہیں- گوہر مقصود پر مجھے پھر احمد حسین صدیقی کی دوسری تصنیف "گوہر بحیرہ عرب" یاد آگئی جس میں انہوں نے پاکستان کی پہلی راجدھانی کراچی کی تاریخ بہت سادہ، سلیس اور دلچسپ انداز میں بیان کی ہے- کراچی کی یہ تاریخ ان کی محنت، دیدہ ریزی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ کہلانے کی مستحق ہے اتنی ہی جتنی ان کی موجودہ تصنیف "کشورِ اولیاء"..... دراصل "گوہر بحیرہ عرب" پڑھ کر ہی اس شک نے میرے ذہن میں سر ابھارا تھا کہ اس مصنف کے اندر کوئی محقق تو چھپا نہیں بیٹھا؟ مجھے خوشی ہے کہ "کشورِ اولیاء" پڑھ کر میرا شک یقین میں تبدیل ہو گیا- "کشورِ اولیاء" پڑھ کر آپ میری رائے کی صحت کو تسلیم کرنے پر یقیناً مجبور ہو جائینگے- اس لیے احمد حسین صدیقی نے امروہہ کی تہذیبی، ادبی، ثقافتی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کو انہوں نے پیش کرنے سے چھوڑ دیا ہو-

خدا کرے ان کا قلم اور ذہن اسی توانائی سے مزید کارنامے پیش کرتا رہے-

-☆☆-

سرفراز عثمانی

امروہہ

۱۲/ فروری ۱۹۹۸ء

## ''کشورِ اولیاء''............ روحِ امروہہ

جہاں ایک طرف انسان اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتا ہے وہیں دوسری طرف اس کے کچھ ایسے فرائض بھی ہوتے ہیں کہ جن کو انجام دینا اس کے لیے اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ احمد حسین صدیقی صاحب اب حالانکہ کراچی میں سکونت پذیر ہیں مگر شہر امروہہ سے ان کی پرانی وابستگی ہے۔ وہ یہاں محلہ چاہ شور میں پیدا ہوئے اور یہیں آئی۔ایم۔انٹر کالج میں انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں کے لوگوں کے ساتھ وہ اٹھے بیٹھے اور ان میں گھلے ملے بھی۔ وقت کے حالات نے انہیں مجبور کیا اور ہندوستان کی تقسیم کے چند سال بعد وہ پاکستان چلے گئے، مگر یہاں کی تہذیب تمدن، فن کاری، میلے تہوار، جلوس، مزارات، امام باڑے، واسدیو تیرتھ، تعلیمی ادارے و دیگر متفرق عمارتیں وغیرہ ان کے دل و دماغ پر چھائے رہے اور اب وقت آنے پر ان سے متعلق اپنے تاثرات کو انتہائی خوبصورت لڑیوں میں پرو کر ایک کتاب کی شکل میں ''کشورِ اولیاء'' کے نام سے لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ میری نظر میں ان کے فرائض میں سے ہی ایک ایسا قرض تھا جسے پورا کرنا ان کے لیے لازم تھا۔

کتاب کشورِ اولیاء کو میں نے بڑی دلچسپی اور بہت غور سے اول تا آخر پڑھا ہے۔ صدیقی صاحب ایک حقیقت پسند اور کشادہ نظر انسان نظر آتے ہیں۔ اسی لیے کتاب میں بھی صداقت صاف صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ''کشورِ اولیاء'' دراصل روحِ امروہہ ہے تو قطعئی غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے بہت سلیس زبان کو اپنایا ہے۔ جتنا بھی لکھا ہے اس میں سب ہی پڑھنے والے لوگوں کے لیے ایک جیسی کشش ہے۔ ان کے اس انداز سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ سبھی معاشروں کے جلوس، میلے اور تہواروں کو جہاں صدیقی صاحب نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے وہیں بنا کسی فرق کے امروہہ کے خاص خاص ادیبوں، شاعروں، مصنفوں، حکیموں اور دینی شخصیات وغیرہ کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ جیسے ان میں سے کچھ کے ساتھ ان کا بہت نزدیکی تعلق رہا ہو۔

صدیقی صاحب کی شخصیت اس ناتے قابل تحسین و تعریف ہے کہ انہوں نے اپنے جاء ولادت امروہہ کو ''کشورِ اولیاء'' جیسا بہترین نام دیا اور اسی نام سے یہ کتاب لکھ کر اس شہر کو ایک نئے چراغ سے روشن کیا ہے۔ آنے والی نسلیں ان کے علمی شوق و ذوق سے فائدہ حاصل کرتی رہیں گی۔

رام ناتھ شرما محلہ چوک امروہہ

## "کشورِ اولیا"............مدنی زندگی کی جھلکیاں

امروہہ احمد حسین صدیقی صاحب کا مکہ ہے اور کراچی مدینہ - انہوں نے پہلے "گوہر بحیرہ عرب" اور پھر "کشور اولیاء" لکھ کر دونوں کی محبت کا حق ادا کر دیا- ہوا کچھ یوں کہ پچھلے دنوں جب صدیقی صاحب امروہے تشریف لائے اور ان کی کتاب "گوہر بحیرہ عرب" دوستوں کی نظر سے گزری تو ان سے فرمائش کی گئی کہ کیا اچھا ہو اگر وہ ایسی ہی ایک کتاب اپنے وطن مالوف امروہے کے بارے میں بھی مرتب کر دیں- انہوں نے دوستوں کی اس فرمائش کو قبول فرماتے ہوئے اپنے چند ہی روز کے قیام میں مجوزہ کتاب کا نہ صرف خاکہ مرتب کر ڈالا بلکہ اس کے لیے جگہ جگہ جا کر، باخبر لوگوں سے مل کر اور اپنے موضوع سے تعلق رکھنے والی کتابیں کھنگال کر ضروری مواد بھی اکھٹا کر لیا- اس تحقیقی کام کے لیے امروہے میں ضروری وسائل کے فقدان کے باعث انہیں کافی زحمتیں بھی اٹھانا پڑیں، لیکن وہ ہمت نہیں ہارے اور بستی سے دور نسبتاً ویران مقامات میں مرور ایام سے بتدریج مٹتے ہوئے ان تاریخی آثار کو ڈھونڈ نکالا جو خود یہاں کے رہنے والے کتنے ہی لوگوں کی نظر سے اوجھل تھے- ان کا کیمرہ ہر جگہ ان کے ساتھ رہا جس کی مدد سے انہوں نے ان تمام تاریخی مقامات، مساجد، مقابر اور درگاہوں کی تصاویر بھی اپنے پاس محفوظ کر لیں جو انہیں درکار تھیں-

اس کتاب کا نام "کشور اولیا" بے حد مناسب ہے- اس قدیم بستی کے اطراف واکناف میں پائے جانے والے بزرگانِ دینؒ، شہداؒ اور اولیاء اللہؒ کے مزارات امروہے کے اس تشخص کا بیّن ثبوت ہیں-- ان بندگان خدا رسیدہ کا تذکرہ اگرچہ ہمیں بعض دوسری کتابوں میں خصوصاً محمود احمد عباسی کی تالیفات "تاریخ امروہہ" اور "تذکرۃ الکرام" میں مفصل طور پر مل جاتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اب یہ کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں- صدیقی صاحب نے "کشور اولیاء" میں وہ تمام ضروری معلومات بہت سادہ اور سلیس زبان میں فراہم کر دی ہیں جس کی ایک عام آدمی خصوصاً نئی نسل کو جستجو رہتی ہے یا ان پر خدا کا فضل ہو تو کبھی آئندہ ہو سکتی ہے- انہوں نے یہاں کی قدیم مساجد کے بارے میں پوری تحقیق کے بعد ان کے محل وقوع، بنوانے والوں کے نام، زمانۂ تعمیر اور موجودہ حالت کی بالالتزام نشاندہی کر دی ہے جس سے ہماری معلومات میں یقیناً بڑا اضافہ ہوگا-

امروہہ علم وادب اور فنون لطیفہ بالخصوص شعر وشاعری کا گہوارہ رہا ہے- اس کتاب کے مطالعے سے ہماری

نسل ان بزرگوں سے بالتفصیل نہ سہی تو کم از کم سرسری طور پر ہی متعارف ہو سکتی ہے جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنے وطن کا نام اس طرح روشن کیا ہے کہ آج کوئی منصف مزاج مورخ امروہے کے حوالے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب یہاں کی مدنی زندگی کی وہ تمام جھلکیاں پیش کرتی ہے جس کے بغیر امروہے کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی، مثلاً یہاں کی عزاداری، شعراء، علماء، اطبا، تعلیمی ادارے، بود و باش، آب رسانی کے طریقے، وسائل نقل و حمل، صنعت و حرفت، تہوار، میلے ٹھیلے، کھیل تماشے وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے نقشے پر امروہہ قومی اتحاد و یگانگت اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس سے دوسرے مقامات کے باشندوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

"امروہہ کا محرم" کے زیر عنوان مصنف نے یہاں کے چند مشہور عزاخانوں اور مراسم عزا کے بارے میں جو تفصیل دی ہے اس سے ایک اجنبی قاری کی معلومات میں بلاشبہ بڑا اضافہ ہو سکتا ہے۔ عشرہ محرم کے ماتمی جلوس کا بیان بے حد مربوط و مرتب ہے جس کو مصنف کے باریک بین مشاہدے اور برمحل جزئیات نگاری نے ایک ایسی تحریری ڈاکومینٹری بنا دیا ہے جس کو پڑھ کر اس جلوس کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت جو غالباً ہر ادب شناس قاری کو متاثر کرے گی اس کی لاجواب مطالعہ پذیری (Readability) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کی دوسری تخلیقات کی طرح اس کتاب کا اسلوب بیان بھی ایسا سلیس، رواں اور شگفتہ ہے کہ دوران مطالعہ ذہن پر کوئی بار نہیں ہوتا بلکہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کامیابی کے لیے بھائی احمد حسین صدیقی صاحب کی خدمت میں اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور مقبول ہوگی۔

-☆☆-

ڈاکٹر منظر عباس نقوی

سابق چیرمین، ڈپارٹمنٹ آف اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

## کشورِ اولیا............ آئینۂ امروہہ

مکمل طور پر اپنے مولد امروہہ پر مشتمل جناب احمد حسینؔ صاحب کی تیسری تصنیف "کشورِ اولیاء" کو اگر ہم آئینۂ امروہہ کہیں تو غلط نہ ہوگا- یہ کتاب قدیم اور موجودہ امروہہ کی ایک ایسی خوبصورت دستاویز ہے جو یقیناً قابلِ قدر ہے- تفصیلات کے علاوہ تصاویر کے ذریعہ امروہہ میں اولیائے کرام کی درگاہوں، مقبروں، مساجد، مندروں اور دیگر عمارتوں کو انہوں نے اس شاندار انداز میں پیش کیا ہے کہ امروہہ کی تاریخ اپنے منہ سے خود بخود بولتی نظر آتی ہے- جس طرح موصوف نے کراچی پر ایک معتبر کتاب "گوہر بحیرۂ عرب" لکھی ہے کم و بیش اسی طرح انہوں نے "کشورِ اولیاء" میں اپنے مادرِ وطن امروہہ کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے- اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک عرصے سے ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی- سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمود احمد عباسی کی کتاب "تاریخِ امروہہ" کے بعد امروہہ پر کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی جو تمام امروہہ کی عکاسی کرتی ہو-

دنیا بھر میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے مشہور امروہہ کو جس فراخ دلی کے ساتھ موصوف نے "کشورِ اولیاء" میں ایمانداری کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے- کشورِ اولیاء کا جنم دراصل اُس جلسہ میں ہو گیا تھا جو گزشتہ سال موصوف کی امروہہ آمد پر ان کے خیر خواہ دوستوں نے محلّہ بگلہ امروہہ میں منعقد کیا تھا- جس میں بھائی شمیم ہادی صاحب بھی موجود تھے- جلسہ کی نظامت مشہور و معروف محقق، ادیب اور شاعر جناب ڈاکٹر عظیم حیدرؔ صاحب امروہوی کر رہے تھے- مشاعرے کے اختتام پر ڈاکٹر عظیم حیدر صاحب نے کہا، کہ جس طرح جناب احمد حسین صدیقی صاحب نے ایک عرصے دراز تک کراچی میں رہنے اور کے-ڈی-اے کے ڈائریکٹر جنرل کے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہنے کے سبب "گوہر بُحیرہ عرب" (کراچی) تصنیف کر کے کراچی کا قرض اتارا ہے اسی طرح انہیں امروہہ پر ایک کتاب تصنیف کر کے اپنے مولد کے قرض سے بھی بری ہونا چاہیے جو یقیناً یہاں کے لوگوں کا حق بھی بنتا ہے- یہ بات شاید ان کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دل و جان سے جٹ گئے اور بہت جلد ہی نتیجہ بھی سامنے آگیا- جب تقریباً دو ڈھائی مہینے کے بعد یکم فروری سنہ ۱۹۹۸ء کو وہ اپنے ایک ہندو دوست پنڈت رام ناتھ شرما زہینؔ کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے امروہہ تشریف لائے تو "کشورِ اولیاء" کا کمپیوٹر پر کمپوز کیا ہوا مسودہ ان کے ہاتھ میں تھا جسے دیکھ

کر یہاں کے لوگوں کو بڑی حیرانی ہوئی۔

انہوں نے مزید اپنی منشایہ ظاہر کی کہ اس میں اور ضروری مواد بھی شامل کیا ہے جسے انہوں نے جمع کرنے میں بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔ شہر کی نامور شخصیات جناب ڈاکٹر عظیم حیدرؔ، توفیق احمؔد قریشی، ڈاکٹر احمد حسین صؔفی، سید خورشید مصطفیٰ رضوی، پنڈت رام ناتھ شرما زیؔن، سرفراز عثمانی، رئیس نجمی جیسے ادیبوں، شاعروں اور صحافی حضرات نے ان کی اب تک کی کاوش کی بڑی تعریف کی۔ کشورِ اولیا میں موصوف نے جس خوبی کے ساتھ امروہہ کو سمیٹا ہے وہ ان کے امروہوی ہونے اور اس کے لیے ان کے دل میں جھلکتے پیار کا ثبوت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کشورِ الیاء تصنیف کر کے موصوف نے اپنے مولد کا قرض چکا دیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میں آخر میں احمد حسین صدیقی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

-☆☆-

بھونیش کمار شرؔما بھون امروہوی

کنوینئر امروہہ کے گورو

امروہہ

## ''کشورِ اولیا''......ایک دستاویز

یوں تو امروہہ کا ذکر ہندوستان و پاکستان میں لکھی جانے والی مختلف کتب تواریخ میں ہر دور میں مل جاتا ہے۔ فارسی اور اردو تذکرہ نگاروں کے علاوہ انگریزی میں سرکاری گزیٹیر نے بھی امروہہ کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ صرف امروہہ کو موضوع بنا کر جو کتب تاریخ گذشتہ دو سو سال میں فارسی اور اردو میں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔

لیکن ان تمام تواریخ میں خاندانوں کے شجرات 'شاہی منصبداروں کے تذکرے اور حسب و نسب کی افضلیت کا زیادہ ذکر ہے۔ جناب احمد حسین صدیقی امروہہ کے وہ پہلے مورخ ہیں جو نہ صرف مورخ بلکہ مصور بھی ہیں مگر مورخ ایسے کہ غیر بھی جنھیں منصف مان لے 'اور مصور ایسے کہ تصاویر کو قوتِ گویائی عطا کردیں گونگی تصاویر کو زبان عطا کردیں۔

''کشورِ اولیا'' ان کی ایسی تصنیف ہے کہ بلا شبہ جسے ان کا شاندار 'یادگار اور تاریخ ساز کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے کہ جس کی انفرادیت 'اہمیت 'افادیت اور عظمت کا اعتراف ہر علم دوست منصف مزاج تاریخ داں کو کرنا پڑے گا۔ صدیقی صاحب نے اس میں جس صدق بیانی سے کام لیا ہے ان کی اس صداقت کا کلمہ پڑھا جا سکتا ہے۔ ''کشورِ اولیا'' ایک محب وطن کے دل 'ایک مصور کی نگاہ اور ایک محقق و مورخ کے ذہن کا عظیم شاہکار ہے۔

سرزمینِ امروہہ اپنے اس نامور سپوت پر جتنا بھی فخر کرے وہ کم ہے۔

-☆☆☆-

ڈاکٹر عظیم حیدر نقوی

امروہہ

# امروہہ...... مثل ایک چھوٹا برّ اعظم

امروہہ شمالی ہند کی ایک چھوٹی سی قدیم بستی ہے جو صدیوں سے آباد ہے۔لیکن افسوس اس کی کوئی تاریخ نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو سکے یہ کب آباد ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مہابھارت کی جنگ کے وقت بھی آباد تھی۔اتنی مختصر بستی ہونے کے باوجود یہ علم و ادب، تہذیب و تمدن، ثقافت و ضیافت اور اپنی خوبصورتی میں پورے ہندوستان میں ایک نمایاں مقام اور دنیا بھر میں اپنی شہرت رکھتی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم اندلسی مورخ و سیاح ابو عبداللہ ابن بطوطہ بھی اس شہر کا ذکر اور اس کی خوبصورتی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا

امروہہ اپنی آبادی اور رقبے کے لحاظ سے ایک چھوٹا شہر ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس مختصر بستی کا ذکر Encyclopaedia Britanica میں بھی ملتا ہے جس میں شیخ سدو اور سوت ندی کے بارے میں کچھ اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

"Amroha,a Municipal Town and Tehseel (Sub.division) of Moradabad District Rohil Khand division,Utter Pardesh,India lies above 81 MI,E.of Delhi on the Delhi Moradabad Section of the Northern Railway. Pop.(1961)68,965. It is on the left bank of Sot river,on a low site among mango groves and is note worthy for the Shrine of Sheikh Saddo,a Muslim Saint. Three intermediate colleges are connected with Agra University. Carpet,weaving and ornamental pottery making are its chief Industries and there is Sugar mill."

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس کے ہر محلے، ہر گلی، اور ہر کوچہ و بازار کا کلچر، رہن سہن، رسم و

رواج اور انداز بیاں اپنی جگہ منفرد نظر آتا ہے۔ جب ایک محلے کا آدمی دوسرے محلے میں نظر آئے تو اس کی گفتگو اور بول چال سے فوراً شناخت ہو جاتی ہے کہ اس شخص کا تعلق فلاں محلے سے ہے۔ اس لحاظ سے اگر اس شہر کو تہذیب و ادب کا ایک چھوٹا سا براعظم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ زہریلے بچھو بھی اس سرزمین کی تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جنہیں پکڑ کر دبایا بھی جائے تو اپنی فطرت کے خلاف ڈنک نہیں مارتے۔۔ ہمالیہ کے دامن میں اس بستی کا کچھ عجب رنگ ہے۔ یہاں کتنے ہی مذاہب کے لوگ آباد ہیں لیکن ان کے رہنے سہنے کے انداز میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہی بزرگوں کا ادب واحترام، وہی سادگی اور وہی قناعت پسندی، جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی، قائم ہے۔ یہاں کے لوگ، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو حصول سے آگے نہیں بڑھنے دیتے، معصوم بچے بھی مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں۔ یہاں نہ ڈرائنگ روم ہے نہ بیڈ روم، وہی بیٹھک ہے، لیٹنے کو کھوڑا پلنگ اور بیٹھنے کو تخت ہے۔ آج کا دور ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے، بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے اپنے آپ کو ترقی یافتہ شہری کہلاتے ہیں۔ عزت وشہرت، عیش و عشرت اور پرسکون زندگی کے لیے وہ اپنی دولت پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ لیکن انہیں چین و سکون جیسی چیز میسر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان چھوٹے شہروں کے لوگ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ ٹریفک کا شور ہے نہ کلاشنکوف کی گھن گرج، جب رات کی تاریکی اس شہر کو اپنی آغوش میں لیتی ہے تو علم وادب کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جگہ جگہ مشاعروں اور چار بیتوں کی محفلوں سے داد و تحسین کی آوازیں آتی ہیں، دل کو موہ لینے والے بھجن اور کہیں دور ...... سے مندروں کی گھنٹیاں اور ناقوس کی سریلی آوازیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ کہیں چھوٹی چھوٹی خوبصورت نشستوں کے قہقہے سنائی دیتے ہیں تو کہیں مسجدوں سے آذانوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور پھر کہیں ..... دور ........ سے شادی بیاہ کے گیتوں سے، جو لڑکیاں ڈھولک بجا بجا کر گاتی ہیں، امیر خسرو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ غرض کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ یہاں کوئی بھی ادبی محفل نہ ہوتی ہو۔ یہی زندگی ہے۔ ..یہی زندہ دلی ہے..... اور تو کچھ بھی نہیں۔

یہی موسموں کا حال ہے، جب یہ اپنا رنگ بدلتے ہیں تو کبھی کپکپی لگتی ہے، کبھی جسم و جاں سے، کبھی آسمان سے لڑیاں ٹپکتی ہیں۔ کبھی ساون، کبھی بھادوں، کبھی موسم بہار آتا ہے اور پھر آم کے باغوں پر نکھار آتا ہے۔ بور کی بھینی بھینی خوشبو دل ودماغ کو معطر کر دیتی ہے اور چار دانگ کوئل کی سریلی صدائیں گونجنے لگتی ہیں۔ کبھی پروا کبھی پچھوا اور کبھی دوپہریہ کی لوویں چلتی ہیں تو کبھی باد نسیم کے دل آویز جھونکے، کبھی کالی گھٹاؤں میں سفید بگلوں کی

قطاریں گزرتی ہیں' تو کبھی آسمان پر شفق اپنے رنگ بکھیرتی ہے- ہولی آتی ہے تو گرمیوں کا سلام کہتی ہے، دیوالی آتی ہے تو سردیوں کا پیغام دیتی ہے اور اسی طرح چھم چھم کرتی ہوئی برسات یہاں کے شاعروں کو نیا کلام دیتی ہے- اس شہر میں خوشیاں بھی ہیں غم بھی ہیں- جہاں عید و بقر عید، ہولی دیوالی اور چھڑیوں کے میلے اپنی خوشیاں اور رنگ بکھیرتے ہیں وہاں محرم کے غم تڑپا دیتے ہیں اور یہاں کے ہر مذہب و فرقے کے لوگ، امیران شہر سے لیکر غریبان شہر تک' اس غم میں شریک ہو کر شہدائے کربلا کی یاد تازہ کر دیتے ہیں-

امروہہ میں جہاں اتنی خوبیاں ہیں' خوبصورت موسم ہوتے ہیں اور رات دن علم و ادب کی اتنی محفلیں منعقد ہوتی ہیں کہ غیر امروہوی بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ایک مردم خیز اور منفرد بستی ہے- لیکن اس بستی کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ یہاں کے اکثر باشندوں میں ذات پات کی تقسیم' خاندانوں کی تقسیم، پیشوں کی تقسیم اور کمتری و برتری کا گھناؤنا احساس' بھی نمایاں ہے- اس برائی کے پیدا ہونے کا اصل سبب عہد ماضی میں جاگیر داری نظام تھا جس نے طبقہ اعلیٰ اور ادنیٰ کی داغ بیل ڈالی- یہ بات صرف امروہہ ہی پر منحصر نہیں، آج بھی جہاں یہ نظام رائج ہے وہاں یہ خرابی اپنی جگہ موجود ہے جس کی جڑیں بڑی مضبوط اور گہری ہیں-

برصغیر میں انگریز نے اپنے اقتدار و تسلط کو پائدار اور مستحکم بنانے کے لیے باشندگان ملک میں ادنیٰ و اعلیٰ اور ذلیل و پست کی تقسیم کا جال پھیلایا- جو لوگ صاحبان والا شان کے کاسہ لیس اور حاشیہ بردار تھے ان کو اعزاز و انعامات' اور مراعات سے نوازا گیا- ان کو غریب اور متوسط لوگوں پر حاکم بنا کر مسلط کیا گیا- جس کے نتیجے میں ایک طبقہ دولت کے ذرائع کا مالک اور حکومت کا منظور نظر بنا جس کی تعداد قلیل تھی اور بقیہ کہ جس کی تعداد کثیر تھی اسے طبقہ ادنیٰ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا- اس طبقے نے اپنی حاکمیت کے اقتدار و اختیارات کے خوب خوب جوہر دکھائے- غریب اور محنت کش مزدور کی عزت و آبرو، جان و مال، اس طبقے کے لیے کھلونا بن کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ہر قسم کا استحصال جائز ہوا- جس کو پیٹ کے لیے دو روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے تین کپڑوں کا حصول بھی محال ہو گیا تو اس کے اندر تعلیم تربیت اور اعلیٰ اخلاق و معیار کہاں سے پیدا ہوتا- اسی بات نے ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کو جنم دیا- ظاہر ہے جب خصائل رزیلہ عادت و مزاج بن جائے تو طبقہ' اشراف اس سے نفرت ہی کریگا- اس طرح جو دوری اور تفریق پیدا ہوئی اس نے قوموں کو تباہ کر دیا- اس انداز سلطنت و حکومت کے نتیجہ میں باہمی بیزاری و نفرت، غربت و افلاس کو فروغ ہوا اور محنت کش مزدور غریب سے غریب تر اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتا چلا گیا-

امروہہ بھی اس جاگیر دارانہ کینسر سے محفوظ نہ رہ سکا- یہاں جاگیر داری نظام کا تو خاتمہ ہو چکا لیکن اس برائی کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا- یہاں فضیلت کا معیار کردار نہیں خاندان ہے- حسب نسب کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم وحوا کی اولاد ہیں- ذاتیں اور خاندان تو محض شناخت کے لیے بنائے گئے ہیں- اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ومکرم وہی شخص ہے جس کا تقویٰ وطہارت بلند ہے- لیکن مسلم قوم نے تو اپنے یہاں اتنی تقسیم کر ڈالی کہ ملت اسلامیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی اور مختلف فرقوں اور گروہ میں بٹ گئے- اسی طرح تعلیم یافتہ طبقہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جن میں انکساری نام کو نہیں- وہ اپنی علمیت پر ایسے نازاں ہیں جیسے علم پر ان ہی کا حق تھا-

ہر طرح کی قربت اور ہم آہنگی کے باوجود ادنیٰ واعلیٰ' بلند اور پست کی تفریق بڑے عروج پر رہی- حتیٰ کہ پیشے کو بھی معیار شرافت اور پیمانۂ رذالت بنالیا گیا تھا- عہد ماضی میں یہاں بوجہ پیشہ ان پیشہ وروں کے ساتھ بھائی جیسا سلوک نہیں کیا گیا- ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز والی بات تو دیکھنے میں ضرور آتی تھی لیکن ایک ہی محفل میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی- اگر کسی نے حق حلال روزی کے لیے کوئی پیشہ اختیار کر لیا تو اسے اس پیشہ کے نام سے پکارا جانے لگا اور اس کی برادری کو الگ تھلگ کر کے رکھ دیا- یہ تقسیم غیر طبعی اور غیر انسانی تھی جو پرچم برطانیہ کے سایہ تلے اس کے نمک خواروں نے خوب خوب کی- لیکن جس دن یہ بازی گر انگریز اپنی بساط لپیٹ کر روانہ ہوا تو انسانیت نے کروٹ لی- آج وہ تمام تفریقات ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئیں- فضل ربانی کے دروازے تمام نوع انسانی پر کھلے ہوئے ہیں- ہر شخص اپنے ظرف اور کسب کے مطابق فیضیاب ہو رہا ہے- کل تک جن کو کمتر اقوام کہا جاتا تھا آج وہ علم وفضل میں' دولت وثروت میں' شائستگی اور تہذیب میں' سنجیدگی ومتانت میں ایک مقام ارفع کی طرف گامزن ہیں- ۴۳سال کے بعد سفر امروہہ کی سعادت نصیب ہوئی تو تعلیمی ادارے، مسجدیں، دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، عیدگاہ ودیگر رفاہی اور قومی اداروں کی شان دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی- آج ان اداروں کی بقا وترقی کے لیے ہمارے وہ پیشہ ور بھائی بھی' جن کو کبھی درجہ برابری دیا جانا بعض طبیعتوں پر گراں گزرتا تھا' پیش پیش ہیں- سماجی ورفائی کاموں میں دلچسپی کاوش وخلوص اور ان کا ایثار وتعاون قابل تحسین ہے-

-☆☆☆-

# امروہہ............تاریخی پس منظر

ہندوستان کی قدیم ترین بستیوں میں امروہہ کو ڈھائی ہزار سال پرانی بستی بتایاجاتا ہے- عموماً ہندوستان کی قدیم بستیوں کی تاریخ ملتی ہے، یعنی یہ کہ ان کی بنیاد کب پڑی اور کس نے رکھی، لیکن افسوس کہ امروہہ کی وجہ تسمیہ اور اس کی بنیاد کا زمانہ بڑی حد تک پردۂ اخفا میں ہے- اس بارے میں روایت یہ ہے کہ راجہ پرتھی سنگھ کی بہن امبارانی نے اسے آباد کیا، کچھ مورخین کہتے ہیں کہ اس بستی کے اردگرد آموں کے باغات بہ کثرت پائے جاتے ہیں اسی لیے اس بستی کا نام امروہہ پڑگیا اور کچھ مصنفین یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک سنسکرت لفظ "امرونم" سے "امروہہ" مشتق ہے-

امروہہ کا نام کیوں اور کس نے رکھا؟ یہ بات اگرچہ حتمی طور پر معلوم نہیں، تب بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک نہایت قدیم بستی ہے- اس کی قدامت کے بارے میں "تاریخ سادات امروہہ" کے مصنف سید خصال احمد نقوی ابن سید جمال احمد نقوی (مرحوم) کا کہنا ہے کہ:

"یہ امر بدرجہ یقین ثابت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ سے قبل اس بستی کا وجود تھا- اور اب تک بعض مقامات پر امروہہ میں کہیں کہیں اہل ہنود کے زمانہ کی اینٹیں اور سکے وغیرہ ایسے مل جاتے ہیں جن سے اس بستی کی قدامت پر مہر تصدیق لگ جاتی ہے- سب سے اول مسلمانوں کی جس ترک تاز (لشکر کشی) کا پتہ اس نواح میں چلتا ہے وہ سلطان محمود غزنوی کا ایک حملہ ہے جس میں ہندوؤں کو سلطان محمود غزنوی کے مقابل رہب ندی (رام گنگا) کے کنارے شکست ہوئی- غزنوی دور میں اس طرف کوئی مستقل حکومت مسلمانوں کی قائم نہیں ہوئی- اس کے بعد سلطان شہاب الدین غوری نے سنہ ۵۸۸ھ مطابق سنہ ۱۱۹۲ء میں تراوڑی (تھانیسری) کے میدان میں رائے پتھورا کو شکست دے کر اسلامی حکومت کی مستقل طور پر بنیاد ڈال دی- خاص امروہہ میں اسلامی لشکر کے داخلے اور عملداری کی صحیح تاریخ معلوم نہیں مگر روایت ہے کہ حضرت مسعود سالار غازی نے

سنبھل کے قریب ہندوؤں کے مقابل ایک نمایاں فتح حاصل کی تھی جس کی یادگار میں اب تک سنبھل و امروہہ وغیرہ میں نیزے کا میلہ منعقد ہوتا ہے-اس کے بعد تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں امروہہ کو ایک ولایت قرار دے کر یہاں ایک حاکم مقرر کیا اور شاہی لشکر کی چھاؤنی بھی یہاں بنائی- حکومت اسلامی کی ابتدا میں بلکہ بعد میں بھی کوئی خاص تاریخی اہمیت امروہہ کو حاصل نہیں ہوئی- کہیں کہیں قدیم کتب تاریخ میں مثلاً تاریخ فیروز شاہی و فرشتہ وغیرہ میں مفسدین کی سرکوبی وغیرہ کے سلسلے میں امروہہ کا ذکر آتا ہے-کتب تذکرہ سے پایا جاتا ہے سلطان معزالدین کیقباد کے زمانہ سلطنت میں ملک عنبر حاکم امروہہ نے امروہہ کی جامع مسجد ۶۸۶ ہجری میں تعمیر کرائی-جس کا کتبہ اس مسجد کے دروازے پر موجود ہے-اور اب یہ مسجد شیخ سدو کی مسجد کے نام سے مشہور ہے-بقول صاحب تاریخ فرشتہ و صاحب تاریخ فیروز شاہی ۱۳۰۵ء عیسوی میں مغلوں کے لشکر سے سلطان کو فتح حاصل ہوئی-"صاحب تاریخ امروہہ اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر لکھتے ہیں:

"سید العارفین سید حسن المعروف بہ شرف الدین شاہ ولایتؒ قدس سرہ العزیز سلطان غیاث الدین تغلق کے ابتدائی عہد سلطنت میں نواح ملتان سے مع اپنے خلفا اور اعزا کے امروہہ تشریف لائے اور یہاں کے شاہ ولایت کہلائے -آپ کے فرزند قاضی سید امیر علی جد سادات محلہ لکڑہ و حقانی وغیرہ بعہد سلطنت محمد تغلق امروہہ کے اخلاف اور برادرزادگان نے سلطنت کی شاندار فوجی و ملکی خدمات انجام دیں- شہرت و ناموری حاصل کی اور تنخواہ و مدد معاش میں جاگیریں اور معافیاں ملیں-"

امروہہ کی قدامت اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی حیثیت کے بارے میں جناب محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب "تاریخ امروہہ" میں بہت تفصیل سے لکھا ہے-وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس بستی کے سنسکرت نام سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ نگری کسی ایسے زمانہ میں بسی تھی جب سنسکرت زبان بول چال میں مروج یا کم از کم شہروں اور بستیوں کے نام رکھنے میں مستعمل تھی-ایسے زمانہ کی کم سے کم مدت تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح شمار ہوسکتی ہے،اس اعتبار سے امروہہ کو تقریباً ڈھائی ہزار برس سے آباد سمجھنا چاہیے-

روایت مختص المقام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس میں اس بستی کا بسانا ہستناپور کے راجہ امر جودہ سے منسوب کیا جاتا ہے-امروہہ کے مغرب میں پانچ کوس کے فاصلہ پر گنگ استھل ایک موضع اب تک آباد ہے-

مشہور ہے کہ یہاں راجہ کا ہاتھی خانہ تھا- اس موضع کا نام سنسکرت زبان کے الفاظ گج (بہ معنی ہاتھی) اور استھل (بہ معنی استھان (جگہ)) سے مرکب ہے جو اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ اس نواح میں بستیوں کی آبادی ضرور اس زمانہ میں ہوئی جب سنسکرت زبان بول چال میں مستعمل تھی- "امروہہ" اصلاً سنسکرت زبان کے ایک مرکب لفظ امر وانم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "آموں کی جگہ"-

آریہ قوم کے زمانہ عروج میں شمالی ہند کی اکثر قدیم بستیوں کے نام مختلف اقسام کے درختوں، دریاؤں، اناج کے پودوں، مفید اور کار آمد جانوروں وغیرہ کی مناسبت سے اس زمانہ کی مروج زبان سنسکرت میں رکھے جاتے تھے چنانچہ صوبہ جات متحدہ میں متعدد بستیوں کے نام، جہاں آم اور مہوا کے درختوں کی روئیدگی بکثرت تھی یا ان درختوں کے خودرو جنگل موجود تھے، اس مناسبت سے رکھے گئے ہیں- مثلاً ضلع کانپور بستی میں امر ودہ وامور با وغیرہ-

گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ ان ناموں کے شروع و آخر کے حرفوں میں تبدیلی ہوتی رہی، "امر وانم" سے "امر وہا" اور "امر وہا" سے "امر وہہ" بن گیا- اسلامی عہد کے فارسی نویس بھی "انبہ" (آم) کی مناسبت سے "انبر وہہ" لکھا کرتے تھے- عہد اکبر و جہانگیر کے اکثر فرامین اور اس عہد کی بعض تاریخی یا قلمی کتابوں میں "امر وہہ" کا نام "انبر وہہ" لکھا ہوا ملتا ہے-

ہندوؤں کے زمانے کے تاریخی حالات مہا بھارت وغیرہ کے چند افسانوں، زبانی روایتوں یا اس عہد کے آثار قدیمہ کی زبانِ حال کے سوائے تاریخ کی کسی کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتے- افسوس کہ ایسے آثار قدیمہ بھی اس نواح میں موجود نہیں جن کی زبان حال ہی سے ہم یہ افسانہ کہن سنتے- مگر پرانوں سے یہ بات تو ثابت ہے کہ مہابھارت کی لڑائی تقریباً ایک ہزار پچاس برس قبل مسیح میں مگدھ کے راجہ نندا کے جلوس سے ہوئی تھی اور معتبر کتب سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ راجہ نندا چار سو برس قبل مسیح تخت نشین ہوا- پس یہ جنگ عظیم تخمیناً ایک ہزار چار سو پچاس برس قبل مسیح واقع ہوئی تھی- اس حساب سے اس لڑائی کو تخمیناً تین ہزار چار سو اڑتالیس برس ہوئے- آثار الصنادید سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ مہابھارت کی لڑائی مگدھ کے بادشاہ نندا کے جلوس سے ایک ہزار پچاس برس قبل ہوئی- یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ راجہ نندا چار سو برس قبل مسیح مسند نشین ہوا تھا-

**ہستنا پور:** ہستنا پور دریائے جمنا کے کنارے، موجودہ دہلی سے کئی کوس دور، واقع تھا- ایک ہزار چار سو

پچاس برس قبل مسیح سے ایک ہزار دو سو بارہ قبل مسیح تک ہستناپور راجدھانی رہا- یہاں کے راجاؤں میں راجہ پانڈ کا بیٹا یدھشٹر پہلا راجہ ہوا-درج ذیل چارٹ سے پانڈ خاندان کے حکمرانوں کے عہد کی مدت اور دیگر متعلقہ معلومات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے-(بحوالہ آثار الصنادید)

پانڈ خاندان کے فرماں روایان دار الملک اندرپت راندرپرستھ (دہلی)

| راجہ کا نام | باپ کا نام | دار السلطنت | سلطنت کی مدت |
|---|---|---|---|
| راجہ یدھشٹر | راجہ پانڈ | ہستناپور | ۳۶سال |
| راجہ پرچھت (یدھشٹر کا بھتیجا) | ابھمن پسر ارجن | " | ۳۲سال |
| راجہ جنمیجہ | راجہ پرچھت | " | ۳۴سال |
| راجہ اشمید | راجہ جنمیجہ | " | ۳۳سال |
| راجہ ادھمن | راجہ اشمید | " | ۳۲سال |
| راجہ اشوی دھج عرف مہاجسی | راجہ ادھمن | " | ۳۶سال |
| اسین کرشن | اشوی دھج عرف مہاجسی | " | ۳۵سال |
| دشت دان | اسین کرشن | اول ہستناپور پھر اندرپت | ۳۵سال |
| راجہ چکر عرف اوگرسین | دشت دان | اندرپت | ۳۶سال |
| راجہ سورسین | راجہ چکر عرف اوگرسین | " | ۳۶سال |

پانڈ خاندان کے مندرجہ بالا راجاؤں سمیت تیس راجاؤں نے ایک ہزار سات سو اسی سال تک حکومت کی-پانڈ خاندان کے آخری راجہ کو اس کے وزیر بسرادہ نے مار کر سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح پانڈ خاندان کا خاتمہ ہوگیا-بسرادہ کی دسویں پشت میں اندرپرستھ کا راجہ امر جودھ ولد سنجی حکمراں ہوا جس کی سلطنت کی مدت مختلف مورخوں نے مختلف لکھی ہے-غلام دستگیر خاں نے اپنی کتاب ''دربار آصف''میں سلطنت کی مدت ۴۳سال اور سجان رائے بٹالوی کی تصنیف کے مترجم ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے'' خلاصۃ التواریخ''میں ستائیس سال چار ماہ بیان کی ہے جبکہ سر سید احمد خاں کی تصنیف'' آثار الصنادید''میں ۱۳سال ہے-

اس طرح بہت سے مورخوں کا خیال ہے کہ اسی راجہ امر جودھ نے امروہہ کو بسایا تھا- میرا خیال ہے کہ مختلف تاریخی کتابوں میں امروہہ کے تذکرے سے قوی امکان یہی ہے کہ امروہے کا اصل بانی امر جودھ ہی تھا-

امر جودھ کے خاندان کے بارے میں تاریخی حقیقت یہ ہے کہ راجہ بسر اوہ جو پانڈ خاندان کے آخری راجہ کشی مک کا وزیر تھا- اس نے کشی مک کو قتل کر کے خود راجہ بن بیٹھا- مندرجہ ذیل چارٹ جو "آثار الصنادید" سے ماخوذ ہے' یہ ثابت ہوتا ہے کہ راجہ امر جودھ بسر اوہ خاندان کا دسواں راجہ تھا-

بسر اوہ خاندان

| راجہ کا نام | باپ کا نام | سلطنت | مدت سلطنت |
|---|---|---|---|
| 1 راجہ بسر اوہ | | اندرپت | ۷ سال |
| 2 راجہ سورج سین | بسر اوہ | اندرپت | ۱۹ سال |
| 3 راجہ بیر ساہ | سورج سین | اندرپت | ۲۴ سال |
| 4 راجہ انیک ساہ یا رب سین | راجہ بیر ساہ | اندرپت | ۲۲ سال |
| 5 راجہ ہر جیت یا چتر سال | راجہ انیک ساہ | اندرپت | ۱۶ سال |
| 6 راجہ دربہہ | راجہ ہر جیت | اندرپت | ۲۰ سال |
| 7 راجہ سدھی پال | راجہ دربہہ | اندرپت | ۱۳ سال |
| 8 راجہ برست | راجہ سدھی پال | اندرپت | ۱۹ سال |
| 9 راجہ سنجی | راجہ برست | اندرپت | ۱۶ سال |
| 10 راجہ امر جودھ | راجہ سنجی | اندرپت | ۱۳ سال |
| | | | |

صاحب تاریخ امروہہ جن کی کتاب سے میں نے استفادہ کیا ہے وہ راجہ امر جودھ کو پانڈ خاندان کا بتاتے ہیں- مگر مندرجہ بالا چارٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ امر جودھ کا تعلق راجہ یدھشٹر کے خاندان سے نہیں تھا بلکہ اس کے جد امجد راجہ بسر اوہ نے پانڈ خاندان کے آخری راجہ کشی مک کو قتل کر کے حکومت حاصل کی تھی- امروہہ کی تاریخی کتابوں میں امروہہ کا تعلق پانڈ خاندان کے راجہ یدھشٹر سے بتایا گیا ہے جو ہستناپور اور اندرپت کا حکمران

رہا ہے اور اس خاندان کا سب سے اہم نام راجہ یدھشٹر کا ہے۔

**یدھشٹر:** مہابھارت کی لڑائی کے بعد پہلا راجہ یدھشٹر ہوا جس نے ہستناپور میں راجدھانی قائم کی اور اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اس نے ۳۶ سال حکومت کی۔ جب یدھشٹر کو کرشن جی مہاراج کی وفات کی خبر ملی تو اس کی نظر میں دنیا تاریک ہو گئی اور حکمرانی چھوڑ کر آخرت کی تیاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات دل میں ٹھہرا کر اس نے بھتیجے پریکیت کو بلایا اور تخت و تاج اس کے حوالے کر کے ہماچل کی پہاڑیوں میں چلا گیا اور یہیں کڑی ریاضتوں میں اپنے جسم کو برف میں گلا دیا۔ پریکیت کی چھٹی پشت میں دشٹ دان ہوا۔

**راجپوتوں کا راج:** ہستناپور کے راجاؤں کے بعد تومر یا تنور راجپوت چندر بنسی خاندان کی مشہور شاخ ہیں۔ یہ لوگ اپنی نسل جنمیجہ راجہ کے پوتے شتانیک سے قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی حکومت عرصۂ دراز تک رہی لیکن درمیان میں ان کا راج چھن گیا تھا۔ لیکن سنہ ۶۷۶ء میں اسی قوم کے ایک شخص انیکپال تومر نے دوبارہ راج قائم کر لیا۔ سنہ ۹۱۵ء میں جب مشہور اسلامی سیاح اور مورّخ ابوالحسن مسعودی ہندوستان آیا تو اس وقت دہلی سے قنوج تک اسی خاندان کی حکومت تھی اور امروہہ پر بھی یہی خاندان حکمران تھا۔

**بہدپال:** راجہ انیک پال کی دسویں پشت میں راجہ بہدپال ہوا جس کا بہت کچھ اقتدار اس نواح میں تھا۔ گڑھ مکتیسر کے قرب وجوار کے موضعات میں اس کی نسل کے لوگ آج تک موجود ہیں۔

**پرتھی راج:** اس خاندان کے آخری راجہ انگ پال کا نواسہ پرتھی راج تھا جس نے ۲۲ سال ۲ مہینے اور ۱۶ دن حکومت کی۔ اسی نے سنبھل اور امروہہ میں قلعے تعمیر کیے۔ روایت ہے انگ پال کی بہن رانی امبا نے امروہہ کے قلعے کو، جو کسی وجہ سے مسمار ہو گیا تھا، دوبارہ تعمیر کرایا تھا جس کی بنیادوں کی اینٹیں بعض مقامات پر اب بھی نکلتی ہیں۔

**چوہانوں کا راج:** تومر راجپوتوں کا راج سنہ ۱۰۷۲ء تک یعنی ۴۱۹ برس ۷ مہینے ۲۸ دن قائم رہا۔ اس کے بعد بلدیو چوہان نے ان کے ہاتھ سے زمام حکومت چھین لی۔ چوہانوں میں کل سات راجہ ہوئے اور سنہ ۱۱۳۱ء تک ان کا راج قائم رہا۔

**کایستوں کا راج:** چوہانوں کے بعد اس علاقہ پر کچھ عرصہ تک کایستوں کے ایک خاندان سورج دھج کی

حکومت رہی-راجہ کرپانا تھ ان میں مشہور راجہ ہوا-امروہہ میں بعض کنویں ان کی یادگار ہیں-

**تگوں کی حکومت:** مسلمانوں کی آمد کے زمانے میں تگا قوم کا یہاں عروج ہوا امروہہ اور اس کے نواح میں اس قوم نے حکومت قائم کی- پچھراج نامی ایک تگے سردار نے اپنے نام پر پچھرایوں آباد کیا- قوم تگوں میں راجہ کرن اور راجہ ساسا چندن بہت مشہور ہوئے لیکن یہ راجپوت خاندان کے راجہ دت کے ماتحت تھے جس کی حکومت قنوج اور تھانیسر کے درمیانی علاقہ پر تھی-اس علاقہ میں امروہہ، سنبھل، میرٹھ، کول (علیگڈھ)، برن (بلند شہر) متھرا اور ایٹہ کے علاقے شامل تھے-

**سلطان محمود غزنوی کے حملے:** سلطان محمود غزنوی نے شمالی ہند پر متواتر حملے کیے-ساتویں بار سنہ ۴۰۹ھ مطابق سنہ ۱۰۱۷ء میں جب میرٹھ کا محاصرہ کیا تو اس وقت اس علاقہ کا حکمراں راجہ ہردت تھا جس کا راج قنوج اور تھانیسر کے درمیانی علاقے پر تھا-اس علاقے کی حدود ایک طرف برن (بلند شہر)، کول (علیگڑھ)، متھرا اور ایٹہ تھیں اور دوسری طرف امروہہ و سنبھل کے علاقے تک تھیں-راجہ ہردت اس حملے کی تاب نہ لاسکا اور دو لاکھ پچاس ہزار روپے اور تیس ہاتھی پیش کر کے جان کی امان طلب کی- محمود نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور جان کی امان دیدی-

پانچ سال بعد محمود غزنوی نے ملک کٹھیر پر حملہ کیا- علاقہ امروہہ میں رہب ندی (یعنی رام گنگا) کے کنارے شدید جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کو شکست اٹھانی پڑی - سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں لیکن یہاں کبھی مستقل حکومت کی بنیاد نہیں ڈالی- سلطان محمود کے چلے جانے کے بعد یہاں پھر ہندو راجاؤں کی حکومت قائم ہو گئی اور سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے تک باقی رہی-

**سالار مسعود غازی:** کسی تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امروہہ مسلمانوں نے کب فتح کیا اور کب امروہہ پر قابض ہوئے- بزرگوں سے روایت ہے کہ اس نواح میں سالار مسعود غازی نے مجاہدانہ حملے کیے اور امروہہ اور سنبھل کے قلعے ان ہی کے ہاتھوں فتح ہوئے تھے-یہ بات بھی مشہور ہے کہ امروہہ کے نواح میں جو شہدا آسودہ خاک ہیں وہ سالار مسعود غازی کے ساتھیوں میں سے ہیں-

**سلطان شہاب الدین غوری:** محمود غزنوی کے بعد زمام حکومت غوریوں نے چھین لی اور سلطان معزالدین بن سام المشہور سلطان شہاب الدین غوری تخت نشین ہوا-اس نے ہندوستان فتح کرنے کا مصمم عزم

کیا- سنہ ۱۱۸۵ء میں اس نے غزنوی خاندان کے آخری حکمران خسرو ملک کو شکست دے کر پھر شمالی ہند کا رخ کیا-

معتبر کتب تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ سنہ ۵۸۵ھ مطابق ۱۱۸۹ء سے سنہ ۵۹۱ھ مطابق ۱۱۹۵ء یعنی چھ سال تک سلطان شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک نے ہندو راجاؤں سے سخت جنگ کے بعد میرٹھ، برن (بلند شہر) بدایوں، کول (علی گڑھ) دہلی اور دوسرے مقامات کو فتح کر کے قبضہ حاصل کیا اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی- سنہ ۱۱۹۲ء میں تراوڑی (تھانیسر) کے میدان میں جب سلطان شہاب الدین غوری رائے پتھورا کو شکست دے کر غزنین واپس گیا تو اس کے نائب سپہ سالار قطب الدین ایبک نے اس نواح کے متعدد قلعے فتح کیے- ان فتوحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امروہہ و سنبھل پر بھی مسلمانوں کا تسلط اور قبضہ سنہ ۹۳-۱۱۹۴ء میں یعنی سلاطین غوریہ کے زمانے سے شروع ہوا-

**قطب الدین ایبک:** قطب الدین ایبک نے بڑی محبت اور سلیقے کے ساتھ شہاب الدین غوری کی خدمت کر کے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا- چنانچہ جب شہاب الدین غوری ان فتوحات کے بعد غزنین واپس ہوا تو اس کے اسی نائب سپہ سالار قطب الدین ایبک نے بڑی فتوحات حاصل کیں-

قطب الدین کو اس کے بچپن کے زمانے میں ایک سوداگر ترکستان سے نیشاپور لایا اور یہاں اسے اسی زمانے میں قاضی فخر الدین ابن عبدالعزیز کوفی (جو حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے) کے پاس بیچ دیا- چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ قطب الدین ایک دن بڑا آدمی ہوگا- اس لیے بچپن ہی سے اس کے چہرے سے عظمت اور برتری کے آثار نمایاں تھے- قاضی فخر الدین نے اپنے بیٹوں کے ساتھ قطب الدین کی تعلیم کا بھی انتظام کیا- وہ اسے بڑا عزیز رکھتے تھے- لیکن ان کے انتقال کے بعد قاضی فخر الدین کے کسی بیٹے نے قطب الدین کو ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا- اس سوداگر نے قطب الدین کو تحفے کے طور پر سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کر دیا- سلطان نے قطب الدین ایبک کے معاوضے میں ایک بیش قرار رقم دی- چونکہ قطب الدین کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے بادشاہ اور درباریوں نے اسے ایبک کہنا شروع کر دیا تھا-

**شمس الدین التمش:** طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ شمس الدین التمش فراختائی ترکوں کے ایک بہت بڑے گھرانے کا بیٹا تھا- اس کا باپ ایلم خاں البری قبیلے کا سردار تھا- التمش اپنی صورت اور سیرت کے لحاظ سے اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھا- التمش کے بھائی اس سے خوش نہیں تھے اور التمش کے ساتھ انہوں نے وہی

سلوک کیا جو حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا تھا۔ وہ مختلف سوداگروں کے ہاتھوں بکتا رہا اور آخر میں اسے قطب الدین ایبک نے خرید لیا۔ قطب الدین ایبک التمش پر بڑا اعتماد کرتا تھا یہاں تک کہ گوالیار کا قلعہ فتح کر کے التمش کو اس کا حاکم بنا دیا۔ کچھ عرصہ بعد التمش کو برن اور اس کے گرد و پیش کے علاقوں کی جاگیرداری دی گئی اور بدایوں کا حاکم بنایا گیا۔ سلطنت اسلامی کے ابتدائی دور میں بدایوں، سنبھل اور امروہہ ایک ہی حاکم کے تحت تھے۔ قطب الدین کی وفات کے بعد شمس الدین التمش نے سنہ ۶۰۷ھ میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

امروہہ کا پہلا جاگیردار..... **ملک امیر علی حاتم خان:** ناصر الدین التمش کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں وزارت کا عہدہ التمش کے محبوب غلام اور داماد غیاث الدین بلبن کے سپرد کیا جو ناصر الدین کے بعد بادشاہ ہوا۔ بلبنی عہدِ حکومت کے شروع میں ولایت امروہہ کا انتظام و انصرام درست کرنے کے خیال سے امروہہ کے علاقے کو ملک امیر علی حاتم خان کی جاگیر میں دیا گیا۔

**ملک اعزالدین غوری حاکم امروہہ:** عہد بلبنی میں کچھ عرصہ خواجگی امروہہ پر ملک اعزالدین غوری مامور رہا۔ چاہ غوری جسے گوری کنواں کہا جاتا ہے اسی حاکم کے نام سے منسوب بتایا جاتا ہے۔ سلطان معزالدین کیقباد کے عہد میں ملک اعزالدین غوری بادشاہ کے مقربان خاص اور نامور ارکین میں شامل تھا۔

**ملک عنبر سلطانی حاکم امروہہ:** سلطان معزالدین کیقباد کے عہد میں امروہہ کا حاکم ملک عنبر سلطانی تھا۔ یہ شخص بہت بارسوخ اور اچھا منتظم تھا۔ امروہہ کی قدیم مسجد جسے عرف عام میں سدو کی مسجد کہا جاتا ہے سنہ ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں اسی حاکم نے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد سے ملحق ایک مدرسہ معززیہ بھی قائم کیا تھا جس کی عمارت کے آثار آج بھی کھنڈر کی صورت میں موجود ہیں۔

**ولایت امروہہ میں مغلوں کی جنگ:** عہد بلبنی میں مغلوں نے ملتان و سندھ کی جانب متعدد حملے کیے جن کو شیر خاں حاکم پنجاب اپنی پامردی سے روکتا رہا۔ سنہ ۷۰۴ھ مطابق ۱۳۰۵ء میں در عہد سلطان علاء الدین خلجی مغل کوہ سوالک کی تلیٹی میں ہو کر ولایت امروہہ پر حملہ آور ہوئے۔ یہ لوگ دامن کوہ سوالک سے ہوتے ہوئے ضلع بجنور کی جنوبی سمت سے امروہہ کے علاقہ میں داخل ہوئے اور امروہہ اور اس کے اطراف کے علاقے کو بھی خوب لوٹا اور تباہ و برباد کر دیا۔

بادشاہ نے مغلوں کے حملے کی خبر پاتے ہی ملک کافور اور غازی ملک تغلق کو بڑے بھاری لشکر کے ساتھ

مغلوں کے مقابلے کے لیے بھیجااور ہدایت کی کہ نہایت عجلت کے سات امروہہ پہونچیں اور ایک مغل کو بھی زندہ نہ چھوڑیں۔ چنانچہ حدود امروہہ میں یعنی رہب ندی(دریائے رام گنگا) کے کنارے دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔اس مقابلے میں مغلوں کو شکست ہوئی۔ان کے دو سرداروں کے ساتھ اور بھی ہزاروں آدمی اس مقابلے میں زندہ گرفتار ہوئے جنہیں دونوں سرواروں کے ساتھ دہلی پہنچایا گیا۔دونوں سرداروں کو ہاتھی کے پیروں سے کچلوادیا گیااور باقی قیدیوں کے سر تن سے جدا کردیے۔

**امروہہ میں شاہی فوج کی چھاؤنی:** مغلوں کے بار بار حملوں کے خوف سے امروہہ میں فوجی چھاؤنی قائم کی گئی اور کافی تعداد میں یہاں لشکر رکھا گیا۔ علاء الدین خلجی کے مقربان خاص میں سے ملک ہزبرالدین ظفر خان، جو شجاعت اور دلاوری میں اپنا ثانی و نظیر نہ رکھتا تھااور جسکا نام ہی مغلوں کے لیے خوف و ہراس کا باعث تھا۔اس کی فوج کا بڑا حصہ یہاں متعین تھا۔ملک ہزبرالدین ظفر خان کچھ عرصہ خود بھی امروہہ میں مقیم رہا۔

**شہزادہ خضر خان کا امروہہ میں قیام:** سلطان علاء الدین خلجی کا بڑا بیٹا شہزادہ خضر خان جو ولیعہد سلطنت بھی تھا کچھ عرصہ بحکم شاہی امروہہ میں مقیم رہا۔مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان علاء الدین بیمار پڑا تو خضر خان اور اس کی ماں ملکہ جہاں اور اس کے ماموں اور خسر الپ خان کی جانب سے ملک کافور نے جو عرصہ سے حصول سلطنت کا خیال رکھتا تھا، جھوٹے سچے قصے ملا کر بادشاہ کو اپنے بیٹے اور اس کے ماموں اور خسر سے بدظن کردیا تھا۔الپ خان تو فوراً قتل کردیا گیا مگر خضر خان کو سیر و شکار کے بہانے اپنے سے دور امروہہ جانے کا حکم دیا۔ اس موقعے پر امیر خسروؔ نے اپنی مثنوی دول رانی (عشقیہ) میں امروہہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے؎

بامروہہ نشیں بالشکر خویش | کہ برکوہ آزمائی خنجر خویش
وزاں سو خود بفرما باد دل تنگ | سوے امروہہ گرداز میرٹھ آہنگ
گذشت از گنگ باخاصاں تنے چند | کلاہ را سایہ بر امروہہ افگند
بامروہہ درون غمناک نبشت | جو گل با سینہ صد چاک نبشت

**سید شرف الدین شاہ ولایتؒ:** سید العارفین سید حسن المعروف بہ شرف الدین شاہ ولایت قدس سرہ سلطان غیاث الدین تغلق کے ابتدائی دور میں نواح ملتان سے مع اپنے خلفاء اور اعزا کے امروہہ تشریف لائے اور یہاں کے شاہ ولایت کہلائے۔ آپؒ کے بڑے بیٹے قاضی سید امیر علی بہ عہد سلطان محمد تغلق امروہہ

کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ عہد مغلیہ میں آپؒ کی اولاد امجاد بالخصوص سید محمد میر عدل، ان کے اخلاف اور برادر زادگان نے سلطنت کی شاندار فوجی و ملکی خدمات انجام دیں۔

**عزیز خمار حاکم امروہہ:** اس زمانے میں امروہہ کا حاکم عزیز خمار تھا۔ یہ نہایت بیدار مغز اور ایک اچھا منتظم تھا۔ اس حاکم کے تدبر اور عمدہ انتظام سے مفسد لوگوں کو سرکشی کا کوئی موقع نہ ملا۔ اس کا بھائی نجیب خمار اور اس کے دوسرے عزیز بھی حکومت کے عہدوں پر مامور تھے۔ یہ لوگ عہد مغلیہ تک اپنے ناموں کے ساتھ 'خمار' لکھتے رہے۔

**ابن بطوطہ:** آٹھویں صدی ہجری کے عظیم اندلسی مورخ ابو عبداللہ ابن بطوطہ نے بھی اس مختصر بستی کی سیاحت کی اور یہاں کی ضیافت اور اس کی خوبصورتی کو قلم طراز کیا۔ سنہ ۷۴۱ھ مطابق ۱۳۴۰ء کو جب وہ یہاں آیا تو اس وقت امروہہ کا حاکم عزیز خمار تھا۔ ابن بطوطہ اپنی مشہور عالم سفر نامے میں لکھتا ہے:

"بادشاہ کے حسب الحکم وزیر نے مجھے دس ہزار من غلہ تو دیدیا اور باقی کی بابت حکم لکھدیا کہ ہزار من امروہہ کے علاقہ سے دیا جائے۔ اس وقت وہاں کا حاکم عزیز خمار تھا اور وہاں کا امیر شمس الدین بدخشانی تھا۔ میں نے اپنے آدمی بھیجے 'انہیں کچھ غلہ مل تو گیا لیکن عزیز خمار کے سخت برتاؤ کی شکایت بھی مجھ سے کی۔ چنانچہ باقی غلہ لینے میں امروہہ خود گیا۔

یہ علاقہ دہلی سے تین دن کی مسافت پر ہے' برسات کا موسم تھا' ۳۳ آدمی اپنے ساتھ لے کر گیا اور دو ڈوم بھی اپنے ساتھ لے لیے' دونوں بھائی تھے اور گانا بہت اچھا جانتے تھے۔ ہم بجنو میں پہنچے وہاں سے تین ڈوم اور لیے 'یہ بھی تینوں بھائی تھے۔ کبھی تو ان دونوں بھائیوں سے گانا سنتا اور کبھی ان تینوں بھائیوں سے۔ یہاں تک کہ ہم امروہہ پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ اس کے اہلکار استقبال کے لیے باہر آئے 'شہر کے قاضی امیر علی اور خانقاہ کے شیخ دونوں آئے اور دونوں نے مل کر میری ضیافت بہت اچھی طرح کی۔"

**ملک محمود بک شیر خان حاکم امروہہ:** سنہ ۷۸۴ھ مطابق ۱۳۸۲ء میں بعہد سلطان فیروز شاہ تغلق ملک محمود بک شیر خان امروہہ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس کے دور میں امروہہ مفسدین کے شر و فساد سے محفوظ رہا۔

**سید السادات سید سالم:** آٹھویں صدی ہجری کے آخر اور نویں صدی کے آغاز میں امروہہ معہ دیگر اقطاع کے سید سالم نامی ایک امیر کی جاگیر میں عرصہ تک رہا۔ سید سالم کے حالات میں فرشتہ لکھتا ہے: "کہتے ہیں

کہ سید السادات سید سالم تیس سال تک خضر خان بادشاہ کے ہاں امرائے عظام کے زمرہ میں شامل تھا- اس کی جاگیر میں عمدہ پرگنے بھی تھے- بھٹنڈہ میں اس نے خزانہ اور قلعہ داری کے سامان کا ذخیرہ بھی فراہم کر لیا تھا- علاوہ بھٹنڈہ کے امروہہ، سرسی اور ملک دوآبہ اور بہت سے پرگنہ جاگیر میں تھے- اسے مال جمع کرنے کی بہت حرص تھی-"

**امروہہ میں سلطان علاءالدین عالم شاہ کا قیام:** سنہ ۸۵۱ھ مطابق ۱۴۴۷ء میں سلطان علاءالدین عالم شاہ کو دہلی سے بدایوں جانے کا اتفاق ہوا جہاں کی آب وہوا کچھ ایسی پسند آئی کہ سنہ ۸۵۲ھ مطابق ۱۴۴۸ء میں دہلی چھوڑ کر بدایوں کو مستقر قرار دیا- بدایوں کے زمانہ قیام میں علاءالدین نے مع اپنے امراء کے امروہہ میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا اور سیر و تفریح میں مشغول رہا- کچھ عرصہ کے بعد ہی سلطنت سے دستبردار ہو کر بدایوں میں مستقل طور سے مقیم ہو گیا اور تازمانہ حیات ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۷۸ء اس علاقہ پر جس میں امروہہ بھی شامل تھا، علاءالدین ہی حکومت کرتا رہا- اس کے بعد سلطنت لودھی خاندان میں منتقل ہو گئی-

**امروہہ عہد مغلیہ میں:** سنہ ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۹ء میں بابر بادشاہ نے خاندان تیموریہ کی حکومت ہندوستان میں قائم کی- بابر نے کچھ عرصہ سنبھل میں بذات خود قیام کیا اور امروہہ کا علاقہ شیخ زادہ محمد موسیٰ فرملی عرف کالا پہاڑ ایک نامور امیر کی جاگیر میں دیدیا- 'سنہ ۹۳۵ھ میں موسیٰ فرملی کو جو دریائے سرجو کے چھوڑتے وقت حاضر ہوا تھا تیس لاکھ کی جاگیر امروہہ کے علاقہ کی اسکی تنخواہ میں دی اور خلعت خاص مع گھوڑا اسکو دیکر امروہہ جانے کی رخصت عطا کی' (ترجمہ توزک بابری)-

**خواجہ قطب الدین قناق خان حاکم امروہہ:** خواجہ قطب الدین قناق خان عہد ہمایوں اور ابتدائی عہد اکبری میں امروہہ کا حاکم تھا- امروہہ میں اس کے عہد کی کئی یادگاریں ہیں- جامع مسجد کیقبادی (سدو کی مسجد) جب شکستہ ہو گئی تو قطب الدین نے سنہ ۹۶۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء میں اسے پھر تعمیر کرایا تھا- کنکوئی کے جنگل میں قطب الدین قناق خان کا انتہائی خوبصورت مقبرہ آج بھی اس دور کی یاد دلاتا ہے-

**میر محمد خان:** سنہ ۹۷۶ھ مطابق ۱۵۶۸ء میں سرکار سنبھل (یعنی وہ علاقہ جس میں پرگنہ امروہہ شامل ہے) جو ہندوستان کے بہترین علاقوں میں سے ہے میر محمد خان مشہور بہ خان کلاں (برادر بزرگ محمد خان اتکہ) کی جاگیر میں دیا گیا-

**مراد آباد:** جہانگیر کے عہد حکومت تک پرگنہ امروہہ سنبھل سرکار کے تحت رہا لیکن شاہجہاں بادشاہ کے ابتدائی دور میں کٹھیریوں کے سردار راجہ رام سکھ نے فساد بپا کیا جس کی سرکوبی کے لیے سنہ ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء میں رستم خان دکھنی صوبہ دار سرکار سنبھل (اصل نام مقرب خان تھا اور ابتدا میں نظام الملک والی دکن کے عمال میں سے تھا) کو متعین کیا گیا- رستم خان نے راجہ کو شکست دی- راجہ مارا گیا تو اس کا قلعہ فاتح کے ہاتھ آیا- رستم خان نے پرانے قلعہ کو مسمار کرا کے نیا قلعہ اور مسجد تعمیر کرائی اور شاہی ہدایات سے تجاوز کرتے ہوئے اس جگہ کا نام رستم نگر رکھا- اس فعل کی جوابدہی کے لیے دربار شاہی میں حاضری کا حکم ہوا- جب رستم خان سے نو آباد مقام کے نام کا سوال ہوا تو اس نے فوراً جواب دیا کہ میں نے شہزادے کے نام پر اس کا نام مراد آباد رکھا ہے- چنانچہ اس وقت سے نہ صرف یہ مقام مراد آباد کے نام سے موسوم ہوا بلکہ صدر مقام قرار پایا-

**روہیلوں کا تسلط:** سنہ ۱۷۴۴ء سے سنہ ۱۷۷۴ء تک ملک کٹھیر پر روہیلوں کا تسلط قائم رہا اور ان کا صدر مقام بریلی تھا- عہد مغلیہ کے آخری دور میں کچھ افغان قبیلے اپنے ذریعہ معاش کے لیے افغانستان سے یہاں ملک کٹھیر میں آئے اور یہیں آباد ہو گئے- ان ہی کے نام سے ملک کٹھیر بعد میں روہیلکھنڈ کے نام سے موسوم ہوا- روہیلکھنڈ دو لفظ روہ اور کھنڈ کا مرکب ہے- روہ افغانستان میں ایک علاقہ کا نام ہے جہاں کے رہنے والے کو روھیلہ کہا جاتا ہے اور کھنڈ کے معنی علاقہ کے ہیں- نواب علی محمد خان روہیلہ (مورث نوابان رامپور) نے ہزاروں روہیلہ افغانوں کو، جو ذریعہ معاش کی تلاش میں سرگرداں تھے، اپنے زیر اثر لا کر ایک طاقتور لشکر بنا لیا- روہیلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر سنہ ۱۷۴۲ء میں محمد شاہ بادشاہ نے مراد آباد کے گورنر راجہ ہرنند کو حکم دیا کہ روہیلوں کو ملک کٹھیر سے نکالدیا جائے- راجہ ہرنند پچاس ہزار فوج کے ساتھ روہیلوں پر حملہ آور ہوا لیکن اسے شکست ہوئی اور مارا گیا- اس طرح نواب علی محمد خان نے سنہ ۱۷۴۴ء میں مراد آباد، امروہہ اور سنبھل پر اپنا تسلط قائم کر لیا-

دو سال کے بعد محمد شاہ بادشاہ نے خود بہ نفس نفیس اس طرف فوج کشی کی- اس نے سب سے پہلے گڑھ مکتیسر کے مقام پر دریا کو عبور کیا اور سنبھل کے علاقہ سے گزر کر نواب علی محمد خان کی گڑھی بان گڈھ پر، جو بدایوں کے متصل واقع تھی، حملہ کیا- علی محمد خان کو شکست ہوئی- نواب قمر الدین خان وزیر اعظم کی سفارش پر علی محمد خان کو معافی دیدی گئی لیکن بادشاہ نے اسے اپنے ساتھ دہلی لے جا کر عرصہ تک نظربند رکھا- اس طرح

مراد آباد پر بادشاہ کا پھر تسلط قائم ہو گیا اور اس نے شیخ فرید الدین بن شیخ عظمت اللہ کو حکومت پر تعینات کیا- کچھ ہی عرصہ کے بعد روہیلوں نے پھر اپنا لشکر اُستوار کیا اور مراد آباد پر حملہ کر دیا- شیخ فرید الدین حاکم مراد آباد مارا گیا اور اس کی جگہ راجہ چتر بھوج کو حاکم مقرر کیا- ان ہی دنوں میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی وجہ سے ایسی بد نظمی پھیلی کہ نواب علی محمد خان سرہند سے، جہاں انہیں حاکم تعینات کیا گیا تھا، بعجلت تمام مراد آباد آگئے اور یہاں آکر راجہ چتر بھوج کو نکال کر اس تمام حصہ ملک پر قابض ہو گئے لیکن کچھ ہی دن کے بعد ۱۴ ستمبر سنہ ۱۷۴۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا- ان کے انتقال کے بعد ابتدا میں حکومت ایک کونسل کے ہاتھ میں رہی جس کے صدر حافظ رحمت خان تھے- لیکن سعد اللہ اور اللہ یار پسران علی محمد خان جو دہلی میں نظر بند تھے ان کی واپسی پر ضلع مراد آباد کا علاقہ اللہ یار کو نامزد ہوا- لیکن اصل اقتدار حکومت نواب دوندے خان کے پاس تھا- اسی سال اللہ یار کا انتقال ہوا تو ۱۷۵۴ء سے دوندے خان ہی مالک و مختار رہا- ۱۷۷۰ء میں نواب دوندے خان کا بھی انتقال ہو گیا- نواب دوندے خان کے انتقال کے بعد روہیلوں کی حکومت زوال پذیر ہو گئی- اسی زمانہ میں مرہٹوں نے بھی فوج کشی کی-

سنہ ۱۷۷۲ء کے معاہدہ کی رو سے نواب شجاع الدولہ وزیر الممالک اودھ نے مرہٹوں کو ملک بدر کرنے کا اس شرط سے وعدہ کیا تھا کہ تین سال کے عرصہ میں چالیس ۴۰ لاکھ روپے روہیلہ سرداران کو ادا کریں- نواب شجاع الدولہ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا لیکن حافظ رحمت خان نے اس رقم کی ادئیگی نہیں کی- نوبت جنگ تک پہنچی جس کے نتیجہ میں جنگ ہوئی اور روہیلوں کو شکست ہوئی- سنہ ۱۷۷۴ء کے عہد نامہ کی رو سے نواب فیض اللہ خان پسر نواب دوندے خان کو رام پور کی جاگیر دیدی گئی اور بقیہ ملک روہیلکھنڈ نواب وزیر الممالک اودھ کے علاقہ میں شامل ہو گیا-

**مرہٹہ گردی اور امروہہ کی حفاظت:** مرہٹہ گردی میں بد نظمی اور ابتری کی وجہ سے امروہہ پر جاٹوں نے حملے شروع کر دیے- ایسے دور میں کہیں سے مدد ملنے کی کوئی توقع نہ تھی لہذا باشندگان امروہہ نے اپنے شہر اور اپنی حفاظت کا خود انتظام کیا-

**نوابان اودھ کی حکومت:** سنہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء سے سنہ ۱۲۱۶ھ مطابق سنہ ۱۸۰۱ء اٹھائیس برس تک روہیلکھنڈ پر نوابان اودھ کی حکومت رہی- بریلی، بدایوں، اور مراد آباد تین ضلعوں پر ملک کی تقسیم کی گئی- مراد آباد میں پہلے اصالت خان حاکم مقرر ہوا اور اس کے بعد چودہری مہتاب سنگھ بشنوئی کو یہ عہدہ تفویض ہوا-

نوابانِ اودھ کے عہد میں مالگذاری اور نذرانہ وصول کرنے کے لیے رعایا پر بہت جبر و تشدد کیا گیا- سنہ ۱۱۹۳ھ میں امروہہ کے عامل نے جو منجانب نواب وزیر الممالک یہاں متعین تھا، اتنی سختی برتی اور خلاف معمول چند ایسے جدید مطالبات قائم کیے کہ امروہہ کے معافیداروں کی کثیر تعداد نے ایک جلسہ کیا اور یہ عہد و پیمان کیے کہ نذرانہ مقررہ قدیم کے سوا جدید مطالبات ہرگز ادا نہیں کریں گے اور اس معاملہ میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہ کر متفقہ قوت سے کام کریں گے -اس مضمون کی ایک دستاویز ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۳ھ کو مرتب کی گئی -تھے خانی کے حادثہ کا ایک سبب بعض معافیداروں کا یہ طرز عمل بھی تھا-

**تھے خانی حادثہ:** تھے خانی حادثہ سنہ ۱۱۹۳ھ ۱۷۸۵ء میں امروہہ میں پیش آیا- تھے خان منجانب وزیر الممالک آصف الدولہ حاکم سنبھل تھا- حیات خان بن روشن خان، جو تھے خان کا خسر تھا، امروہہ میں سکونت پذیر تھا-ان کے پاس املاک و جاگیر معافی کے بہت سے مواضعات تھے - حیات خان والا باغ، جو شہر سے متصل ہے اور جس میں ایک خوبصورت مسجد بھی بنی ہوئی ہے، ان ہی سے منسوب ہے- محلّہ گذری کے بعض سیدوں سے کسی معاملہ پر ان سے ان بن ہو گئی، معاملہ نے یہاں تک طول پکڑا کہ تھے خان اپنے خسر کی حمایت میں اپنی فوج لے کر مخالفوں کے مقابلہ کو چڑھ آیا- میر اسد اللہ خان سے مخالفت تھی ان ہی کے مکانات کو حملہ آوروں نے خوب لوٹا-اس حادثہ میں متعدد لوگ مارے گئے - سید گلزار علی بن سید وزیر علی جو بہ رسالہ بخشی الملک مظہر علی خان منصب دار تھے، اسی تھے خانی حادثہ میں قتل ہوئے-

امروہہ میں تھے خاں کا نام تھے خانی حادثہ، تھے خاں کی مسجد اور تھے خاں کے باغ کی وجہ سے خاصہ مشہور و معروف ہے- یہاں پر کچھ تھے خاں کے بارے میں بھی معلومات ہو جائے کہ موصوف کون تھے -تھے خاں کے اجداد کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا-اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ہزارہ (صوبہ سرحد) کے متصل علاقے ڈیر میں ایک خدارسیدہ بزرگ شہاب الدین تھے، ان کا مزار بھی وہیں ہے-ان کے تین فرزند (۱) حسن (۲) محمود عرف موتی (۳) بائی خاں تھے- محمود کے پانچ بیٹے آزاد خاں، شہزاد خاں، شہداد خاں، حکیم خاں، حسن خاں اور شاہ عالم ہوئے -شاہ عالم خاں کے صاحبزادے حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید اور حسن خاں کے فرزند دوندے خاں تھے -رحمت خان شجاع الدولہ کی لشکر کشی میں سنہ ۱۷۷۴ء کو شہید ہوئے-دوندے خاں بسولی ضلع بدایوں کے نواب بنے-یہ بڑے جری اور بہادر تھے-ان کے تین بیٹے محمد رحیم خاں معروف رن مست خاں، محمد اشرف خاں اور محمد مظہر علی خاں تھے- محمد رحیم خان معروف رن مست خاں کی اولاد میں رحم علی خاں، ہدایت

علی خان اور نتھے خاں ہوئے - نتھے خاں کا اصل نام حرمت خاں تھا - نتھے خاں کے چچا مظہر علی خاں دونوں بیٹوں ایام خاں اور امراؤ خاں بہادر اور رحیم علی کے بیٹوں کے ساتھ ایک جماعت کو لیکر دہلی گئے - ایام خاں اور ساتھیوں کے ہمراہ بریلی چلے گئے اور وہاں لڑائیاں لڑتے رہے - لیکن جب انگریز کامیاب ہوئے تو مظہر علی نیپال کی طرف چلے گئے اور وہیں انتقال کیا اور ان کی سب جائداد ضبط کر لی گئی البتہ نتھے خاں ڈٹے رہے - (ص ۴۵ "مرقع فیض" عنایت علی بریلوی - مطبوعہ یوسفی دہلی)

نتھے خاں ایک نامور جنرل تھے - نتھے خاں کی قبر محلہ کنکوئی میں دیوان خانے کے پھاٹک کے بائیں جانب واقع ہے جو دیکھنے والوں کو درسِ عبرت دے رہی ہے -

**انگریزوں کا تسلط :** سنہ ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں نواب وزیر الممالک نے بعوض اخراجات فوج انگریزی روہیلکھنڈ کا وسیع علاقہ بشمول ضلع مراد آباد ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کر دیا - مراد آباد ضلع کو صدر مقام قرار دیا گیا اور مسٹر ڈبلیو لیسٹر Mr.W.leycester پہلے کلکٹر مقرر ہوئے - یہ زمانہ مرہٹہ گردی کا تھا، مرہٹوں کے متواتر حملے اس علاقہ میں ہو رہے تھے - سنہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۵ء سے ۱۸۵۷ء تک امروہہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا البتہ بعض اوقات ڈاکہ زنی کی وارداتیں ہوتی رہیں -

**امروہہ میں انگریزی فوج کی چھاؤنی:** ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے ابتدائی دور میں انگریزی فوج کی چھاؤنی بھی امروہہ میں قائم کی گئی تھی اور کچھ عرصہ تک شہر کے قریب فوج کا پڑاؤ رہا، چند عارضی بنگلے اور عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں لیکن بعد میں فوجی افسروں کی رائے تبدیل ہو گئی اور یہاں کی فوج میرٹھ بھیج دی گئی - یہی وجہ ہے کہ میرٹھ اور دہلی کی فوجوں میں امروہہ کے بے شمار آدمی ملازم تھے - صرف محلہ قریشی کے تیس آدمی میرٹھ کی سوار فوج میں تھے - لیکن جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو ان میں اکثر چھٹی پر تھے - کہا جاتا ہے کہ یہ چھٹی تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کے سبب لی گئی تھی -

**جنگ آزادی میں امروہہ کا کردار:** ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں امروہہ نے جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور ہندوستان کے مورخین نے آخر کار اس کو تسلیم بھی کیا ہے - امروہہ کے لوگوں نے اس جنگ آزادی کو جس کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا نا قابل فراموش کارنامے انجام دیے اور وہ قربانیاں پیش کیں جن کو پڑھ کر آج ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے - مگر افسوس اس کا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی

جان کے نذرانے پیش کیے آج انہیں فراموش کر دیا گیا ہے۔ انگریز حکومت کے جتنے مظالم باشندگان امروہہ نے برداشت کیے ان کو پڑھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ ان کے جذبۂ حب الوطنی کو آفرین کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ملک عزیز کی خاطر جان و مال اور خاندان کی بھی پروا نہیں کی۔ تحریک آزادی کے اس دور میں جو مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا گیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان حریت پسندوں کو باغی شمار کر کے پھانسی کی سزائیں دی گئیں گھر سے بے گھر کیا گیا اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ انہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا اور حد تو یہ ہے کہ ان کے گھروں کو بھی مسمار کرا کر زمین ہموار کر دی تاکہ کوئی نشان باقی نہ رہے۔ یہ زمانہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور اذیت ناک تھا۔ ان غاصبوں کو ہر حریت پسند مسلمان باغی نظر آتا تھا۔

جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا سورج غروب ہو رہا تھا تو انگریز ہندوستان پر قبضے کے دیرینہ خواب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے 'برسوں سے پر سکون لوگوں کو آپس میں لڑانے میں، مذہبی اختلافات اور نفرتیں پھیلانے میں اور انعام و اکرام کا لالچ جیسی چیزوں کے حربے استعمال کرنے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن ہندوستان کے غیور باشندے آخری دم تک غلامی کی زندگی پر مر جانے کو ترجیح دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جس کو انگریزوں نے غدر قرار دیا' شمالی ہندوستان کے لوگوں کی عام طور پر اور خاص طور پر مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ہزاروں خاندان اور ان کے گھر تباہ و برباد کر دیے گئے۔ جب شمالی ہند کے مسلمانوں کا جینا دوبھر ہو گیا تو بڑے بڑے شہروں میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت اور تحریک آزادی کی آگ بھڑکنا شروع ہو گئی جس کی لپٹوں سے امروہہ جیسی چھوٹی بستی بھی نہ بچ سکی۔

۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء کو جب امروہہ کے لوگوں کو میرٹھ اور دہلی کے غدر اور میرٹھ میں فوج کے باغی ہونے کی خبریں ملیں تو یہاں کی صورت حال بھی تشویشناک ہو گئی۔ اس زمانہ میں ضلع کا انتظام مسٹر سی۔ بی۔ سانڈرس (Mr.C.B.Saunders) مجسٹریٹ مراد آباد، مسٹر جے۔ جے۔ کیمپبل (Mr.J.J.Campbell) جوائنٹ مجسٹریٹ اور مسٹر جے کراکرافٹ ولسن (Mr.J.Cracroft Wilson) جج کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا۔ سید افضل علی کو امروہہ کا کوتوال مقرر کیا گیا۔

امروہہ میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچیں تو کہا جاتا ہے کہ ۱۷ر مئی کو درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ میں سربرآوردہ اور معزز حضرات کا ایک جلسہ ہوا جس میں دیوان سید محمود (دربار کلاں) اور خاندان درویش علی خان کے افراد اور شہر امروہہ کے مختلف خاندانوں کے مقتدر حضرات کو بھی بلایا گیا۔ احاطہ میں منعقد ہونے والے اس

جلسے میں تقریباً تمیں افراد شامل ہوئے۔ آزادی کے لیے مرمٹنے کا ایسا جذبہ تھا کہ درگاہ کے باہر بن بلائے لوگوں کا بھی بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ اگر میرٹھ اور دہلی جیسی صورت حال ضلع مراد آباد میں بھی رونما ہو تو امروہہ میں بھی انگریز عملداری کو ختم کر دیا جائے لیکن جلسے کی اس قرارداد سے سید علی مظفر خان (گھڑیال والے) سید محمد حسنؔ خان (دانشمند) کے ساتھ ساتھ امروہہ کے دیگر اکابر کو اختلاف تھا۔ بہر حال اس اختلاف کے باوجود جلسے کی قرارداد منظور کر لی گئی۔

۱۸ مئی کو مسٹر سانڈرسؔ میرٹھ جانے کے لیے مراد آباد سے روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ رجب پور ہی پہنچے تھے کہ ۱۹ر مئی کو انہیں مراد آباد کا جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرانے اور فوج کے باغی ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً مراد آباد واپس ہو گئے۔

۱۹ر مئی کو جب جیل خانہ کے قیدی آزاد ہو گئے تو سید گلزار علی بن سید اکبر علی (دربار کلاں) جو اسوقت مختار تھے ان قیدیوں کی جماعت لے کر راتوں رات امروہہ پہنچ گئے۔ یہاں کے لوگ درگاہ شاہ ولایتؒ میں منعقد ہونے والے جلسے کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ سید گلزار علی کے امروہہ پہنچنے کے بعد شیخ رمضان علی کے گھر دربار کلاں میں رات بھر بڑے زور شور کے ساتھ پنچایت ہوتی رہی۔

۲۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو علی الصباح امروہہ کے لوگوں نے جو کئی ہزار بیان کیے جاتے ہیں تھانہ پر حملہ کیا اور میر مددعلی تھانہ دار اور شہامت خان جمعدار کو قتل کر کے تھانہ کے مکان جلا دیے۔ تھانہ پر حملہ کے بعد ان لوگوں نے تحصیل پر بلہ بول دیا اور خزانہ کا سترہ ہزار روپیہ لوٹ کر دفتر کو جلا دیا۔ پورے شہر میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔ تھانہ دار اور جمعدار کی لاشیں بے گور وکفن پڑی رہیں، باغیوں کے خوف سے کسی شخص کی یہ ہمت نہ تھی کہ اُن لاشوں کو دفنا دیں۔ آخر حاجی حسن مفتیؔ اور سید محمد وغیرہ نے مع اپنے اقربا اور احباب کے موقع پر پہنچ کر کفنایا اور نماز جنازہ پڑھ کر تھانہ کے دروازے کے آگے دفنا دیا۔

مسٹر سانڈرس نے امروہہ کے ان حالات کی اطلاع ملتے ہی اسی دن سید محمد حسن خاں کو انتظام سنبھالنے کے لیے مقرر کیا اور مراد آباد سے امروہہ بھیجا۔ وہ یہاں تقریباً ایک بجے پہنچے تو تھانہ پر حملہ ہو چکا تھا اور تحصیل لٹ چکی تھی۔ اس لوٹ مار اور قتل وغارت کی اطلاع جب ضلع کے حکام کو پہنچی تو مسٹر سانڈرس نے امروہہ کا انتظام درست کرنے کے لیے گور سہائے ولد ہربت سنگھ (قوم جاٹ) کو بھیجا۔ یہ اسوقت کلکٹری میں ناظر تھا۔

۲۴ر مئی ۱۸۵۷ء کو مسٹر گور سہائے ولد ہربت سنگھ امروہہ آیا تو سید علی مظفر خان، میر بنیاد علی (پیرزادہ)

اور امروہہ کے کچھ لوگ شہر سے باہر جاکر اسے اپنے ساتھ لائے - مسٹر گور سہائے کے آنے پر ان کے ہم قوم جاٹوں کی کثیر تعداد بھی جمع ہو گئی - امروہہ آکر مسٹر گور سہائے نے پیر سید امیر الدین کے مکان علی جان منزل واقع محلّہ قریشی میں قیام کیا-

۲۵ر مئی ۱۸۵۷ء کو مسٹر ولسن (جج) بھی تلنگوں کی ایک جماعت کے ساتھ مراد آباد سے امروہہ آگئے - جنگ آزادی کے حریت پسند سید گلزار علی کو مسٹر ولسن کے امروہہ آنے کی اطلاع ملی تو وہ امروہہ سے چلے گئے اور مدت العمر ضلع بریلی وغیرہ میں اپنے جلاوطنی کے دن پریشان حالی میں گزارے اور اسی عالم میں ملک عدم کو سدھارے - مسٹر ولسن نے حریت پسندوں کو آزادی کی جدوجہد سے باز رکھنے اور انگریز حکومت کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے سید گلزار علی وغیرہ کے مکانات منہدم کرادیے - گھروں سے انتقام لیکر موصوف ۲۶ر مئی ۱۸۵۷ء کو واپس مراد آباد چلے گئے -

جنگ آزادی کو کچلنے کی خدمات کے صلے میں ناظر گور سہائے کو راجہ کا خطاب دیکر گیارہ گاؤں کے انعام سے بھی نوازا گیا اور امروہہ کا ناظم مقرر کیا گیا - لیکن صرف دس دن امروہہ میں رہا تھا کہ اسے دو سو آدمیوں کے ساتھ مسٹر جے کیمپبل کے بلانے پر حسن پور جانا پڑا - ۱۰ ارجون کو وہاں سے واپس آیا تو اس نے امروہہ کے حالات بدلے ہوئے دیکھے - ضلع میں انگریزی عملداری ختم ہو چکی تھی اور انگریز حکام بھی میرٹھ و نینی تال بھاگ گئے تھے - گور سہائے بھی، جسے حریت پسند مارڈالنے کی فکر میں تھے، اسی دن امروہہ سے مراد آباد بھاگ گیا - انگریز حکومت امروہہ کے بہادر انقلابیوں کا مقابلہ نہ کر سکی - اس کے پیر اکھڑ چکے تھے اور سارا نظام انقلابیوں کے ہاتھوں میں تھا-

**امروہہ پر جاٹوں کا حملہ** : جبکہ ضلع بھر میں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی تو اسی دور میں امروہہ پر جاٹوں نے حملہ کیا - ان کے حملے کا مقصد لوٹ مار تھا - لیکن باشندگان امروہہ نے ان کا ایسا مقابلہ کیا کہ پھر کبھی جاٹوں کو امروہہ پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی-

مئی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ضلع اور خاص طور پر امروہہ کے حالات کئی ماہ تک بڑے ناگفتہ بہ رہے - اس دور میں مسلمان رؤسا اور سربر آوردہ لوگ اسلامی حکومت کی از سرِ نو تشکیل چاہتے تھے چنانچہ بعض موقع شناس مسلمانوں نے معزول بادشاہ کی خدمت میں عرضداشتیں بھیجیں جن میں اظہار عقیدت کے ساتھ ساتھ انگریزی سلطنت کو مٹانے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی خواہش اور استدعا کی گئی تھی کہ نہ صرف امروہہ بلکہ

ملک کٹھیر (روہیلکھنڈ) کا اہتمام وانتظام ان کے سپرد کیا جائے۔اہل امروہہ کی یہ عرضداشتیں، جن میں نام و پتے بھی موجود تھے، فتح دہلی کے بعد شاہی دفتر سے شاہ کے معزول ہو جانے کے بعد برآمد ہوئیں۔ان عرضداشتوں میں سید شبیر علی خان کو حسب ذیل شقہ معزول بادشاہ کی طرف سے موصول ہوا تھا:

نقل شقہ مخطوفہ عرضی کوٹ گشت

"سیادت پناہ شجاعت دستگاہ محمد شبیر علی خان مورد تفصسلات بدانند عرضی آں سیادت پناہ مشعر بر رسوخ ارادت وخصوص عقیدت دربارگاہ فلک اکفاخسروی بہ امید احراز سعادت حضوری وبازماندن بسبب فتنہ وفساد جاناں ناہنجار ضیاء اندوز انظار قدسی گردیدو بکلی کیفیت معروضہ بوضوح رسید۔لہذا زیب ارقام می رود کہ آں فدوی خاص تا انتظام کلی آنجا قصد احضار وردولت نہ نماید وہرگاہ الینست کامل بندوبست بہ ظہور رسد کاغذ جمع خرچ از تحصیل بعد مجرائے مصارف ضروری حاضر حضور شود دریں صورت مورد الطاف بادشاہی خواہد گردید۔زیادہ تفصسلات شناسند۔

المرقوم ۱۲رذی الحجہ ۱۲۷۳ ہجری"(تاریخ امروہہ)"

شقہ شاہی ملتے ہی سید شبیر علی اور ان کے ساتھیوں نے امروہہ پر حکومت کرنی چاہی اور یہ حالت چند ہی دن رہی تھی کہ سنہ ۱۸۵۸ء کے اوائل میں نواب رامپور کی مدد سے انگریزی حکومت دوبارہ قابض ہو گئی۔ ۲۲رمئی ۱۸۵۸ء کو مسٹر ولسن اسپیشل کمشنر ہو کر مراد آباد آئے۔تحریکِ آزادی کے الزام میں امروہہ کے بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور سیکڑوں ناموں کی ایک فہرست بہ عنوان "باغیان امروہہ" تیار کی گئی۔اس فہرست میں جن افراد کو سزائیں ملیں ان کا ذکر مراد آباد گزیٹیر میں موجود ہے جس میں مراد آباد ضلع کو دغاباز علاقہ بھی لکھا ہے۔خلیفہ امان اللہ صدیقی، خیر اللہ صدیقی کو گرفتار کر کے انڈمان نکوبار بھیجا گیا، ان کے بھائی احسان اللہ صدیقی کو پھانسی دی گئی۔خاندان درویش علی خاں میں مولوی حکیم بشارت علی خاں، ولایت علی خاں، مہربان علی خاں وغیرہ اکتالیس نفوس کو گرفتار کر کے پھانسی دی گئی۔ان کی حویلیوں کو بارود سے اڑایا گیا اور ملبہ اٹھا کر زمین ہموار کر دی گئی تاکہ ان عمارتوں کا نام ونشان باقی نہ رہے۔سادات دربار کلاں، شیخ محمد افضل بن شیخ رمضان کے ساتھ ساتھ کچھ اور افراد کو بغاوت کے سرغنہ یا مرتکب ہونے کے جرم میں حبس دوام بہ عبور دریائے شور، ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔لیکن سید شبیر علی خان کو مسٹر رابرٹ ہنری ڈنلاپ مجسٹریٹ نے بذریعہ روبکار عدالت فوجداری مورخہ ۱۸رنومبر سنہ ۱۸۵۸ء سپرد محکمہ سشن جج بہادر اسپیشل کمشنر کیا۔اس مقدمہ کی سماعت

مسٹر ایلگزنڈر اسپیشل کمشنر نے کی اور سزائے دائم الحبس بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائداد دی گئی-

باشندگان امروہہ کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ امروہہ سے متعلق سنہ ۱۹۱۱ء میں جو Gazetteer ضلع مراد آباد سے Mr.H.R.Naval کے زمانے میں چھاپا گیا اس میں تحریر ہے " گروہی ساز شیں ان کا خاص مشغلہ ہے، یہاں تک کہ خاص لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں- مسلمان بحیثیت ایک جماعت ہندوؤں کے خلاف نہیں ہیں- کسی خاص سیاسی گروہ کے مفاد کے مقابلے میں عوام کا مفاد ثانوی حیثیت رکھتا ہے یہاں تک کہ میونسپلٹی کے ممبران بھی اس مرض میں مبتلا ہیں-یو-پی- میں غالباً کوئی دوسرا شہر ایسا نہیں جس نے انتظامیہ کو اتنا پریشان کیا ہو، جس قدر اہل امروہہ نے مشکلات کھڑی کی ہیں- اس کہاوت میں ایک حد تک حقیقت پنہاں ہے کہ یہاں برطانیہ کی حکومت نہ ہونے کی برابر ہے-"

## آزادی

آزادئ ہند کے سلسلے میں تحریک چلی تو اہل امروہہ نے اس میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا- سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی جماعت " توسیع نظام علماء " کا ایک سالانہ اجتماع یہاں منعقد ہوا -یہ اجتماعات مسجد میر کلو سے متصل سید سبط رسول صاحب نبیرہ سید اسد اللہ کے دیوان خانہ عرف چمن میں تین روز تک ہوتے رہے تھے-

سنہ ۱۹۳۰ء میں جمیت العلماء ہند کے ولولہ انگیز اور معرکہ آرا اجلاس کے انعقاد کا بھی سرزمین امروہہ کو فخر حاصل ہے-اس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت اور خطبہ استقبالیہ پڑھنے کا شرف سید علی متقی خاں گھڑیال والے کو حاصل ہوا- سید طفیل حسن رضوی نے وہ بصیرت افروز خطبہ تحریر کیا جسے ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی-

نواب وقار الملک مرحوم مسلم لیگ کے نامور اور ممتاز رکن بلکہ بانیان لیگ میں سے تھے- سنہ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کی دیگر مخالف جماعتوں سے انتخابی معرکے شروع ہوئے تو امروہہ براعظم ہندوپاکستان میں پہلا انتخابی حلقہ تھا جس میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی- اسی سال محمد علی خاں (گھڑیال والے) کی تحریک پر ایک جلسہ منعقد ہوا- اس جلسہ میں جس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی تھی (مولانا کی والدہ 'بی اماں' امروہہ کی تھیں)' مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا- اس جلسہ کا انعقاد سید سجاد الحسنین نقوی وکیل (سابق چیئرمین امروہہ میونسپلٹی) کے دیوان خانے میں ہوا تھا- جلسہ کے بعد ایک رسالہ " مسلم اسٹوڈینٹس

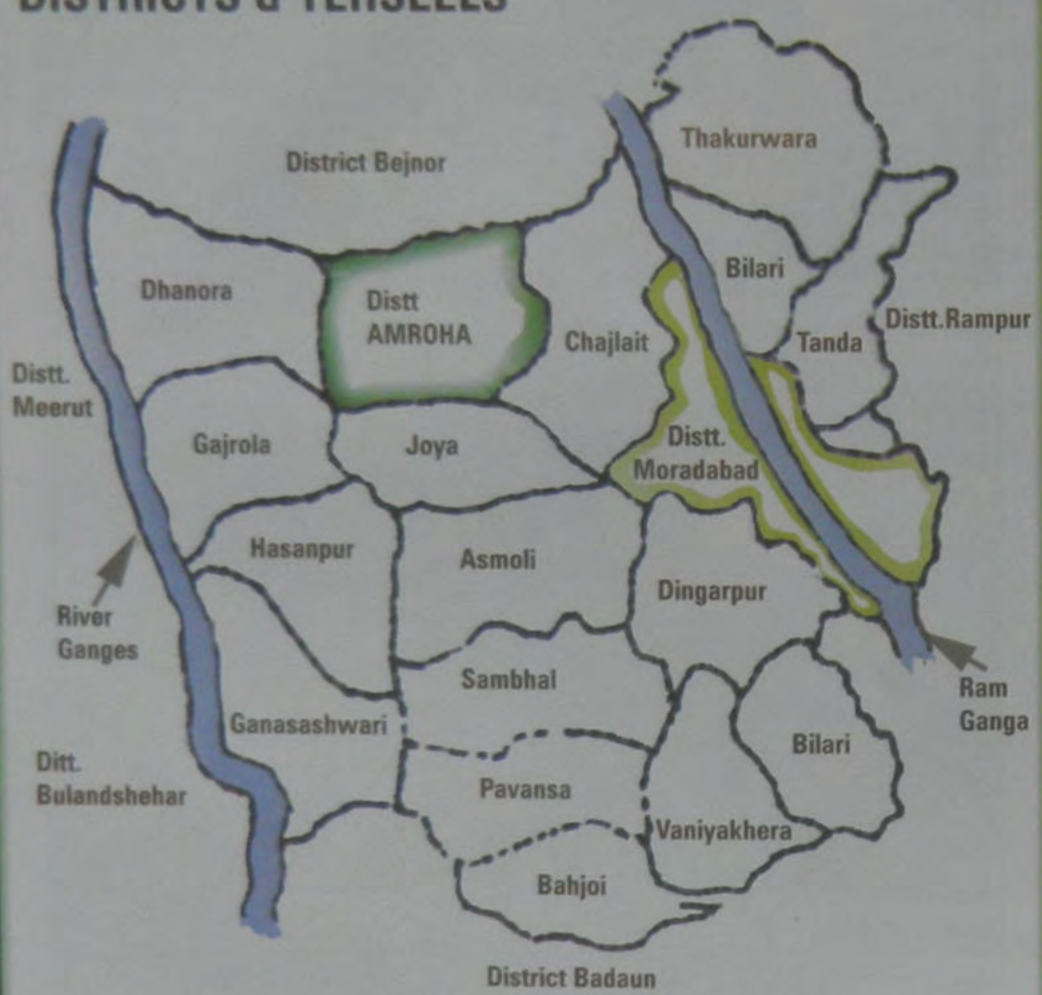
فیڈریشن" کے نام سے خادم حسین خادم نے شائع کیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے مسلم لیگ کی تائید میں جو پہلا فتویٰ حاصل کیا گیا تھا وہ علی متقی خاں (گھڑیال والے) لے کر آئے تھے۔ یہ فتویٰ "انصاف" میں بھی شائع کیا گیا۔ "انصاف" امروہہ سے نکلنے والا مسلم لیگ کا پہلا اخبار تھا جسے علی متقی خاں نے جاری کیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کو جنگ آزادی ختم ہوئی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ملک کی تقسیم ہوئی اور ۱۴/اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو ایک نئی مملکت پاکستان وجود میں آئی اور ۱۵/اگست سنہ ۱۹۴۷ کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اس تقسیم کے ساتھ ساتھ خاندانوں کی بھی تقسیم ہوگئی۔ امروہہ کے بھی بیشتر مسلم خاندان بٹ گئے۔ کچھ تو امروہہ ہی میں رہ گئے اور کچھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔

**امروہہ کی آبادی اور ضلع کا درجہ:** امروہہ دہلی سے بجانب شرق ۸۱ میل مراد آباد سے بجانب غرب ۱۹ میل پر واقع ہے۔ ۶۲ میل شمال میں اس کے ہمالیہ پہاڑ ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق امروہہ کی کل آبادی چالیس ہزار چار سو اڑتالیس تھی جن میں انتیس ہزار پانچ سو ساٹھ مسلمان، دس ہزار ایک سو اٹھتر ہندو اور سات سو گیارہ عیسائی وغیرہ تھے۔ سنہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ایک لاکھ چھتیس ہزار آٹھ سو بیانوے افراد پر مشتمل ہے جس میں ۶۵ فیصد مسلمان اور باقی ۳۵ فیصد ہندو اور دوسری اقوام ہیں۔ سنہ ۱۹۹۷ء کو امروہہ کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ اس طرح امروہہ صوبہ اُتر پردیش کا ۷۰واں ضلع بن گیا۔

-☆☆☆-

## LOCATION PLAN OF DISTRICTS & TEHSEELS




**MAP SHOWING LOCATION OF DISTRICTS AND TEHSEELS. IT IS PREPARED BY AHMED HUSAIN SIDDIQI FOR HIS BOOK " KISHWER-E-AULIA(Amroha)"**



درگاہ شاہ ولایت کے احاطے میں بی بختوئی کا مزار

# اولیاء اللہ اور علماء و فضلا

سرزمین امروہہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اتنے ولی بھیجے کہ شاید ہی ہندوستان کے کسی اتنے مختصر خطۂ ارض کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہو۔یہی وجہ ہے کہ امروہہ کے چپے چپے پر ان کے آستانے، خانقاہیں، تکیے اور ان کے مزارات اب بھی زبان حال سے عظمت رفتہ کی داستانیں سنا رہے ہیں۔اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابند یہ ہستیاں علم ظاہر و باطن کے جامع اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کے آشنا تھے ۔ جذبۂ تبلیغ اسلام سے سرشار یہ بزرگان دین اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر ابتدائی عہد اسلامی میں یہاں تشریف لائے اور اس خطۂ ارض پر معارف و حقائق کے دریا بہائے اور اس اندھیری بستی کو شمع توحید سے روشن کیا۔ مسلمانان شہر بلکہ ہر مذہب کے لوگ ان سے عقیدت رکھتے ہیں اور جوق در جوق ان کے مزاروں پر آتے ہیں۔بلاشبہ یہی ہستیاں ہیں جنھوں نے آج بھی امروہہ پر فیوض و برکات اور پیار و محبت کا سایہ کیا ہوا ہے۔

مولانا محمود احمد عباسی (مرحوم) نے اپنی تالیف "تذکرۃ الکرام" میں ان کے حالات و واقعات بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد جتنی تفصیل سے اردو زبان میں لکھے ہیں کسی اور کتاب میں نہیں ملتے اور شاید اتنی تفصیل سے کوئی کتاب لکھی بھی نہیں گئی۔لیکن اب یہ کتاب تقریباً بالکل نایاب ہو چکی ہے۔اولیائے کرام و علما کے بارے میں اگر وقتاً فوقتاً لکھا جاتا رہے تو ہماری نئی نسل بھی مستفید ہوتی رہے۔ان بزرگان دین پر کچھ لکھنا مجھ نااہل کی دسترس سے تو قطعی باہر ہے اور نہ میں اس قابل ہوں کہ ان کے حالات بیان کر سکوں۔لہٰذا زیر نظر باب جو اولیائے کرام کے بارے لکھا گیا ہے وہ مولانا محمود احمد عباسی (مرحوم) کی متذکرہ بالا کتاب سے ماخوذ ہے یا اس سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ یہاں نہ صرف اولیائے کرام آسودۂ خاک ہیں بلکہ شہدائے متقدمین کے مزارات بھی جابجا اندرون و بیرون شہر واقع ہیں، ان میں اکثر وہ غازیان اسلام ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی زمانہ میں یہاں کے معرکہ ہائے جنگ و جدال میں شہید ہوئے۔یہ مزارات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں جن کی جائے وقوع کچھ اس طرح ہے کہ سیدنا ابراہیم شہید: شہر کے گوشۂ شمال و مغرب میں بہ فاصلہ ایک میل، حسن شہید: جانب شمال محاذ عیدگاہ، محمد شہید: جانب غرب شہر سے دو میل کے فاصلہ پر موضع پنجو سرائے میں، حامد شہید: محلّہ قریشی میں (وزیر سنگھ امیر سنگھ کایستہ نے تخمیناً پچاس سال قبل یہ مزار از سر نو بنوایا تھا، عثمان

شہید: متصل رام تالاب، شمن شہید: جانب شرق مراد آبادی دروازے کے باہر، مبارک شہید: جانب جنوب شہر سے ایک میل سڑک کے کنارے، شمن شہید ثانی: واقع محلّہ چکلی، ماکم شہید: واقع محلّہ کوزہ گران، جھنڈا شہید: واقع محلّہ شیخ زادگان (اب یہ محلّہ جھنڈا شہید کے نام سے موسوم ہے)، بھورے خاں شہید: آپ کا مقبرہ اسٹیشن سے بجانب جنوب و مشرق ریلوے لائن کے پار واقع ہے- آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بہت جلالی بزرگ ہیں، جہانگیر شہید: واقع محلّہ جزدویہ، عبدالحکیم عباسی: متصل تکیہ ساہو جانب جنوب، کنوارے شہید: متصل روضہ شاہ گھاسی، جہانگیر شہید ثانی: محلّہ ملانہ متصل دیوان خانہ قاضی ابن عباس عباسی، ہدایت اللہ شہید: بادشاہی چبوترہ اندرون مکان مولوی احسان الحسن، نتھے خاں شہید: محلّہ کٹکوئی-

آج بھی ان بزرگان دین کے مزارات پر سیکڑوں معتقدین جوق در جوق آتے ہیں- ان کے مزاروں پر بہت سی کرامات بھی نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے-

**سید احمد گنجِ رواں قدس سرہ:** "شیخ الصوفیہ سید احمد گنج رواںؒ بن سید عبداللہ فضل ابتدائے عہد اسلامی میں امروہہ تشریف لائے- آپ نے تشنگانِ حقانیت کو روحانی فیض و برکت سے سیراب کیا- کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہ سے آپ کو اکتساب نسبت حاصل ہے- حضرت ابوالحسن خرقانیؒ چوتھی صدی ہجری کے اکابر مشائخ میں سے تھے- سید احمد گنجِ رواں قدس سرہ کا مزار امروہہ کے گنجان علاقے نوبت خانہ سے محلّہ لکڑہ جاتے ہوئے سر راہ واقع ہے- امروہہ کے اولیا میں ان کا زمانہ سب سے زیادہ قدیم ہے-"

**شاہ اعزالدینؒ سہروردی:** صاحب "تذکرۃ الکرام" تحریر کرتے ہیں: "سید اعزالدین سہروردی قدس سرہ مشائخ متقدمین میں سے ہیں خاندان کا حال کچھ معلوم نہیں، نسباً سید مشہور ہیں- شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کا آپ کو مرید و خلیفہ بتایا جاتا ہے- درویشانہ سیر و سیاحت اور تبلیغ اسلام کے جذبہ نے وطن آبائی چھڑایا، عراق سے ہندوستان آئے، بہت لوگ آپ کی تلقین و ہدایت سے مشرف باسلام ہوئے- امروہہ میں بڑ تلے والے کایستھ خاندان کو آج تک آپ سے عقیدت چلی آتی ہے- آپ کے بعض خوارق و کرامات بھی مشہور ہیں.......... حضرت شاہ ولایتؒ کے زمانہ سے تقریباً ایک صدی پہلے آپ امروہہ تشریف لائے تھے- آپ کی درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ کی درگاہ سے جانب جنوب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے- مزار پرانوار کے پاس کھرنی کا جو درخت اب تک موجود ہے غالباً اس سے زیادہ کوئی پرانا درخت امروہہ میں نہیں ہے- درگاہ کے

سامنے برگد کا درخت بھی اپنی قدامت زبان حال سے بتلا رہا ہے۔ اس نواح میں بعض شکستہ چبوتروں اور قبروں کی اینٹیں آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو میں وقتاً فوقتاً خاکسار مولف کی نظر سے گذریں جن کی ساخت و جسامت ہی ان کی قدامت کی دلیل ہے۔ان میں بعض ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ لمبی چوڑی اور دو دو تین انچ موٹی تھیں جو یقیناً مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ ولایتؒ کی درگاہ یا کسی اور قدیم مزار کے پاس اس ساخت اور جسامت کی اینٹیں یا آثار قدیمہ مولف کی نظر سے باوجود تلاش و جستجو نہیں گذرے۔امتداد زمانہ کی وجہ سے جب یہ مزار شکستہ و بے نشان ہو گیا تھا تو ۹۰۷ھ میں شیخ جمنؔ نامی ایک شخص نے اسے درست کرایا۔ نبو شاہؔ اسی درگاہ میں رہا کرتے تھے،ان کی قبر بھی احاطہ ءدرگاہ جنوب و مشرقی گوشہ میں ہے۔اس لیے عوام میں یہ درگاہ 'نبو شاہ کی درگاہ' مشہور ہو گئی ہے۔اس درگاہ میں بھی غیر نیش زن (تکلیف نہ دینے والے) بچھو پائے جاتے ہیں۔بڑھ تلے والے کائستہ خاندان کو اس مزار سے موروثی عقیدت ہے۔وزیر سنگھ و امیر سنگھ کائستہ نے اس درگاہ کی چہار دیوار ی وغیرہ از سر نو تعمیر کرائی تھی۔ہر سال ۲۹، ۳۰رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

صاحب مقاصدؔ العارفین نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ حضرت سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ جب امروہہ میں وارد ہوئے اور بیرون شہر ریت کے ٹیلے کے قریب سے گزر ہوا تو اس وقت آپ نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ اس جگہ کچھ بوئے یگانگت آتی ہے۔ریت کے تودے اس مقام سے ہٹائے گئے تو ایک کہنہ قبر نمودار ہوئی شاہ ولایتؒ مراقب ہوئے۔حالت استغراق سے فارغ ہونے پر فرمایا کہ یہ قبر سید اعزالدین کی ہے جو شیخ الشیوخ کے خلفا میں صاحب مقامات عالیہ بزرگ تھے۔" حال ہی میں جب میں امروہہ گیا تو آپ کے مزار پر بھی حاضری دی اور وہاں پر میں نے ایک بچھو کو اپنے ہاتھ سے پکڑا تو اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

**سید عبدالعزیز حاجی حرمین سہروردیؒ:** "خاندان کا حال کچھ تحقیق نہ ہو سکا۔سید اعزالدین سہروردیؒ کا مرید بیان کیا جاتا ہے۔روایت ہے کہ آپ نے سات حج پاپیادہ کیے۔ آپ کی والدہ بھی عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔مادر مشفقہ کی خدمت بہت کرتے تھے...... پیر و مرشد کے وصال کے وقت حرم مکہ معظمہ میں تھے۔ وفات کی خبر پا کر بے تابانہ امروہہ چلے آئے اور پھر یہاں سے باہر نہ نکلے۔چند سال بعد مرشد سے جا ملے اور ان ہی کی درگاہ کے محاذ میں جانب شرق مدفون ہوئے۔ان کی والدہ کی قبر بھی پہلو میں ہے۔"

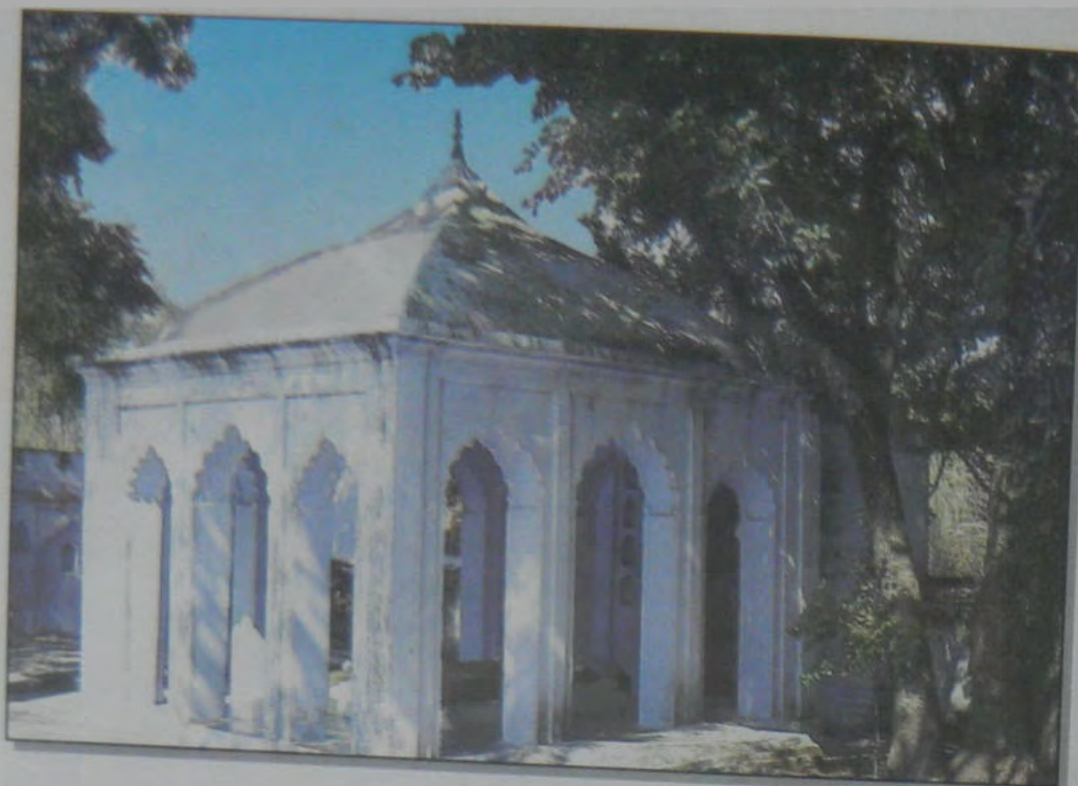
**حضرت شاہ ولایتؒ:** امروہہ کی یہ مشہور معروف درگاہ مرجع خاص و عام ہے۔ حضرت شاہ ولایتؒ کی

بہت سی کرامتوں اور تصرفات کے منجملہ ، جو عوام میں مشہور ہیں ایک یہ کرامت بھی خاص شہرت رکھتی ہے کہ احاطہ ء درگاہ میں پایا جانے والا بچھو ڈنک نہیں مارتا- آپ کے بارے میں صاحب تاریخ نے بیان کیا ہے کہ "اسم گرامی سید حسن، لقب شرف الدین، مشہور شاہ ولایت، سلسلہ نسب بچند واسطہ امام علی نقیؑ سے متصل ہوتا ہے- باین طریق سید شرف الدینؒ حسن بن سید علی بن سید مرتضٰی بن سید ابو المعالی بن سید ابو الفضل سید داؤد ( تاریخ واسطیہ اور اصغری میں ابو الفرح واسطی لکھا ہے ) بن سید حسین بن سید علی بن سید ہارون بن سید جعفر بن امام علی النقی رضی اللہ عنہم اجمعین-

آپ کے پدر بزرگوار سید علی جو اپنے نبیرہ قاضی امیر علی کے امتیاز کی خاطر خاندان میں سید علی بزرگ مشہور ہوئے عراق سے ہندوستان آئے- انکے جد القبیلہ جعفر بن امام علی النقیؑ کا قیام عراق میں رہا.......... ثمرات القدس کی روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ بزمانہ سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ) اپنے پدر بزرگوار سید علی بزرگ کی معیت میں امروہہ تشریف لائے اور اہل خاندان کو یہاں چھوڑ کر دامن کوہ میں عبادت کے لیے تشریف لے گئے...... روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا اور جنگل کا قیام پسند خاطر اور درویشانہ سیر و سیاحت مرغوب طبع تھی-........ مقاصد العارفین میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت شاہ ولایتؒ باعتبار علوم ظاہری و باطنی درجہ امتیاز رکھتے تھے، اکثر اوقات آپ پر عالم استغراق طاری رہتا لیکن باوجود اس حالت کے اتباع شریعت میں سرگرم و ثابت قدم تھے اور کبھی کوئی سنت فرد گذاشت نہ ہوئی...... حضرت شاہ ولایتؒ کے پہلو میں آپ کی زوجہ معظمہ کی قبر ہے اور آپ کے پائین مزار آپ کے بڑے بیٹے قاضی سید امیر علی اور ان کی زوجہ کی اور ان کے پائین مسماۃ بختوئی دختر شاہ ولایت کی قبور ہیں-

انیسویں سے اکیسویں رجب تک تین دن عرس ہوتا ہے- ابتدا میں شاہ ولایتؒ کی اولاد عرس کا انتظام کرتی تھی، اس کے بعد پہلی تاریخ میں درگاہ کے مجاور، دوسری تاریخ میں بڑھ تلے والے کائستھ اور تیسری تاریخ میں شہر کے قصائی تیلی وغیرہ روشنی اور عرس کا انتظام کرتے تھے-" آپ کے مزار پر ویسے تو ہر روز بہت لوگ آتے ہیں لیکن جمعرات کے دن بڑی تعداد میں آپ کے معتقدین آتے ہیں اور نیاز نذر کر کے غریبوں، مسکینوں میں تقسیم کرتے ہیں- اس دن یہاں میلے کے جیسا سماع ہوتا ہے اور شام کو مزار کے باہر قوالی بھی ہوتی ہے-

**شیخ معین الدین صدیقیؒ قدس سرہ:** "مولانا صحیح الدین سہروردی کے بیٹے، قدوۃ العارفین قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے پوتے فضائل صوری معنوی سے بہرہ ور مشائخ متقدمین سے ہیں- باپ دادا باعتبار علم و

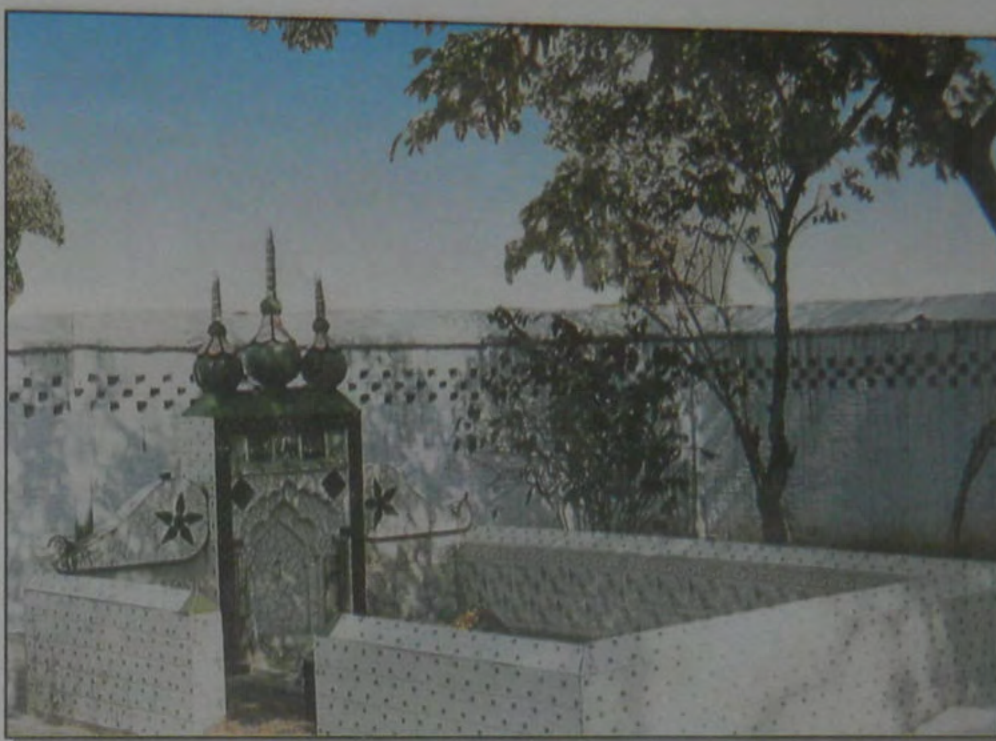


درگاہ شاہ اعز الدینؒ سہروردی...... نزد پانواڑی تالاب



درگاہ حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایتؒ............ درگاہ کا بچھو جو کاٹتا نہیں





احاطہ شاہ ولایتؒ میں سید محمد ابدال دودھاریؒ کا مزار



درگاہ شاہ نصیرادین چشتیؒ ...... متصل بانسدیو پارک

فضل، زہد و رع اور علو ءِ مرتبت درجہ امتیاز رکھتے تھے - روایت ہے کہ آپ کے والد مولانا صبح الدین سہروردیؒ سے حضرت سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ نے اکتساب فیض کیا تھا شاید اسی تعلق سے حضرت ممدوح نے اپنے مرشد زادہ کو فیض تربیت سے بہرہ ور کیا مدۃ العمر ساتھ رکھا اور خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا- حضرت شاہ ولایتؒ کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد امروہہ سے باہر چلے گئے لیکن اپنے انتقال سے قبل اس خیال سے مع اپنی اولاد کے امروہہ تشریف لے آئے کہ موت کے بعد بھی پیرو مرشد کا قرب حاصل رہے- آپ کے بارہ فرزند تھے اسی وجہ سے ان کا قیام سکونت محلّہ "بارہ پوتیاں" مشہور ہوا- آپ کا مرقد منورہ شاہ ولایتؒ کے پائیں مزار جانب غرب ہے-"

**قاضی عبداللطیف سہروردیؒ:** "قاضی عبداللطیف سہروردیؒ عالم فاضل اور درویش کامل تھے- خاندان کا حال کچھ تحقیق نہو سکا- حضرت سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ کے فیض یافتہ اور خلیفہ مجاز تھے- مزار متصل تالاب پانواڑی نوگزہ پر ہے-

عوام میں ایک روایت مشہور ہے کہ اپنے انتقال سے پہلے قاضی عبداللطیفؒ نے امروہہ کے کسی کفن چور کو' جو اپنی نالائق حرکت کی وجہ سے اس زمانہ میں خاص شہرت رکھتا تھا' اپنے پاس بلایا اور پارچہ کفن کے بقدر نقد دام دیکر فرمایا کہ جاؤ یہ دام تو لیجاؤ مگر ہماری قبر کے پاس آنے یا کفن چرانے کی نازیبا حرکت کبھی مت کرنا- کفن چور دام لیکر اور کفن نہ چرانے کا عہد و پیماں کر کے چلا گیا- لیکن قاضی صاحب کی تدفین کے بعد حرص و طمع بے طرح دامنگیر ہوئی، رات کو قبر پر جا پہنچا، تختے الگ کیے اور ہاتھ بڑھا کر چاہتا تھا کہ میت پر سے کفن کی چادر گھسیٹ لے کہ قاضی صاحب نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا- مردے کے اس طرح سے ہاتھ پکڑ لینے سے اس سیاہ دل کفن چور کے قلب پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ فوراً دم نکل گیا- صبح کو لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر ہر چند چاہا کہ اس کی لاش کو علیحدہ کریں مگر قاضی صاحب کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی- یہ خبر سید اشرفؔ کے مبارک کانوں تک پہنچی آپ تشریف لائے اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا "قاضی را نہ باید کہ بایں ہمہ خود را ظاہر سازد کہ شرط ایں راہ نیست ...... واگبذار" کہتے ہیں کہ اس پر قاضی صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا اور خواب میں فرمایا کہ اسے ہماری قبر کے پاس دفن کر دیا جائے- اس روایت کی حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن ایک قبر آپ کے پائیں مزار موجود ہے، مرقد منور متصل چوکی چنگی محلّہ نوگزہ ہے-" آپ کے مزار کی تلاش میں راقم الحروف بھی ایک دن پنواڑی تالاب پر گیا لیکن اب مزار کا کوئی نشان باقی نہیں ہے-

**سید محمد ابدال دودھ دھاریؒ:** "سید محمد ابدال دودھ دھاریؒ خلف سید عبدالعزیز سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ جد بزرگوار کے خلیفہ و جانشین، صاحب کشف و کرامات اور قطب وقت تھے- صحرانوردی اور درویشانہ سیر وسیاحت سے رغبت اور تبلیغ وہدایت محبوب شغل تھا- قوت لایموت کے لیے تھوڑے سے دودھ پر اکتفافرماتے اسی بنا پر "دودھ دھاری" کے لقب سے مشہور ہیں- صاحب مقاصد العارفین لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولایتؒ نے بنور باطن معلوم کر لیا تھا کہ آپ سے سلسلہ بیعت آئندہ جاری نہ رہیگا- اسی لیے اپنے خلفاء کو بھی اس کے اجرا سے منع فرمایا- چنانچہ سید محمد ابدال نے باوجود مبلغانہ جدوجہد اور ارشادوہدایت کی مصروفیت کے لوگوں کو سلسلۂ بیعت میں داخل کرنا ترک کر دیا تھااور آخر وقت جد بزرگوار کے تبرکات جبہ ودستار و نعلین کو بھی کسی کے سپرد نہیں کیا- انتقال کے وقت احباب واعزا کو وصیت کی کہ تبرکات کو ہماری نعش کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے- غالبًا اسی وجہ سے حضرت شاہ ولایت کے تبرکات میں سے کوئی شے آپ کی اولاد کے پاس باقی نہیں رہی- سترھویں ربیع الاول کو رحلت کی، سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا- درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ کے شمال مغربی گوشہ میں، جس کا احاطہ سید علی مظفر خاں بن سید امان علی خاں (گھڑیال والے) نے تعمیر کرایا تھا' آپ کا مزار پر انوار ہے-"

**قطب الاولیا سید اشرف جہانگیرؒ:** مولف تذکرۃ الکرام تحریر فرماتے ہیں: "آپ ملک ولایت کے سرتاج، اسرار حقیقت کے رازدار' علوم میں یگانۂ عصر' زہد و تقویٰ میں ممتاز اور عبادت و ریاضت میں شہرۂ آفاق تھے- قاضی سید امیر علی کے فرزند ارجمند اور حضرت سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ کے پوتے، آٹھویں صدی ہجری کے اولیا عظام اور خانوادہ چشتیہ کے مشائخ کرام میں سے ہیں- سید اشرف نام جہانگیر لقب امروہہ کے شاہ ولایت تھے، شرف الدین کے نام سے موسوم ہیں- سلطان محمد تغلق کے ابتدائے عہد میں ولادت ہوئی.... ابتدائی زمانہ جد امجد اور پدر بزرگوار کے آغوش تربیت میں بسر ہوا- بعد وفات جد بزرگوار تحصیل علم کے شوق نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، دہلی پہونچے اور کسب علوم میں مصروف ہوئے..... دہلی کے قیام میں باطنی علوم کی تحصیل کا بھی شوق پیدا ہوا- جد بزرگوار کے وصال کے بعد خاندانی سلسلہ بیعت کا انقطاع ہو چکا تھا اس لیے سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ سے نسبت بیعت درست کی......

چھٹی ربیع الاول ۷۸۳ھ میں رحلت کی، وفات سے پہلے اپنے سب عزیز و اقارب اور اپنے مریدوں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا کہ اب ہم اس دنیا سے سفر آخرت اختیار کرتے ہیں ہماری نعش کو تجہیز و تکفین کے بعد

بزرگوار حضرت سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ اور والد ماجد قاضی سید امیر علیؒ کے پہلو میں دفن کرنا عمدہ لباس زیب تن کیا سر تکیہ پر رکھا، اور دست مبارک آنکھوں پر رکھ کر اللہ اللہ کہتے ہوئے انتقال فرمایا۔"

**مخدوم شیخ نصیر الدین چشتیؒ قدس سرہ:** "نویں صدی ہجری کے یہ صاحب تقویٰ بزرگ مولانا بدرالدین اسحٰق دھلوی کی اولاد امجاد سے تھے جن سے سلسلہ نسب اس طرح متصل ہوتا ہے۔ مخدوم شیخ نصیر الدینؒ بن خواجہ سیف الدینؒ بن خواجہ فخر الدینؒ بن خواجہ محمد امامؒ بن مولانا بدرالدین اسحٰق بن علیؒ بن اسحٰق دہلوی۔ مخدوم شیخ نصیر الدینؒ کے جداعلیٰ خواجہ فخر الدین جنکا سلسلہ نسب بواسطہ مولانا بدرالدین اسحٰق عمر الاشرف بن امام زین العابدین سے متصل کیا جاتا ہے، بعطائے مواضعات مدد معاش سلطان محمد تغلق عادل کے عہد (۷۲۵، ۷۵۲) میں دہلی سے امروہہ چلے آئے، عرصہ تک یہ خاندان یہاں رہا، بعد میں کچھ افراد نوگانواں وغیرہ مواضعات میں متوطن ہوگئے

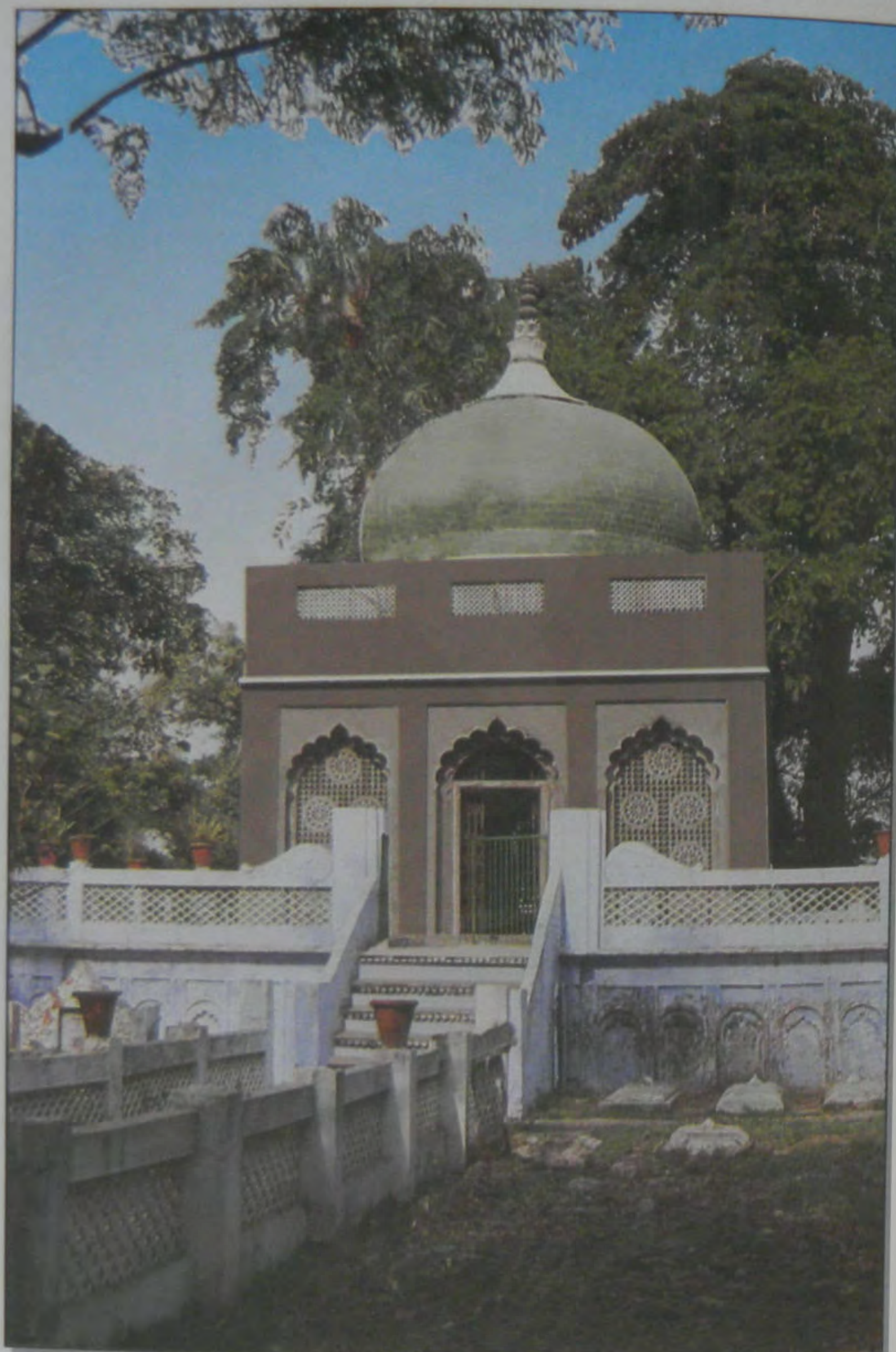
مخدوم صاحب کا سال پیدائش معلوم نہ ہوسکا تاہم یہ امر یقینی ہے کہ آپ کا زمانہ ولادت حضرت سید شرف الدین شاہ ولایتؒ کے زمانہ سے تقریباً ایک صدی بعد کا ہے۔ شاہ صاحب کی درگاہ بیرون شہر جانب شمال ومغرب متصل بانسدیو پارک واقع ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے آخر تک یہ درگاہ بارونق اور آباد تھی، عرس بھی ہوتا تھا۔ لیکن اب ویران وسنسان ہے اور عرس بھی نہیں ہوتا۔"

**شیخ چاندہ فاروقیؒ:** "عہد سلاطین لودھی میں امرہہ کے بدر منیر تھے۔ آپ وارث ولایت فریدی، ثمر شجرہ فاروقی، مجمع فضائل معنوی وصوری، تقویٰ وطہارت میں بے نظیر تھے۔ سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت شیخ الاسلام فرید الحق والدین مسعود گنج شکر فاروقی سے متصل ہوتا ہے۔ اس طریقے سے شیخ عیسیٰ جو شیخ چاندہ مشہور ہوئے بن شیخ منور بن شیخ موسیٰ حاجی بن شیخ ضیاء الدین بن شیخ بہاالدین رجبپوری بن شیخ فخر الدین سادہ معروف بہ شیخ سالار بن شیخ علی شیر بن شیخ نظام الدین شہید بن شیخ الاسلام فرید الحق والدین۔ عہد سلاطین لودھی میں سلسلہ چشتیہ کا فیض آپ کی ذات سے جاری رہا۔ چاندہ جو ترکی زبان میں شہزادہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ کا لقب ہے اور اسی سے امروہہ میں آپ کی شہرت ہے۔ لفظ چاندہ بگڑ کر پہلے چاندہ ہوا اور چاندہ سے چائنیں پھر چائین، چاہن اور اب عوام میں چائیاں مشہور ہے۔ آپ کا مزار متصل آبادی جانب شرق تالاب پانباڑی واقع ہے۔ اس محلہ کا نام بھی شیخ چاہن پڑ گیا ہے۔ تقریباً بیس برس ہوئے گلاب شاہ ساکن مراد آباد نے

اس مزار اور مسجد کی مرمت کرائی تھی۔"

**حضرت شاہ ابن بدر چشتی**: حضرت کا اسم گرامی عبداللہ کنیت ابوالفتح عرف ابن اور لقب بدر چشتی تھا۔ آپ سالک و مجذوب اور ولی کامل تھے۔ مزار مبارک امروہہ شہر کے جانب جنوب ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ آپ اپنے وقت کے بڑے عالی مرتبہ، عالم و فاضل معروف بزرگ ہوئے ہیں۔ صوفیائے کرام میں آپ درجۂ شیخ کے مرتبے پر فائز اور سلوک و جذب کے حامل تھے۔ آپ کے اجداد کرمان (ایران) سے موضع گھٹاؤلی (ضلع بلند شہر) میں آکر آباد ہوئے۔ آپ حضرت محمود مالامال کرمانی کے بھائی سید طیفور کی اولاد میں ہیں۔ نسب حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے۔ آپ حضرت شاہ علاؤالدین مفرح دریا فیل مست سے بیعت ہوئے جو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے سجادہ نشینوں کے سلسلے میں آتے ہیں۔ حضرت علاؤالدین فیل مستؒ نے آپ کو سلوک و جذب کے مراحل طے کرنے کے بعد صاحب ولایت بنا کر آگرہ جانے کا حکم دیا۔ جب آپ وہاں گئے تو وہاں ایک اور صاحبِ ولایت بزرگ حضرت سید علاؤالدین حسینیؒ (عرف حضرت شاہ علاول بلاول) موجود تھے جنہوں نے آپ کو امروہہ جانے کی ہدایت کی اور آپ امروہہ آئے۔ یہاں آپ نے اپنی خانقاہ، مکان اور مسجد تعمیر کرائی (موجودہ محلہ پیرزادگان) خانقاہ بہ تبدیل ہیت موجود ہے۔ اسی خانقاہ میں عہد اکبری کے مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جنہوں نے اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں آپ کا ذکر اس عنوان سے کیا ہے۔ "سید ابن امروہہ" اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ "آپ سالکِ مجذوب تھے مگر اس کیفیت کے باوجود شریعتِ مطاہرہ کا کوئی دقیقہ بھی فرو گذاشت نہ فرماتے تھے۔" اپنے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں پنجاب سے بدایوں جاتے ہوئے امروہہ میں سید موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ قران مجید کی تفسیر بیان فرما رہے تھے۔ ۵ ذیقعد سنہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء میں آپ کا وصال ہوا۔ حضرت مخدوم سید ابن بدرِ چشتیؒ کے خلفاء بے شمار ہیں جن میں سنبھل کے حضرت شاہ عالم کرمانی، بریلی میں حضرت شاہ داناؒ اور رام پور میں حضرت شاہ برخوردارؒ قابل ذکر ہیں۔

آپ کا عرس امروہہ اور کراچی میں بہت پُر شکوہ انداز سے ہوتا ہے جس کا اہتمام آپ کی اولاد کرتی ہے۔ انجمن سادات رضویہ کے نام سے ایک تنظیم بھی ہے جو عرس کا اہتمام کرتی ہے۔ عرس کے موقعہ پر ایک رسالہ "درِ مقصود" بھی امروہہ اور کراچی دونوں جگہ سے شائع ہوتا ہے۔



روضہ حضرت پیر شاہ اٰمَن بدر چشتؒ



روضہ عمدۃالواصلین سید عبدالحکیم قدس سرہ......نزد عید گاہ



روضہ سید عبدالمجید قدس سرہ......نزد عید گاہ

**حضرت شیخ پیرکؒ:** "شیخ رکن الدین عرف شیخ پیرک، عہد اکبری کے صالحین سے تھے، خواب گاہ خاکی محلہ نیازیاں میں ایک بہت بڑے احاطہ میں واقع ہے جو تکیہ شاہ پیرک نام سے مشہور و معروف ہے۔ یہاں اور بھی بہت سی قبور ہیں اور ایک مسجد ہے۔ اب اس احاطہ کے چاروں طرف آبادی ہے۔"

**شاہ گدا قادریؒ:** "عالی نسب، والا حسب، تقویٰ و طہارت میں یکتا، کاملین وقت سے تھے۔ سلسلہ نسب حضرت غوث الثقلین محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی سے متصل ہوتا ہے...... آپ کے والد سید سراج الدین بن سید محمد بغدادی ذی علم بزرگ تھے۔ میر سید محمد میر عدل سے اکبر آباد کے قیام میں مراسم اتحاد و یگانگت پیدا ہو گئے، غالباً اسی تعلق سے امروہہ چلے آئے اور میر عدل موصوف کی پوتی بی بی اچھی بنت میر ابوالقاسم کے ساتھ عقد ہوا جن کے بطن سے شاہ گداؒ متولد ہوئے...... ننہیالی ترکہ مال و دولت کا بہت کچھ تھا، میر ابوالقاسم آپ کے نانا عہد اکبری و جہانگیری کے نامور منصب دار امیر کبیر تھے۔ سید عبدالمنعم آپ کے ماموں لاولد فوت ہوئے دوسرے ماموں سید حسن کی دختر بی بدی کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی۔ اس لیے میر ابوالقاسم، سید عبدالمنعم اور سید حسن کے ترکہ کی وارث آپ کی والدہ اور زوجہ ہوئیں مگر جس کو روحانی دولت کے حصول کی تمنا ہو اس کی نظر میں دولت دنیوی کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ یہ دربار ایزدی کے گدا دنیاوی مال و دولت کی جانب کبھی راغب نہ ہوئے۔ اپنی نانی کی تعمیر کردہ مسجد میں چلہ کشی کرتے اور یاد الٰہی میں مصروف رہتے، چلہ کشی اور عبادت میں مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ یہ مسجد ہی چلہ کی مسجد مشہور ہو گئی۔ شروع عہد شاہجہانی میں انتقال فرمایا اور تالاب کیتھیا کے قریب اپنے پدر بزرگوار کے پاس مدفون ہوئے۔"

**قطب الاقطاب شیخ عبدالمجید علویؒ قدس سرہ:** "شیخ عبدالمجید علوی قدس سرہ خلف سید معروف علویؒ کا سلسلہ نسب امام محمد حنفیہ بن حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے متصل ہوتا ہے۔ سنہ ۹۷۰ھ میں پیدا ہوئے، آغاز شباب میں تحصیل و تکمیل علم کے شوق نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ کچھ عرصہ دہلی میں رہے پھر نارنول پہونچے اور حضرت شیخ نظام الدین نارنولی کے مدرسہ میں داخل ہو کر علوم ظاہری کی تحصیل کی اور وطن واپس آ کر حضرت سید شاہ شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ کی روحانیت سے استفاضہ کیا اور آپ کے روضہ منورہ میں عرصہ دراز تک چلہ کشی کرتے رہے...... اس کے بعد حج کی نیت کر کے امروہہ سے چلے، اثنائے راہ میں اجمیر پہنچے، حضرت خواجہ اجمیری کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ شب کو بشارت ہوئی کہ تم نے حج کی نیت کی تھی بارگاہ ایزدی

میں قبول ہوئی -اب تم امروہہ واپس جاؤ اور طالبان حق کو فیض پہنچاؤ..... چنانچہ اجمیر سے لوٹ کر پھر امروہہ آئے اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے - آپ شاہ ولایتؒ کے روضے کے قریب جہاں اب آپ کا مزار ہے' تنہائی میں جا بیٹھے - یہاں بڑی تعداد میں لوگ آپ سے فیض و برکت حاصل کرتے - آپ نے دنیا کو ترک کر دیا تھا - وفات سے دو مہینہ پیشتر دوستوں اور مریدوں کو خطوط لکھوا کر بھیجے کہ اب ہمارا آخری وقت ہے ملاقات کر جاؤ..... ربیع الآخر سنہ ۱۰۴۶ھ میں انتقال فرمایا-

شیخ عبدالمجید علویؒ قدس سرہ کا مزار پختہ چہاردیواری کے اندر متصل عیدگاہ واقع ہے - مرقد منورہ پر خوبصورت مقبرہ بنا ہوا ہے - جو اب جا بجا سے شکستہ ہو گیا ہے - آپ کے بھائی اور جانشین شیخ فیض اللہؒ کی قبر بھی پائین مزار ہے جو اب اینٹوں کا ڈھیر ہے - احاطہ درگاہ میں عالی شان مسجد ہے جس کے خوشنما گنبد جا بجا سے شق ہو گئے ہیں، سامنے کا ایک مینار گر گیا، کنگرے ٹوٹے پڑے ہیں، گنبد پر خودرو درخت اگ آئے ہیں - مسجد کے متصل شاہ صاحب کے خلیفہ عمدۃ الواصلین سید عبدالحکیم کا مقبرہ ہے جو طرز تعمیر میں آپ کے مرشد کے مقبرہ کے مشابہ ہے - یہ بھی جا بجا سے شکستہ ہو گیا ہے - سابق میں آپ کا بھی عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا - اس خاندان کے لوگ جب امروہہ میں باقی نہ رہے تو عرس بھی موقوف ہو گیا اور مقبروں کی مرمت اور خدمت کرنے والا بھی کوئی باقی نہ رہا-"

شیخ عبدالمجید علویؒ اور عمدۃ الواصلین سید عبدالحکیم قدس سرہ کے مقبرے ایک ہی احاطہ میں واقع ہیں - اس احاطہ کو اللہ ہو کا باڑہ یا اندھیریا مسجد کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا - گذشتہ زمانے میں ان مزاروں اور مسجد کی واقعی بڑی مخدوش حالت تھی اور یہاں ہر وقت بڑی ویرانی چھائی رہتی تھی، مزاروں یا مسجد میں جاتے ہوئے لوگ خوف کھاتے تھے - اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ مزار اور مسجد بیرون شہر واقع ہیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں خودرو جھاڑیاں اور اتنے گھنے اور گنجان قد آور درخت تھے کہ دن میں بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا رہتا تھا - ظاہر ہے ایسی صورت میں مزاروں اور مسجد کی دیکھ بھال کون کرتا - لیکن اب خودرو جھاڑیاں اور کچھ درخت کاٹ کر اس احاطہ کو صاف کر دیا گیا ہے - احاطہ میں ایک بہت بڑا حوض بھی بنایا گیا ہے جس میں پمپ کے ذریعہ پانی بھر دیا جاتا ہے - چنانچہ اب یہاں بڑی رونق رہتی ہے، سیکڑوں عقیدت مند صبح و شام یہاں روز آتے ہیں - مسجد کی مرمت کر کے آباد کر دیا گیا ہے - مسجد کا ایک مینار جو پہلے ہی گر گیا تھا دوبارہ نہیں بنا-

**حضرت شاہ شکر اللہ قادریؒ:** "عہد جہانگیر کے خدارسیدہ اور قادریہ سلسلہ کے صاحب کمال

بزرگ تھے - آپ کا سلسلہ بیعت کئی پشتوں تک امروہہ میں جاری رہا- مشائخ امروہہ کی بعض قدیم دستاویزات پر 'سید قطب بن سید محمد افضل صاحب سجادہ حضرت شاہ شکر اللہ عارف باللہ قادری' کے دستخط ان ہی الفاظ کے ساتھ تحریر ہیں-۱۰۹۷ھ یعنی عہد عالمگیرؒ تک اس خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ کاغذات میں ملتا ہے- خاکسار مولف کوامروہہ کے قبرستانوں اور مزارات میں اکثر بزرگوں کی قبروں اور مزارات کی شکستگی کے نظارے نے بارہاافسردہ کیا ہے لیکن جس وقت ایک صوفی منش دوست کی معیت میں حضرت ممدوح کے مزار کے تجسس میں اس مقام پر پہنچاجو آپ کی آرام گاہ ہے تو زبان قلم سے نکلے ہوئے الفاظ قلب کی اس اذیت اور دل کی اس بیتابی کااظہار نہیں کرسکتے جواس منظر کے دیکھنے سے پہنچی- محلہ کالی پگڑی(دستار سیاہ) میں، جس کانام ہی حضرت ممدوح کی خاندانی خصوصیت کا آج بھی اظہار کررہا ہے 'امام باڑہ کے سامنے، جو کسی زمانہ میں حضرت ممدوح کی خانقاہ تھی، مٹی کاایک اونچاڈھیر پڑا ہے حضرت کی نسل میں اب ایک دواشخاص جو باقی ہیں ان میں سے امروہہ میں موجود نہیں-"

**میاں شیخ محمودؒ:** "آپ عہد شاہجہانی کے صاحب نسبت اور واقف حقیقت بزرگ تھے، آپ کے اجداد میں شیخ کمال الدین ابتدائے عہداکبری میں امروہہ آئے، شیخ مصطفیٰ امروہوی اسی خاندان سے تھے-دیرینہ کاغذات میں فضائل و حقایق پناہ میاں شیخ محمودؒ وغیرہ الفاظ سے آپکانام نامی تحریر ہے-اب اس نسل میں کوئی خاندان امرہہ میں موجود نہیں ہے-"

**عمدۃالواصلین سید عبدالحکیم قدس سرہ :** "عمدۃ الواصلین سید عبدالحکیمؒ قدس سرہ بن سید عبدالصمد بن سید سعیدؔ خاں بن دیوان سیدؔ منجھو ازاولاد قاضی امیر علی بن سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ ،سید عالی نسب والا حسب، وارث علوم اجداد، تقویٰ و طہارت میں ممتاز، صاحب ذوق و شوق اور شیخ وقت تھے، آبائے کرام دولت علم سے مالامال اور مناصب شاہی سے معزز و ممتاز رہے، انہوں نے بادشاہ حقیقی کی غلامی کو بادشاہ مجازی کی ملازمت و تابعداری پر ترجیح دی،اوائل عمر سے تصوف کی جانب میلان خاطر تھا- قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالمجید علویؒ سے علوم ظاہری وباطنی کاسرمایہ حاصل کیا-

پیرومرشد کی وفات کے بعد امروہہ سے دل اچاٹ ہوایہاں کسی طرح کاکوئی تعلق تو دامن گیر نہ تھاحج و زیارت روضہ مطہرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شوق اورولولہ مدت سے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا-اللہ پر

بھروسہ کر کے اپنے چند ہمرنگ اور ہم مزاج ساتھیوں کے ساتھ دربار محبوب کی جانب چل کھڑے ہوئے- پہلی ہی منزل پر ساتھیوں سے فرمایا کہ تم لوگوں میں طلب دنیا کی بو آتی ہے اس پر ایک ساتھی نے اقرار کیا کہ چاندی کے چند سکے میرے پاس ہیں- آپ نے وہ چند سکے حاجتمندوں میں تقسیم کرا دیے اور اب سوائے والہانہ شوق زیارت حرمین کرمین آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے پاس کچھ زادِ راہ باقی نہ رہا- اسی حالت میں پیادہ پا سفر کرتے ہوئے دربار محبوب خدا میں حاضر ہوئے- اتفاقاً چار دن متواتر غذا میسر نہ ہوئی- صبر واستقامت اور توکل شیوہ تھا، سوال کیوں کرتے- حرم محترم کے پاس ایک حجرہ کے اندر اسی حالت میں اللہ کی طاعت میں مشغول ہو گئے، چوتھے دن شریف مکہ کو رحمت للعالمین کے حضور سے بشارت ہوئی کہ ہمارا ایک مہمان عبدالحکیم ہندی تین دن سے فاقہ کی حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے، جاکر اس کی تواضع کرو- شریف مکہ اور اس کے آدمی آپ کا نام پکارتے ہوئے تین مرتبہ آپ کے حجرہ کے سامنے سے بھی گذرے- لیکن آپ عبادت الٰہی میں مصروف رہے- چوتھی مرتبہ نام سننے پر جواب دیا کہ بھائی، ایک عبدالحکیم ہندی تو میں ہوں- جب شریف مکہ نے بشارت کا حال بیان کیا تو آپ نے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ کوئی اور خوش قسمت عبدالحکیم ہوگا- جسے حضور سرور کائنات نے شرف مہمانی بخشا ہے- اس واقعہ کے بعد لوگوں میں ان کی بزرگی اور کمالات کا چرچا ہونے لگا- خلقت کا ہجوم رہتا مگر ان کو اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنے کی خواہش نہ تھی- ادھر پیر ومرشد کے مزار پر انوار کی زیارت کے شوق کا غلبہ ہوا، کچھ عرصہ حجاز میں مقیم رہنے کے بعد وطن واپس آکر مرشد کے مزار پر معتکف ہو بیٹھے- طالبان حق کی رہنمائی اور فقرا و درویشوں کی خدمت میں مصروف رہے- وصال سے چند روز پیشتر پیر ومرشد کی طرح احباب ومعتقدین کو خطوط بھجوائے کہ سفر آخرت کا وقت آپہنچا ملاقات کر جاؤ-"

**شاہ علاول چشتی قدس سرہٗ:** "آپ باعتبار نسب سید حسینی ہیں اور آپ کا نام سید علاء الدین، شاہ علاول لقب، مشائخ متاخرین میں کامل وقت اور قوی النسبت بزرگ تھے- حضرت شیخ عبدالمجید علویؒ سے سالہا سال اکتساب فیض کیا- خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے- بعد وصال پیر ومرشد عمدۃ الواصلین سید عبدالحکیمؒ سے بھی فیض صحبت پایا- ۱۰۸۶ھ میں آپ نے وفات پائی- مزار پرانوار درگاہ حضرت شیخ شاہ عبدالمجید علوی کے متصل جانب جنوب لب سڑک واقع ہے جو شاہ علاول کے نام سے مشہور ہے-"

**شاہ گھاسی چشتیؒ:** "آپ قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالمجید علویؒ کے مرید و خلیفہ تھے- پیر ومرشد

کے وصال کے بعد اپنے پیر بھائی عمدۃ الواصلین سید عبدالکلیم سے فیض صحبت پایا- ہجرت نشینی، عزلت گزینی کا یہ عالم تھا کہ سوائے نماز جمعہ و عیدین یا زیارت مزار مرشد کے کبھی حجرہ سے قدم باہر نہ رکھا، اکثر اسی میں ذکرواشغال اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے- مثنوی روم کا کثرت سے مطالعہ فرماتے تھے- اکثر ذی علم مثنوی کے مطالب آپ ہی سے سمجھنے آتے تھے- آپ نے متعدد اشخاص کو فیضیاب کیا- جس میں شیخ سلیم کنبوہ سنبھلی، جو سنبھل کے صاحب کمال بزرگ ہوئے' سید عبدالباری بن سید ابوالحسن اور سید غلام علی بن سید محمد عاقل جو سید محمد میر عدل کے پوتے تھے آپ سے خاص عقیدت رکھتے تھے- آپ نے شادی نہیں کی تھی اور اہل و عیال کی بندشوں سے قطعاً آزاد تھے- ۱۹ر رمضان المبارک سنہ ۱۰۹۹ھ کو آپ کا وصال ہوا-"

آپ کا روضہ تالاب بنواڑی کے قریب سید اعزالدین سہروردی کی درگاہ سے جانب شرق و جنوب میں ہے- آپ کا مقبرہ بہت خوبصورت اور بہتر حالت میں ہے- چہار دیواری البتہ جابجا شکستہ ہو گئی ہے- ۱۰۸۴ء میں ہی یہاں خانقاہ و حجرہ کی عمارتیں آپ کی زندگی میں تعمیر ہو گئی تھیں- آپ کا روضہ آپ کے سجادہ نشین مولنٰا عبدالرشید عباسی قدس سرہ نے تعمیر کرایا- مولنٰا کا مزار بھی اپنے مرشد کے جوار مزار چبوترہ پر واقع ہے- چبوترے کے نیچے جانب جنوب شیخ عبدالمناف کی قبر ہے- ۲۹ر رمضان کو حضرت شاہ گھاسی کا عرس ہوتا ہے-

**شاہ نظام الدین سہروردیؒ:** "آپ امروہہ کے مشائخ و صالحین سے ہیں- آپ نے ناموری کے مقابلے میں گمنامی کو پسند فرمایا- آپ کا تعلق فرقۂ سہروردی سے بتایا جاتا ہے- گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے درمیان آپ امروہہ کے صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے- غالب قیاس ہے کہ آپ وہی بزرگ ہیں جن کے آخری ایام میں حضرت شاہ عبدالہادی صدیقی کے سلب قوت کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے- آپ کا مزار محلہ دستار سیاہ (کالی پگڑی) میں واقع ہے جو شکستہ حالت میں تھا اور جس کو مخیّر حضرات کی مدد سے مولانا سید عبدالرحمٰن مکی نے ۱۳۴۷ھ میں درست کرایا-"

**شیخ عبداللطیف مہاجر مکّی قدس سرہ:** "شیخ عبداللطیف مہاجر مکی بن شیخ محمود نبیرہ حضرت شاہ احمد بن قدوۃ العارفین حضرت شاہ ابن بدر چشتیؒ وارث علوم آباء و اجداد جامع فضائل و کمالات متقی متورع نیک ذات نیک صفات تھے- حصول علم کے لیے وطن چھوڑ کر سالہا سال بلگرام اور قنوج میں رہے- کتب درسی میر سید نعمت اللہ بلگرامی سے پڑھیں- کمالات و فضائل صوری کا سرمایہ ان کی صحبت میں کیا پھر قنوج جا کر شیخ حبیب اللہ قنوجی

سے نسبت بیعت درست کی، ریاضیات و مجاہدات میں مدتوں مصروف رہے اور کمالات باطنی میں کمال حاصل کیا- آخر میں زیارت حرمین شریفین کے ولولہ نے سفر حجاز پر آمادہ کیا- مکۂ معظمہ پہنچے اور وہیں مقیم ہوگئے- چند سال کے بعد اس ارادہ سے ہندوستان آئے کہ اپنی والدہ ماجدہ کو بھی اپنے ساتھ لیجائیں اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف کرائیں لیکن جب وطن مالوفہ پہونچے تو والدہ معظمہ کا انتقال ہو چکا تھا- غالبًا اہلیہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا- اکلوتے فرزند کو جو شیخ نادر علی کے نواسہ تھے اعزا کے پاس چھوڑ کر پھر حرم محترم کو واپس چلے گئے اور تقریبا پچاس سال تک وہیں مقیم رہے- اپنی قوت بازو سے معاش حاصل کرتے تھے- آپ کو مہمان نوازی اور مساکین و فقرا کی خدمت کا شوق تھا- ہر سال حج ادا کرتے اور دربار حبیب خدا کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے تقریبا تمیں حج کیے اور مدینہ منورہ کی زیارت کی-

علامہ بلگرامی نے آپ کا ایک واقعہ 'مآثر الکرام' میں لکھا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تزکیہ باطن کی غرض سے وہ اپنے نفس کو ایک ادنی سی لغزش پر کیسی سخت سزا دیتے تھے- ایک دن باب السلام (حرم مکی) کے سامنے ایک ہندی درویش پر آپ کی نظر پڑی جو نہایت درجہ بد حال تھا- اس کو دیکھتے ہی آپ کو کراہت اور گھن آئی لیکن اسی وقت غیرت الٰہی کا عکس بھی دل پر پڑا- اسی وقت انہوں نے اپنے نفس کو ملامت کی کہ اپنے ہم جنسوں سے اس قدر نفرت اور گھن کیوں؟ بس اب اس کی سزا یہ ہے کہ ایک ہی برتن میں اس کثیف اور بد حال کے ساتھ کھانا کھاؤ- چنانچہ چالیس دن تک آپ نے اس شخص کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھایا-"

**شاہ یتیم صحرائیؒ قدس سرہ :** "گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے اکابر عارفین سے ہیں- محویت و استغراق کا غلبہ تھا- آبادی کے قریب قیام کرتے، لباس پھٹا ہوتا- امروہہ اور نواح کے اکثر باشندے آپ سے حسن عقیدت رکھتے اور یہ سمجھتے تھے کہ آپ جو کچھ زبان سے فرماتے ہیں وہی ہو جاتا ہے-

آپ کے مرشد کا نام شاہ مسکینؒ تھا جنکے پیر طریقت شاہ غریبؒ تھے اور ان کے شاہ مجنوں صحرائی انکے شاہ ذاکرؒ الملقب بہ سودائی جو شاہ ابو سعید بن نور الحقی الگنگوہیؒ کے ہم عصر تھے- مو خر الذکر دونوں حضرات شاہ نظام الدین تھانیسری ثم البلخیؒ متوفی ۱۰۳۵ھ سے مجاز طریقت تھے- آپ کا انتقال بوقت ملاقات حضرت شاہ عبد الہادیؒ نواح امروہہ کے جنگل میں ہوا اور اسی خانہ خس پوش میں بعد ادائے نماز دفن کیے گئے جہاں آپ بحالت حیات زمانہ صحو میں قیام فرماتے تھے- مزار مبارک لب سڑک داؤد سرائے وراہ عیدگاہ جانب شمال درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ کے قریب ایک مرتفع چبوترہ پر مختصر سی چہار دیواری میں ہے-"

**شاہ عبدالہادیؒ صدیقی قدس سرہ:** ''حضرت شاہ عبدالہادی صدیقی قدس سرہ کی ولادت ۱۴ رجب ۱۰۸۴ھ بروز بدھ ہوئی۔ سلسلہ نسب اکتیس واسطوں سے حضرت محمد بن ابی بکر صدیق سے متصل ہوتا ہے۔ آپ کے جد ششم مفتی محمد طاہر کو ۹۷۷ھ میں بعہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ موضع بوابور تھن پرگنہ دہام پور میں املاک مدد معاش عطا ہوئی تھی، اس تعلق سے مفتی موصوف کے بعض اخلاف نے موضع مذکور میں سکونت اختیار کرلی تھی لیکن کچھ مدت بعد شیخ عبدالسمیع نے، جو مفتی محمد طاہر سے چوتھی پشت میں ہوئے ہیں، پھر وطن آبائی کو واپس ہوئے اور امروہہ کو اپنا مسکن بنایا۔

آپ کے بچپن اور آغاز شباب کا زمانہ خاص حالات میں بسر ہوا، درسی اور مکتبی تعلیم بہت کم پائی، نو دس سال کی عمر میں ایک خاص واقعہ پیش آجانے سے تعلیم کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن آپ مکتب میں تنہا بیٹھے لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے کہ ایک درویش نے کھانے کی کوئی چیز منہ سے نکال کر آپ کو دی اور اس کے کھالینے پر اصرار کیا۔ آپ درویش کو دیکھ کر خوف زدہ تھے اس لیے اس چیز کو کھالیا۔ ایکدم سے درویش نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس چیز کا حلق سے اترنا تھا کہ آپ پر آثار جذب و وحشت طاری ہوگئے۔ مکتب چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور مسلسل تین چار روز لاپتہ رہے۔ تلاش و جستجو کے بعد تیسرے دن اس حالت میں ملے کہ لباس پارہ پارہ تھا، حواس غائب اور جذب و وحشت کے آثار غالب تھے۔ اس کے بعد سے معمول ہوگیا کہ دن بھر صحرا نوردی کرتے اور رات میں کسی وقت گھر آجاتے۔ عمر کے ۱۶ سال اسی حالت میں گزرے۔

آپ کے والد ماجد نے یہ سوچکر کہ شاید کسی شغل میں مصروف ہوجانے سے وحشت و جنون میں تخفیف ہوجائے آپکو بعض مواضعات پر غلہ کے اہتمام کی غرض سے چند ملازمین کے ساتھ بھیجدیا۔ یہ سال عام قحط کا تھا، کاشتکار بہت سقیم الحال تھے ان مصیبت زدوں کی حالت آپ سے نہ دیکھی گئی، کاشتکاروں کو بلاکر عام اجازت دیدی کہ اپنی ضرورتوں کے موافق غلہ لیجائیں اور اپنے نقصان کی مطلق پرواہ نہ کی۔ آپ کی ایسی لاپرواہی دیکھ کر والدین نے آپ کا عقد موضع سولاہتن پور پرگنہ دہام پور میں اپنے ہم جدی صدیقیوں میں کردیا۔ سنہ ۱۱۰۴ھ میں آپ کے والد بزرگوار بقضائے الٰہی فوت ہوگئے، لوگوں نے آپ کو ان کا جانشین کرنا چاہا مگر آپ کے قلب میں خداشناسی کا قوی جذبہ موجزن تھا تمام کاروبار دنیوی ترک کرکے صحرا نوردی اختیار کرلی۔

۴ رمضان المبارک یوم جمعہ ۱۱۹۰ھ قریب دوپہر آپ کا وصال ہوا اور جسم مطہر بمقام موضع کھائی کھیڑہ ضلع بریلی سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے بعد یکم شوال المکرم ۱۱۹۰ھ کو تابوت مبارک تمام اعزا و مریدین امروہہ لے

کر آئے اور ۸ر شوال سنہ مذکور کو بمقام امروہہ اپنے صاحبزادہ شیخ ظہور اللہ صدیقی کے باغ میں' جس میں آپ نے ایک عالیشان روضہ پہلے سے تعمیر کرایا تھا' آسودہ فرمائے گئے-"

**شاہ عبدالرسول قادریؒ:** "سادات اکبر آباد (آگرہ) سے تھے- آباواجداد عہد فرخ سیر میں مناصب شاہی پر ممتاز رہے- یہ خود بھی شاہی فوج سے منسلک اور صاحب منصب تھے، شعروشاعری کا ذوق بچپن سے تھا، نثار تخلص کرتے اور میر تقی میر سے اصلاح لیتے- صاحب تذکرہ "گارساں دی تاسی" لکھتے ہیں کہ:

"وہ نامی شاعر میر تقی میر کا دوست تھا، اسی کی صحبت میں اسے نظم کا شوق کیا، میر اس کو اصلاح دیتے تھے- آخر میں عشق مجازی کی داستان گوئی ترک کر کے عشق حقیقی کے مسلک پر گامزن ہوئے، سلسلہ قادریہ میں بیعت کی بقیہ عمر زہدوعبادت میں متوکلانہ اور مجردانہ بسر کی- دہلی کے قیام میں سادات امروہہ بالخصوص سید ابدال محمد بن سید منور (ساکن محلہ لکڑہ) سے مراسم اتحاد و یگانگت پیدا ہو گئے تھے- اسی تعلق سے امروہہ چلے آئے اور پھر یہاں سے باہر نہ گئے- سید ابدال محمدؒ نے جن کو آپ سے عقیدت وارادت تھی، موضع دہرہ آپ کے مصارف کے لیے نذر کیا تھا- شیخ مصحفی امروہوی کے عنفوان شباب میں شاہ صاحب کا قیام امروہہ میں تھا- مصحفی اکثر و بیشتر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے- وہ اپنے "تذکرۂ ہندی گویاں" میں لکھتے ہیں:

"میر سید عبدالرسول نثار مردیست جہاں دیدہ وفہمیدہ- اصلش
ازاکبر آباد است- فقیر اور ادر ابتدائے شاعری در قصبہ امروہہ دیدہ
بود- اکثر بعد ہفتہ وعشرہ ملاقات و تذکرۂ شعر بہ میاں می آمد-"

"گارساں دتاسی" نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میرؔ و مصحفیؔ دونوں آپ کے علم' ذہانت اور ذوق کی تعریف کرتے ہیں- سنہ وفات تحقیق نہو سکا البتہ ۹ر رمضان تاریخ وفات بتائی جاتی ہے- سید ابدال محمدؒ کی تعمیر کردہ مسجد کے گوشہ شمال ومشرق میں مدفون ہیں- آپ میر تقی میرؔ کے ارشد تلامذہ میں تھے- عبدالرسول نثار کے تلامذہ میں سید امیر حسن امیرؔ جنہوں نے مطلع الشمسین لکھی تھی بہت مشہور ہوئے جن کے خانوادے میں نصیر حسن شایاںؔ' نفیس حسن دتیمؔ' انیس حسن ہلالؔ' وحید حسن اخترؔ' سید شفیق حسن ایلیاؔ' رئیس امروہوی' محمد تقی صدرؔ اور جون ایلیا نے شاعری میں بڑا نام پیدا کیا- مولانا عبدالسلام نے "شعر الہند" میں نثار کی کئی غزلیں لکھی ہیں- مسجد ابدال محمد کے مرکزی در پر راقم الحروف نے ان کا یہ فارسی قطعہ تاریخ کندہ دیکھا ہے:

سید ابدال حامئ اسلام     مسجد ساختہ است عرش مماس



روضہ شاہ عبدالہادی صدیقیؒ ............ متصل محلّہ قریشی



درگاہ شاہ عبدالہادی صدیقیؒ ............ متصل مزار



روضہ شاہ گھاسیؒ ........ نزد پانواڑی تالاب



مزار حاجی حرمینؒ سہروردی ........ متصل مزار شاہ اعزالدینؒ

سال تاریخ او خرد گفتہ        خانۂ کعبہ را نہادہ اساس

سنہ ۱۱۴۱ھ

نثارؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن        منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن
واں گل رکھے پھرے ہے دستار پر تو اپنے        یاں عاشقوں کے سر پر پڑتے ہیں سنگ تجھ بن
ہر سمت صد تمنا تڑپے ہیں خاک و خوں میں        ہے صحن خانہ میر امیدان جنگ تجھ بن

-------

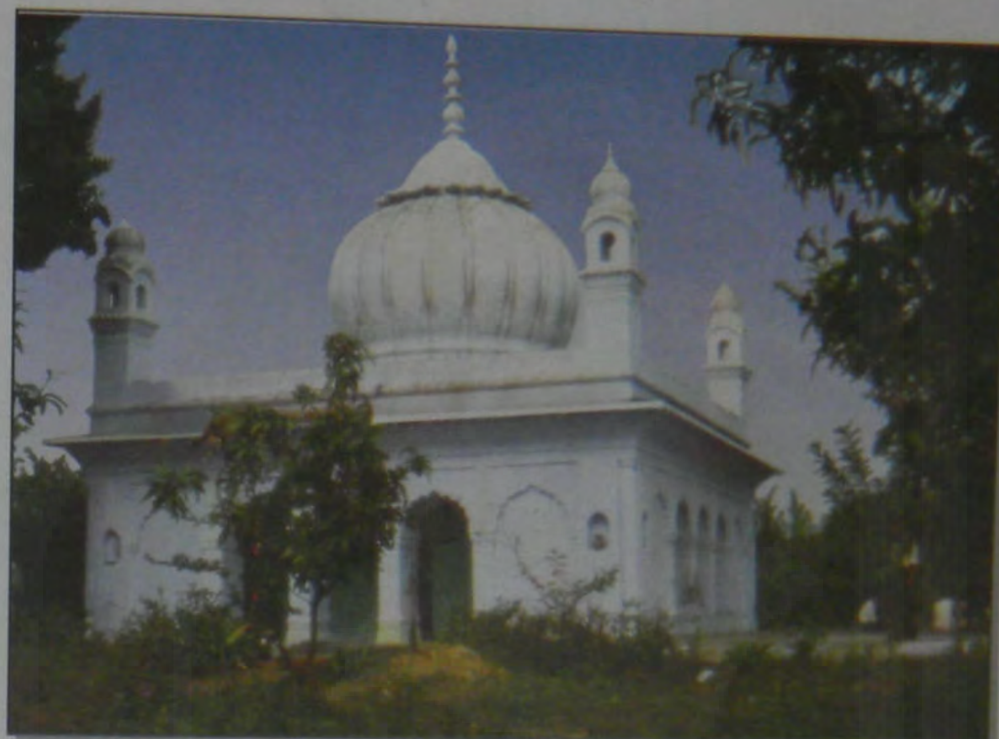
اکثر ہیں دل فگار و لیکن نہ اسقدر        اکثر ہیں بیقرار و لیکن نہ اسقدر
سونپا ہے تو نے قتل مر اغیر کے تئیں        ہوں تو گناہ گار و لیکن نہ اسقدر
گھر بار، جان و مال میں اس پر لٹا دیا        کرتے تو ہیں نثار و لیکن نہ اسقدر

------

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم        یہ گریباں دامن صحرا کو دکھلا دیں گے ہم

**سید عبدالغنی شاہؒ:** "اواخر بارہویں صدی کے صاحب کشف و کرامت اور سکھ گردی کے دنوں میں امروہہ کے صاحب خدمت کامل الوجود بزرگ تھے - خاندان کا حال معلوم نہ ہو سکا، نسباً سید مشہور ہیں - ۱۷۹[illegible] میں جب سکھوں کی لوٹ مار سے ان اطراف میں بد نظمی پھیلی ہوئی تھی، ہر شخص حفاظت جان و مال کے لیے پریشان حال تھا آپ کی دعا سے اہل شہر محفوظ رہے - سنہ ۱۲۰۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا - مزار شاہراہ دہلی پر ایک بلند مقام پر واقع ہے -"

**شاہ معزالدینؒ معروف بہ میاں موج:** "آپ شاہ عضدالدین محمد جعفریؒ کے فرزند تھے - پدر بزرگوار کی صحبت بافیض و برکت میں علوم ظاہری و باطنی سے مستفیض ہوئے - آپ کے خوارق عادات (معجزے) بہت مشہور ہیں - آپ کے ابتدائی زمانہ میں اسلامی سلطنت کے بجائے برطانوی تسلط قائم ہو رہا تھا - لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش موجزن تھی کہ غیر ملکی سلطنت زائل ہو کر پھر قومی حکومت قائم ہو، بعض اشخاص نے آپ سے کہا کہ حضرت دعا فرمائیں کہ موجودہ سلطنت کو زوال ہو - آپ نے فرمایا کہ یہ سلطنت اس وقت تک رہے گی جب تمام زمین پر لوہے کا جال بچھ جائیگا - یہ اشارہ ریلوے لائن اور تار سے تھا حالانکہ اس وقت ہندوستان میں نہ



روضہ شاہ گھاسیؒ ........ نزد پانواڑی تالاب



مزار حاجی حرمینؒ سہروردی ........ متصل مزار شاہ اعز الدینؒ

سال تاریخ او خرد گفتہ خانۂ کعبہ را نہادہ اساس
سنہ ۱۱۳۱ھ

نثار کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

تک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن
واں گل رکھے پھرے ہے دستار پر تو اپنے یاں عاشقوں کے سر پر پڑتے ہیں سنگ تجھ بن
ہر سمت صد تمنا تڑپے ہیں خاک و خوں میں ہے صحن خانہ میرا میدان جنگ تجھ بن

-------

اکثر ہیں دل فگار ولیکن نہ اسقدر اکثر ہیں بیقرار ولیکن نہ اسقدر
سونپا ہے تو نے قتل مرا غیر کے تئیں ہوں تو گناہ گار ولیکن نہ اسقدر
گھربار، جان و مال میں اس پر لٹا دیا کرتے تو ہیں نثار ولیکن نہ اسقدر

------

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم یہ گریباں دامن صحرا کو دکھلاویں گے ہم

**سید عبدالغنی شاہؒ:** "اواخر بارہویں صدی کے صاحب کشف و کرامت اور سکھ گردی کے دنوں میں امروہہ کے صاحب خدمت کامل الوجود بزرگ تھے- خاندان کا حال معلوم نہ ہو سکا، نسباً سید مشہور ہیں- ۱۱۸۶ھ میں جب سکھوں کی لوٹ مار سے ان اطراف میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، ہر شخص حفاظت جان و مال کے لیے پریشان حال تھا آپ کی دعا سے اہل شہر محفوظ رہے- سنہ ۱۲۰۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا- مزار شاہراہ دہلی پر ایک بلند مقام پر واقع ہے-"

**شاہ معزالدینؒ معروف بہ میاں موج:** "آپ شاہ عضدالدین محمد جعفریؒ کے فرزند تھے- پدر بزرگوار کی صحبت بافیض و برکت میں علوم ظاہری و باطنی سے مستفیض ہوئے- آپ کے خوارق عادات (معجزے) بہت مشہور ہیں- آپ کے ابتدائی زمانہ میں اسلامی سلطنت کے بجائے برطانوی تسلط قائم ہو رہا تھا- لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش موجزن تھی کہ غیر ملکی سلطنت زائل ہو کر پھر قومی حکومت قائم ہو، بعض اشخاص نے آپ سے کہا کہ حضرت دعا فرمائیں کہ موجودہ سلطنت کو زوال ہو- آپ نے فرمایا کہ یہ سلطنت اس وقت تک رہے گی جب تمام زمین پر لوہے کا جال بچھ جائیگا- یہ اشارہ ریلوے لائن اور تار سے تھا حالانکہ اس وقت ہندوستان میں نہ

ریل کا کوئی وجود تھا نہ ٹیلیگراف کا، صاحب انوار العارفین کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت شاہ مکمل مراد آبادی سے ایک مرتبہ فرمایا کہ تمہارے یہاں جو فرزند پیدا ہوگا آدھا تمہارا ہوگا اور آدھا ہمارا چنانچہ شاہ مکمل کے فرزند حضرت غلام نبی کی یہی حالت رہی کہ چھ ماہ حالت جذب میں رہتے اور چھ ماہ حالت سلوک میں۔

طبیعت بڑی موزوں پائی تھی' بعض ہندی نظمیں آپ سے منسوب ہیں جو قوال گاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ کے فرزند شاہ بدرالدین پیدا ہوئے تو آپ نو مولود کو گود میں لیکر ہندی میں یہ فرماتے جاتے اور بچے کو بلاتے جاتے:

"تم کون ہو میاں کہاں کے ہو' تم کون ہو میاں کہاں کے
ہو اس نگری میں آئے تو موج پیا کا سکھ دیکھو' کچھ ایسی کرنی نا
کیجیو جو یہاں کے ہو نہ وہاں کے ہو' تم کون ہو میاں کہاں
کے ہو"

آپ کا وصال ۷ اشوال سنہ ۱۲۰۰ھ کو ہوا۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ شاہ مسیح الدین مجذوب تھے بارہ برس تک ایک کوٹھری میں معتکف رہے دوسرے شاہ بدرالدین عارف کامل اور عالم تبحر ہوئے۔"

**حاجی غلام علی شاہؒ:** "حضرت حافظ موسیٰ مانکپوری قدس سرہ سے بیعت تھے۔ ریاضات و مجاہدات سے مرتبہ کمال پر پہنچے، بڑے عابد و زاہد تھے۔ مسجد چلہ میں طالبین کو ذکر جہر (بلند آواز سے اللہ اکبر' اللہ اکبر کہنا) کی تلقین کرتے، اس زمانے میں امروہہ کے شرفا و سادات کے متعدد اشخاص صوفیانہ لباس پہنے حلقہ میں شامل ہوتے، اس وقت مسجد کے در و دیوار سے اللہ اللہ کی آواز بازگشت دور دور تک سنائی دیتی۔ ۳ر جمادی الاول ۱۲۵۳ھ کو وصال ہوا۔ مسجد چلہ کے عقب میں اندرون باغیچہ مزار واقع ہے۔"

**مولانا سید امانت علی چشتیؒ قدس سرہٗ:** "مولانا سید حفیظ اللہ بن سید عزیز اللہ کے فرزند تھے' بزرگوں کا وطن سنبھل تھا، مولنا کے والد کسی تعلق سے امروہہ چلے آئے تھے۔ عنفوان شباب میں اکتساب علوم باطنی کا شوق ہوا تو مراد آباد میں سید محمد حسین شاہ سرہندی سے فیض اٹھایا' پھر انکے خلیفہ کا مگار خاں سے فیض صحبت حاصل کرتے رہے۔

مولنا موصوف اپنے زمانہ میں خانوادہ چشتیہ کے امام اور شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ آپ نے

درویشوں اور صوفیوں کی نہ کبھی وضع اختیار کی اور نہ تصوف کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا... پنجاب اور کشمیر میں مرید بکثرت تھے- نذر اور تحفہ میں جو کچھ آتا وہ سب مہمانوں، تنگدستوں اور مسکینوں پر صرف کر دیتے- آپ کے تین فرزند ہوئے، حکیم سید انوار الحق، حافظ سید اسرار الحق و مولوی سید اظہار الحق-۱۹؍ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی، مزار حاجی والے باغ میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے روضہ سے متصل ہے-"

**شاہ قیام الدینؒ جعفری:** "آپ شاہ بدر الدین کے فرزند اور سالک مجذوب تھے- ابتدا میں جذب کی کیفیت زیادہ غالب تھی- بارہ برس تک اسی حالت میں رہے، گھر سے باہر نکلنا بھی ترک ہو گیا تھا- اس کے بعد اکثر اوقات سلوک میں رہتے، لیکن مرید بنانے سے بہت بچتے جو زیادہ اصرار کرتا اپنے صاحبزادے میاں سعید الدین سے بیعت کرا دیتے- کشف و شہود اس درجہ صاف اور پاک تھا کہ ہر مرید و معتقد کے دلی خیالات اور مرادوں کو بغیر بیان کیے خود ہی بتا دیتے تھے مگر اس طرح نہیں جیسے کوئی نجومی یا رمال بتاتا ہو بلکہ باتوں باتوں میں اس کے خیال اور سوال قلبی کا جواب عطا فرما دیتے- آپ کے بڑے صاحبزادے میاں سعید الدینؒ بھی سالک تھے-"

**شاہ بہاالدین نقشبندیؒ:** "شاہ بہاالدین خلف شاہ امین اللہ نقشبندی سنہ ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوئے- گیارہ برس کی عمر میں آپ کے والد محترم نے رحلت کی- پیری مریدی کا سلسلہ آپ کے خاندان میں کئی پشتوں سے برابر چلا آتا تھا- والد بزرگوار کے انتقال کے چند سال بعد علوم ظاہری کی تکمیل کا خیال ترک کر کے علوم باطنی کی تحصیل میں مشغول ہوئے- اٹھارہ انیس سال کی عمر میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن شاہ جہانپوری کے مرید و خلیفہ حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے-

مدۃ العمر خلق خدا کی خدمت اور پیری مریدی کرتے رہے- ہندوستان میں چند ہی اضلاع ایسے ہوں گے جہاں آپ کے مرید و معتقد موجود نہ ہوں- آپ نے اپنی عمر میں ۷ ۳ مرتبہ حج و زیارت کی- آپ نے مکہ مکرمہ میں ایک مکان خرید کر چند سال اس بلدۂ طیبہ میں اقامت گزین رہے- آپ کے پانچ بیٹے ہوئے- بڑے فرزند حکیم علاء الدین مکہ معظمہ میں مطب کرتے تھے- دوسرے فرزند شاہ ضیاء الدین احمد، جن کی ولادت تقریباً ۱۳۰۳ھ کی ہے، بچپن میں مکہ معظمہ میں رہے- ہندوستان آ کر فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی پھر نقشہ نویسی کا کام سیکھا اور ریاست الور بے پور میں بسلسلہ ملازمت قیام رہا اور اسی دوران میں کتاب "مراۃ الانساب" تالیف کی-" آپ کے فرزندوں میں شہاب الدین احمد مولوی فاضل، نوجوان، موزوں طبع تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا- آپ کا یہ

شعر ملاحظہ ہو:

دیوانے ہیں جو زینت عالم پہ فدا ہیں ہوشیار وہی ہیں کہ جو مرتے ہیں عدم پر

**حافظ عباس علی خاںؒ:** حافظ عباس علی خاںؒ بن محمد دلدار علی خان سنہ ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ابتدا میں قرآن پاک حفظ کیا اس کے بعد فارسی و عربی حسب ضرورت پڑھی' شرح ملا جامی تک پڑھنے پائے تھے کہ والد بزرگوار کے انتقال سے سلسلہ تعلیم درہم برہم ہو گیا۔

غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے کئی سال بعد آپ حالت جذب میں مولانا سید فخرالدین احمد المعروف بہ حکیم بادشاہ الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ رفیع الزماں قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ قادریہ سہروردیہ نیز سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں مرید ہوئے۔ایک عرصہ تک حاضر خدمت رہ کر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے پھر وطن آکر تقریباً باون برس تک عبادت الٰہی اور طالبان حق کی رہنمائی میں مصروف رہے۔۶ر رمضان سنہ ۱۳۲۴ھ میں رحلت فرمائی اور اپنے جد امجد درویش علی خان کے روضہ سے متصل مدفون ہوئے۔آپ کے لائق فرزند مولانا احمد حسین خاں نے ۱۳۳۱ھ میں خانقاہ و مسجد بنوائی اور ایک وسیع باغ بھی لگایا جو مسجد اور عرس کے مصارف کے لیے وقف ہے۔ہر سال ماہ بیساکھ میں آپ کا عرس ہوتا ہے۔

**پناہ شاہ:** "تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں امروہہ کے صاحب خدمت تھے' عالم استغراق اکثر طاری رہتا تھا۔نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو سمت قبلہ کی کوئی تخصیص نہ ہوتی، جدھر چاہتے منہ کر کے کھڑے ہو جاتے۔ حالت صحو میں آتے تو حاضرین سے بخندہ پیشانی پیش آتے تھے۔آپ کا مزار لب سڑک دہلی متصل مزار شاہ عبدالغنی ہے۔"

**گنڈار شاہ:** "آپ کا مزار محلہ نوبت خانہ میں حضرت شیخ الصوفیہ سید احمد گنج رواں کے مزار کے قریب ہے۔گنڈار شاہ مجذوب اور وارفتہ حال تھے۔روایت ہے کہ جذب کی حالت میں جو پیشن گوئی کرتے، وہی واقع ہوتا۔غدر سنہ ۱۸۵۷ء سے کئی ماہ پہلے سے کہا کرتے 'اب ہوا بگڑ گئی' تقریباً سنہ ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا"

**نبو شاہ:** "نبو شاہ کا مزار احاطہ درگاہ شاہ عزالدین سہروردیؒ میں، بجانب جنوب و مشرق ایک گوشہ میں واقع ہے۔آپ کا مزار عوام میں بہت مشہور ہے۔خاندان سادات عقیلی ساکنان محلہ مولانا' اولاد سید رکن الدین عقیلی سے تھے۔دنیا ترک کر کے سید اعزالدین سہروردیؒ کے مزار پر جا بیٹھے اور چالیس سال تک اسی طرح آزادانہ

مجردانہ بسر کئے۔اس اثنا میں نہ کبھی شہر میں آئے اور نہ کسی چیز کے طالب ہوئے۔درویش صاحب جذبہ اور وارفتہ حال بزرگ تھے۔عمر نوے ۹۰ سال سے زائد ہوئی جس مقام پر حالت استغراق میں بیٹھے رہتے تھے وہی آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔"

-☆-

## علماء و فضلا

**قاضی نظام الدین قریشیؒ:** "آپ امروہہ، نگینہ، سودھرہ (پنجاب) اور محمود آباد اودھ کے صدیقیوں کے مورث اعلیٰ ہیں۔آپ کا سلسلہ نسب قاضی جلال الدین بخاری کے واسطے سے حضرت محمد ابن ابی بکر صدیق سے متصل ہوتا ہے۔آپ کے اجداد میں قاضی جلال الدین کا شمار بلبنی عہد کے اکابر فضلاء میں ہوتا ہے۔سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارہ سے ہندوستان آئے۔قاضی نظام الدین سلطان فیروز شاہ خلجی کے عہد میں امروہہ کے قاضی مقرر ہوئے۔آپ کی اولاد میں صرف قاضی محمد کی نسل باقی ہے۔ہمایوں کے عہد میں اودھ میں آپ کے خاندان میں جاگیر ملی۔تعلق داران محمود آباد بھوامؤ وغیرہ ہیں۔"

**قاضی امیر علیؒ:** "قاضی سید امیر علی حضرت سید شرف الدین شاہ ولایت کے بڑے بیٹے تھے۔عہد تغلق میں آپ امروہہ کے عہدہ قضا پر مامور ہوئے۔سنہ ۷۴۱ھ میں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ امروہہ آیا تو آپ ہی نے اس کی ضیافت کی تھی جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں بھی کیا ہے۔آپ کی اولاد میں علمائے شریعت اور مشائخ طریقت ہوتے رہے۔آپ کے فرزند سید اشرف جہانگیر الملقب بہ شرف الدین شاہ ولایت ثانی، نیز آپ کے پوتے سید عمر زندہ پیر بن سید خادم جن کی اولاد نے قصبہ اغوانپور میں بودوباش اختیار کرلی اور جائے سکونت کو 'سرائے فاروق' کے نام سے موسوم کیا۔نیز عمدۃ الواصلین سید عبدالحکیم مرید و خلیفہ قطب الاقطاب حضرت شاہ عبدالمجید علویؒ آپ کے فرزند سید محمد کی نسل میں ہوئے۔"

**سید محمد میر عدل:** "سرزمین امروہہ کے عظیم فرزند سید محمد میر عدل کا نام برصغیر کی نامور شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔مختلف تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد میر عدل عہد اکبری میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے اور آخر میں بھکر (جن میں آج کے پنجاب کے بہت سے اضلاع بھی شامل تھے) کے گورنر مقرر ہوئے۔محمود احمد عباسی اپنی تالیف 'تذکرۃ الکرام' میں سید محمد میر عدل کے متعلق فرماتے ہیں "نقادہ دودمان سیادت،

باعث افتخار سلف و خلف، عہد اکبری کے مشاہیر علما و فضلاء اور ارا کین سلطنت سے تھے- سلسلہ نسب چند واسطوں سے سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ سے متصل ہوتا ہے- بایں طریق سید محمد میر عدل بن سید ملتجب ثانی بن سید بدھ بن سید چاند بن سید راجے بن سید عزیز اللہ بن سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ-

اوائل عہد اکبری میں علماء کی بڑی قدر و منزلت تھی- میر سید محمد بھی تقریباً سنہ ۹۶۶ھ میں بیرم خاں خان خاناں کی وساطت سے دربار اکبری میں پہنچے، تھوڑے ہی عرصے میں اہل دربار اور خود شہنشاہ اکبر پر اپنے تبحر علمی کا سکہ جمادیا- شاہی دربار میں پہنچکر اپنی خداداد قابلیتوں اور گوناگوں اوصاف کو کام میں لانے کے بہت سے مواقع ملے- وہ اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو کر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچے- ملازمت بھی اگرچہ آخر حصۂ عمر میں اختیار کی تھی لیکن بایں ہمہ انکا تبحر علمی، انکا زہد و تقویٰ، انکا تدین، ان کی راست بازی، انکا بے لاگ انصاف، ان کی شجاعت' انکی شہامت، انکا تدبر، ان کی حمیت دین، انکا اختصاص اور علوے مرتبت حاصل ہوگیا اور وہ سنہ ۹۸۱ھ میں 'میر عدل' کے اعلیٰ منصب پر مامور ہوئے'

اس زمانے میں اکبر کے مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا ہو رہا تھا، علامہ ابوالفضل و فیضی کی رسائی دربار شاہی میں ہوچکی تھی، آزاد خیالی کا دور دورہ تھا، علما کی سخت گیری سے طبیعتیں بیزار تھیں- میر صاحب کی دربار میں موجودگی آزاد خیالوں کے لیے مانع اظہار خیال کی جاتی تھی شاید اسی لیے بادشاہ نے صوبہ بھکر کی گورنری پر یہ کہکر انہیں نامزد کیا کہ ملک کا کنارا ہے، قندھار اور ایران سے پہلو لگتا ہے اور آپ کے سوا کسی دوسرے پر اطمینان نہیں- آپ کو صوبہ سندھ کی زمام حکومت ہاتھ میں لیے دوسرا ہی سال تھا کہ کاروبار کی مصروفیت، آب و ہوا کی ناموافقت، گرمی کی حدت سے کچھ سوز مزاجی ہوئی- فصد لی، خون زیادہ آیا جس سے ضعف بہت زیادہ عارض ہوا- فصد لینا ہی بہانہ موت ہوگیا اور آٹھویں شعبان ۹۸۵ھ کو یہ آفتاب علم و فضل ہندوستان کے مغربی حصہ میں غروب ہوگیا- بھکر کے پرانے قلعہ میں جسم خاکی سپرد خاک ہوا-"

**ملا امان اللہؒ:** آپ سید اسمٰعیل کے بیٹے تھے اور آپ کا شمار عہد اکبری کے فضلاء میں ہوتا تھا- آپ عالم اور ولی تھے- مطابق تاریخ "ذکائی" شہنشاہ اکبر اعظم کے استاد تھے اور وہ بھی آپ سے عقیدت رکھتا تھا- آئینِ اکبری میں زمرۂ اولیا میں آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے- امروہہ میں چاہ ملا امان آپ ہی کے نام سے موسوم ہے-

(از شجرات سادات بڑیگاؤں)

**مولانا سید اشرف دانشمند:** "آپ سید سعید خاں کے فرزند تھے-سلسلہ نسب بواسطہ سید عبداللہ زربخش جو سلطان مسعود بن سلطان محمود کے زمانے میں خراسان سے ہندوستان آکر نواح لاہور میں مقیم ہوئے سید موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی سے متصل ہوتا ہے- سید عبداللہ زربخش کے اخلاف میں کچھ لوگ جونپور اور صوبہ بہار میں متوطن ہوئے-ان میں سید خیرالدین جونپور سے نٹھور ضلع بجنور میں آکر مقیم ہوئے- سید خیرالدین مذکور کے پوتے چارواسطوں سے سید اشرف ہوئے جو نٹھور سے ابتدائے جہانگیری میں امروہہ آئے-عالم متجر اور فاضل کامل دانشمند کے لقب سے ملقب تھے جو اس زمانہ کی اصطلاح میں عالم متجر کے لیے استعمال ہوتا تھا-امروہہ آکر درس وتدریس اور فتویٰ نویسی کا شغل رہا-۲۰/ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ کو ایک تحریر میں اس امر کے متعلق مسئلہ شرعی بیان کیا کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے نکاح کر لے تو اولاد غلام ہوگی یا آزاد' فرماتے ہیں:

"اگر از حرہ فرزندے حاصل شدہ باشد دپدر او اگرچہ عبدکسے باشد آں فرزند حکم مادر وارد"

سنہ ۱۰۴۶ھ میں بیرون حصار قدیم اس مقام پر جہاں محلہ دانشمندان واقع ہے سکونت کے لیے مکان تعمیر کیا مادہ تاریخ "دارالخیر" یادگار ہے-سنہ ۱۰۸۷ھ میں آپ کا وصال ہوا-"

**مولانا سید ضیف اللہ کاظمی نقشبندی مجددیؒ:** "آپ مولانا سید سیف اللہ بن سید محمد اشرف کے بیٹے تھے-آپ کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے-تقریباً سنہ ۱۱۴۵ھ میں ولادت ہوئی-بچپن ہی میں والدین کے ساتھ دہلی سے امروہہ آئے-ان کے جدامجد مولوی سید محمد اشرف' احمد شاہ ابدالی کے منصب دار' ذی علم' صوفی منش اور مولانا حاجی سید محمد اعتمادالدین دہلوی چشتی قادری کے مرید تھے اور ان کے والد مولانا سید سیف اللہ آخرالذکر بزرگ کے داماد اور مرید تھے-۱۱۶۵ھ میں وفات پائی اور مسجد محلہ کنکوئی کے سامنے چبوترہ پر مدفون ہوئے...... حضرت مولنا شاہ ضیف اللہ نے علوم دینیہ کی ابتدائی تعلیم اور سلسلہ چشتیہ قادریہ میں بیعت پدر بزرگوار سے حاصل کی پھر دہلی میں اکابر علماء سے حدیث وتفسیر وفقہ کی تکمیل کی، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ دہلوی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے،اور کمالات باطنی سے آراستہ ہوکر خلافت سے مشرف ہوئے-امروہہ واپس آکر اپنے مکان اور مزار پدر بزرگوار کے متصل ایک مسجد تعمیر کی اور اسکے شمال میں اپنی اقامت کے لیے خانقاہ بنائی اور مسافر خانہ تعمیر کیا-

حضرت شاہ صاحب اعلیٰ درجہ کی روحانیت کے مالک سراپائے نور صاحب جلال و جمال و طہارت ظاہری و باطنی میں بے مثال، نہایت قانع اور متوکل بزرگ تھے - آپ کے علم و فضل اور کمالات باطنی کا شہرہ سن کر نواب فیض اللہ خان والی رامپور نے آپ سے رامپور میں قیام فرمانے کی خواہش کی، جاگیر و وظیفہ مقرر کرنا چاہا مگر آپ نے فقر و توکل کی مسند چھوڑ کر دربار امرا کی حاضری پسند نہ فرمائی - ۹؍رجب ۱۲۴۰ھ کو بوقت عصر بحالت سجدہ وصال ہوا - اپنی خانقاہ کے صحن میں اندرون احاطہ مدفون ہوئے - ایک معتقد کائستھ نے مصرعہ تاریخ کہا -

ندا آمد کہ شد ضیف الٰہی ۱۲۴۰ھ"

**مولوی سید محمد سیادت:** "آپ مولوی سید محمد عبادت بن سید محمد نجابت بن سید شفاعت فاضل خوش استعداد تھے - سنہ ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی جو فرقہ شیعہ کے امروہہ میں اولین پیش نماز اور ذی استعداد، عالم تھے - کچھ عرصے تک مولانا شاہ ضیف اللہ نقشبندی مجددی (محلہ کٹکوئی) سے بھی تعلیم پائی پھر لکھنؤ جاکر مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کے فرزند سید محمد مجتہد نیز دیگر علمائے شیعہ سے اخذ علوم کیا - کتب طب کا بھی بڑا وسیع مطالعہ تھا - آپ کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں اس کے صفحہ کے صفحہ ازبر تھے - آپ انتہائی درجہ متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار تھے - فتویٰ قلم برداشتہ لکھتے - بیوگان کے نکاح کے لیے جو اس زمانے میں امروہے کے شرفا معیوب سمجھتے تھے آپ نے عدت کے بعد عقد ثانی کو جائز قرار دیا - آپ بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار تھے - سنہ ۱۲۶۵ھ میں وفات پائی - مسجد شفاعت پوتہ سے ملحق جانب جنوب مدفون ہوئے - سید محمد عسکری اور سید محمد حسن دو فرزند یادگار چھوڑے دونوں عالم فاضل ہوئے -"

**مولوی سید فضل اللہ خاں:** "آپ پیر اسر ار احمد ملھو کے فرزند تھے - ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی - آپ کے والد ریاضی کے ماہر اور ادبیات فارسی کے مشہور عالم تھے - ابتدائی تعلیم کے بعد مولوی سید فضل اللہ نے رامپور جاکر مولانا سید حیدر علی رامپوری سے علوم دینیہ خصوصاً حدیث و تفسیر کی تکمیل کی اور امروہہ آکر درس و تدریس میں مصروف ہوگئے - اسی دوران نواب وزیر الدولہ بہادر ٹونک نے آپ کے استاد مولانا سید حیدر علی کو ٹونک بلالیا - اس کے بعد مولانا سید حیدر علی نے سید فضل اللہ کو بھی ٹونک بلالیا جہاں آپکو نواب صاحب کے صاحبزادوں کا اتالیق مقرر کیا گیا - نواب محمد علی خاں آپ ہی کی تربیت سے فیضیاب

ہوئے- جب نواب محمد علی خاں مسند نشین ہوئے تو انہوں نے اپنے استاد سید فضل اللہ کی غیر معمولی قدر افزائی کی- خطاب خانی کے ساتھ ساتھ بہت کچھ عطا کیا گیا اور مفتی شہر سے مفتی اعظم مقرر ہوئے- نواب صاحب اپنے استاد کا انتہائی ادب واحترام کرتے تھے- جب کبھی مولوی فضل اللہ امروہہ جاتے تو واپسی پر نواب موصوف خود بناس ندی تک استقبال کو تشریف لاتے اور اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر قیام گاہ تک پہنچاتے تھے- کبھی مولوی صاحب دربار میں چلے جاتے تو نواب صاحب مسند چھوڑ کر ان کو اپنی جگہ بٹھاتے اور خود مسند کے کونے پر بیٹھ جاتے تھے- نواب محمد علی خاں تین سال حکومت کرنے کے بعد معزول کیے گئے اور ابراہیم علی خاں مسند نشین ہوئے لیکن مولوی فضل اللہ کو اپنے عہدوں پر بدستور ممتاز رکھا لیکن اسی سال آپ نے وفات پائی اور ٹونک ہی میں مدفون ہوئے-"

**مولوی سید محمد عسکری:** "خلف سید محمد سیادت جامع علوم تھے- سنہ ۱۲۳۲ھ میں آپ کی ولادت ہوئی- ابتدا میں اپنے والد بزرگوار سے پڑھا- پھر لکھنؤ جا کر مولانا سید محمد اور آقا سید حسین عرف میرن صاحب مجتہدین کے حلقہ درس میں رہ کر عرصہ تک تحصیل علوم میں مصروف رہے- امروہہ آکر والد بزرگوار کے جانشین ہوئے- مجاز امامت اور صاحب نیابت مجتہد، نہایت کم گو، عبادت گزار عالم تھے- علم ہیئت وہندسہ سے خوب واقفیت اور علاج امراض میں کافی مہارت تھی- سنہ ۱۲۸۹ھ کو ۵۷ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی-"

**مولوی سید محمد حسین جعفری:** "مولوی سید محمد حسین بن سید غلام حسین سنہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے- جامع علوم عالم تھے- رامپور میں مولانا محمد علی منطقی کے درس میں درسیات ختم کیں- امروہہ آکر شوقین طلباء کو پڑھانا شروع کیا تو آپ کے درس کی بہت شہرت ہوئی- مولانا سید احمد حسن محدث' مولانا سید رافت علی اور مولانا آل حسن نخشی مصنف "نخبۃ التواریخ" نے بھی ابتدائے عمر میں آپ ہی سے پڑھا تھا- امروہہ کے مشہور اطباء حکیم حکمت اللہ سید ابن حسن' حکیم عبدالسلام یہ سب آپ ہی کے شاگرد تھے- طب کی کتابوں پر حاوی اور معقولات نیز ریاضیات میں ممتاز تھے- سرکاری مدرسہ عربی فارسی سہارنپور کے مدرس اول بھی رہے- اس کے بعد گورنمنٹ نظام کی جانب سے صوبہ اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے- وہاں سے آنے کے بعد ڈپٹی امداد العلی نے اپنے مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں بہت قدردانی اور اصرار کے ساتھ بلایا تو وہاں بھی درس دیتے رہے- ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی اور متصل مزار شاہ ولایتؒ مدفون ہوئے-"

**داد علی عباسی:** ”مولوی سید داد علی بن ہدایت علی عباسی تقریباً سنہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے- ابتدا میں رامپور میں مولوی سید غلام نبی رامپوری سے علوم دینیہ کی اور حکیم محمد کفایت اللہ خاں امروہوی سے طب کی تعلیم حاصل کی- فارغ التحصیل ہو کر ابتدا میں مہاراجہ گوالیار کے یہاں طبیب کی حیثیت سے ملازمت کی پھر اسی ریاست میں جھانسی کے، جب کہ یہ علاقہ ریاست گوالیار میں شامل تھا، مددگار صوبہ مقرر ہوئے- آپ کے ماموں شیخ کریم بخش عباسی، جن کا تعلق ملازمت بتوسط حضرت شاہ خاموشؒ شمس الامرا امیر کبیر رفیع الدین خاں بہادر کے علاقہ میں ہو گیا تھا- ضیق النفس کے مرض میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے مولوی صاحب کو حیدر آباد طلب کیا- رخصت منظور نہ ہونے پر مستعفی ہو گئے- شیخ صاحب تو امروہہ آگئے- مگر مولوی صاحب حیدر آباد پہنچے اور سنہ ۱۲۸۲ھ سے وکالت شروع کر دی- صبح نو بجے تک مطب کرتے پھر وکالت- سہ پہر کو بعض شوقین طلباء کو درس بھی دیتے تھے-

مولوی سید داد علی عباسی حافظ کلام پاک، متقی و متورع تھے- سنہ ۱۳۱۲ھ میں وفات پائی- افسر الاطبا حکیم سید احمد سعید امروہوی آپ کے پھوپی زاد بھائی تھے- زوجہ اولیٰ حافظ عزت اللہ عباسی کی دختر تھیں- عقد ثانی حیدر آباد دکن میں کیا- آپ کی کوئی اولاد زندہ نہ رہی-“

**مولانا حکیم محمد حسن:** مولانا حکیم محمد حسن شیخ کرامت علی کے فرزند سنہ ۱۲۴۹ھ کو پیدا ہوئے- آپ کا تاریخی نام خورشید الزماں ہے- آپ بڑے زاہد و عالم اور طبیب تھے- علم طب حکیم امام الدین دہلوی سے حاصل کیا تھا- فلسفہ مشائیہ اور علم عقلیہ کی تعلیم مولانا فضل حق خیر آبادی سے حاصل کی اور تفسیر و فقہ میں مفتی صدر الدین دہلوی کے شاگرد تھے- کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج اجمیر میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے- ۳۹ سال آپ کا قیام اجمیر میں رہا- علم تصوف سے آپ کو خاص لگاؤ تھا- توریت و انجیل کا گہرا مطالعہ کیا تھا- آپ نے توریت و انجیل اور زبور کے دیدوں سے آنحضرت صلی اللہ وسلم کے ظہور کے متعلق پیشن گوئی ثابت کی ہے- حکمت میں بھی آپ کا اعلیٰ مقام تھا- مہارانا اودے پور میواڑ کے طبیب خاص تھے- ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ کو آپ نے وفات پائی-“

**مولوی سید محمد احسن:** ”سید محمد احسن بن سید مردان علی ساکن محلہ شاہ علی سرائے سنہ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم مولوی سید محمد حسین جعفری اور مولوی سید رافت علی نقوی سے حاصل کی- مولانا حکیم

محمد حسن محلہ ملانہ سے طب اور منطق کی کتابیں پڑھیں-امروہہ کے سرکاری مدرسہ میں مدرس رہے- پھر وائسرائے کے باڈی گارڈ رہے بعدازاں ڈیڑھ دون میں عرصہ تک میر منشی کے عہدے پر فائز رہے-ریاست بھوپال میں ملازمت کے تعلق سے قیام رہا- عمر کے آخری حصہ میں جماعت احمدیہ میں داخل ہوئے اور احمدی مشرب کی تبلیغ کرتے رہے،اس مقصد میں چند کتب بھی تصنیف کیں-مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات کے بعد احمدی جماعت دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی-ایک قادیانی جماعت اور دوسری لاہوری جماعت- آخر عمر میں امروہہ میں رہے- قادیانی مشن کی جانب سے گھر بیٹھے تنخواہ برابر ملتی رہی-ایکسو پانچ سال کی عمر پاکر وفات ہوئی- آپ کے پانچ فرزندوں میں ایک مولوی حکیم سید محمد اسمٰعیل عیش تھے-"

**مولوی سید سخاوت حسین:** "مولوی سید سخاوت حسین بن سید منور حسین ساکن محلہ سرائے کہنہ امروہہ میں تقریباً ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے-مولانا علیم اللہ بجنوری سے تعلیم حاصل کی،بعد فراغت تعلیم آپ نرسنگھ پور ضلع جبلپور میں مدرس رہے- مولوی علی رضا خاں رکن عدالت عالیہ حیدر آباد دکن کو ایم -اے- (عربی) کی تیاری کرائی-مولوی علی رضا کی سفارش پر نواب مختار الملک نے آپ کو تحصیل دار مقرر کرایا-- علمی ذوق بہت تھا- آپ نے اپنی تالیف کردہ کتاب دلائل ایمان میں توحید و رسالت کے متعلق دلائل عام فہم درج کیے ہیں اور جو مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں اہل اسلام میں جاری تھیں ان کو غلط قرار دینے کی کوشش کی- آپ خود فرماتے ہیں 'بعض جہال اہل اسلام بھی اولیاءاللہ کی قبروں وچلوں کو پوجتے ہیں اور مثل تعظیم خدا تعالیٰ ان کی تعظیم کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور مشرک بنتے ہیں'- مولوی صاحب کو شعری ذوق بھی تھا-اردو فارسی دونوں زبانوں میں آپ کے کلام کا ذخیرہ موجود ہے جو غزلیات،رباعیات،قصائد پر مشتمل ہے-اس کے علاوہ مناجات، حمد و نعت و منقبت ساقی نامہ و قطعات ہر صنف کلام طبع آزمائی کی ہے-حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں ایک قصیدہ فارسی زبان میں لکھا-"

**مولوی آل حسن نخشی:** "مولانا امام الدین نخشی کے پوتے تھے-جامع علوم و متقی پرہیزگار عالم تھے- مکتبی تعلیم کے بعد امروہہ میں اپنے عم بزرگوار مولوی کریم بخش، مولوی سید رافت علی اور مولوی سید محمد حسین جعفری الزینبی سے پڑھا-سنہ ۱۲۸۰ھ میں تکمیل تعلیم کے لیے وطن سے باہر گئے اور نہایت عسرت کی حالت میں علم حاصل کیا-تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں-تحصیل علم میں برابر انہماک رہا اور درسیات ختم کیے بغیر تعلیم کو

نہ چھوڑا۔

امروہہ سے باہر جاکر مولانا لطف اللہ علیگڑھی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور معقولات کی تکمیل کی۔ ابتداً میں حدیث کا درس مولانا عالم علی محدث مراد آبادی سے لیا پھر دہلی میں مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث و کتب صحاح ختم کر کے سند حاصل کی۔ تکمیل و تحصیل علوم کے بعد ۱۲۹۷ھ میں وطن آئے۔اسی دوران امروہہ کے خاندانوں کے حالات میں "نخبۃ التواریخ" کتاب فارسی زبان میں تالیف کر کے شائع کی۔طبعاً قناعت پسند تھے۔کچھ عرصہ تک مدرسہ قاسم العلوم واقع جامع مسجد (محلہ ملانا) میں اور پھر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس رہے۔سنہ ۱۳۰۶ھ میں تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔اولاد نرینہ نہ تھی صرف دو بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے عقد میں آئیں۔"

**مولوی سید اعجاز حسن:** "آپ سید علی حسن ساکن محلہ گذری کے فرزند تھے۔مولوی سید اعجاز حسن شیعہ فرقہ کے ممتاز عالم اور ممتاز اکابر و عمائدین میں سے تھے۔سنہ ۱۲۶۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔منطق و علم معانی، فقہ و حدیث ابتدائی کتابیں مولوی احمد حسن محدث امروہوی سے پڑھیں۔اس کے بعد لکھنؤ جاکر جناب مفتی سید محمد عباس مجتہد سے تعلیم حاصل کی۔حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کرنے کے بعد پھر لکھنؤ گئے اور مولانا حامد حسین سے بعض کتابیں پڑھیں۔آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔ آپ نے فارسی، عربی اور اردو میں ۳۱ کتابیں لکھیں۔چند کتابوں کے نام یہ ہیں:۔مفاتیح المطالب فی خلافۃ علی بن ابی طالب (فارسی) تفسیر آیہ لا ینال عہد من الظالمین (فارسی) تاریخ اصحاب (اردو) مذاہب العلماء فی یقین الخلفا (اردو)، القرآئنۃ والکتابۃ (عربی) وغیرہ۔سنہ ۱۸۸۷ء میں آپ کا نام فہرست درباریاں میں درج ہوا۔اس کے بعد آپ آنریری مجسٹریٹ بھی مقرر ہوئے۔سنہ ۱۹۲۲ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے آپ کی وفات ہوئی۔"

**سید العلماء مولانا سید احمد حسنؒ محدث:** "امروہہ کی دینی علمی خدمات میں پیش پیش شخصیت حضرت مولانا احمد حسنؒ محدث کی ہے جو چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ابنؒ کے خاندان سے تھے۔ مولوی محمود احمد عباسی نے اپنی تالیف "تذکرۃ الاکرام" میں حضرت مولانا احمد حسنؒ محدث سے متعلق تحریر کیا ہے: " علامہ زماں، استاد الاساتذہ، افضل الفضلاء، امام المحدثین، ذہین و فطین، خوشر و خوش تقریر، صاحب وجاہت و بزرگ عہد تھے۔آپ شاہ ابوالقاسم بن شاہ ابن بدر چشتیؒ کے پوتے، پیر اکبر حسین کے بیٹے تھے، سنہ

۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی۔

اوائل عمر میں مولانا سید رافت علی، مولوی کریم بخش نخشی اور مولوی سید محمد حسین جعفری سے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر دیوبند پہونچکر حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم صدیقی نانوتوی سے اخذ علوم کیا۔۔۔۔۔ اکتساب علوم، معارف کے بعد تاحیات مشغلہ تبلیغ و تدریس جاری رکھا۔۔۔۔۔ مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشنگان علم کو سیراب کیا۔ سنہ ۱۳۰۱ھ سے وطن مالوفہ میں قیام رہا۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ واقع جامع مسجد محلہ مولانا کو، جس کی بنیاد آپ کے محترم استاد حضرت مولانا نانوتویؒ کے مبارک ہاتھوں سے پڑی تھی، آپ کی ذات سے ایسا استحکام اور عروج حاصل ہوا کہ آج تک اس درس گاہ کا فیض برابر جاری ہے آپ اس مدرسہ کے تاحیات عملاً خود ہی مہتمم اور خود ہی صدر مدرس رہے، آپ کی علمی شہرت اور ذاتی کشش سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے طالبان علم جوق در جوق یہاں آتے اور علم سے بہرہ ور ہوتے۔ ایک طرف سرحد و افغانستان بلکہ بخارا و ترکستان سے دوسری طرف بہار و بنگال بلکہ سلہٹ و آسام اور برہما سے اور تیسری طرف دکن و مدراس سے طلبہ یہاں آتے اور سالہا سال تحصیل علم کرکے واپس جاتے رہے۔ یہ سلسلہ ابتک جاری ہے۔۔۔۔۔ سنہ ۱۳۳۰ھ کو علم و فضل کا یہ آفتاب جس نے اپنی ضوفشانی سے ایک عالم کو منور کر رکھا تھا غروب ہو گیا۔ جسم خاکی مسجد جامع کے صحن میں سپرد خاک کیا گیا۔"

جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ و عیدگاہ کی سالانہ روئیداد سنہ ۱۴۰۱ھ میں بھی مولانا احمد حسنؒ محدث کا ذکر اس طرح ملتا ہے 'حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہوی نے تقریباً ۲۷ برس بعہدہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث اس درسگاہ میں درس دیا۔

**محمد عبدالرحمٰن صدیقی**: "مولانا حافظ محمد عبدالرحمٰن مولوی عنایت اللہ کے فرزند تھے۔ حافظ صاحب سنہ ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباواجداد کا وطن سندیلہ ضلع ہردوئی تھا۔ پانچ سال کی عمر میں آپ اپنے والد کے ساتھ مکہ گئے جہاں آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان واپس آئے تو بغرض دینی تعلیم دیوبند گئے اور مولانا محمد یعقوب 'حضرت مولانا محمد قاسم اور شیخ الہند مولانا محمود حسن سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد مراد آباد میں مولانا احمد حسن محدث سے درس لیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو کچھ دن پونا اور بمبئی میں قیام کیا اس کے بعد شاہی مدرسہ مراد آباد میں مدرس ہو گئے۔ لیکن مولانا احمد حسن محدث نے مدرسہ عربیہ کی خدمات کے لیے امروہہ بلا لیا۔ مولانا کی حیات تک آپ

مدرسہ عربیہ میں مدرس دوئم رہے۔

آپ بڑے ذہین اور ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ سوال کا جواب فی البدیہہ اور دلپسند دیتے تھے۔ عربی زبان کے ماہر اور لکھنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ تفسیر و حدیث اور علم بلاغت و کلام سے خاص مناسبت تھی۔ مولوی عبدالقیوم شفق جن کا ذکر امروہہ کے شعرا میں کیا گیا ہے آپ ہی کے نیک فرزند تھے۔"

**مولانا سید اولاد حسن سلیم:** "مولانا سید اولاد حسن خلف مولوی سید محمد حسن نبیرہ سید محمد شفاعت کی سنہ ۱۲۶۸ھ میں ولادت ہوئی۔ ابتدا میں اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی پھر جناب مفتی محمد عباس مجتہد سے لکھنؤ جاکر اخذ علوم کیا۔ آپ نہایت درجہ منکسر مزاج، نیک کردار و پاکیزہ خصلت، متقی پرہیز گار تھے۔ آپ کو خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اشرف المساجد شفاعت پوتہ کی استرکاری میں جو تحریرات اور قرآن پاک کی آیات کندہ ہیں وہ آپ کی خوشنویسی کا نمونہ ہیں۔ آبائی جائیداد کی آمدنی معقول تھی۔ آپ کے مزاج میں اسقدر سادگی تھی کہ گھر میں نوکر چاکر ہونے کے باوجود اپنے گھر اور پاس پڑوس کا سودا سلف خود لا دیا کرتے تھے۔ آپ کی سادگی، نیک دلی کی وجہ سے ہندو، مسلمان شیعہ و سنی ہر فرقہ کے لوگ آپ کا ادب و احترام اور آپ سے بڑی محبت کرتے تھے۔

آپ شگفتہ مزاج، موزوں طبع، شاعر شیریں مقال تھے۔ آپ کا تخلص سلیم تھا۔ فارسی اور اردو میں کلام کا ذخیرہ آپ کی یادگار ہے۔ ہر صنف کلام پر آپ کو پوری قدرت حاصل تھی۔ قدیم رنگ کی غزلیات کے علاوہ اردو فارسی میں قصائد و قطعات و سلام و مراثی کا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو میں ایک دیوان مرتب کرنا شروع کیا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اکثر دوسروں کی فرمائش پر غزلیں اور قطعے کہہ کر دیدیتے تھے اور اس کی نقل بھی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ سید نورالحسن کے امام باڑہ (محلہ دانشمندان) میں جدید سائباں بننے لگا تو آپ سے تاریخ کی فرمائش ہوئی۔ آپ نے بے ساختہ تاریخ کہی، مصرعہ تاریخ بھی لاجواب ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

فکر تھی تاریخ کی ہاتف پکارا ناگہاں　　رونے والوں کے سروں پر نور کا ہے سائباں

**شمس العلما مولانا سید نجم الحسن مجتہد:** "شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن مجتہد پسر مولوی سید اکبر حسین ۶ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۵ر مئی ۱۸۶۳ء امروہہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا موصوف کی طبیعت

بچپن ہی سے تحصیلِ علوم عربیہ و تکمیل فنونِ لطیفہ و پسندیدہ کی طرف راغب تھی- ابتدائی تعلیم والد محترم سے حاصل کر کے مراد آباد کے سرکاری مدرسہ عربیہ میں مولوی تفضل حسین سنبھلی سے تحصیل علم کی- جب سید تفضل حسین کا تبادلہ مراد آباد سے کانپور ہوا تو وہ اپنے ساتھ مولانا نجم الحسن کو بھی ساتھ لے گئے اور جب کبھی وہ مفتی محمد عباس صاحب مجتہد سے ملنے لکھنؤ جاتے تو اپنے اس شاگرد کو بھی ساتھ لے جاتے تھے- مفتی صاحب کو جب مولانا نجم الحسن کے علمی شوق کا علم ہوا تو اپنے حلقہ درس میں شامل کر لیا اور علوم سے بہرہ ور کیا اور اپنی دامادی کا بھی شرف بخشا- مفتی صاحب جب واجد علی شاہ' شاہِ اودھ کے پاس مٹیا برج کلکتہ تشریف لے گئے تو آپ کو بھی وہیں بلا لیا- زیادہ تر اسی جگہ آپ کو مفتی صاحب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور اسی زمانے میں مفتی صاحب نے آپ کو نجم العلماء کا خطاب دیا- اس کے بعد حکومتِ برطانیہ کی طرف سے آپ کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا-

مفتی صاحب کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۰۶ھ سے آپ نے مستقلاً لکھنؤ میں قیام کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے- یوپی کا ہر گورنر خاص طور پر جیمس مسٹن سلطنت کے اہم امور میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے- جیمس مسٹن آپ کا ایسا مداح تھا کہ جس نے انگلستان جانے کے بعد بھی آپ سے خط و کتابت رکھی- آپ کی علمی شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ غیر ممالک ایران' عراق وغیرہ میں بھی آپ کا نام مشہور و معروف تھا- اپنی علمی قابلیت اور اپنے اوصاف کی بنیاد پر آپ کو شیعیانِ ہند کی قیادت کا درجہ حاصل ہو گیا- اپنے اثر سے مختلف مقامات پر مدارس قائم کرائے- ان کی کوششوں اور مشوروں سے لکھنؤ میں ناظمیہ کالج قائم ہوا اور امروہہ میں آپ نے امام المدارس کا افتتاح ۱۹۰۱ء میں کیا- آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کی متواتر صدارت کی-"

**مولوی سید ابوالقاسم:** "آپ مولوی سید سخاوت حسین صاحب کے فرزند تھے- تقریباً سنہ ۱۲۸۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی- مراد آباد کے ہائی اسکول سے انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ اسی دوران کسی صوفی کے مرید ہو گئے اور انگریزی تعلیم ترک کرنے کے بعد مراد آباد ہی میں مولانا سید رافت علی امروہوی اور مولانا عالم علی مراد آبادی سے علوم متداولہ عربیہ و فارسیہ کی تحصیل کی- اس کے بعد مکہ معظمہ میں حاجی رحمت اللہ مہاجر مکی کے مدرسہ میں درسیات کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر سند حاصل کی-

اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کی پوری قدرت تھی- آپ کی تصانیف کی تعداد

مشتمل ہیں- بعض کتابوں کی ضخامت آٹھ سو تقریباً ڈیڑھ سو ہے جو زیادہ تر تصوف و حقایق و معارف و معالم وغیرہ پر صفحات سے بھی زیادہ ہے- فارسی زبان میں آپ کی چند کتابیں، کتاب السلوک اعنی بوستان حقیقت و معرفت، ریاض العلوم و حیاض العیون بہت معروف ہیں- سنہ ۱۳۲۹ھ کو حیدر آباد میں آپ کی وفات ہوئی-"

**مولوی حاجی سید مرتضٰی حسین:** "آپ سید قربان حسین کے فرزند اور شیعہ مذہب کے بااخلاق و نیک سیرت عالم تھے- سنہ ۱۲۸۱ھ میں آپ کی ولادت ہوئی- جوانی میں علم کا شوق پیدا ہوا تو ابتدا میں مولوی محمد امین الدین خاں سے پڑھا- پھر مولوی محمد ہارون زنگی پوری کو امروہہ بلا کر بہت محنت کے ساتھ مزید علم حاصل کیا- بموجب الحکمۃ ضالۃ المومن جس کسی کو اہل پایا اس سے علم حاصل کرنے میں ذرا بھی تردد نہیں کیا- اپنی ذاتی کوششوں اور محنت سے بہت جلد علوم میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر لی اور علماء کی صف میں کھڑے ہو گئے- آپ نے زرِ ذاتی سے ایک بیش قیمت کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا- مدرسہ نور المدارس میں آپ برسوں تک اعزازی پرنسپل رہے- لاتعداد طلباء نے آپ سے فیض حاصل کیا- آپ اپنی عمر کے آخری ایام تک علم کا درس دیتے رہے- کبھی کبھی مناجات حمد و نعت اور منقبت میں شعر بھی کہتے تھے- سنہ ۱۳۵۰ھ میں اس علم کے شیدائی نے دار فانی سے کوچ کیا-"

**مولوی احمد حسینؒ خان:** "حافظ عباس علی خان کے فرزند عالم' فاضل ادیب تھے- مولانا سید احمد حسنؒ محدث امروہوی کے درس سے فیض یاب ہوئے- استاد گرامی انہیں بایزید بسطانی کے نام سے مخاطب فرماتے تھے- فارسی، عربی کی تعلیم مدرسہ عربیہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ سے حاصل کی- آپ انتہائی منکسر المزاج اور سادگی پسند انسان تھے- کھانا اس وقت تک نہ کھاتے جب تک ان کے دستر خوان پر کوئی مہمان نہ ہوتا تھا- کسی دن کوئی بھی مہمان نہ ہوتا تو جامع مسجد کے پاس جا کر کسی غریب مسکین کو لے آتے اور اسے دستر خوان پر ساتھ بٹھا کر کھانا کھاتے تھے- لباس اتنا سادہ ہوتا کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بہت بڑے عالم ہیں- حیدر آباد دکن میں محکمہ امور مذہبی اور بعد میں مدرسہ محبوبیہ کی صدر مدرسی پر فائز رہے-" ابتدائے عمر سے ادبی ذوق رکھتے تھے- تصوف و سیر ۃ المشائخ وغیرہ میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں- انیسویں صدی کے اواخر میں امروہہ سے شعری گلدستہ 'نسیم چمن' آپ ہی شائع کرتے تھے- آپ کی ایک صاحبزادی بادشاہ بیگم کراچی میں رہائش پذیر ہیں- یہ بھی بڑی لائق فائق خاتون ہیں- محترمہ کا بڑا وسیع مطالعہ ہے اور اپنے والد کی طرح ادبی ذوق رکھتی ہیں- اکثر کراچی کی ادبی

محفلوں میں آپ کو ضرور بلایا جاتا ہے-

مولوی احمد حسینؒ نے ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء کو خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس کے موقع پر اجمیر میں انتقال فرمایا- جس دن جنازہ پہنچا تو سارے ملک میں انڈیا چھوڑ د تحریک کے خلاف انگریزوں نے تشدد شروع کر دیا تھا- آپ کا مرقد منورہ روضہ درویش علی خان کے نزدیک ہے-

**مولوی سید یوسف حسین مجتہد:** "آپ مولوی حاجی سید مرتضیٰ حسین کے فرزند' عالم جید' صاحب استعداد' مذہب امامیہ کے روشن خیال مجتہد تھے- ابتدا میں اپنے والد سے پھر مولوی محمد امین الدین خاں سے علم حاصل کیا اس کے بعد عراق گئے اور تقریباً آٹھ سال تک وہاں کے علماء سے علوم کی تحصیل کی- ۱۳۳۲ھ میں سند اجتہاد لیکر وطن واپس آئے- چار پانچ سال تک نور المدارس میں درس دیتے رہے پھر مدرسہ منصبیہ' میرٹھ' کے پرنسپل رہے- آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات کے پروفیسر بھی رہے- اصول فقہ میں خاص مناسبت رکھتے تھے- اتحاد بین المسلمین کے بڑے حامی تھے-- سنہ ۱۹۲۱ء میں جب تحریک خلافت تحریک زور شور پر تھی تو آپ نے ترک موالات میں علمائے اہل سنت والجماعت کے فتاویٰ کی تائید کی تھی-"

**مولوی سید محمد مجتہد:** "آپ مولوی سید احمد حسینؒ کے فرزند تھے- سنہ ۱۳۰۹ھ کو آپ کی ولادت ہوئی- آپ کا تاریخی نام "نظیر الحسن" تھا- ابتدا میں امروہہ پھر لکھنو جا کر تحصیل علوم کیا- سنہ ۱۳۳۶ھ میں صدر الافاضل کی سند حاصل کی اور سید المدارس امروہہ میں صدر مدرس رہے- اس کے ایک سال بعد عراق جا کر مرزا محمد تقی شیرازی اور آقا شیخ حسین بازندرانی اور آقا محمد کاظم شیرازی کے درس میں شریک رہے- سنہ ۱۳۳۹ھ میں اجازۂ اجتہاد حاصل کر کے وطن آئے اور سید المدارس میں صدر مدرس اور شیعیان امروہہ کے پیش نماز ہوئے- آپ منکسر المزاج' بااخلاق' ذکی و ذہین عالم تھے- آپ کی کئی تصانیف بھی ہیں-"

**مولوی اظہار الحق سہیل عباسی:** "آپ مولوی عبدالحق صاحب عباسی کے نیک فرزند تھے- سنہ ۱۳۱۷ھ میں آپ کی ولادت ہوئی- دیوبند و مراد آباد کے مدارس میں تعلیم حاصل کی- اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فاضل کی سند لی- ابتدا میں گجرانوالہ کے اسلامیہ ہائی اسکول عربی اور دینیات کے معلم رہے- اسی زمانے میں رسالہ معلم کی ادارت بھی کرتے تھے- ترک ملازمت کے بعد آپ اعلیٰ درجہ کے واعظ اور مقرر تھے- جامع مسجد ٹوبہ ٹیک سنگھ فیصل آباد پاکستان کے خطیب اور مدرسہ عربیہ کے مہتمم رہے- ترک ملازمت کے بعد

ضلع گجرات میں آپ نے ایک دینی درسگاہ قائم کی۔ شعر و سخن کا بھی شوق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ کا تخلص سہیل تھا۔ "شعرائے امروہہ کے باب میں آپ کی شاعری کا ذکر کیا گیا ہے۔

**حاجی سلیمان و حاجی عبداللہؒ:** "آپ دونوں بزرگوں کی درگاہ محلہ شاہی چبوترہ میں واقع ہے۔ صاحبان مزار کا مفصل حال معلوم نہیں۔ البتہ امروہہ میں یہ مزارات بہت قدیم ہیں۔ روایت ہے کہ غازیان متقدمین میں یہ دونوں صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ۱۰۶۷ھ میں عہد شاہجہاں میں شیخ منصور نے اس درگاہ کو تعمیر کرایا تھا۔ احاطہ درگاہ میں حاجی سلیمان اور حاجی عبداللہ کے مزارات پہلو بہ پہلو ہیں۔"

**درویش علی خاںؒ:** درویش علی خاں فرخ سیر و محمد شاہ کے عہد میں پنجاہ و دو صد ہزاری منصب دار تھے اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیت تھے۔ ۱۴ر محرم ۱۲۱ھ کو جنگ بارہہ میں شہید ہوئے۔ آپ کا مقبرہ آپ کے چھوٹے بیٹے محمد شمس الدین خاں کے انتقال کے بعد ۱۲۰۸ھ کے آس پاس تعمیر ہوا تھا۔ آپ کے دائیں پہلو میں آپ کے بڑے بیٹے غلام محی الدین خاں جو درویش علی خاں ثانی کہلاتے تھے اور بائیں پہلو میں محمد فخر الدین خاں جو آپ کے منجھلے بیٹے تھے مدفون ہیں۔ مقبرہ کے اندر ایک پتھر پر فارسی میں ایک کتبہ کندہ ہے۔ درویش علی خاں کو بھی منصب پنج ہزاری دیا گیا تھا اور داروغہ توپ خانہ مقرر کیے گئے تھے۔ آپ پانی پت کی جنگ میں شہید ہوئے۔

**مولانا محمد صابر خاں:** خلف محمد سعید خاں امروہہ میں پیدا ہوئے، محلّہ گھیر مناف میں آپ کی سکونت تھی۔ ابتدا میں آپ نے الہ آباد سے مڈل پاس کیا اس کے بعد مدرسہ چلّہ پھر مدرسہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے دینی تعلیم حاصل کی اور عالم دین کی سند حاصل کی۔ علم طب مولوی فرید احمد عباسی سے حاصل کیا۔ آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم طب کو مولانا اشرف علی تھانوی کی ہدایت پر ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ حصول علم کے بعد ساری عمر آپ نے تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ امروہہ، مرادآباد، علیگڑھ، رواڑی، ٹانڈہ، کاز گنج، بریلی اور سہارنپور کے دینی مدارس میں ہزاروں تشنگان علم کو فیض پہنچایا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ کراچی کے دار العلوم نانک واڑہ میں آپ عرصہ دراز تک نائب مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا محمد صابر صاحب کو، جو راقم الحروف کے حقیقی ماموں تھے، علم طب، فلسفہ، منطق، اردو، انگریزی، عربی و فارسی، ہندی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں دو

کتابیں "مشکواۃ السراج" اور "سیرت الصدیق" بہت مقبول ہیں۔ سیرتِ فاروق بھی لکھی لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اس کتاب کی طباعت نہ ہو سکی۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں آپ نے دارِ فانی سے کوچ کیا۔

**مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ:** مولانا نسیم احمد فریدیؒ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے فاضل، بالغ نظر مفتی، مترجم، محقق، محدث، مفسر، فقیہہ، متصوف، واعظ و خطیب، مصنف اور جید عالم دین تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲ر رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ مطابق ۶ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو اپنے آبائی مکان محلہ جھنڈا شہید امروہہ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی حسین احمد صاحب فریدی ایک زمیندار تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب براہِ راست حضرت شیخ الاسلام بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے ملتا ہے اور ان کا سلسلہ نسب خلیفہ دوم غیظ الکفار والمنافقین امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ ردہیل کھنڈ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم ابوالفتح سید عبداللہ المعروف شاہ ابن بدر چشتیؒ کی اولاد میں سے تھیں۔

مفتی صاحب کی عمر ابھی ڈھائی سال ہی تھی کہ آپ شفقت مادری سے محروم ہوگئے۔ چھ سال کے ہوئے تو آپ کو پرائمری اسکول میں داخل کرادیا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے مڈل اسکول سے مڈل کا فائنل امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے انگلش مڈل، منشی الہ آباد، منشی کامل اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ فارسی کی تعلیم انہوں نے منشی عبدالرب شکیبؔ مرحوم سے حاصل کی۔ فارسی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ آپ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ چلّہ میں فارسی کی تعلیم دیتے رہے اور اسی دوران مولوی کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے عربی کی تعلیم حضرت مولانا رضا حسن صاحب مرحوم، مولوی انوارالحق صاحب عباسی اور حضرت حافظ عبدالرحمٰن صاحب امروہوی سے حاصل کی۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں حصول تعلیم کی غرض سے آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے حدیث شریف کا درس حاصل کیا اور انہی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ دیوبند سے فارغ ہوئے تو مولانا نعمانی کے ایماء سے بریلی چلے گئے اور وہاں مدرسہ اشفاقیہ میں تقریباً چار سال حدیث شریف خصوصاً بخاری کا درس دیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ نے فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ دارالعلوم امروہہ سے منسلک تھے۔ مفتی نسیم احمد فریدیؒ انتہائی منکسر مزاج، خوشگوار اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ کو ۱۹۹۰ء میں صدر جمہوریہ ہندوستان کی طرف سے "عربی عالم" کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

۵ر ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۸ر اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز سہ شنبہ عالم باعمل مولانا مفتی نسیم احمد فریدی صاحب

نے وفات پائی- آپ نہایت نیک نفس' نیک سیرت اور خوش اخلاق انسان تھے - راقم الحروف کو بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ مولانا صاحب بعد نماز مغرب اکثر راقم الحروف کے کاندھوں پر اپنا دست مبارک رکھ کر اپنے گھر جاتے تھے-

**مولانا سید محمد عبادت کلیم**: نام محمد عبادت اور تخلص کلیم تھا- آپ مولانا سید اولاد حسن سلیم (اپنے دور کے جید عالم) کے اکلوتے بیٹے تھے -۶ر صفر ۱۳۲۹ھ مطابق ۷ر فروری ۱۹۱۱ء کو محلّہ شفاعت پوتہ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب آپ کی عمر دس سال بھی نہیں تھی- حاجی سید مرتضیٰ حسین مجتہد نے آپ کو اپنے زیر سرپرستی لے لیا- حاجی صاحب قبلہ نے مولانا محمد عبادت کو صرف پڑھایا ہی نہیں بلکہ ان کی تربیت اور تزکیہ نفس میں بھی سعی بلیغ کی- حاجی صاحب نے اپنی علالت کے زمانے میں انہیں لکھنو جانے کی ہدایت کی جہاں خوش قسمتی سے ان کو سرکار نجم الملت کی سرپرستی حاصل ہوئی- لکھنو میں انہوں نے ناظمیہ میں تعلیم حاصل کی- ان کے اساتذہ میں اس عہد کے عظیم فلسفی مولانا سید مظاہر حسین قبلہ اور مفتی اعظم سید احمد علی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں- ان دونوں عالموں سے انہوں نے فلسفہ 'منطق' اصول فقہ اور فقہ استدلالی کی باریکیاں حاصل کیں- نیز عربی اور فارسی ادب عالیہ میں کمال دسترس انہوں نے لکھنو کے علماء سے حاصل کی- مولانا نے اپنے علم کی پیاس 'منصبیہ' میرٹھ میں بھی تعلیم حاصل کر کے بجھائی-

مولانا محمد عبادت اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے ہیں- وہ ایک جید عالم اور مجتہدانہ فکر کے حامل تھے- ان کی ذات و صفات کا احاطہ کرنا ذرا مشکل کام ہے- ان کی ہمہ جہت شخصیت' تبحر علمی' ان کے عالی افکار' ان کا علم و فضل' ان کا زہد و تقویٰ غرض کہ وہ تمام صفات جو کسی انسان کو مثالی بناتے ہیں مولانا سید محمد عبادت میں مجتمع تھے- یوں تو وہ شیعان امروہہ کے امام الجمعہ والجماعت تھے- مگر ان کی وسیع المشربی بلا تفریق مذہب ہر طبقہ فکر میں تسلیم کی جاتی تھی- اس شہر کا ہر فرد ان کا احترام اور دل سے عزت کرتا تھا-

درسیات کے ختم ہونے کے فوراً بعد ہی انہوں نے 'محقق صدرہ' کے ایک رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا- اصول فقہ پر عربی میں ایک رسالہ 'سراج الفقیہہ' بھی تحریر کیا- ایک اور رسالہ عربی زبان میں 'الاستفسار فی نجاست المشرکین والکفار' میں تحریر کیا- ان کی ایک کتاب 'مقام شبیری' پاکستان میں سید قمر رضی اور ان کے چند دوستوں نے شائع کی- مولانا کے درجنوں مقالے اور اہم موضوعات پر کتابیں ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہیں- ۲۳ر ربیع الاول ۱۴۱۰ھ مطابق ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو آپ کی وفات ہوئی-

مولانا محمد عبادت کا شعر و ادب میں اعلیٰ مقام تھا۔ ہر صنف سخن پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ نامانوس بحروں، مشکل زمینوں، مشکل قافیوں اور ردیفوں میں منقبت، سلام اور غزل کہنے کے عادی تھے۔ نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

اے بارش رحمت میرے عصیاں کو گھٹاؤ — ہاں ایک گھٹا ایک گھٹا ایک گھٹا اور
انساں ہے وہی قول و عمل ایک ہوں جسکے — انسان وہ کیا جس نے کہا اور کیا اور

-------

ہے طور دل سلامت وہ بجلیاں گرائیں — ہاں اور مسکرائیں ہاں اور مسکرائیں
چلنے لگیں ہوائیں چھانے لگیں گھٹائیں — رندو! ذرا سنبھل کر ساغر چھلک نہ جائیں

----

ہر دن کے انقلاب سے لیتا رہا سبق — ہر شام ہر نگاہ کو میں دیکھتا رہا
دن رات اس جہان عروج و زوال میں — احوال مہر و ماہ کو میں دیکھتا رہا

**مولانا شفیق احمد صدیقی:** مولانا شفیق احمد صدیقی (مرحوم) محلہ چاہ شور امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ محمد صدیق صاحب کے بڑے فرزند تھے اور رشتے میں راقم الحروف کے چچا تھے۔ آپ نے عربی کی تعلیم جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ اور مدرسہ چلّہ میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان الہ آباد بورڈ سے پاس کیا۔ آپ انتہائی خوش مزاج اور ذہین عالم و فاضل تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں آپ ریاست ٹھکانا کھیڑی چلے گئے اور مدرسہ ناصر الاسلام میں سیکڑوں تشنگان علم کو درس دیکر فیضیاب کیا۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کو آپ سے خاص انسیت تھی۔ آخر میں حضرت مولانا حفظ الرحمن نے آپ کو جمعیت علمائے ہند دہلی بلا لیا اور جمعیت علمائے ہند کی اتر پردیش کی شاخ کا صدر مقرر کر دیا جس کا صدر دفتر مراد آباد یوپی میں تھا۔ شفیق احمد کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ غزل پر طبع آزمائی کرتے تھے اور کبھی کبھی بچوں کے لیے نصیحت آموز کہانیاں اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ آپ کے چند شعر جناب مثال احمد خاں صاحب (قمر جمالی) نے عنایت کیے۔ ملاحظہ ہوں:-

دیکھ کر چاروں طرف پھر دل سا بیٹھا جائے ہے

بیٹھے بیٹھے جب مرا دل آپ سے گھبرائے ہے
اس گھڑی پھر خط سے ہی کچھ گفتگو ہو جائے ہے
جب اندھیری رات میں پتا کوئی کھڑکائے ہے
ابتداء میں یہ سمجھوں ہوں کہ کوئی آئے ہے
دیکھ کر چاروں طرف پھر دل سا بیٹھا جائے ہے

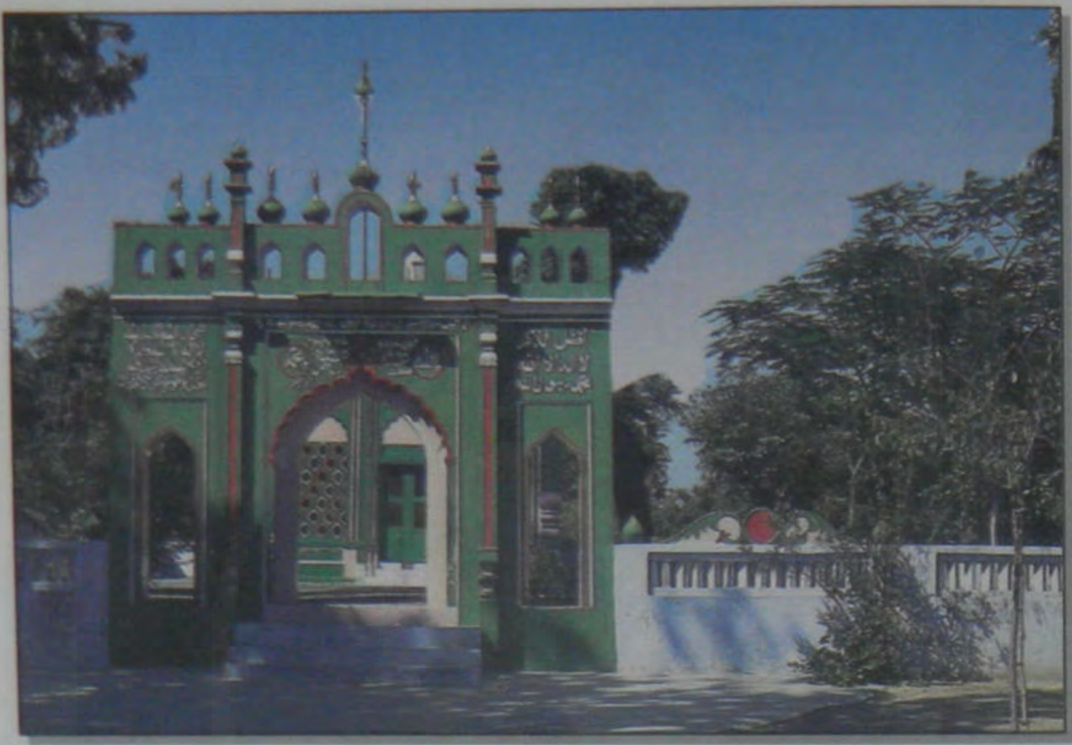
خیر خواہ میرا کوئی پھر یوں مجھے سمجھائے ہے
جو چلا جائے کہیں وہ لوٹ کر کیا آئے ہے
پھر نہ جانے دل مرا کیوں خیال ان کا لائے ہے
ہائے رے کمبخت جی مجھکو ڈبوتا جائے ہے
دیکھ کر چاروں طرف پھر دل سا بیٹھا جائے ہے

تین شعر اور ملاحظہ ہوں۔

ہوش و حواس کھو دیے، جان بھی اب نثار کر ۔۔۔ باقی ہے کیا قفس میں اب اس کو بھی تار تار کر
دست کرم جب اٹھ گیا باقی رہے نہ کچھ کسر ۔۔۔ دامن و جیب سے گزر قلب کو بر کنار کر
سوز و قلق برنگ فق عین حیات ہے شفیقؔ ۔۔۔ باقی ہے جب تلک رمق دل کو نہ سوگوار کر

-----

**مولانا طاہر حسن:** حضرت مولانا طاہر حسن حافظ زاہد حسن مرحوم کے فرزند ہیں۔آجکل آپ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں محدث ہیں۔آپ کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔آپ کے والد، جنہوں نے مدرسہ جامعہ حسینیہ دارالعلوم محلّہ چلہ کی تاسیس اور ترقی میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، دارالعلوم کے نائب مہتمم تھے۔مولانا طاہر حسن نے ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں حاصل کی۔آپ نے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر شرح جامی تک پڑھا۔جب آپ کے والد جامع مسجد کے نائب مہتمم ہوئے تو ایک سال آپ نے یہاں پڑھنے کے بعد درس نظامی کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے کی۔وہاں سات سال دورہ پڑھنے کے بعد معقولات کی تکمیل کی۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے میرٹھ، تھانہ بھون، دھامپور وغیرہ کے مدارس میں درس دیا۔اب تقریباً ۲۸ سال سے مدرسہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں دورۂ حدیث کی تدریس انجام دے رہے



بھورے خاں شہیدؒ..........نزد ریلوے اسٹیشن



روضہ قاری سبطِ رسولؒ..........نزد عید گاہ



مقبرہ درویش علی خانؒ......نزد روضہ حافظ عباسؒ



مزار مولوی مشتاق حسینؒ نواب وقار الملک..........نزد مقبرہ درویش علی خانؒ

ہیں

عرصۂ دراز سے آپ "معارف مدینہ" کے نام سے ترمذی شریف کی ایک مبسوط شرح لکھ رہے ہیں جس کے ۱۴ حصے شائع ہو چکے ہیں۔حال ہی میں 'پیغمبر اعظم' کے نام سے سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے جس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا طباعت کے مراحل میں ہے۔انتہائی کشادہ ذہن، خوش مزاج، کم سخن، متقی، پرہیزگار اور بڑے عبادت گزار انسان ہیں۔سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں حصے بڑی تحقیق کے بعد تصنیف کیے ہیں۔جس طرح وہ خود کشادہ ذہن کے مالک ہیں اسی طرح اس کتاب میں غیر مسلموں کی ذہنی و فکری سطح کا بے حد خیال رکھا ہے اور ان کے مسلمات کا ذکر کر کے ان پر حجت قائم کی ہے۔

**قاری سبطِ رسولؒ:** جناب قاری سبط رسول سبط احمد کے فرزند تھے جن کی سکونت محلہ چاہ شور میں تھی۔ قاری سبط رسول کی ولادت ۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو امروہہ میں ہوئی۔ آپ جناب قاری عزیز الحق اور مولانا انوار الحق سے دینی تعلیم حاصل کر کے مولوی اور ایک بہترین قاری ہوئے۔مزید تعلیم میرٹھ میں حاصل کی۔اس کے بعد مولانا مختار آپ کو ضلع اناؤ لے گئے جہاں مولانا شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی کے خلیفہ اول عبدالکریم کی صحبت میں رہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں حضرت میاں غلام سرور قادری طرطوسی سے بیعت حاصل کی۔ ۲۳ر مئی سنہ ۱۹۹۷ء کو آپ نے وفات پائی۔

آپ کے ہمعصروں و حلقہ احباب میں مولانا سید محمد عبادت کلیم، مولانا نسیم احمد فریدی، حکیم کلب علی، حکیم اسلام الحق، شہباز امروہوی، شمیم احمد جعفری اور قمر رضی شامل تھے۔ قاری صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے صاحبزادے جناب سبط زبیر کو اپنا جانشین بنادیا تھا۔ آپ کے معتقدین میں مختلف مذاہب کے بے شمار لوگ شامل ہیں۔ آپ کا مزار پر نور حضرت شاہ ولایتؒ کی درگاہ کے نزدیک بجانب جنوب و غرب واقع ہے۔

قاری صاحب انتہائی خوش مزاج، خلیق، ملنسار انسان تھے۔اگر ان کو کوئی برا بھلا بھی کہتا تو ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ آتا تھا بلکہ زیر لب مسکرادیا کرتے تھے۔میرے بزرگ شمیم احمد صاحب جعفری، جو بحیثیت میرے بڑے بھائی کے ہیں، نے بھی قاری صاحب کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ملاحظہ ہو ؎

اے شبیہ یادگار اولیائے قادری — تجھکو ہے لاریب زیبا افسری و قیصری
ابتلائے رنج و غم میں کیا کمال صبر تھا — ثانیٔ ایوب تھا، پایا مقام مہتری
دشمنوں کی بد سلوکی پر ترا احسنِ سلوک — ظلم سہہ کر بھی ہمیشہ دی دعائے بہتری

جبکہ حاصل تھا تجھے بھی اختیار انتقام — غم ہے لیکن مقابل کی نہ کی پردہ دری
آفریں اے مردِ باہمت! تجھے صد آفریں — دشمن جاں کو سدا سمجھا خطاؤں سے بری
نیشِ عقرب سے نہ تھا کچھ کم سلوک اقربا — اب خجل ہیں دیکھ کر تیری اعزاء پروری
گالیاں سن کر ہمیشہ مسکرایا زیرِ لب — یوں رکھا تو نے بلند اپنا نشان برتری
قابل تقلید ہے اس کا تحمل اے شمیم — خلق عالی سے ملا جس کو مقامِ سروری

**حسن:** ڈاکٹر سید محمد حسن رضوی (دانشمندان) ملۃ الاسلام سید انیس الحسنین کے فرزند ہیں۔ آپ کے والد مدرسۃ الواعظین کے فارغ التحصیل تھے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں کراچی آگئے تھے۔ یہاں سندھ مدرسۃ الاسلام اور ایس ایم کالج میں پچاس سال اسلامی علوم کی تعلیم دی۔ دس سال جناح کالج میں پڑھایا۔ رضویہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ علم فقہ پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ مولانا محمد حسن آپ کے ہی فرزند ہیں۔ جنہوں نے سندھ یونیورسٹی سے پوزیشن کے ساتھ بی اے آنرز کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے معاشیات کیا۔ جامع اظہر کے ایک بورڈ میں آپ کی ایک کتاب ترجمہ اصول کافی "انگریزی" اور اس مقدمہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ ڈاکٹر صاحب نے "قران مبین" کے نام سے قران مجید کا آسان اور واضح اردو ترجمہ کیا۔ آپ نے خلاصۃ التفاسیر کے نام سے تفسیر قرآن لکھی۔ اس کے علاوہ "اثبات و معرفت خدا" اور "روح قرآن نام کی کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کی آیات کو موضوعات کے اعتبار سے مرتب کیا۔ آپ نے شاہ عبدالطیف بھٹائی کے کلام کا انتخاب کر کے ترجمہ ایک جامع مقدمہ کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔

**رضی:** علامہ سید محمد رضی مجتہد، شمس العلما آیت اللہ نجم الحسن مجتہد محلّہ دانشمندان نجف کے فارغ التحصیل ہیں۔ اکابرین علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کو مجلس شوریٰ میں بھی لیا تھا اور آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ مانے ہوئے مجتہد جامع الشرائط ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں شریعت الاسلام، شہادت کبرا اور بہت سی دوسری تصنیفات ہیں جن کی تفصیل میرے پاس موجود نہیں۔ آپ شعر بھی اچھا کہتے ہیں۔ "نقوش بے خودی" آپ کی غزلیات اور قصائد کا مجموعہ ہے۔ "نقوش حیات" آپ کی زندگی کی خود نوشت ہے۔

-☆☆☆-

# مساجد

امرہہ جہاں بے شمار اولیاء کرام کے مزارات ہیں وہاں بے شمار مساجد بھی ہیں جن میں کچھ قدیم ترین ہیں- یہاں صرف اُن مساجد کا ذکر کیا جارہا ہے جو قدیم اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں-ان مساجد کا حال لکھنے میں "تاریخِ امروہہ "اور" تاریخ اصغری" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے-زیر نظر باب میں ان مساجد کے موجودہ حالت،ان میں توسیع وترمیم کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو راقم الحروف نے حال میں بذات خود دیکھے ہیں-

**مسجد کیقبادی (سدو)**: یہ امروہہ کی قدیم ترین تاریخی مسجد محلہ سدو میں واقع ہے-۶۸۶ھ میں ملک عنبر سلطانی حاکم امروہہ نے اس کو تعمیر کرایا تھا-ملک عنبر نے قرآن پاک کی آیات بھی پتھروں پر کندہ کرا کے مسجد کی محرابوں اور دروں پر نصب کرائی تھیں-ان آیات کے چند ٹکڑے آج بھی مسجد کے دروازہ کے اندرونی رخ پر نظر آتے ہیں-۹۶۴ھ میں جب یہ عمارت کسی صدمہ سے شکستہ ہوگئی تو قطب الدین قتاق خاں نے،جو اس زمانہ میں امروہہ کے حاکم تھے،اس کی مرمت کرائی-اس کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جس کے تین شعر مسجد کے جنوبی دروازے پر اور دو شعر مسجد کے شمالی پایہ پر منقوش ہیں-فارسی زبان میں یہ شعر حسب ذیل ہیں-

در عہدِ عدل خان زمان فلک جناب　　کز فیض عدل اوست وجہان خلد جاودان

کانِ سخا و خواجۂ دنیا و قطبؔ دین — عالی تبار قافلہ سالار راستان
از بہر خاص و عام جہان ساخت مسجدے — کز مسجد الحرام وہد در صفا نشان
فرشش بہ روشنی و شرافت چو آفتاب — سقفش بہ سادگی و لطافت چو آسمان
تاریخ ایں خجستہ بنا بر رواق چرخ — کلک قضا نوشت بنائے قتاقؔ خان

---------

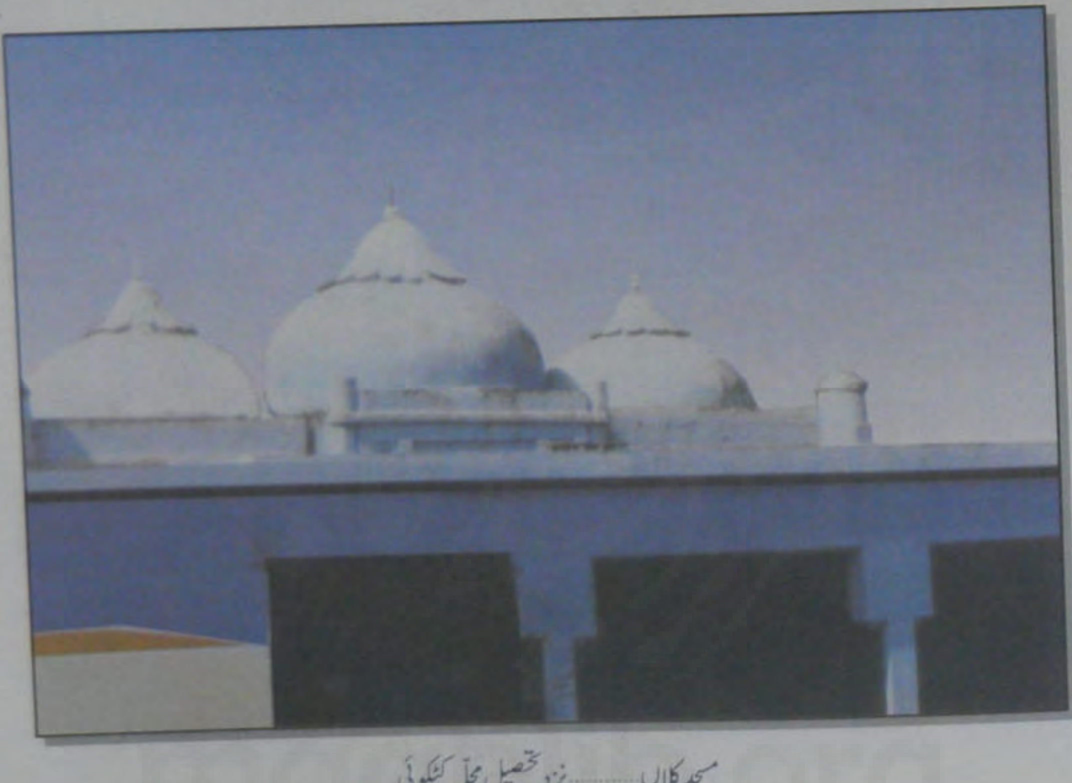
اس کے بعد ۹۸۱ھ میں یہ مسجد پھر شکستہ ہو گئی-اس وقت سید محمد میر عدلؔ امروہوی نے نہ صرف مرمت کرائی بلکہ اس کی تعمیر میں اضافہ بھی کیا-ابتدا میں مسجد کے صرف تین گنبد تھے سید محمد میر عدل نے ان پر دو گنبدوں کا اور اضافہ کیا- یہ پانچ سو سال تک امروہہ کی جامع مسجد رہی، جہاں مسلمانان امروہہ کے اسلاف کرام، علما و فضلاء، مشائخ اولیا، خالق معبود کی عبادت میں مصروف رہتے تھے-

یہاں اس مسجد سے متعلق ایک روایت ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے نصف میں اس مسجد کے موذن شیخ صدر الدیؔن عرف صدو تھے-ان کی شہرت صرف امروہہ تک محدود نہیں تھی بلکہ ملک کے دور دراز صوبوں میں بھی شیخ صدر الدین اپنی عرفیت صدو (سدو) سے مشہور ہیں- بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ صدر الدین کو عملیات کا بہت شوق تھا اور زین خاؔن نام کا ایک موکل ان کے تابع تھا- شیخ صدو اس موکل کے ذریعے خوبصورت عورتیں منگواتے تھے -کہا جاتا ہے کہ شیخ صدو کی اس حرکت سے زیؔن خان بہت پریشان تھا اور ایک دن اس نے شیخ صدو کو ناپاکی کی حالت میں قابو پاکر ہلاک کر دیا تھا-اس دن سے شیخ سدو کی روح خوبصورت اور جوان عورتوں پر آجاتی ہے اور اس وقت تک نہیں جاتی جب تک شیخ سدو کے نام کا چڑھاوا نہ چڑھایا جائے-اس روایت کو سن کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ سدو کو عورتیں بلاتے ہوئے کس نے دیکھا تھا؟ کیا اس پوشیدہ عمل کو شیخ سدو نے خود ہی لوگوں پر عیاں کر دیا تھا؟ بہر حال اس واقعہ کی کوئی شہادت نہیں ملتی -نہ معلوم وہ کون لوگ تھے جنہو نے اس کہانی کو گھڑ کر دولت کمانے کا ذریعہ بنایا- حیرت ہے کہ اس کہانی کا ہیرو بھی ایک موذن کو بنایا' اور کوئی ملا ہی نہیں -زمانہ' گزشتہ میں جو بے حرمتی اس مسجد کی مسلمانوں کے ہاتھوں کی گئی اس کی مثال نہیں ملتی-

آج اس مسجد کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے-اس کے اطراف میں دور تک مسلم آبادی ہے- لیکن اس مسجد میں نہ تو چراغ جلتا ہے اور نہ کبھی اذان کی آواز سنائی دیتی ہے- تاریکی میں ڈوبی ہوئی یہ مسجد اس قدر خستہ حال ہو چکی ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہوئے خوف آتا ہے-



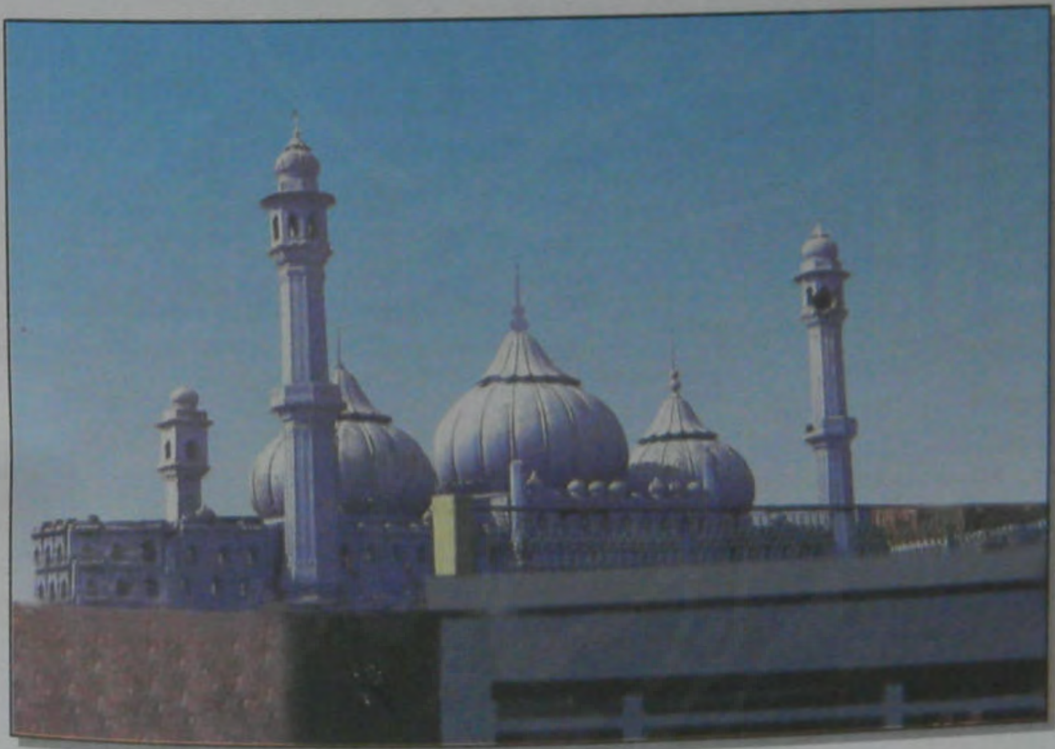
مسجد کیقبادی (سدو کی مسجد)............ محلّہ سدو



مسجد کلاں............ نزد تحصیل محلّہ کشکوئی



جامع مسجد محلّہ ملانہ امروہہ



مسجد بصری بیگم نزد مراد آبادی دروازہ

**مسجد جامع کلاں:** یہ مسجد تحصیل کے سامنے محلہ کنکوئی کے نزدیک واقع ہے- یہ بھی امروہہ کی ایک تاریخی مسجد ہے جو مسجد کیقبادی کے بعد ابتدائے عہد اکبری میں تعمیر ہوئی تھی- شکر ہے کہ یہ مسجد آباد ہے اور یہاں کے موذن بھی خوش قسمت ہوئے جنہیں شیخ سدو کی طرح کسی Scandle میں ملوث نہیں کیا گیا-اس مسجد میں پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کی جاتی ہے- مسجد کے آگے کی جانب صحن میں پکی لنٹر کی چھت ڈال کر مسجد میں کچھ تھوڑی بہت توسیع کی گئی ہے-زمانہ گزشتہ میں یہاں املی کے قدیم درخت تھے جو اس مسجد پر سایہ کیے ہوئے تھے-یہ درخت اب باقی نہیں ہیں-غالباً یا تو سوکھ گئے یا کاٹ دیے گئے-

صاحب "تاریخ امروہہ" لکھتے ہیں: "...... کوئی کتبہ مسجد میں نصب نہیں تاہم متعدد فرامین و پروانہ جات شاہی سے جو خاکسار مولف کی نظر سے گذرے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ابتدائے عہد اکبری میں اس زمانہ کی تعمیر ہے جب مسجد کیقبادی کی شکستگی کی وجہ سے امروہہ میں نماز جمعہ کے لیے کوئی دوسری وسیع مسجد باقی نہ تھی-اوائل عہد مغلیہ میں اس مسجد کے مصارف کے لیے ۸ بسوہ بیگہ زمین، منجانب حکومت اسلامی، موضع شاہ پیرک سرائے میں جسے غلطی سے لوگ 'پبلک سرائے بھی کہتے ہیں' دی گئی تھی-"

مسجد کلاں محلہ کنکوئی کے بارے میں کسی تاریخ میں یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ اسے کس نے تعمیر کرایا تھا-صاحب "تاریخ امروہہ" نے یہ تحریر کیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ابتدائے عہد اکبری میں اس زمانہ کی تعمیر ہے جب مسجد کیقبادی کی شکستگی کی وجہ سے امروہہ میں نماز جمعہ کے لیے کوئی دوسری وسیع مسجد باقی نہ تھی-" سنہ ۹۷۶ھ مطابق ۱۵۶۸ء میں سرکار سنبھل (یعنی وہ علاقہ جس میں پرگنہ امروہہ شامل تھا) جو ہندوستان کے بہترین علاقوں میں سے ہے میر محمد خان مشہور بہ خان کلاں (برادر بزرگ محمد خان اتکہ) کی جاگیر میں دیا گیا- میرا خیال ہے کہ یہ مسجد میر محمد خاں مشہور بہ خان کلاں نے تعمیر کرائی ہوگی-اس زمانے میں اکبر اعظم ہی بادشاہ تھا-یہ مسجد آج بھی "مسجد کلاں" ہی کہلاتی ہے-

**مسجد جامع امروہہ:** یہ عالی شان اور خوبصورت مسجد محلہ ملانا میں متصل تالاب پانواڑی مرتفع مقام پر واقع ہے-اس کے پیچھے تالاب اور باغات کے پر فضا منظر نے مسجد کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے-موسم برسات میں بالخصوص جب مسجد کے پشت کے دروازے کھلے ہوتے ہیں تو کچھ عجب دلآویز اور پر بہار منظر ہوتا ہے-اب پانواڑی تالاب خشک ہو چکا ہے-گزشتہ زمانے میں جب اس میں پانی ہوتا تھا تو بہت ہی دلفریب منظر ہوتا تھا-

تالاب کے دوسرے کنارے پر بجنور روڈ گزر رہی ہے-

صاحب تاریخ امروہہ تحریر کرتے ہیں: "ابتدا میں یہ مسجد صرف ایک پچھلی گہہ اور مختصر سے صحن پر مشتمل تھی- اسے سید عبدالخالق بن دیوان سید محمود بن سید عبدالماجد بن سید عبدالخالق بن سید شاہ ابوالحسن بن سید محمد میر عدل نے غالباً ۱۱۰۷ھ میں اپنے خاندانی قبرستان سے متصل تعمیر کرایا تھا- مسجد سے جانب شمال سید شاہ ابوالحسنؒ اور ان کی اولاد میں دیوان سید محمود اور دوسرے اشخاص کی قبریں تھیں- اس خاندان کے قبرستان کے علاوہ اس مقام پر، جہاں اب صحن کا شرقی حصہ اور حوض وغیرہ ہے، دوسرے قدیم خاندانوں کے افراد کی بھی کچھ قبریں تھیں- سید عبدالخالق نے قبرستان کی خدمت اور مسجد کی جاروب کشی کے لیے ایک نقارچی کو مقرر کیا تھا، جسے کچھ اراضی بھی خدمت کے معاوضہ میں دی تھی-"

حال ہی میں مسجد سے ملحق پانوازی تالاب کے کچھ حصے کو پاٹ کر تقریباً چالیس فٹ توسیع کی گئی ہے- مزید اور توسیع کرنے کا پروگرام ہے جس کے لیے پانوازی تالاب کو اور پاٹا جا رہا ہے-

**مسجد بصری بیگم:** یہ خوبصورت اور وسیع مسجد مراد آبادی دروازہ کے قریب واقع ہے- یہ بھی امروہہ کی قدیم مسجد ہے جسے سنہ ۱۱۸۰ھ میں بصری بیگم نے تعمیر کرایا تھا- بصری بیگم امروہہ کے نہایت معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں- سید فیض علی بن سید محمد افضل علی بن سید محمد فاضل کی زوجہ تھیں ان کے بھائی سید غلام حسین خاں نائب ریاست رامپور تھے- اس مسجد کے گنبد اور مینار انتہائی خوبصورت اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک نمونہ ہیں- مسجد کے صحن سے ملحق وضو خانہ وغیرہ کی تعمیر نئی ہے جو غالباً بعد میں کرائی گئی ہوگی- اس مسجد کے احاطہ میں بصری بیگم کی قبر بھی ہے-

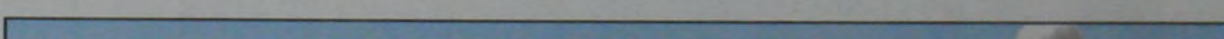
**مسجد شفاعت پوتہ:** یہ مسجد اگرچہ عہد اسلامی کی تعمیر نہیں ہے لیکن اپنی زیبائش وسعت اور مسلمانوں کے شیعہ فرقہ کی عبادت گاہ ہونے کے لحاظ سے قابل تذکرہ ہے- ابتدا میں یہاں ایک مختصر سی مسجد تھی جسے حاجی شیخ اشرف علی عظیم آبادی نے جو امروہہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ۱۲۳۳ھ میں تعمیر کرایا تھا- اس کی وجہ صاحب تاریخ اصغری نے یہ لکھی ہے کہ جناب مولوی سید محمد عبادت (پیش نماز شیعان امروہہ) مسجد کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت امام باڑہ میں پڑھایا کرتے تھے- لہذا حاجی صاحب نے یہ مسجد مختصر بنائی لیکن نمازیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اہل جماعت کو تکلیف ہوتی تھی تو حاجی صاحب نے مسجد کو وسعت



اشرف المساجد...... محلّہ شفاعت پوتہ



مسجد اسد اللہ میر کلو محلّہ گذری



مسجد حافظ عباس محلّہ چوک

دینی چاہی اور کچھ سامان تعمیر بھی فراہم کیا مگر آغاز تعمیر کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی۔اس لیے امروہہ کے شیعہ حضرات نے چندہ جمع کر کے اس مسجد کو وسیع کیا۔پانچ سال میں یہ عالی شان اور خوشنما مسجد تعمیر ہوئی۔اشرف المساجد امروہہ کا بہترین Landmark ہے،کاش کہ اس کے سامنے کی سڑک دور تک کشادہ ہوتی۔اس کے بلند اور خوبصورت مینار امروہہ کے اطراف میں میلوں دور سے نظر آتے ہیں۔سال تکمیل تعمیر ۱۲۸۴ھ ہے۔اس مسجد میں سنگ مرمر وغیرہ کا فرش کرایا گیا ہے۔میناروں کی مرمت کر کے پتھروں کے ٹائل لگائے گئے ہیں جس سے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔اشرف المساجد سے متصل سید المدارس کی خوشنما اور وسیع عمارت ہے۔

**مسجد میر کلو:** ۱۱۷۲ھ میں یہ وسیع اور خوشنما مسجد مع عمارت مدرسہ سید اسد اللہ خاں عرف میر کلو نے اپنے مکانات کے متصل محلہ گذری میں تعمیر کرائی اور ایک موضع جھرن اس کے اخراجات کے لیے وقف کیا۔ امروہہ کی قدیم مساجد میں شمار ہوتی ہے۔میر کلو امروہہ کے مشہور و معروف اور امیر گھرانے کے شخص تھے۔ آپ عہد عالمگیر ثانی میں شاہی خدمات پر مامور تھے۔آپ نے مسجد سے ملحق ایک مدرسہ بھی قایم کیا تھا۔مسجد کے صحن میں ایک خوبصورت حوض بھی ہے۔یہیں پر میر کلو کا مزار بھی ہے۔

**مسجد حافظ عباس علی خاں:** امروہہ کی تحصیل کے قریب محلہ چوک میں ایک خوبصورت مسجد حافظ عباس علی خاں یا سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔یہ بھی امروہہ کی قدیم مساجد میں ہے۔اس کی تزئین حافظ عباس علی خاں نے سنہ ۱۷۹۲ء میں کی تھی اور اس کی تعمیر ان کے جد امجد درویش علی خاں کے بھائی عاقل محمد خاں نے کرائی تھی۔مسجد ایک اونچے پلیٹ فارم پر بنی ہوئی ہے جس کے نیچے بیسمنٹ میں کچھ دکانیں ہیں۔

**مسجد عباسیاں:** یہ مسجد مولانا محمد عباسی علیہ الرحمہ جو محمود احمد عباسی کے جد اعلیٰ تھے،نے عہد اکبری کے اواخر میں اپنے مکان کے متصل تعمیر کرائی تھی۔مولانا موصوف جب آخر عمر میں شاہی خدمات سے سبکدوش ہو کر وطن چلے آئے تو اسی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔

**مسجد میر بھاون:** یہ مسجد سادات رضویہ کے میر غلام حسین بن میر رحمت اللہ کے فرزند میر غلام امامین عرف میر بھاون نے محلہ پیرزادگان میں اپنے عالی شان مکان اور دیوان خانے کے ساتھ تعمیر کرائی مسجد کے ساتھ ایک کنواں بھی تعمیر کرایا۔میر بھاون اپنے عہد کے عمائد و اکابر میں ممتاز تھے۔عرصے تک مہاراجہ مادھوجی

راؤ سندھیا کی جانب سے صوبہ دوآبہ کے گورنر رہے- حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے صاحبزادے مولوی بنے میاں اسی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے-

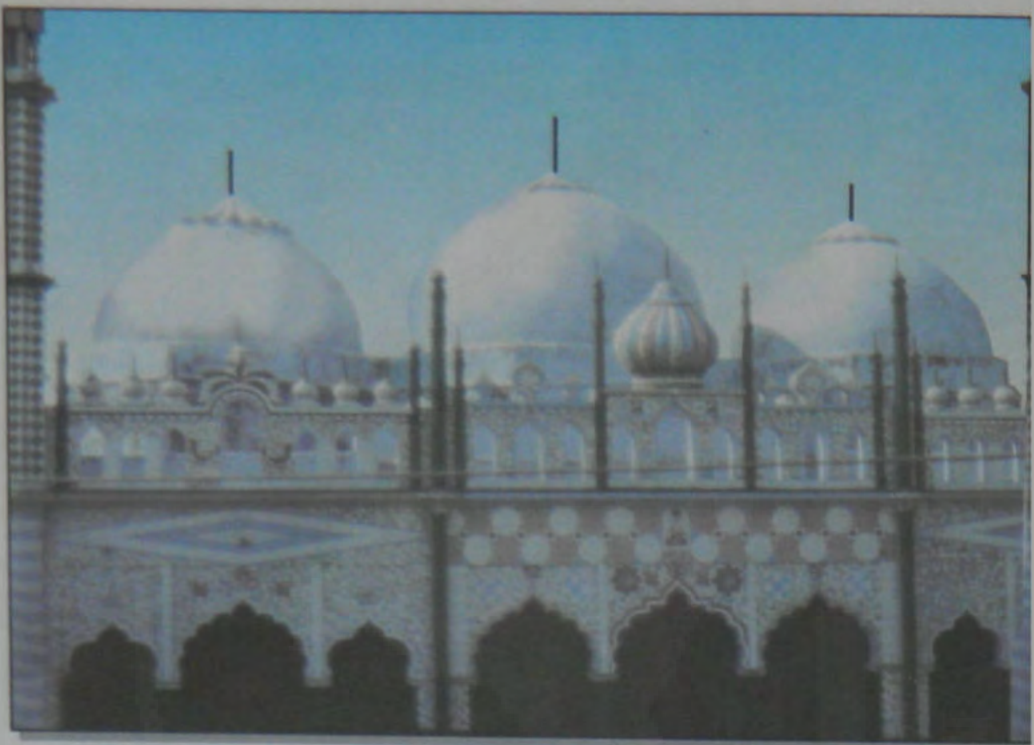
امروہے کا مشہور بلو کبابیا اسی مسجد کے صدر دروازے پر اپنی دکان لگاتا تھا جہاں صاحبان ذوق سموسے اور کباب مزے لے لے کر کھایا کرتے تھے-

**مسجد درگاہ ملک الشہدا حاجی سلیمان** : یہ مسجد درگاہ ملک الشہدا حاجی سلیمان' محلّہ بادشاہی چبوترہ میں واقع ہے- کہاجاتا ہے کہ یہ مسجد بھی بہت پرانی ہے- سنہ ۱۰۶۶ھ میں شیخ منصور بن شیخ بیرو نے تعمیر کرائی تھی- اس مسجد سے پہلے بھی اس مقام پر ایک مسجد تھی لیکن اب پرانی عمارت کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں- کچھ عرصہ پہلے اس مسجد کی مرمت کرا کر اس کے صحن کو وسیع کیا گیا ہے اور کچھ ترمیم بھی کرائی گئی ہے-

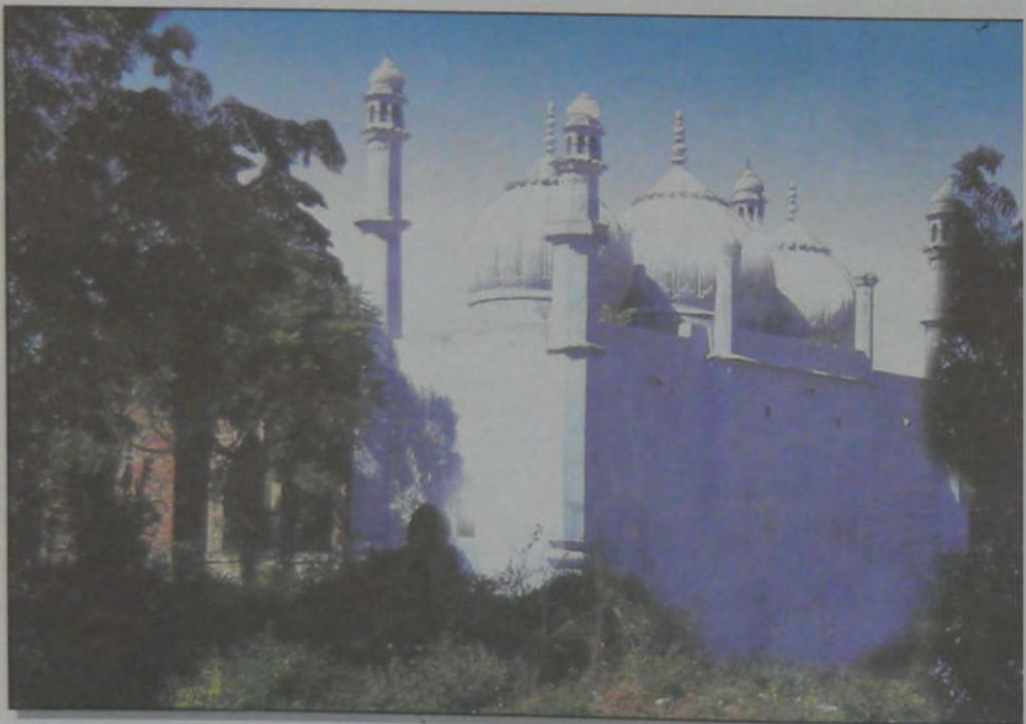
**شیرے کی مسجد**: یہ مسجد متصل محلّہ کٹرہ غلام علی واقع ہے- ۱۰۴۲ھ میں کمال خان مختار عام سید ابراہیم و سید عاقل نے کارواں سرائے کے قریب تعمیر کرائی تھی- یہ بھی امروہہ کی قدیم ترین اور خوبصورت مسجد ہے- اس مسجد کے بارے میں ایک روایت ہے کہ جب اسکی تعمیر کے لیے بنیاد کھودی گئی تو وہاں سے بڑی مقدار میں شیرہ نکلنا شروع ہو گیا جسے فروخت کرنے سے اس کی تعمیر میں بڑی سہولت ہوئی- واللہ عالم- مسجد پر کوئی کتبہ موجود نہیں، لیکن طرز تعمیر یقیناً قدیم ہے-

**مسجد تھے خاں**: یہ خوبصورت و خوشنما مسجد بیرون شہر بجانب جنوب و مغرب تھے خاں والے باغ میں واقع ہے- مسجد کے آگے بجنور روڈ ہے- تھے خاں جو حیات خاں حاکم سنبھل کے خسر تھے، امروہہ میں ساکن تھے- اپنے زمانے میں نامور اور متمول شخص تھے- یہ مسجد اور ایک کنواں بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں انہوں نے تعمیر کرایا تھا اور ایک باغ بھی لگایا تھا- شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے گزشتہ پچاس سال پہلے یہ مسجد آباد نہیں تھی- مسجد کے اطراف میں قد آور درخت اور اس کے عقب میں گھنا جنگل تھا- لیکن اب یہاں چاروں طرف آبادی ہے- آبادی ہو جانے کی وجہ سے یہ مسجد بھی آباد ہو گئی ہے- اس مسجد کا کنواں 'خونی کنواں' کے نام سے مشہور ہے-

**اندھیریا مسجد**: عیدگاہ امروہہ سے متصل درگاہ شاہ عبدالمجیدؒ قدس سرہ کے احاطہ میں واقع ہے- یہ مسجد اندھیریا مسجد کے نام سے مشہور ہے- پچاس کی دہائی میں اس احاطہ میں بیشمار گھنے اور گنجان درخت تھے جن کے



شیرے کی مسجد.......... محلہ کٹرہ غلام علی



مسجد نتھے خاں بجنور روڈ



مسجد سید محمد ابدال دربار شاہ ولایتؒ (لکڑہ)



قدیم مسجد محلہ کالی پگڑی

سایے کی وجہ سے اس مسجد میں اندھیرا رہتا تھا- لیکن اب درخت اور جھاڑیاں کاٹ دی گئی ہیں اور مسجد کی بھی مرمت کر کے آباد کر لیا گیا ہے- مسجد سے ملحق وضو کرنے کے لیے ایک بڑا حوض ہے- یہاں پانچوں وقت پابندی سے نماز ادا کی جاتی ہے- ایک مینار جو کسی زمانے میں منہدم ہو گیا تھا اب تک نہ بن سکا- مسجد کے اطراف میں بڑا خوشگوار ماحول اور روح افزا مناظر ہیں- ایک طرف عیدگاہ ہے اور دوسری اطراف میں شیخ عبدالمجید قدس سرہ اور عمدۃالواصلین سید عبدالحکیم قدس سرہ کے مقبرے اور باغات ہیں-

**مسجد چلّہ:** عہد اکبری میں ایک بزرگ شخصیت سید سراج الدین حسنی قادری آگرہ سے منتقل ہو کر امروہہ تشریف لائے اور اسی محلہ کے وسیع و عریض علاقہ میں اپنے خاندان کے مکانات بنا کر مستقل سکونت اختیار کی سید صاحب موصوف کی شادی سید ابوالقاسم صاحب کی صاحبزادی "اچھی بی بی" سے ہوئی جن کے بطن سے شاہ گداؒ تولد ہوئے- حضرت شاہ گداؒ کی نانی بی بی زینب نے عہد جہانگیری میں یہ مسجد بغیر گنبد کی تعمیر کرائی تھی- شاہ گداؒ اپنی عبادت و ریاضت کا بیشتر وقت اسی مسجد میں گزارتے تھے- یہ بھی مشہور ہے کہ موصوف نے اس مسجد میں چلّہ کشی کی تھی جس کی مناسبت سے یہ مسجد "مسجد چلّہ" مشہور ہوئی-

**مسجد سید ابدال محمدؒ:** یہ خوشنما مسجد دربار شاہ ولایت متصل محلہ لکڑہ میں واقع ہے- سید ابدال محمدؒ بن سید محمد منور نے ۱۱۴۱ھ میں تعمیر کرائی تھی- سید ابدال محمدؒ منصب دار شاہی تھے- حسب ذیل قطعہ تاریخ پتھر پر کندہ ہے:

سید ابدال حامی اسلام    مسجدے ساخت است عرش حماس
سال تاریخ از خرد گفتہ    خانہ ء کعبہ را نہاد اساس    ۱۱۴۱ھ

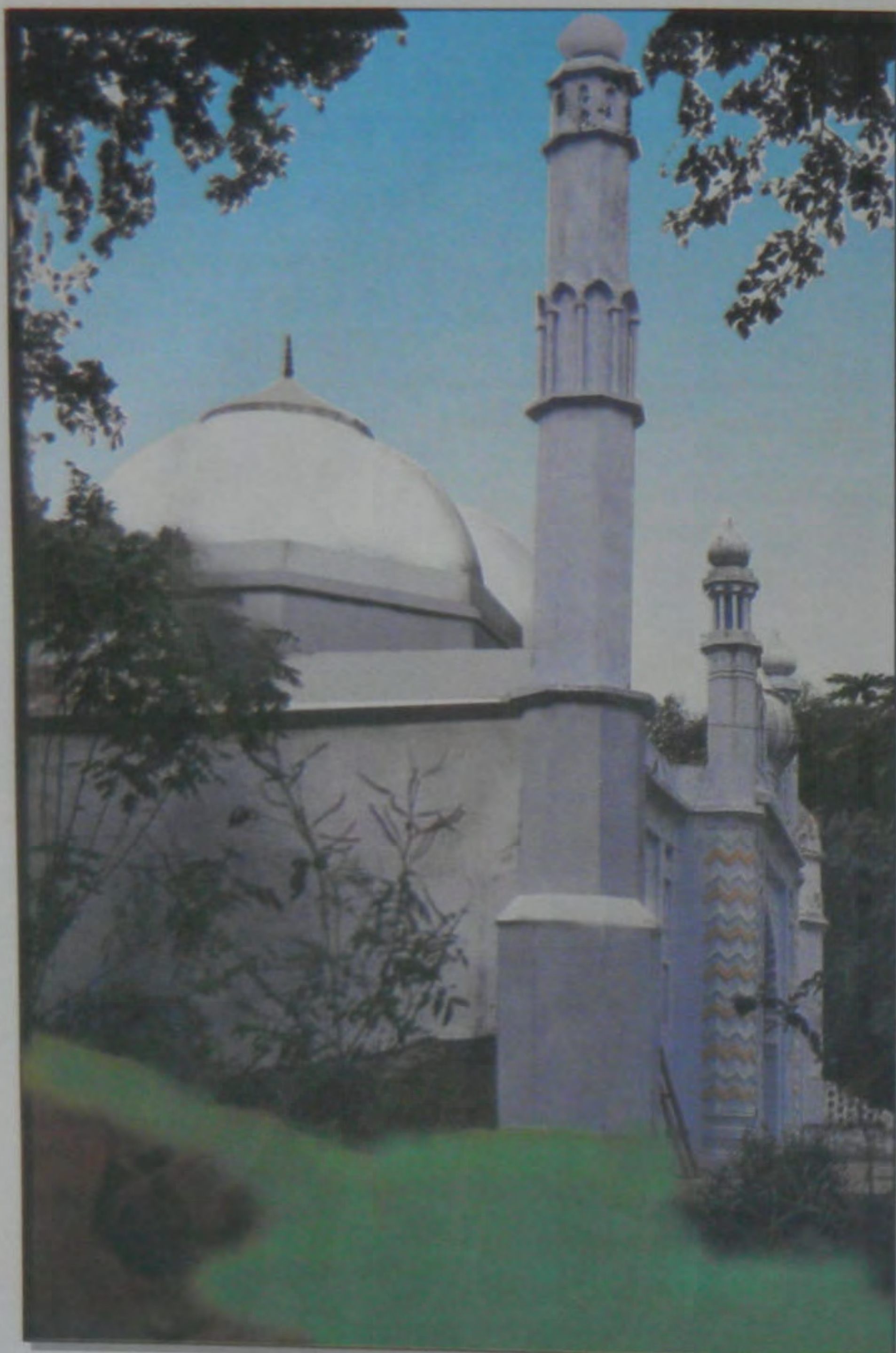
احاطہ مسجد کے شرقی و شمال گوشہ میں شاہ عبدالرسول قادریؒ کا مقبرہ ہے جو سید محمد ابدالؒ نے تعمیر کرایا تھا- شاہ عبدالرسولؒ، سید ابدالؒ محمد کے پیر طریقت تھے- آپ کو سید ابدالؒ محمد دہلی سے اپنے ہمراہ لے آئے تھے- سید ابدال محمدؒ نے موضع جلال پور وغیرہ جائداد معافی بنام مسجد وقف کر کے اپنے بیٹے سید فیض احمد کو اس کا متولی کیا- پھر تعلقات دنیاوی ترک کر کے اسی مسجد کے ایک مکان میں گوشہ نشینی اختیار کی اور چالیس برس عبادت میں مصروف رہے- قرآن شریف حفظ تھا-

**مسجد دستار سیاہ:** یہ خوبصورت مسجد محلہ کالی پگڑی میں واقع ہے- امروہہ کی قدیم مساجد میں شمار ہوتی

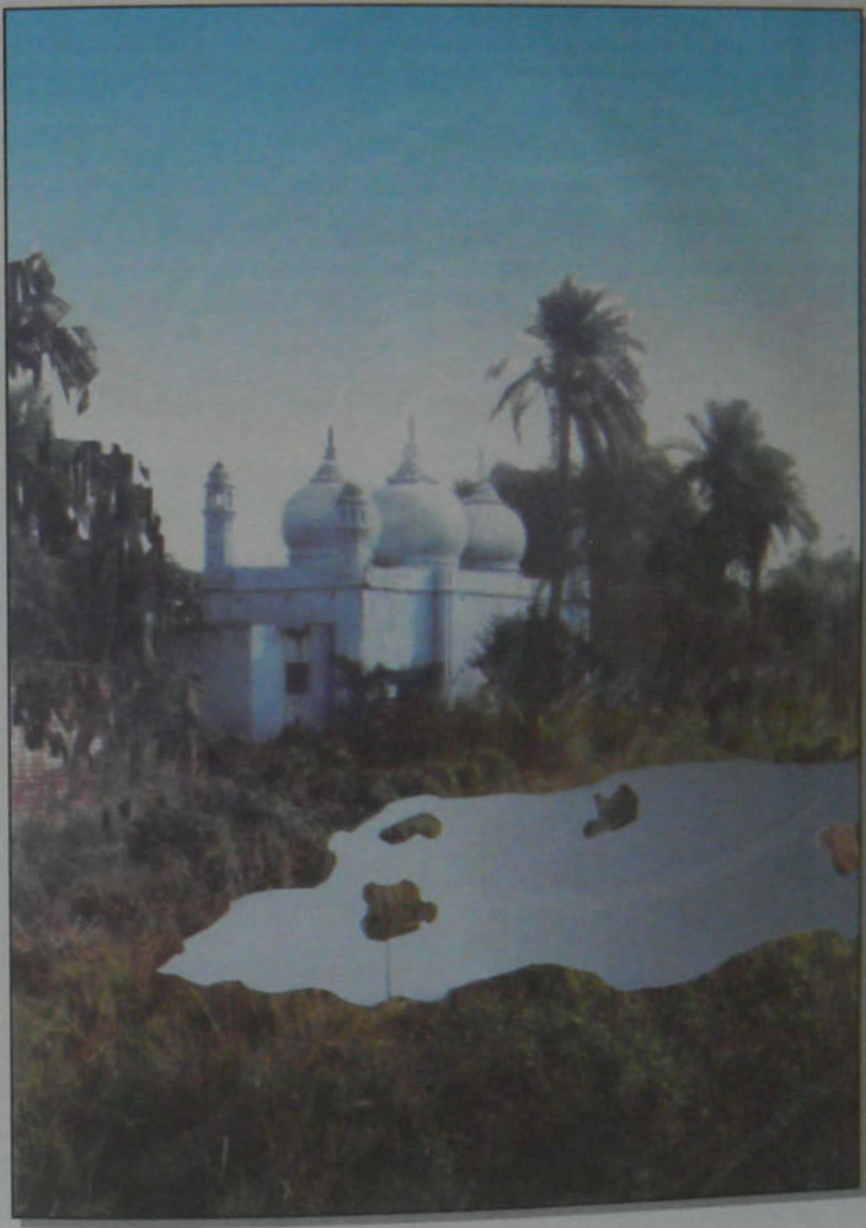
ہے۔ مسجد دستار سیاہ جو حافظ عباس علی خان کے مکان سے متصل ان کی صاحبزادی ولیہ بیگم زوجہ حکمت اللہ نے تعمیر کرائی تھی۔

ان مساجد کے ساتھ ساتھ امروہہ میں دو زنانی مسجدیں بھی تھیں۔ایک مسجد محلّہ شفاعت پوتہ میں واقع ہے جو آج بھی زنانی مسجد ہے،دوسری مسجد محلّہ تر یولیا میں تھی لیکن اب یہ مردانی مسجد ہو گئی ہے۔

-☆☆☆-



اندھیریا مسجد..........نزد عیدگاہ



قدیم مسجد...... نزد کوشک تالاب

# شخصیات

اگرچہ امروہہ ایک چھوٹی سی بستی ہے لیکن علم و ادب، شاعری اور فنون کی دنیا میں اس بستی کو جو شہرت ملی ہے وہ برصغیر کے کسی شہر کو نہ مل سکی۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں جس میں امروہہ کے لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام نہ دیے ہوں۔ سرزمین امروہہ نے 'جسے بڑے بڑے اولیا و صوفیائے کرام 'ولی اللہ' سنت اور مہاتماؤں نے اپنا مسکن بنایا۔ یہاں جتنی مشہور اور شہرہ آفاق شخصیات پیدا ہوئیں شاید ہی کسی اور شہر کو یہ فخر حاصل ہو۔

اگر امروہہ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بے شمار ہستیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ منصبداران میں' میر عدل جو عہد اکبری میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے جو بعد میں سندھ کے گورنر ہوئے۔ اردو ادب میں دیکھیں تو استاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی ہیں اور دوسری طرف میر سعادت علی جنہوں نے شہنشاہ غزل میر تقی میرؔ کو ریختہ کہنے کا مشورہ دیا تھا۔ مثنوی نگاروں میں دیکھیں تو شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار اسمٰعیل امروہوی اور ایک ایسی ہی شخصیت من لعل راغبؔ کی ہے کہ جن کا دیوان آج بھی لندن کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ مرثیہ نگاروں کو دیکھیں تو برصغیر کی نامور شخصیت شمیم امروہوی اور ان کے پوتے سید قایم رضا نسیمؔ' جنگ آزادی کے نامور سپاہیوں میں احسان اللہ کو پھانسی دی گئی۔ سید شبیر علی' خلیفہ امان اللہ اور خیر اللہ کو سزائے دائم الحبس بہ عبور دریائے شور و ضبطی جائداد کی سزا دی گئی اور سید گلزار علی نے جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ خاندان درویش علی خاں میں مولوی حکیم بشارت علی خاں، ولایت علی خاں، مہربان علی خاں وغیرہ اکتالیس آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد لوگوں کو جنگ آزادی کی سزا میں پھانسی ہوئی اور جائدادیں ضبط کی گئیں۔ ملت

اسلامیہ کا دور رکھنے والے نواب وقار الملک مشتاق حسین جنہوں نے سر سید احمد خاں کے انتقال کے بعد علی گڑھ کی تحریک کو بھرپور سیاسی رنگ دیا اور مسلمانوں کو ایسی ڈگر پر ڈالدیا جس کی بناء پر ان کا سیاسی تشخص وجود میں آیا- عالموں میں دیکھیں تو شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن، محدثین میں دیکھیں تو مولانا احمد حسن محدث' اطباء میں دیکھیں تو حکیم احمد سعید' شفاء الملک مولانا حکیم رشید احمد خاں خلف علی بہادر خاں علی' مولانا مولوی حکیم فرید احمد عباسی' حکیم سید محمد' حکیم سید احمد (اچھو)' حکیم مستحسن اور حکیم سید حسن عسکری رضوی' صحافت میں دیکھیں تو رئیس امروہوی اور سید محمد تقی' ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور قمر علی عباسی' مصوری میں دیکھیں تو صادقین (مرحوم) اور اقبال مہدی اور تاباں صاحب کی صاحبزادی زیبا' مجسمہ سازی میں دیکھیں تو افسر مدد نقوی' فلم انڈسٹری میں دیکھیں تو کمال امروہی اور نجم نقوی' جبکہ ہندو مسلم بیوروکریٹس اور میڈیکل کے میدان میں بڑے بڑے فزیشین اور سرجن ہوئے ہیں' غرضکہ اس سرزمین نے ایسے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جنہوں نے اپنے علم و فن سے امروہہ کا نام روشن کیا-

اس باب میں ایسی شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے حیات میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور سرزمین امروہہ کے نام کو چار چاند لگائے- ایسی شخصیات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جن کے بارے میں ایک طرف تو پاکستان میں بیٹھ کر معلومات کا حصول تقریباً ناممکن ہے اور جن کے ناموں کا پتہ بھی چل گیا ہے تو ان کے کوائف کا حاصل کرنا بھی آسان نہیں- میں نے بڑی کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا ذکر کروں جنہیں ہماری نئی نسل اب بھولتی جا رہی ہے- میری بدقسمتی کہیے کہ باوجود انتہائی خواہش اور جدوجہد کے مجھے بیشتر صاحبان علم و فن کے بارے میں تفصیلات مہیا نہ ہو سکیں- اس کی وجہ ظاہر ہے کہ امروہہ سے سیکڑوں میل دور بیٹھ کر یہ کام انتہائی دشوار ہے- حالانکہ اس سلسلے میں "کشورِ اولیا" کی طباعت کو التواء میں بھی رکھا' بہت سے خطوط امروہہ لکھے اور کراچی میں بھی امروہہ کے لوگوں سے ملا- مجھے افسوس اس کا رہے گا کہ بہت سی ایسی شخصیات جو یقیناً بڑی اہم ہوں گی اس کتاب میں ان کا تذکرہ نہ ہو سکا- بہر حال جن شخصیات کے بارے میں جو کچھ میسر آیا' بیان کیا جا رہا ہے- یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں نے شخصیات کے ناموں کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی ہے-

**آل احمد نقوی:** سید محمد میر عدل کی اولاد میں سید آل احمد ولد سید ظہور حسین محلہ کٹکوئی کا نام امروہہ کی علمی و ثقافتی دنیا کا اہم نام ہے- موصوف ایکسائز انسپکٹر تھے اس لیے اہل امروہہ ان کو آل احمد آبکاری کے نام سے

یاد کرتے تھے- موصوف نہایت باہمت اور دوراندیش ترقی پسند شخص تھے- تعلیم نسواں کے سلسلے میں جب سر سید نے مسلمان قوم کو متوجہ کیا تو ہر طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوئی- امروہہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا مگر سید آل احمد نے اس سمت میں جرات مندانہ قدم اٹھایا اور آل احمد گرلز اسکول کی بنیاد رکھی- امروہہ میں ہر طرف ان کی مخالفت کا شور تھا- اکثر شعراء نے ان کی ہجو میں نظمیں کہیں مگر یہ بہادر انسان اپنے مقام پر ڈٹا رہا اور اپنی کچھ جائداد بھی اس اسکول کے لیے وقف کردی- ان کے انتقال کے بعد سید مسعود حسن وکیل اور سید سجاد الحسنین وکیل نے اسکول کو آگے بڑھایا اور آج یہ اسکول انٹر کالج ہے جبکہ اس کو کالج کا درجہ پانے کے امکانات بہت قوی ہیں- اس اسکول نے تعلیم نسوان کے فروغ میں اہم خدمات انجام دی ہیں جس کا سہرا سید آل احمد بانی اسکول کو جاتا ہے-

**آلِ محمد رضوی عرف مُنّو میاں:** سید آلِ احمد رضوی مشہور طبی خاندان کے چشم و چراغ تھے- آپ نے جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے تعلیم حاصل کی- آپ کے نانا حکیم احمد سعید صاحب ریاست حیدر آباد میں افسر الاطباء تھے- حکیم آلِ محمد صاحب عرف منو میاں بھی اپنے نانا کی طرح بڑے قابل اور معروف حکیم تھے- تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی اور یہیں آپ کی وفات ہوئی-

**آلِ احمد نقوی:** سید آل احمد نقوی (شدن) ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ سید آل محمد محلہ سدو کے فرزند ہیں- ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے مکتب میں پائی اور ساتھ ہی ساتھ قرآن پاک پڑھا- ۱۹۴۶ء میں امام المدارس انٹر کالج سے میٹرک پاس کیا اس کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی- کام کیا-

آزادی کے بعد سنہ ۱۹۵۹ء میں آپ پاکستان آگئے اور انڈونیشی سفارتخانے سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا- آپ سنہ ۱۹۵۹ء تک انڈونیشی سفارتخانے میں کمرشیل اتاشی کے اہم منصب پر فائز رہے- سنہ ۱۹۶۰ء میں PIA سے منسلک ہوگئے جہاں ترقی پاتے ہوئے آپ جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچے اور سنہ ۱۹۹۴ء میں اسی عہدے سے آپ ریٹائر ہوئے- دوران ملازمت جینوا، سوئٹزرلینڈ، لندن، روم اور دوبار لندن میں تعینات رہے اور دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا- اسلامی کتب کا مطالعہ آپ کا محبوب مشغلہ ہے- آپ نے ایک کتاب "تسخیر عالم کا یہودی منصوبہ" بھی تصنیف کی ہے- مختلف رسائل میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں-

**اسد اللہ خان:** سید غلام اسد اللہ خاں امروہہ کے رئیس اور نامور شخص تھے جو اپنے لقب "میر کلو" کے نام

سے آج تک مشہور و معروف ہیں- آپ عہد عالمگیر ثانی میں پنج ہزاری کے اہم عہدے پر فائز تھے- آپ بڑے بہادر، باہمت اور دور اندیش تھے- پانی پت میں مرہٹوں کے ساتھ لڑائی میں آپ نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے- نواب دوندے خان کی حکومت میں آپ انتہائی معتبر اور باہمت شخص سمجھے جاتے تھے-

میر کلو بہت ہی منکسر المزاج اور ایک بڑے عالم تھے- رئیس ہونے کے باوجود آپ کا رہن سہن بہت سادہ اور عام لوگوں جیسا تھا- آپ نے امروہہ کے بازار گذری میں بہت سے مکانات اور بازار بنوائے- ایک دروازہ' جو محلہ گذری میں واقع تھا اور بسبب تین راستوں کے ترپولیہ کہلانے لگا' آپ ہی نے تعمیر کرایا تھا- آپ بڑے دیندار' مخیر اور بڑے عالم تھے- آپ نے اسی محلہ گذری میں خوبصورت مسجد تعمیر کرائی جس میں ایک خوشنما حوض اور دینی مدرسہ بھی تعمیر کرایا اور اس کے مصارف کے لیے موضع جھرن میں زمین بھی وقف کر دی تھی- یہ مسجد اور مدرسہ' جہاں ہزاروں تشنگان علم فیضیاب ہوتے چلے آ رہے ہیں' آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں- اسی مسجد کے احاطے میں موصوف کا مزار ہے-

**احمد سعید:** حکیم احمد سعید حکیم سید اکبر سعید کے بڑے فرزند تھے- سنہ ۱۸۴۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی- امروہہ اور رامپور میں فن طب کی تکمیل کے بعد اپنے پدر بزرگوار اور چچا سے عملی طب کی تحصیل کی- تھوڑی مدت میں آپ کی وسعت نظر اور کمال فن کا دور دور شہرہ ہو گیا-

حکیم احمد سعید صاحب اپنی قابلیت کے لحاظ سے بو علی سینا تھے- جس زمانے میں آپ حیدر آباد میں افسر الاطبا کے منصب پر فائز تھے تو اس وقت یورپ کے ڈاکٹروں کی تحقیقاتی کمیٹی مرض جذام کی تحقیقات کے لیے ہندوستان آئی- آپ نے بھی اس کمیشن کے سامنے اس مرض پر اپنا تفصیلی بیان (Detailed Report) دیا- اس بیان کا انگریزی ترجمہ جب اراکین وفد کے سامنے پیش ہوا تو سب کے سب حیران رہ گئے کہ طب یونانی کے ایسے ایسے ماہر ہندوستان میں موجود ہیں- متعدد ضخیم تالیفات عربی اور اردو میں آپ کی یادگار اور کمال فن کی شاہد ہیں- اس میں اہم ترین "تشخیص کامل" عربی میں ہے- اس میں تیرہ مقالے ہیں اور ہر مقالہ کا حجم آٹھ سو صفحات تک ہے- سنہ ۱۸۹۷ء کو آپ کی وفات حیدرآباد دکن میں ہوئی اور وہیں آسودہ خاک ہوئے-

**امین الدین:** مولانا مولوی حکیم امین الدین سنہ ۱۲۹۳ھ میں وطن آبائی شاہ آباد علاقہ ریاست رامپور میں پیدا ہوئے- آپ پٹھانوں کے خاندان سے ہیں- مولانا احمد حسن امروہوی رحمتہ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں

میں تھے۔ آپ نے بھی جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے تو امروہہ ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ مولانا احمد حسن امروہوی کی حیات تک مدرسہ ہی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے بعد ازاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے باصرار تمام اپنے صاحبزادے جمیل میاں کی طبی تعلیم کے لیے اپنے پاس دہلی بلالیا۔ آپ طبیہ کالج دہلی کے زنانہ شعبہ کے پرنسپل رہے اور طب کی بہترین کتاب "کلیات نفیسی" کا اردو ترجمہ کیا ہے جو شائع بھی ہوا۔

**امائین عرف میر بھاون:** میر غلام امائین عرف میر بھاون اپنے عہد کے مشہور و معروف عمائدین واکابر میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کے والد کا نام میر غلام حسین تھا۔ آپ عرصہ تک مہاراجہ مادھوجی راؤ سندھیا کی جانب سے صوبہ دوآبہ کے گورنر رہے۔ صوبہ داری کے عہد میں آپ نے اپنی سکونت کے لیے گڑھ مکتیسر کے قدیم قلعے کی از سرنو مرمت کرائی۔ فرانسیسی نژاد مرہٹہ سپہ سالار جنرل پیران اور انگریزی فوج کے جنرل آکٹرلونی سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ کسی معاملہ پر نواب اودھ اور آپ کے درمیان کشیدگی ہوئی تو نواب نے برافروختہ ہو کر آپ کی جاگیر کا کچھ حصہ جو حکومت اودھ کی حدود میں تھا ضبط کرلیا جس کی آپ نے کوئی پرواہ نہ کی۔ میر غلام امائین نے امروہہ میں بھی عالی شان مکان 'دیوان خانے اور ایک خوشنما مسجد تعمیر کرائی جو میر بھاون کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔

**امان علی نقوی:** سید امان علی شجر ۸/ اگست سنہ ۱۹۱۹ء میں امروہہ کے نقوی سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندانی سلسلہ حضرت سید شرف الدین شاہ ولایتؒ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد سید صابر علی خاں کا شمار امروہہ کے مشہور سیاسی لوگوں میں ہوتا تھا۔ "Quit India" کی تحریک میں جیل بھی گئے۔

امان علی نے ایسے سیاسی گھرانے میں آنکھ کھولی تو ظاہر ہے کہ آپ کی شخصیت پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ میٹرک، منشی اور اعلیٰ قابلیت کے امتحان پاس کرنے کے بعد امروہہ میں اے۔ آر۔ پی کی ملازمت کے ساتھ ریڈیکل ڈیماکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد آپ سیاست سے کنارہ کش ہوگئے اور معاش کی تلاش میں حیدرآباد دکن چلے گئے۔ آزادی کے بعد آپ پاکستان آگئے اور محکمہ موسیات میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف محکموں میں خدمات انجام دیں۔

امان علی میرے برادر بزرگ محمد حسین مرحوم کے اچھے دوستوں میں تھے۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کا بھی بڑا

ذوق ہے- چنانچہ مختلف موضوعات پر مضامین اور دو کتابیں "ملفوظات" حکیم ذاکر حسین اور "مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم ذاکر حسین ماتی" اور "مجموعہ قوانین اسلام" مولفہ ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن کی پانچ جلدوں اور "یورپ میں مخطوطات" مولفہ ڈاکٹر آغا افتخار حسین ڈائریکٹر فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا اشاریہ تدوین کیا- حال ہی میں ایک کتاب "گلدستہ امروہہ" تالیف کی ہے- آپ اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کے بھی ماہر ہیں- جب مرکزی اردو بورڈ نے اردو ٹائپ رائٹر کے کلیدی تختے کی اصلاح کے لیے اہل علم کی ایک کمیٹی تشکیل دی تو آپ کو بحیثیت ماہر کمیٹی کا رکن مقرر کیا-

**اظہار امروہوی:** اظہار الحسن صدیقی پاکستان میں ایک سیاسی شخصیت ہیں- آپ کے والد حکیم عبدالحکیم صدیقی امروہہ کے معززین میں شمار کیے جاتے تھے- اظہار امروہوی محلہ قریشی امروہہ میں پیدا ہوئے- اظہار شاعر بھی ہیں ادیب بھی اور صحافی بھی- بقول ان کے "دنیائے شعر و سخن کے معتبر نام مصحفی کے مولد امروہہ سے تعلق کی بنیاد اور رئیس امروہوی کی شخصیت سے متاثر ہو کر میں نے اپنے نام کے ساتھ امروہوی لکھنا شروع کیا تھا" آپ نے امروہہ میں تعلیم حاصل کی- سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان آگئے- اظہار راولپنڈی میں روزنامہ "انجام" کے بیورو چیف "جراءت" کے ایڈیٹر تھے- آپ نے "مساوات" کے لیے بھی کافی عرصے کام کیا اور سعید ہارون کے میگزین "ایسٹرن فیئر" کراچی سے بھی وابستہ رہے- سنہ ۱۹۷۲ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے متعارف ہوئے اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر سیاسی زندگی کا آغاز کیا- ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے نہایت قریبی تعلق تھا- وہ سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت میں پیپلز پارٹی کے ممتاز رہنما سکریٹری اطلاعات اور خصوصی معاون برائے پارلیامانی امور بھی رہے- آپ پارٹی کے حلقوں میں امروہوی صاحب کہلاتے ہیں- آجکل بھی وہ اسی پارٹی میں اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں-

**ادریس احمد:** سید ادریس احمد جیلانی ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو امروہہ کے مقتدر خاندان سادات میں پیدا ہوئے- آپ سید محمد احمد ساکن محلہ چلہ کے فرزند ہیں- آپ کے دادا مولوی شعیب احمد امروہہ کے بڑے لائق اور دیندار لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے- مولوی شعیب احمد نے امروہہ کے مشہور و معروف مدرسہ چلہ کی تاسیس اور ترقی میں بڑا نمایاں کردار انجام دیا تھا- اس مدرسے میں آج تک ہزاروں طلباء دینی تعلیم سے فیضیاب ہوتے چلے آرہے ہیں-

ادریس احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز پی-ایف اسکول سرگودھا سے کیااور یہیں سے آپ نے سینئر کیمبرج اعلیٰ گریڈ میں پاس کیا-اسی اسکول میں دوران تعلیم آپ کو فضائی سروس سے لگاؤ ہوا-سینئر کیمبرج سے فارغ ہوئے تو گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی سے ایف-ایس-سی کیا-اس کے بعد بی-ایس-سی آنرز کے لیے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیااور ساتھ ہی ساتھ پرواز کی تربیت حاصل کرنے کے لیے ایک ٹیسٹ پاس کرکے ایروکلب میں بھی داخلہ لے لیا-ابھی آپ بی-ایس-سی کے دوسرے سال ہی میں تھے کہ پی-آئی-اے میں آپ بحیثیت کیپٹن منتخب ہوئے اوراپنی سروس کا آغاز کیا-

ابتدا میں آپ کو 707 جہاز پر Instructor مقرر کیا گیا پھر اسی جہاز پر آپ فلیٹ Inspector اور بعد میں Air Bus کے چیف پائلٹ بنائے گئے-اس کے بعد آپ کی انتھک خدمات اور اعلیٰ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے آپ کو Chief Pilot Standard Inspection کا اہم عہدہ سونپا گیا-اس کے علاوہ آپ پاکستان ایئر لائن کی سب سے مضبوط ایسوسی ایشن (PALPA) کے دو سال ایگزیکٹو ممبر اور ایک سال صدر بھی رہے-ادریس اپنے ادارے کی ذمہ داریوں کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں-انہیں VIP Pilot ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے-آجکل آپ Director Flight Operation کے انتہائی اہم عہدے پر خدمات انجام دے رہے ہیں-

ادریس احمد اپنے ادارے میں مخلص، ایماندار، مددگار اور انتہائی اعلیٰ ظرف اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں-ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن میں ایک ہی وقت میں خلوص و محبت، انکساری وایمانداری اور دین کی طرف رجحان پایا جائے-روزہ نماز کے آپ ایسے پابند ہیں کہ دوران پرواز بھی قضا نہیں کرتے-اس کے علاوہ بھی آپ میں بہت سی خوبیاں ہیں جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہیں-وہ اپنے پیشۂ پرواز میں بڑے ماہر اور بہت تجربہ رکھتے ہیں-۱۹۷۱ء میں اپنی ماہرانہ خدمات کے نتیجے میں آپ کو تمغۂ قائداعظم سے نوازا گیا-

ادریس احمد کو یوں تو ہلکی پھلکی موسیقی سے بھی لگاؤ ہے اور خود بھی ماؤتھ آرگن بہت خوب بجاتے ہیں لیکن آپ کا بہترین مشغلہ کتابوں کا مطالعہ ہے-کھیلوں میں کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی-دوران تعلیم بحیثیت انگریزی مقرر کے آپ Debates میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ہمیشہ فی البدیہہ تقریر کیا کرتے تھے-میرے مرحوم برادر محمد حسین صدیقی کے بہترین شاگردوں میں ہیں-انہوں نے ادریس احمد کو انگریزی مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ ایک اچھے Debator کی تربیت بھی دی-

## اقبال مہدی

کہنے کو تو امروہہ ایک مختصر بستی ہے لیکن علم وادب' شاعری اور فنون کی دنیا میں جو اس بستی کو آفاقی شہرت ملی ہے وہ برصغیر کے کسی شہر کو نہ مل سکی- یہ بستی ایک ایسا چمن ہے جس کے پھولوں کی خوشبو چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے- شخصیتوں کے گلہائے رنگارنگ میں ایک ہونہار شخصیت جناب اقبال مہدی کی ہے جنہوں نے دنیائے مصوری میں ایک منفرد مقام پایا ہے- اقبال مہدی کا تعلق امروہہ کے محلہ دربار شاہ ولایتؒ (لکڑہ) سے ہے- آپ کے اجداد میں سید امیر علی ایک مسلّم حاذق طبیب تھے اور پرداداسید حمزہ علی کا شمار امروہہ کے علماء اور فضلاء میں ہوتا تھا- اقبال کے والد میر علی بھی ایک اچھے مصور تھے- اس طرح اقبال مہدی کو مصوری ورثے میں ملی- آپ کے والد کو فنِ موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا-

سرزمین پاکستان میں اقبال مہدی نے اپنے موروثی فن کو ایسی جلا بخشی کہ ان کے تخلیقی فن اور موقلم کا عالمی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے- ملک وبیرون ملک آپ کی ڈرائنگ اور پینٹنگ کی ۲۶ نمائشیں ہو چکی ہیں- اقبال مہدی فری ہینڈ پینٹنگ اور پین سے ڈرائنگ بناتے ہیں- آپ کی پینٹنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے دیکھ کر یہ لگتا ہی نہیں کہ ہمارے سامنے کوئی پینٹنگ ہے بلکہ حقیقت کا اظہار ہوتا ہے- سنہ ۱۹۹۸ء میں حکومت پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی (Pride of performance) سے نوازا- ایشیا کی who is who میں آپ کا نام بطور مشہور عالم مصور کے شامل کیا گیا ہے- آپ فراخ دل اور کشادہ ذہن کے مالک ہیں- آپ نے اپنے علم کو اپنی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسروں کو بھی دیا- آپ نے بیسیوں شاگردوں کو پینٹنگ اور پین اسکیچنگ سکھائی ہے-

## افسر مدد

برصغیر ہندوپاک اور بیشتر ممالک میں کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں امروہہ نے نمائندگی نہ کی ہو- یہاں پر ہم Sculpture کے حوالے سے جناب افسر مدد (مرحوم) کا ذکر کررہے ہیں- ان کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان نقوی سے تھا- آپ کے والد محترم سید جعفر مدد' جن کی رہائش محلہ قاضی زادہ میں تھی' نہایت شریف انسان تھے- افسر مدد امام المدارس ہائی اسکول میں میرا بھی ہم جماعت رہا ہے- وہ بچپن ہی سے مصوری' ڈرائنگ' پینٹنگ اور خوش نویسی میں بڑی دلچسپی لیا کرتا تھا- مصوری کا شوق اسے علی گڑھ لے گیا جہاں اس نے مرزا سجاد حسین سے پورٹریٹ کی پینٹنگ کے فن کو سیکھا- اس کے بعد افسر مدد لکھنو چلے گئے جہاں انہوں نے آرٹس کالج میں داخلہ



اقبال مہدی کی بنائی ہوئی علامہ **اقبالؒ** کی تصویر



اقبال مہدی کی مختلف پینٹنگز





لیا- یہاں پر انہوں نے محمد حنیف سے 'جو ایک مشہور Sculpturist رائے چودھری کے شاگرد تھے' مجسمہ سازی سیکھی-اسطرح افسر مدد کو وہ راہ مل گئی جس پر وہ زندگی بھر گامزن رہا-

پاکستان ہجرت کے بعد کراچی آرٹس کونسل میں افسر مدد نے اپنے تراشیدہ فن پاروں کی نمائش کا اہتمام کیا جو اس ملک میں مجسمہ سازی کی پہلی نمائش تھی-اس کے بعد سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کراچی کے بانی نوابزادہ واجد محمود صاحب نے اس فن کی تعلیم وتربیت کے لیے افسر مدد سے درخواست کی- چنانچہ افسر مدد ۲۵ سال تک اس ادارے سے منسلک رہے-افسر مدد اپنی تخلیقات کی پائیداری کے لیے لکڑی' دھات' پلاسٹر آف پیرس اور Terra-cotta (سرخی مائل بادامی رنگ کی مٹی) زیادہ استعمال کرتے تھے-کلاسیکل اسٹائل میں افسر مدد کو انفرادیت حاصل تھی-ایک دوست اور فن کے پرستار کی حیثیت سے اس کا بے حد غم رہے گا کہ قدر دانوں کے فقدان نے ایک عظیم فنکار کو ایسا مایوس کیا کہ وہ اپنی تمناؤں کے ساتھ دنیا سے گزر گیا اور عمر نے اتنی بھی وفا نہ کی کہ اپنے قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس کراچی کو وہ مقام دلا سکتا کہ جس کے لیے اس نے اسے قائم کیا تھا-اس کی خواہش تھی کہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر وادی مہران کے قدیم فن کو پھر زندہ کردے-

**اختر حسن:** سید اختر حسن حکیم مولوی سید محبوب الرحمن کے صاحبزادے ہیں- آپ حکومت پاکستان کی جانب سے آزاد حکومت جموں وکشمیر میں سکریٹری مالیات کے اہم منصب پر فائز رہے ہیں-ادارہ عالیہ تنظیم المساجد ومدرسہ عربیہ اسلامیہ اسلام آباد میں بالترتیب امین العام اور مہتمم ہوئے-

**اظہار احمد عباسی:** اظہار احمد عباسی ۲ر فروری ۱۹۴۳ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد امروہہ کے خاندان عباسی سے تعلق رکھتے تھے-اظہار احمد نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی- آپ نے بلوچستان یونیورسٹی سے MA.Economics. کیا پھر پاکستان کی اعلیٰ ملازمتوں کا امتحان پاس کیا- تعلیم سے فارغ ہوئے تو بلوچستان میں منسٹری آف فائنانس، منسٹری آف ہوم، منسٹری آف کلچر میں سکریٹری کے اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں- آخر میں آپ Public Service Commission Board کے سکریٹری مقرر ہوئے اور یہیں سے آپ ریٹائر ہوئے-

**ایوب صدیقی:** محمد ایوب صدیقی محلہ چاہ شور امروہہ کے ایک غریب گھرانے میں سنہ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے- آپ کے والد محمد یعقوب بڑے دیندار اور نیک انسان تھے-ایوب اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں-جب

انہوں نے ہوش سنبھالا تو تکلیفیں اور پریشانیاں دیکھیں- ظاہر ہے ایسے حالات میں تعلیم کا حصول بڑا مشکل تھا- ہوش سنبھالتے ہی ان پر گھر کی ذمہ داریاں آپڑیں- چنانچہ چھوٹی ہی عمر میں تعلیم چھوڑ کر دہلی چلے گئے جہاں جمیعت علمائے ہند کے دفتر میں ملازمت اختیار کرلی- کئی سال ملازمت کے بعد سنہ ۱۹۵۷ء میں بیڑی بنانے کا کام سیکھ کر بیڑیاں بنانی شروع کیں- سنہ ۱۹۶۴ء سے اپنی بیڑی بنا کر چلائی جو بہت مقبول ہوئی- رفتہ رفتہ انہوں نے بیڑی بنانے کا اپنا کارخانہ قایم کرلیا-

ایوب رفاہی اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں- سنہ ۱۹۷۰ء سے بیڑی مزدور یونین کے سکریٹری چلے آرہے ہیں- سنہ ۱۹۹۴ء سے آپ کریم خاں کالج کے منیجر بھی ہیں- اس کے علاوہ ایک اور تعلیم ادارہ "بیڑی ورکر مسلم گرلز انٹر کالج امروہہ" کے ممبر ہیں-

**انتقام علی:** نواب انتقام علی خاں سرسی محمود پور کے نوابوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زمینیں اور مکانات وغیرہ آج بھی سرسی میں موجود ہیں جہاں ان کا پورا خاندان آباد ہے- مگر انتقام علی خاں جب امروہہ آئے تو یہاں کی فضائیں ایسی بھائیں اور یہاں کا ماحول ایسا راس آیا کہ یہیں کے ہو رہے- امروہہ کی مشہور سماجی اور مذہبی شخصیت سید وجاہت حسین محلّہ نوگیاں کی صاحبزادی سے شادی کے بعد امروہہ کی بود و باش اختیار کرلی- امروہہ کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے رکن رکین بن گئے- انجمن تحفظ عزاداری امروہہ کے عہدیدار رہے اور امام المدارس انٹر کالج کے منیجر بھی رہے- ان کے منیجری کے زمانے میں امام المدارس میں نوجوان قیادت ابھری اور کالج نے ایک نئی جہت اختیار کی- انتقام ایک ملنسار اور محبت کرنے والا انسان ہے- وہ امروہہ میں ہر دلعزیز بھی ہے- وضعداری اور شائستگی اس کے کردار کا روشن پہلو ہے- دوستوں سے پیار، ان کی مدارات، بزرگوں کی عزت اور خوردوں سے محبت و شفقت اس کا شعار ہے-

**ارمان مہدی:** سید ارمان مہدی ولد سید کرار مہدی محلّہ حقانی 'میر تقی میرؔ کے معنوی استاد میر سعادت علی سعادتؔ کی چھٹی پشت میں ہیں- ارمان مہدی میرے بچپن کے ان ساتھیوں میں سے ہیں جنہوں نے زمانے کے سرد و گرم ایک ساتھ جھیلے- امام المدارس میں ہم دونوں ہم جماعت تھے- ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک- آج بھی دل یہی چاہتا ہے کہ وہی فرصت کے رات دن ہوں اور ہم گھنٹوں پانواڑی کی پلیہ پر بیٹھ کر باتیں کریں- ارمان مہدی امروہے کی سیاسی' سماجی اور مذہبی زندگی میں خاصا متحرک رہا ہے اور یہ تو وہ اسکول

کے زمانے میں بھی کرتا تھا-

**ابو محمد:** سید ابو محمد امروہہ کے ایک مشہور و معروف فوٹوگرافر تھے- محلہ کوٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل پر آپ کا اسٹوڈیو تھا- ابو محمد ۱۹۰۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد سید محمد (سید حسن) ریاست پنا میں پولیس انسپکٹر تھے- محکمہ پولیس میں اچھی کارکردگی پر برٹش گورنمنٹ نے متعدد انعامات سے نوازا-

سید ابو محمد نے سنہ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کیا- ابتدا میں آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا لیکن ایک دو سال کے بعد آپ نے فوٹوگرافی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا- اس فن میں ماسٹر حسن صغیر امروہوی اور رگھونندن مراد آبادی کی شاگردی اختیار کی، اور ایسے ماہر ہوئے کہ نہ صرف امروہہ میں مشہور و معروف تھے بلکہ دوسرے شہروں میں بھی آپ کی مہارت کا چرچہ تھا- فوٹوگرافر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک اچھے مرثیہ خواں بھی تھے- سنہ ۱۹۸۴ء میں آپ کی وفات ہوئی- آپ کے فرزند سید ریاض محمد، سید نثار محمد اور سید اکرام محمد بھی امروہہ کے اچھے فوٹوگرافر ہیں جو اپنے والد کے اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں- ریاض محمد ممبئی کی فلم انڈسٹری میں بحیثیت کیمرہ مین خدمات انجام دے رہے ہیں-

**امام علی نازش:** سید امام علی نازش سید انور حسن خاں کے فرزند ہیں- لگ بھگ سنہ ۱۹۵۰ء میں امروہہ سے پاکستان آگئے- آپ پاکستان کیمونسٹ پارٹی کے سیکٹری جنرل ہیں- امروہہ میں آپ کی سکونت محلہ دربار کلاں میں تھی- دربار کلاں کے امام باڑہ میں توسیع و ترمیم آپ کے والد محترم نے ہی کرائی تھی جس میں ایک مکتب بھی قایم ہے-

**ابھینندن کمار جین:** آپ امروہہ کے نامور جین گھرانے میں سنہ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے- آپ کے والد بزرگوار کا نام مکٹ بہاری لعل جین ہے- آپ ایک بڑے ہردلعزیز اور غریب عوام کی خدمت کرنے والے سماجی کارکن ہیں- سنہ ۱۹۵۵ء میں جب ہندی زبان کو فروغ دینے کے لیے ایک ادارہ "ہندی پرچار سبھا" قایم کیا گیا تو آپ اس کے سکریٹری بنائے گئے- اس کے علاوہ بھی امروہہ کے کئی سماجی اداروں کے صدر اور سکریٹری رہ چکے ہیں- سنہ ۱۹۸۱میں آپ "انجمن ترقی اردو" کے بھی صدر ہوئے- post graduate college committee Amroha کے صدر ہیں- آپ کی صدارت کے زمانے میں M.A.Hindi کی منظوری ہوئی- آپ امروہہ میں کپڑے کے بڑے تاجر شمار کیے جاتے ہیں-

**بشیر حسن:** مولانا سید بشیر حسن ابن سید امیر حسن محلہ شفاعت پوتہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ فارسی اور عربی کے منشی تھے۔ گورنمنٹ اسکول باپوڑ، شاہجہانپور اور امروہہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں گورنمنٹ اسکول امروہہ سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نہایت علم دوست، اہل قلم اور تاریخی تحقیقات سے خاص شغف رکھتے تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں "گھر گرہستی" اردو اور ہندی زبان میں شائع کی۔ "تعلیم نسواں" عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر ایک اچھی کتاب لکھی مگر جس کتاب کی وجہ سے آپ کی امروہہ میں زیادہ شہرت ہوئی وہ "شجرات سادات امروہہ" ہے۔ جو تاریخ سادات امروہہ کے بعد سب سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موصوف کے پاس جلد اول جو تاریخ پر مشتمل تھی تیار تھی اور اس کا طبع ہونا باقی تھا مگر سنہ ۱۹۸۰ء میں ۸۴ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جانے کے بعد وہ تمام کی تمام ناقابل حصول ہو گئی ہے۔

**باقر نقوی:** بریگیڈیئر سید محمد باقر نقوی امروہہ کے ان قابل فخر فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ مئی سنہ ۱۹۳۱ء میں ان کی پیدائش محلہ بگلہ کے ایسے خانوادے میں ہوئی جس کا امروہہ کی علمی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی زندگی میں ایک منفرد مقام تھا۔ ان کے والد سید معزز حسن ایڈوکیٹ کے پردادا سید یاد علی نے سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور ان کے دادا سید معجز حسن کو سادات امروہہ کو سزا دینے کے لیے انگریزوں نے قید و بند میں رکھا۔ ان کے والد سید معزز حسین وکیل امروہہ مسلم لیگ کے پرجوش قائد تھے۔ جنہوں نے چودھری خلیق الزماں مرحوم کے ساتھ تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

سید محمد باقر نقوی نے ابتدائی تعلیم امام المدارس میں حاصل کی اور گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔ تقسیم ہند کے بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں کمیشن ملا اور کاکول اکیڈیمی سے بی۔ایس۔سی ملٹری سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں حکومت پاکستان نے اعلیٰ تربیت کے لیے انہیں امریکہ بھیجا۔ سنہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں کھیم کرن حسینی والا سیکٹر میں بہ حیثیت میجر اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اپنی بہترین کارکردگی کی بنیاد پر سنہ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں اہم فوجی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے وہ دوسرے فوجی ساتھیوں کے ساتھ بھارت میں قید و بند کی آزمائشوں سے گزرے۔ سنہ ۱۹۷۵ء

میں انہیں بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں بہ حیثیت بریگیڈیر نیشنل ڈیفنس کالج میں تربیت کے لیے منتخب ہوئے اور ایم۔ایس۔سی ملٹری سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ مارشل لاء عہد میں وہ بریگیڈیر ایڈمنسٹریشن، ہیڈکوارٹرز صوبہ سندھ رہے۔ ان کی پیشہ ورانہ عسکری خدمات پر ۱۹۸۳ء میں حکومت پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز (فوجی) عطا کیا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد سندھ سوشل سیکورٹی کے محکمے میں بہ حیثیت مشیر خدمات انجام دیں۔ وہ پی۔آئی۔اے شیور سے بھی پانچ سال تک ایگزیکیٹو ڈائریکٹر کے طور پر منسلک رہے۔

محمد باقر نقوی ایک باوقار، سنجیدہ، خاموش طبع، پرخلوص اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ انہوں نے بلا تفریق اہل امروہہ کی حتی الوسع خدمت کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ وہ اپنے خاندان کی اعلیٰ روایات کے امین اور پاس دار ہیں میرے برادر بزرگ محمد حسین صدیقی مرحوم کے ہم جماعت اور بہترین دوست تھے اور یہ تعلق خاطر تا دم مرگ میرے بھائی کے ساتھ ان کا قایم رہا۔

**بشیر الدین فریدی:** مولانا حکیم بشیر الدین صاحب اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ شروع میں جبل پور مشن ہائی اسکول میں دس سال تک ہیڈ مولوی رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ترک ملازمت کے بعد باقاعدہ مطب شروع کر دیا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں بمبئی کے قریب بھیمڑی میں مستقل رہے۔

**بابو بھگوتی سہائے (وکیل):** بابو بھگوتی سہائے کے مورث اعلیٰ گھنشیام داس عرف ٹھاکر کھنا تھے۔ بابو بھگوتی سہائے کا خاندان ہندوؤں کے خاص علاقے کالا کنواں میں سکونت پذیر تھا۔ لالہ گھنشیام داس مغلیہ عہد میں امروہہ کے قانون گو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے بیٹے راگھوداس کو بھی بارہ مواضعات کا عہدہ چودھرائی و مقدمی اور پرگنہ امروہے کا قانون گوئی کا عہدہ مغلیہ سلطنت سے عطا ہوا تھا۔

بابو بھگوتی سہائے اپنے زمانے کے بڑے ہوشیار اور مشہور وکیل تھے۔ امروہے کے مشہور مسلمان وکلاء کی طرح انہوں نے بھی .LLB پاس کیا تھا۔ بابو بھگوتی سہائے میونسپل بورڈ امروہہ کے ممبر بھی رہے۔ ان کو تعلیم سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ جگدیش سرن ہندو انٹر کالج امروہہ کے ممبر رہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی چھید الال ریاست ناگور کے دیوان تھے۔ ان کا خاندان امروہہ سے ترک سکونت کر چکا ہے۔

**بھونیش کمار شرما بھون:** امروہہ کے ادبی حلقوں میں ایک نمایاں شخصیت بھونیش کمار شرما بھون کی ہے۔ آپ پنڈت منشی لال شرما مرحوم کے فرزند ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار میونسپل بورڈ امروہہ میں ملازم

تھے۔بھونیش صاحب نے میٹرک کے بعد سنہ ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ کالج امروہہ سے انٹر پھر جے۔ایس ہندو پوسٹ گریجویٹ کالج سے اکنامکس میں ایم۔اے۔کیا۔ابتدا میں آپ نے کسی مدرسہ میں اردو نہیں پڑھی تھی جس کا انہیں بڑا ملال تھا۔لیکن بعد میں اس قدر احساس ہوا کہ آپ نے اپنے دوست احباب سے اردو پڑھی اور اب اردو میں باقاعدہ خط وکتابت کرتے ہیں۔

بھونیش صاحب کے گھر اکثر و بیشتر ادبی نشستیں بھی منعقد ہوتی ہیں جس میں ادبی حلقوں کے لوگ اور شعراء جمع ہوتے ہیں۔میری کتاب "سیاحت ماضی" سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک نظم لکھ ڈالی۔آپ انسان دوست اور محبت وپیار کرنے والے آدمی ہیں' رفاہی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔چند ملاقاتوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے برسوں پرانے دوست ہیں۔آپ ایک بہترین کتاب "امروہہ کے گورو" نام سے تصنیف کرنے میں رات دن سرگرداں ہیں۔"امروہہ کے گورو" سے مراد امروہہ کی شہرت یافتہ شخصیات سے ہے۔آپ نے اپنی کتاب کے لیے امروہہ سے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے والے باشندوں کے بارے میں کافی مواد جمع کیا ہے۔

**برجیندر سہائے:** برجیندر سہائے صوبہ اتر پردیش کے چیف سکریٹری تھے۔مجھے افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے اُن کے بارے میں مجھے کچھ نہ مل سکا۔

**بھگوان سہائے:** آپ ۱۹۵۹ سے ۱۹۶۳ء تک دلی کے چیف کمشنر رہے۔اس کے بعد ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۷ء تک ہماچل پردیش کے لیفٹیننٹ گورنر رہے۔آپ بھی سرزمین امروہہ کے فرزند ہیں۔آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی بہت سے دوستوں کو لکھا تھا مگر تفصیلات حاصل نہ ہو سکیں۔

**بھگوت دت ترویدی:** پنڈت بھگوت دت ترویدی بھاگر تھ ٹولہ محلّہ کنکوئی امروہہ میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔آپ سنسکرت زبان کے مشہور عالموں میں شمار ہوتے تھے۔علم نجوم پر بھی آپ کو خاصی مہارت حاصل تھی۔شہر کے لوگ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان میں آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آتیں۔اہل امروہہ بھی شاید ان کے وجود سے بے خبر ہیں۔

**بھورے:** امروہہ کے عہد ماضی کی شخصیات میں ایک نامور شخصیت بھورے باورچی کی ہے۔مختلف قسموں کے کھانے پکانے میں جو مہارت موصوف کو حاصل تھی اور اس فن میں جو قدرت انہیں اللہ نے عطا کی تھی وہ

دوسروں کو نصیب نہ تھی۔ ان کا نام ایک معتبر نام تھا اور شہر کے رؤساء ان کی خدمات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ دیگچی ہو یا دیگ بھورے کے پکائے ہوئے کھانے اپنا ایک مخصوص ذائقہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ سے پکائے ہوئے کھانوں کا ذائقہ آج تک زبان پر باقی ہے۔ آپ کے فرزند محمد اظہر انصاری سنہ ۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک امروہہ میونسپل بورڈ کے ممبر ہوئے۔ اظہر انصاری متعدد کمیٹیوں اور انجمنوں کے ممبر اور انجمن تنظیم الانصار امروہہ کے صدر رہے ہیں۔

**بنکٹیش پرشاد:** ساہو بنکٹیش پرشاد سنہ ۱۸۸۳ء کو محلہ کٹرہ غلام علی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ میونسپل بورڈ امروہہ کے سب سے پہلے منتخب چیئرمین تھے۔ آپ کا تعلق اگروال ویشوں کے خاندان سے تھا۔ آپ بڑے ہر دلعزیز تھے۔ ہندو مسلم دونوں مذہبوں کے لوگ آپ کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں آپ کا دھانت ہوا۔ آپ کے ایک فرزند شری وید پرکاش اگروال محکمہ جنگلات میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے جنھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کر لی ہے۔

**پھول سنگھ:** پھول سنگھ محلہ سرائے کہنہ امروہہ میں جاٹ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اتر پردیش نیایک سیوا وبھاگ میں چنے جانے کے بعد مجسٹریٹ، سیشن جج وغیرہ کے اعلیٰ عہدوں پر رہنے کے بعد آج کل امرت سر میں انکم ٹیکس ٹریبونل میں جج ہیں۔ آپ بڑے خوش مزاج اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔

**تقی ہادی:** ماضی کی یادوں کے افق پر سادات امروہہ کے جن بزرگوں کے نام اپنی پیشہ ورانہ، سیاسی اور سماجی زندگی میں اہمیت حاصل کرنے کی وجہ سے ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں سید معزز حسین، سید سجاد الحسنین اور سید محمد تقی ہادی کے ہیں۔ یہ تینوں محترم پیشہ کے اعتبار سے امروہہ کے مشہور و معروف اور ممتاز وکیل تھے۔

سید محمد تقی ہادی کا نسبی تعلق بارھویں پشت میں اکبری عہد کے قاضی القضاۃ سید محمد میر عدل سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد میں سید کرم علی خاں نے عہد عالمگیر اور اورنگ زیب میں خان کا خطاب پایا اور اپنی رہائش کے علاقے کو گھیر کرم علی خاں کے نام سے موسوم کیا۔ سید محمد تقی ہادی کے والد محترم خان بہادر سید نبی ہادی امروہہ کے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ تقریباً بیس سال تک امروہہ کے میونسپل کمشنر رہے اور دو سال تک امروہہ میونسپل بورڈ کے چیئرمین رہے۔ موصوف چار سال تک سینٹرل اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔

سید محمد تقی ہادی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے۔ کچھ

عرصہ منصفی امروہہ میں وکالت کی۔ تقریباً بیس سال میونسپل کمشنر اور اسپیشل مجسٹریٹ رہے۔ تقسیم ہند کے بعد یو۔پی کی صوبائی اسمبلی کے ممبر رہے۔ تیس پینتیس سال تک آپ امام المدارس کے منیجر رہے۔ان کے عہد میں امام المدارس انٹر کالج ہوا۔زندگی کے آخری ایام میں باقاعدہ وکالت شروع کردی تھی۔مقامی اور ملکی سیاست میں انہوں نے خاص نام پیدا کیا۔ان کے کاموں کی وجہ سے ان کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔

**تقی رضا:** سید تقی رضا رضوی ۱۱اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کو علی جان منزل امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان رضویہ سے ہے۔ آپ کے والد سید نقی الدین امام المدارس انٹر کالج امروہہ میں لیکچرار تھے۔ تقی رضا کی ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج میں ہوئی اور ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں الہ آباد بورڈ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ریاضی اور فارسی میں ڈسٹنکشن تھی۔اس کے بعد آپ نے آرٹس کو چھوڑ کر سائنس میں داخلہ لیا اور گورنمنٹ کالج امروہہ سے انٹر فرسٹ ڈویژن اور اعزازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے B.Sc.Civil Engeering کی ڈگری حاصل کی۔انہوں نے کبھی کسی استاد سے نہیں پڑھا جو کچھ پڑھا خود کتابوں سے پڑھا۔سنہ ۱۹۶۲ء میں آپ پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ابتدا میں آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز کراچی کی مشہور و معروف کنسٹرکشن کمپنی ''معمار'' سے کیا۔اس کے بعد کراچی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ انجنیرنگ میں اسسٹنٹ انجینیر ملازم ہوگئے۔ اپنے محکمہ میں آپ کی کارکردگی ہمیشہ اچھی رہی اور تھوڑے تھوڑے وقفے میں آپ کی ترقی ہوتی رہی۔ آج آپ اسی محکمہ میں سپرنٹینڈنگ انجینئر کے اہم عہدے پر کام کررہے ہیں۔کچھ دن اپنے محکمہ میں چیف انجنیئر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ تقی رضا طبیعتاً ادبی ذوق رکھتے ہیں۔وہ شاعری،ادب،فلسفہ،تاریخ اور مذہبی کتابوں کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔کھیلوں میں برج آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔

**تقدیس احمد جعفری:** آپ سبط احمد جعفری محلہ چاہ شور کے فرزند تھے۔کثیر المطالعہ و وسیع النظر شخصیت کے مالک تھے۔مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین ''نوائے وقت'' کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔مسئلہ خلافت پر لکھ رہے تھے کہ سنہ ۱۹۹۳ء میں سفر آخرت پیش آگیا۔''نبی کریم کی کلی زندگی'' کے عنوان سے کئی کتابچے لکھے ہیں۔ آپ نے مولانا محمود احمد عباسی کی تالیف ''تحقیق الانساب'' کا نصف حصہ شائع کیا تھا اور دوسرا شائع کرنا چاہتے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی۔

**تہور حسین:** ڈاکٹر سید تہور حسین 'حکیم سید ابوالقاسم محلہ گذری کے فرزند اور سید ابوالحسن فوقی کے نواسے تھے- آپ نے پہلی جنگ عظیم میں برٹش انڈیا کی فوج میں مشرقی افریقہ میں ڈاکٹری کی خدمات انجام دیں- جنگ کے خاتمے کے بعد پہلے مراد آباد میں اور پھر امروہہ میں Practice کرتے رہے- موصوف نے ایک کتاب 'ISLAM,ITS PURITY AND TRUTH' بھی تصنیف کی تھی- آپ کے بڑے بیٹے سید تصور حسین ریاست رامپور کے محکمے زراعت اور پھر یوپی کے محکمے زراعت کے ڈائریکٹر ہوئے- پاکستان آنے کے بعد وہ اقوام متحدہ کی طرف سے عراق میں خوراک وزراعت کے مشیر رہے- ان کے دوسرے بیٹے سید تصویر حسین امام المدارس امروہہ میں استاد رہے- دوسری جنگ عظیم میں عراقی افواج کے ساتھ جنگی خدمات انجام دیں- پاکستان آنے کے بعد وہ پاکستان کی ملٹری ایجوکیشن کور سے منسلک ہوئے- آپ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے بانیوں میں سے تھے- فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ سراج الدولہ کالج کے کئی سال تک پرنسپل بھی رہے- امروہہ میں آپ انجمن اصلاح معاشرت کے بھی صدر رہے تھے اور کراچی آکر سادات امروہہ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے صدر بھی رہے- ڈاکٹر تہور حسین کے تیسرے بیٹے مولانا مصور حسین نجم نے ایران اور عراق میں اسلامی تعلیم حاصل کی- وہ ایک اچھے شاعر، بہترین خطیب اور شعلہ بیان مقرر تھے- ان کا شمار ہندوستان کے بائیں بازو کے سیاستدانوں کی صف اول میں ہوتا تھا- مرحوم میرے بھائی محمد حسین کی طرح جواں سالی میں انتقال کر گئے- بدقسمتی یہ کہ ان کی علمی تحریریں اور شاعری کو ان کے اہل خاندان محفوظ نہ رکھ سکے- ڈاکٹر صاحب کے چوتھے فرزند علی تصدیق بڑے ہونہار شخص تھے- ان کا PIA کی قاہرہ جانے والی پہلی پرواز کے حادثہ میں انتقال ہو گیا- ڈاکٹر صاحب بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کی سب اولاد ہندوستان اور پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی اور امروہہ کا نام روشن کیا-

**تنویر حسین:** لیفٹیننٹ جنرل سید تنویر حسین نقوی (ر)، میجر سید تصویر حسین مرحوم محلہ گذری کے فرزند ہیں- آپ نے ملٹری اکیڈمی میں SWORD OF HONOUR حاصل کی- سنہ ۱۹۷۱ء کی پاک و ہند جنگ میں مختلف محاذوں میں اہم خدمات انجام دیں- آپ نیشنل ڈیفینس کالج کے کمانڈنٹ رہے- آپ کو حکومت پاکستان نے ستارۂ بصالت اور ہلال امتیاز (ملٹری) کے اعزازات سے نوازا- آپ فوجی فاؤنڈیشن کے سربراہ بھی رہے اور آج کل امریکہ کی بین الاقوامی کمپنی یونائیٹڈ ڈفینس کے پاکستان میں کنٹری منیجر ہیں- آپ

امروہہ کے پہلے شخص ہیں جو افواج پاکستان میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے۔

**توقیر حسین:** وائس ایڈمرل سید توقیر حسین نقوی میجر سید تصویر حسین مرحوم محلہ گذری کے فرزند ہیں۔ آپ نے پاکستان نیوی میں ہندوپاک جنگ کے دوران اہم خدمات انجام دیں اور وائس ایڈمرل کے اہم عہدے تک پہنچے۔ آپ کو حکومت پاکستان نے ستارۂ بصالت اور ہلال امتیاز (ملٹری) کے اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ آج کل آپ بحریہ فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔

**توفیق احمد چشتی:** یہاں مجھے ایک ایسی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہے کہ جس نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یہ ہیں جناب توفیق احمد صاحب چشتی ابن دھنا بن چاند بن حبیب اللہ۔ توفیق صاحب ۱۹۴۰ء میں محلہ بساون گنج امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق امروہہ کی قصاب برادری سے ہے لیکن ان کے آباواجداد کا پیشہ کاشتکاری رہا ہے۔ توفیق صاحب نے نویں کلاس تک امام المدارس انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ توفیق ابھی چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھے کہ تاریخ فرشتہ کا مکمل مطالعہ کیا جس کے سبب آپ کو تاریخ اور آثار قدیمہ سے خاص دلچسپی ہوگئی۔ آپ کی یہی دلچسپی اور صلاحیت مرزا اسداللہ خاں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کا اپنا دیوان ڈھونڈ نکالنے کا سبب بنی اور علمی و ادبی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ بی بی سی لندن کا نامہ نگار آپ کے انٹرویو کے لیے آپ کی دکان محلہ گذری تک پہنچا۔ یہ دیوان آپ کو اس وقت ملا جب آپ پرانی کتابوں کے نسخے اور آثار قدیمہ کے تلاش میں بھوپال گئے تھے۔ اسے موصوف نے ۵/اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال سے خریدا اور ۷/اپریل کے روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی میں اشتہار شائع کر کے پہلی بار دنیائے ادب کو اس دریافت کی اطلاع پہنچائی۔ چشتی صاحب نے اس مخطوطہ کی طباعت کے کلی اور دائمی حقوق "ادارۂ یادگار غالب" رامپور یوپی کے نام منتقل کر دیے۔ اب یہ دیوان "نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مخطوطہ غالب کا وہ پہلا مجموعہ کلام ہے جو انہوں نے سنہ ۱۲۳۱ھ میں خود مرتب اور نقل کیا تھا۔

توفیق صاحب کی دوسری اہم دریافت ایک تانبے کی پلیٹ ہے جس پر سنسکرت تحریر ہے سنبھل کا قدیم نام شمبھوپالیکا معلوم ہوا۔ اس دریافت سے بھی پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا اور ان کی شہرت کو چار چاند لگے۔ تعلیم کی کمی کے باوجود توفیق صاحب کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے سے بڑا اسکالر بھی آپ کی ذہانت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ توفیق صاحب کا ایک اپنا ذاتی کتب خانہ بھی ہے جہاں انتہائی اہم اور نادر کتابیں موجود ہیں۔ آپ

کے اس کتب خانے کو ریسرچ سینٹر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

**ثروت حسن:** حکیم سید ثروت حسن حکیم سید حامد حسن رضوی کے فرزند تھے۔سنہ ۱۹۰۳ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں حاصل کی۔اس کے بعد اپنے والد سے جو افسر اطبا تھے طب کی کتابیں پڑھیں۔شروع سے ہی انتہائی ذہین تھے۔آپ پکے نیشنلسٹ 'آزادیٔ وطن کے شیدائی اور انگریزی حکومت کے بے باک باغی تھے۔والد بزرگوار کے انتقال کے بعد امروہہ میں قیام کیا۔ حکیم ثروت مجلس احرار اسلام سے وابستہ تھے۔اس زمانے میں جو مشہور قومی وسیاسی رہنما امروہہ آتا تو وہ آپ ہی کے یہاں قیام کرتا تھا۔ آپ ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ کا دیوان خانہ سیاسی لیڈروں کا گڑھ تھا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوگئے تھے مگر سماجی کاموں میں برابر کام کرتے رہے۔ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔انجمن ترقی اردو اور انجمن تعمیر اردو کے معاملات میں آپ کا اہم کردار رہا ہے۔ادبی اور قومی سرگرمیوں کے علاوہ شیعہ سنی مسائل بھی ان کی خاص دلچسپی کے میدان تھے۔وہ ملت کے ان دونوں گروہوں کو قریب تر لانے اور متحد کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور محرم کے جلوس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ آخری عمر میں مالی پریشانیوں میں گرفتار رہے مگر خودداری کا یہ عالم رہا کہ زبان سے اُف نہ کی۔ ۲۲ر نومبر سنہ ۱۹۶۹ر کو آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دیوان خانے میں سرفراز عثمانی نے ان کے نام پر ثروت اکیڈمی قایم کی جو ایک اچھا اسکول چلا رہی ہے۔

**جمال احمد نظامی:** شخصیات کے باب میں اگر جمال احمد نظامی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ جمال احمد نظامی کے ساتھ نہیں بلکہ امروہہ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔جمال کا تعلق امروہہ کے فاروقی خاندان سے ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، لئیق احمد نظامی، ثمر نظامی اور ظل احمد نظامی سابق ڈائریکٹر جنرل ادارہ ترقیات کراچی اور چانسلر سر سید یونیورسٹی کراچی 'ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

جمال جیسی خوش طبع، خوش اخلاق، زندہ دل، پرمزاح شخصیت امروہہ کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ ہنسنا ہنسانا ہر انسان کے لیے ایک فطری بات ہے۔ہر انسان کے چہرے پر تبسم اسی وقت آتا ہے جب وہ دنیا کی عام روش سے ہٹ کر کسی غیر معمولی چیز کو دیکھتا یا سنتا ہے۔ایک ایسا شخص جو دوسروں کے غموں اور افسردگی کو دور کرنے لیے ایسی دلچسپ اور ہنسنے پر مجبور کر دینے والی بات کہے جس میں جدت بھی ہو اور نیاپن بھی تو ایسا انسان افسردہ اور

مایوس لوگوں میں ایک نیا ولولہ، زندہ دلی اور احساسِ مسرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے- جمال احمد نظامی بھی ایک ایسے ہی کردار کے شخص تھے جو اپنی ادبی اور دلکش گفتگو سے سنجیدہ اور تلخ ماحول کو ہنسی مذاق اور قہقہوں میں بدل دیتے تھے- وہ لوگوں کی عادات، خامیوں اور کمزوریوں کو ایسے مزاحیہ انداز سے پیش کرتے تھے کہ لوگوں کو برا بھی محسوس نہ ہو اور اپنی ان خامیوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں- غالباً سنہ ۱۹۵۷ء میں ایک تمثیلی مشاعرہ میر بھاون کی مسجد کے پیچھے ایک میدان میں منعقد ہوا تو اس مشاعرہ میں جمال نے مرزا غالب کا کردار ادا کیا اور سامعین کو بہت محظوظ کیا- اس مشاعرے میں مرزا غالب کا کردار ادا کرنے پر انہیں ایوارڈ بھی دیا گیا تھا-

یکم جولائی ۱۹۸۶ء کو یہ خوش طبع، خوش گو، ہر دلعزیز شخص دار فانی سے رخصت ہو گیا جس کی موت سے امروہہ کی رونقیں ماند پڑ گئیں- مرحوم کی لوح مزار پر علامہ انور صابریؒ کے یہ دو شعر کندہ ہیں-

شدتِ غم کا کیا کروں اظہار　　دل کا ہر زخم ہو گیا بیدار
سُونا سُونا ہے شہر امروہہ　　لٹ گئی جیسے اس چمن کی بہار

**جگدیش سرن جی گپتا:** امروہہ میں تعلیمی اور سماجی کاموں میں فراخ دلی سے مالی مدد کرنے والوں میں ساہو جگدیش سرن جی گپتا کا نام سر فہرست ہے- آپ انتہائی مخیر اور قوم کا درد رکھنے والے انسان تھے- جے-ایس ہندو انٹر کالج اور جے-ایس پوسٹ گریجویٹ کالج آپ کی ہی فیاضی کا نتیجہ ہیں- اس کے علاوہ امروہہ میں گورنمنٹ گرلس انٹر کالج اور زنانہ ہسپتال بنانے کے لیے آپ نے ہی اپنی ذاتی زمین دی تھی- سنہ ۱۹۷۶ء میں آپ کا دھانت ہوا- امروہہ کے یہ تعلیمی ادارے اور ہسپتال آپ کی یادگار ہیں-

**جمیل الدین:** الحاج جمیل الدین فریدی امروہوی ۸/ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- حضرت بابا فرید شکر گنج کی اولاد ہونے کے ناتے "خانوادۂ فریدیان" سے تعلق ہے- اس نسبت سے آدھا خاندان آپ کا فاروقی کہلاتا ہے- آپ حاجی شیخ سلیم الدین فریدی محلہ چاہ ملامان کے بڑے فرزند ہیں-

جمیل الدین نے امام المدارس انٹر کالج میں تعلیم پائی اور سنہ ۱۹۴۶ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک پاس کیا- اسی سال دہلی میں گورنمنٹ آف انڈیا سینٹرل سیکریٹریٹ میں سروس اختیار کر لی- قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستان آپٹ کر کے کراچی آ گئے اور ادارۂ شرقیہ سے "منشی فاضل" پاس کیا- اس کے بعد آپ نے سنہ ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج کراچی سے بی-اے اور سنہ ۱۹۶۴ء میں ایس-ایم لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی-

ایل ایل بی کرنے کے بعد کراچی میں وکالت شروع کی لیکن مزاج کے مطابق نہ پاکر چند ماہ بعد خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۶۷ء میں جب سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد چاروں صوبوں پر مشتمل "ون یونٹ" بنا تو ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے تحت چاروں صوبوں کا مشترکہ مقابلاتی امتحان PCS (پراونشل سول سروس) پاس کیا۔ سنہ ۷۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے جنرلزم کرنے کے بعد روزنامہ "مارننگ نیوز" سے وابستہ ہو کر عملاً صحافت سے آگاہی حاصل کی۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں حکومت پاکستان کی وزارت صنعت کے تحت پاکستان کی پہلی ٹیز نگ سروے ٹیم میں شامل ہو کر جاپانی لیڈر ایکسپرٹ (ڈاکٹر مکاٹو) کے ساتھ مشرقی پاکستان سمیت ملک بھر کا دورہ کیا اور چمڑے کی صنعت و پیداوار پر جامع رپورٹ تیار کی۔

سنہ ۱۹۶۶ میں کیبنٹ ڈویژن اسلام آباد کی طرف سے محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خاں کے سیکریٹری (گزیٹڈ) مقرر ہوئے۔ آپ ملک کے عظیم صنعتی منصوبہ پاکستان اسٹیل میں بارہ سال تک اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں کے گورنر سندھ ہونے پر بحیثیت پرائیویٹ سیکریٹری گورنر سندھ تین سال تک گورنر ہاؤس کراچی میں فرائض منصبی انجام دیے۔ سنہ ۱۹۷۹ء میں ۳۳ سال سرکاری خدمات انجام دیکر گورنمنٹ سروس سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہت سے ملکوں کی سیاحت بھی کی۔ آجکل آپ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ امروہہ سے متعلق ہر تحریک اور تنظیم میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔

**جمیل حسین:** صوفی شاہ سید جمیل حسین رضوی مرحوم مظفر حسین کے فرزند تھے۔ خاندانِ ساداتِ رضویہ چشتیہ کی ایک کثیر تعداد تقسیم ہند کے بعد امروہہ سے ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہوئی۔ نئی سرزمین پر افرادِ خاندان کو یکجا کرنے میں صوفی شاہ جمیل حسین رضوی مرحوم کا بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے اپنے رفقاء حاجی سید شریف احمد رضوی مرحوم اور سید گل حسن رضوی مرحوم وغیرہ کے ساتھ مل کر سنہ ۱۹۴۸ء میں حضرت شاہ ابن بدرِ چشتؒ کے سالانہ عرس کی داغ بیل ڈالی۔ آپ ہی کی کوششوں سے شمالی ناظم آباد میں خاندانی مرکز "بدرِ چشت ہال" کی تعمیر ممکن ہو سکی۔ صوفی صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ پاکستان میں آپ خاندان ساداتِ رضویہ کے سجادہ نشین تھے۔

شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ خاص طور پر نعتیہ کلام سے بڑا لگاؤ تھا۔ مجموعہ کلام "اوصاف ختم المرسلین" کے نام سے یادگار ہے۔ ۲۰ رجولائی سنہ ۱۹۹۱ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی ایک نعت ملاحظہ ہو۔

مجبور ہو گئے ہیں جو ضبط و فغاں سے ہم — اظہار کرتے رہتے ہیں اشک رواں سے ہم
منزل میں آ گئے آ گے ہیں عمر رواں سے ہم — نزدیک ہوتے جاتے ہیں اس آستاں سے ہم
نظارہ کر رہے ہیں مدینے کے چاند کا — ہیں فیض یاب انجمن کن فکاں سے ہم
مجبور ہو نہ جائیں صدائے انا سے ہم — کیسے اٹھائیں پردۂ دل درمیاں سے ہم
آخر جمال حق سے مشرف ہیں اے جمیلؔ — گذرے ہیں حسن و عشق میں وہم و گماں سے ہم

**حامد علی خاں:** جناب حامد علی خاں (مرحوم) امروہہ کے پہلے بیرسٹر ایک عظیم اور نامور شخصیت تھے- حامد علی خاں صاحب کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان سے تھا- آپ کے والد ماجد حکیم محمد امجد علی خاں صرف ونحو، منطق، حکمت، ریاضی ودیگر علوم عقلیہ ونقلیہ میں عالم اور علم کلام کے بڑے ماہر تھے- غدر سے پہلے اور بعد تک مختلف جگہ تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر رہے اور متعدد معرکتہ الآرا کتابوں کے مصنف تھے- سنہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب کی شادی دلّی کے معزز خاندان میں محمد حسن صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی- ۱۴ر دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو حامد علی خاں بانس بریلی میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد بزرگوار بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے-

حامد علی خاں (مرحوم) قابل ترین افراد میں سے تھے- فارسی کی تعلیم مختلف استادوں اور خصوصاً والد محترم سے حاصل کی جو ایک جید عالم تھے- انگریزی تعلیم خود گھر پر اور انگریزی اسکول میں حاصل کی- جب آپ کے والد کا قیام متھرا میں تھا تو اسوقت آپ کی عمر تقریباً چودہ سال تھی- اسی زمانے میں جناب سید مومن حسین صفی امروہوی آپ کے والد کے پاس متھرا تشریف لائے تو اکثر لوگوں میں وہ اپنا کلام سنایا کرتے تھے- اسی صحبت میں جناب حامد علی کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور چند شعر بھی کہے اور اصلاح جناب صفیؔ امروہوی سے لی- آپ کی نوعمری کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

ہنس دے گا اک شگوفہ میں غنچہ روش صبا — بیٹھا وہ گل ہزار ہے پھولا بھرا ہوا

اس کے بعد سنہ ۱۸۸۰ء میں آپ نے لندن جاکر لاطینی اور فرانسیسی میں خاصی مہارت حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا- اسوقت آپ کی عمر صرف بیس سال تھی- لندن میں حامد علی صاحب عمائدین اہل کمال اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں سے ملا کرتے تھے جن میں ہز ہائینس ناظم بنگالہ نواب سید منظور علی خانصاحب بہادر اور سر آسماں جاہ عرف صوبہ صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں-

حامد صاحب انگریزی کے بھی بہت اچھے ادیب تھے- ان کے سیکڑوں سیاسی، تعلیمی اور تمدنی مضامین لندن

اور ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ نیشنل انڈین ایسوسی ایشن جنرل جس کا نام اب انڈین میگزین ہے اس کے ماہ مئی ۱۸۸۳ء کے پرچہ میں حامد صاحب کا ایک معرکتہ الآرا مضمون اردو نظم پر شائع ہوا۔ اس مضمون کو جب انگلستان کے مشہور شاعر مسٹر اے۔جے۔ ڈبلیو گب نے پڑھا تو اس نے ایک خط اور اپنا انگریزی زبان میں ترکی زبان کے قصائد کا کیا ہوا ترجمہ حامد صاحب کو بھیجا۔ اس کے بعد حامد صاحب کی مسٹر گب سے خاصی دوستی ہو گئی۔ مسٹر گب کی صحبت میں انگریزی میں بھی اشعار کہے اور مسٹر گب سے اصلاح حاصل کی۔ لندن میں قیام کے دوران آپ کی ملاقات لارڈ ٹینی سن (ملک الشعرا) جان برائٹ مسٹر گب، جسٹس میکارتھی، مسٹر میریڈ (ناول نگار)، پرنس آف ویلز اور ایڈورڈ ہفتم وغیرہ سے ہوئی۔ ہندوستان میں آپ کے دوستوں میں جناب تیج بہادر سپرو، برج نرائن چکبست، حکیم اجمل خاں، محشر لکھنوی، عزیز لکھنوی، میر نفیس (پسر میر انیس) شامل تھے۔ لکھنو میں اپنی کوٹھی کی تعمیر کے بعد سنہ ۱۹۱۵ء میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں ملک کے ممتاز شعراء کے علاوہ ہز ہائینس گورنر مسٹن نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ تین روز تک جاری رہا۔ خانصاحب کی غزل بہت پسند کی گئی، خصوصاً اس شعر پر بہت داد ملی ؂

دفن ہیں حامدؔ شہید داغ الفت جابجا کوہ و صحرا و چمن میں لالہ پیدا کیوں نہو

سنہ ۱۹۱۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ صفی لکھنوی نے تاریخ وفات کہی ؂

"مرقد حامد علی خاں صلح کل" (سنہ ۱۳۳۶ھ)

**حبیب اللہ خاں غضنفر:** حبیب اللہ خاں غضنفر سنہ ۱۹۰۲ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ احمد سعید خاں (محلہ افغانان) کے فرزند تھے۔ آپ نے علمی و ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا اور ساری عمر درس و تدریس سے منسلک رہے۔ ایس ایم کالج، اردو کالج میں ہزاروں طلباء کو تعلیم سے بہرور کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنی تصنیف "تہذیب و تاریخ" میں فرماتے ہیں:

"ربع صدی سے زیادہ گزری سنہ ۱۹۵۶ء میں جب کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہو کر آیا، شعبۂ اردو اس وقت رسمی طور قائم ہوا اور مولوی عبدالحق مرحوم اس کے اعزازی پروفیسر اور صدر شعبہ تھے، درس و تدریس کے ابتدائی دور میں اساتذہ بیشتر اردو کالج سے جزوقتی طور پر یونیورسٹی میں تدریس کے لیے تشریف لاتے۔ اس وقت یونیورسٹی نانک واڑہ میں انجمن ترقی اردو کا دفتر، اردو کالج یونیورسٹی کے دفاتر، اور آس پاس کی عمارتوں میں تدریس کے لیے عارضی انتظامات تھے۔ ان اساتذہ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، عبدالسلام صاحب،

عبدالقیوم صاحب اور حبیب اللہ غضنفر صاحب شامل ہیں اور انہوں نے اس شعبہ کی داغ بیل ڈالی۔"

ڈاکٹر صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ بعض حالات میں انہیں (غضنفر صاحب) کسی اور مصنف کے لیے فارسی یا عربی کے ماخذ کا ترجمہ فراہم کرنا پڑا اور اصل کتاب مصنف کے نام سے شائع ہوئی ........ مجھے معلوم نہیں ایسے کتنے کام غضنفر کے کیے ہوئے ہیں جو کسی اور کے نام سے شائع ہوئے' اگر ان کا کوئی مسودہ مل جائے تو پھر شاید اس راز پر سے پردہ اٹھ جائے۔"

غضنفر صاحب کا یونیورسٹی کے قابل ترین اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ آپ اردو کے تو استاد تھے ہی لیکن فارسی' عربی اور ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں "اردو عروض"، "ہندی ادب"، "فردوس بریں" اور "زبان وادب" وغیرہ ہیں۔

**حامد حسن:** حکیم حامد حسن سنہ ۱۲۹۶ھ کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سید اکبر حسن رضوی کے فرزند تھے۔ بچپن میں آپ کے والد نے انتقال کیا۔ والد کی وفات کے بعد حامد حسن کی تعلیم و تربیت آپ کے بڑے بھائی مولانا احمد حسن محدث نے کی۔ ہیئت اور الہیات حکیم صوفی محمد حسن سے اور علم طب حکیم امجد علی خاں امروہوی اور حکیم سید احمد سعید افسر الاطباء حیدر آباد سے حاصل کیا۔ ایلوپیتھک کے طریقۂ علاج کے بنیادی اصول ڈاکٹر عبدالغنی سول سرجن سے سیکھے۔ اس کے بعد حیدر آباد میں اپنا دواخانہ قایم کر کے مطب شروع کیا۔ تھوڑے ہی دن میں اپنی ذہانت اور صلاحیت کے سبب آپ نے اپنے پیشہ میں بڑی شہرت حاصل کر لی۔ آپ کے دواخانے میں غریب لوگوں کا مفت علاج ہوتا تھا اور مفت دوائیں دی جاتی تھیں۔ آپ کی شہرت سن کر حیدرآباد کے افسر الاطباء حکیم فیلسوف جنگ معائنے کے لیے آپ کے دواخانے آئے۔ معائنے کے بعد ان کی سفارش پر حامد حسن کے دواخانے کو سرکاری امداد بھی دی جانے لگی۔ سنہ ۱۳۴۵ھ میں حامد حسن کو افسر الاطباء ممالک محروسہ نظام حیدر آباد کے اہم عہدے پر فائز کیا گیا اور آخر تک اس عہدے پر رہے۔

حامد حسن کو درس وتدریس سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ اپنے مطب کے ساتھ ساتھ شوقین طلباء کو بلا معاوضہ پڑھاتے بھی تھے۔ آپ بڑے خوش اخلاق، خوش مزاج، غریب نواز اور فن حکمت میں بڑے ماہر تھے۔ امروہہ کی نامور شخصیت حکیم ثروت حسن آپ ہی کے نیک فرزند تھے۔

**حسن عسکری رضوی:** حکیم حسن عسکری رضوی سید کلیم بخش اللہ کے فرزند تھے سنہ ۱۱۸۰ھ میں ولادت ہوئی-امروہہ اور لکھنو میں تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں فن طب میں کمال حاصل کیا-نہایت ذہین طباع اور نکتہ رس تھے-خودداری کا مادہ زیادہ تھا چنانچہ والد نے رؤسائے رامپور کے ایماء پر چند چاہا کہ آپ وہاں سے تعلق اختیار کریں لیکن تیار نہ ہوئے اور تاحیات امروہہ ہی میں مطب کرتے رہے تاہم آپ کے کمال حذاقت اور تشخیص کا شہرہ دور دور تک تھا نواب ٹونک نے جو مرض استسقا میں مبتلا تھے اور تمام اطبا کے علاج سے مایوس ہو چکے تھے نہایت اصرار سے آپ کو بلایا-آپ وہاں گئے اور صرف ایک ہفتے کے علاج سے نواب صاحب کو صحت ہو گئی-اس علاج کے سلسلے میں آپ کو نواب موصوف کے دربار سے اسپ وفیل پالکی ونالکی بے شمار زر وجواہر کے علاوہ سوا لاکھ روپیہ نقد اور خلعت گراں سے نوازا گیا-چند روز بعد وہیں پر انتقال ہو گیا لیکن دفن امروہہ میں ہوئے-

امروہہ میں اور بھی اطباء ہوئے جن میں جناب حکیم برکت اللہ، جلال الدین، حکیم عسکری، امجد علی خاں، کفایت خاں، حکیم حافظ سید نور الحسن رضوی، مولانا مولوی حکیم سلطان احمد، عبدالقیوم قریشی، حکیم عبدالسلام صدیقی بہت معروف ومشہور تھے-

**حسن مثنیٰ رضوی:** سید حسن مثنیٰ رضوی ۱۸۹۳ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کے دادا حکیم سید حسن عسکری بڑے پایہ کے حکیم تھے اور نواب ٹونک کے خاص معالج تھے-آپ نے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں تعلیم پائی-آپ عربی فارسی لٹریچر کے زبردست اسکالر اور انساب کے بڑے ماہر تھے-ہندوستان کے مشہور عالم ابو الحسن علی ندوی آپ کے بڑے معتقد تھے-ہندوستان کے علاوہ بیشتر عرب ممالک کے مشہور خاندانوں کے نسب از بر تھے-حسن مثنیٰ نے شروع سے سیاست میں دلچسپی لی اور تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا-آپ پکے نیشنلسٹ تھے اور امروہہ کانگریس پارٹی کے برسوں سکریٹری اور صدر رہے-پنڈت جواہر لال نہرو جب امروہہ آتے تو آپ ہی کے گھر قیام کرتے-اس کے علاوہ آپ امروہہ میونسپلٹی کے دوبار چیئرمین رہے-ایسے اہم عہدوں پر رہنے کے باوجود کبھی کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا-امروہہ کا ہر شخص آپ کی عزت واحترام کرتا تھا-امروہہ کی دو سڑکیں جن میں ایک محلہ کوٹ سے دانشمندان جانے والی سڑک آپ کے ہی نام سے موسوم ہے-آزادی سے صرف ایک سال قبل آپ بیمار ہوئے اور برسوں گوشہ نشینی کی زندگی گزاری-سنہ ۱۹۶۳ء میں

آپ کی وفات ہوئی۔

**حسین بن خامس:** کیپٹن حسین بن خامس (آصف) سید محمد خامس محلہ شفاعت پوتہ کے فرزند ہیں۔ آپ نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان نیوی میں ملازمت اختیار کی۔ آپ بحریہ کے فلائنگ ونگ میں ایک عرصے تک پائلٹ رہے۔ رسالپور سے آپ نے تربیت مکمل کی تھی اور اپنے کورس میں اول آکر بحریہ کے ATLANTIC SQUADRONT میں خدمات انجام دیں۔ دوران ملازمت انہوں نے مختلف قسم کے کورس کیے۔ اور ٹاپ پوزیشن حاصل کی۔ انہوں نے یو ایس نیول وار کالج میں تربیت کے دوران بہت سے تحقیقی PAPERS لکھے۔ آپ کا شمار نیوی کے ذہین افسروں میں کیا جاتا ہے۔

**حسن مجتبیٰ:** ڈاکٹر حسن مجتبیٰ نقوی، سید محمد رضا محلہ گذری کے فرزند ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیمسٹری میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا اور سینٹ لواسٹ یونیورسٹی یو ایس اے میں کافی عرصے پڑھاتے رہے۔ پاکستان واپس آ کر اٹامک انرجی کمیشن سے وابستہ ہو گئے۔ آپ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ریڈیولوجی کے محکمے کے سربراہ رہے اور نیوکلیر انسٹی ٹیوٹ آف اگریکلچر اینڈ بایولوجی (NIAB) فیصل آباد کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ ڈاکٹر مجتبیٰ کا بیرونی ممالک میں بڑا مقام ہے۔ وہ یونیڈو کے .GENETIC ENGG اور بایو ٹیکنالوجی کے انگل میں ممبر رہے۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد اور زراعتی یونیورسٹی فیصل آباد کی اکیڈمک کونسل کے ممبر بھی رہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مشہور سائنسی جرنلس کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بھی ہیں۔ بین الاقوامی ادارے IAEA کے پروجیکٹس کے فلپائن، ایران، شام، مصر، تونیشیا اور مراکو میں مشیر رہے۔ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ کے بھی کنسلٹنٹ رہے ہیں اور آج کل انٹرنیشنل اٹامک انرجی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر ویانا میں کام کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ کراچی کے دوران قیام وہ انجمن سادات امروہہ کے صدر بھی رہے۔ ڈاکٹر مجتبیٰ نے سائنسی تحقیق میں امروہہ کا نام روشن کیا ہے۔

**حسن عباس کاظمی:** حسن عباس کاظمی ۲۰/اکتوبر ۱۹۴۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سید وحید حسن کے فرزند ہیں۔ وحید حسن، جو ملٹری کی سروس سے ریٹائر ہوئے، امروہہ کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حسن عباس نے، جو میرے بھی اسکول کے ساتھی ہیں، امام المدارس انٹر کالج سے میٹرک پاس کیا۔ آپ نے

میرٹھ کالج سے بی-ایس-سی اور لکھنؤ سے کیمسٹری میں پی-ایچ-ڈی کیا-اس کے بعد انگلش میں ایم-اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے .B.Ed کے امتحانات پاس کیے-سنہ ۱۹۵۷ء میں آپ امام المدارس کالج میں لیکچرار ہوئے اور ترقی پاکر سنہ ۱۹۷۴ء سے آپ امام المدارس کالج میں بحیثیت پرنسپل خدمات انجام دے رہے ہیں-

**خلیق احمد نظامی:** پروفیسر خلیق احمد نظامی ۵ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کا تعلق ایک مقتدر اور معزز فاروقی خاندان سے تھا-آزادی ہند سے پہلے خلیق احمد نظامی کے والد عزیز احمد نظامی میرٹھ میں وکالت کرتے تھے لہذا آپکی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی-سنہ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ تاریخ سے وابستہ ہوئے-سنہ ۱۹۶۳ء میں پروفیسر نیز "سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز ان ہسٹری" مقرر ہوئے-سنہ ۷۲-۱۹۷۳ء میں آپ وائس چانسلر بھی رہے-سنہ ۱۹۷۵ء میں آپ نے ملک شام میں بحیثیت ہندوستان کے سفیر خدمات انجام دیں-آپ اردو،فارسی،عربی اور انگریزی کے بھی اہل قلم تھے-کئی زبانوں میں آپ کی بہت سی مصنفہ اور مولفہ کتابیں شائع ہوئی ہیں-۵ر دسمبر ۱۹۹۷ء کو علی گڑھ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہیں-

**خورشید مصطفیٰ رضوی:** خورشید مصطفیٰ رضوی سنہ ۱۹۳۰ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ نے ابتدائی تعلیم امروہہ،مرادآباد اور بریلی میں حاصل کی-اس کے بعد آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے .B.Sc کیا-سنہ ۱۹۶۵ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی لب B.Lib اور سنہ ۷۱ء میں سیاسیات میں ایم اے کیا-تعلیم سے فارغ ہوئے تو تقریری مباحثوں میں حصہ لیتے رہے-آپ نے ایک کتاب "جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء" لکھی جس پر آپ کو انعام سے بھی نوازا گیا-خورشید مصطفیٰ کی دوسری تصنیف "حیات ذاکر حسین" ہے-ہندوستان کے اخبارات میں بھی آپ کے مقالے چھپتے رہتے ہیں-آپ برسوں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری سے وابستہ رہے-بچپن سے آپ کو ادب،تحقیق اور اور تاریخ کا شوق پیدا ہوا-آپ برسوں سے سادات رضویہ کے سالانہ مجلہ در مقصود کے ایڈیٹر ہیں-آپ صوفی ازم سے بہت قریب نظر آتے ہیں-آجکل امروہہ اور دہلی میں تصنیف و تالیف میں معروف ہیں-انتہائی سنجیدہ مزاج اور مخلص کردار کے مالک ہیں-

**خورشید احمد:** خورشید احمد انصاری ۱۹ر مارچ سنہ ۱۹۴۷ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کا تعلق انصاری خاندان سے ہے-آپ ایم-کے-انصاری کے فرزند ہیں-خورشید احمد نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی-بچپن ہی سے سیاست کی طرف رجحان تھا-جو لوگ سیاسی و سماجی کاموں میں نیک نیتی سے قدم رکھتے ہیں اور ان

کے دل میں قوم کا درد ہوتا ہے تو ان کی منزل آسان ہو جاتی ہے-ان کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی-اس کی مثال جناب خورشید احمد انصاری ہیں جو بیک وقت بیسیوں انجمنوں یونینوں اور کمیٹیوں کے سکریٹری، صدر، نائب صدر اور چیئر مین ہیں-ایک طرف آپ اتر پردیش بیڑی مزدور یونین کے نائب سکریٹری ہیں تو دوسری طرف آل انڈیا مومن کانفرنس کے جنرل سکریٹری ہیں-سنہ ۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک آپ امروہہ کی Constituency سے Legislative Assembly کے ممبر رہے-اتنی جگہ آپ کو بیک وقت دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ آخر خورشید صاحب میں ایسی کیا بات ہے-اس کا جواب ہمیں یہی ملتا ہے کہ جو لوگ نیک نیتی سے کام کرتے ہیں دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ اور دل میں قوم کا درد رکھتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے-وہ خود سامنے نہیں آتے بلکہ انہیں عوام سامنے لاتے ہیں-ایسے لوگوں میں ایک شخصیت خورشید احمد انصاری کی ہے-

**دیوکی نندن:** ساہو دیوکی نندن کا امروہہ کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا-لالہ گوبند پرشاد کے متبنٰی تھے-لالہ گوبند پرشاد، جن کے کوئی اولاد نہیں تھی، اگروال خاندان (مقیم محلّہ کوٹ) کے لالہ جوہری مل امروہہ کے مشہور ساہوکار کے بیٹے تھے-آپ امروہہ کے معزز ترین اور خوش طبع شخص تھے-رئیس ہونے کے باوجود آپ کا رہن سہن انتہائی سادہ تھا-سماجی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے-

**ذکی احمد خانصاحب:** مولانا مولوی ذکی احمد شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں کے برادر حقیقی تھے-جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی-دہلی میں مطب فرماتے تھے-مایوس مریضوں کی نگاہیں آپ ہی کی طرف اٹھتی تھیں-دہلی میں جید برقی پریس آپ ہی کا تھا-

**رشید احمد خاں:** شفاء الملک مولانا حکیم رشید احمد خاں خلف مولوی علی بہادر خاں علی جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے فارغ التحصیل ہوئے-ابتدا میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں شیدا صاحب کے پہلے شاگرد اور تحصیل علم کے بعد تقریباً ۱۳سال تک ان کے سکریٹری رہے-اس کے بعد بمبئی میں مطب شروع کیا-حذاقت طب میں اپنی قابلیت کی بنا پر وہ شہرت حاصل کی کہ آپ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے "شفاء الملک" کے اعلیٰ خطاب سے نوازا گیا-

**رئیس الدین:** رئیس الدین پیر محمد علی جان کے فرزند تھے-آپ سنہ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے-ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی-اس کے بعد عربی، فارسی اور طب کی تعلیم حاصل کی-سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ میونسپل

کمشنر اور ۱۹۳۰ء میں آنریری اسسٹنٹ کلکٹر مقرر کیے گئے اور نو دس سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ صرف امروہہ ہی میں نہیں بلکہ ضلع کی بااثر شخصیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۴؍اپریل سنہ ۱۹۵۹ء میں رئیس الدین کی وفات ہوئی۔

**رحمان عطّار:** عبدالرحمٰن عطار مولوی آل علی رضوی کے فرزند تھے۔ امروہہ میں مشہور و معروف "رحمانی دواخانہ" آپ ہی چلاتے تھے۔ رحمٰن صاحب بڑے ولولہ انگیز سماجی کارکن تھے۔ آپ ہمیشہ مجلس احرار اسلام اور جمعیتہ علماء کے نہایت پرجوش حامی اور کارکن رہے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی اجازت پر امروہہ میں رضاکارانہ تنظیم کی بنیاد ڈالی جسے الیکشن کے بعد مجلس احرار اسلام کے تحت دیدیا۔ مجلس احرار اسلام کی متعدد کانفرنسیں امروہہ میں منعقد ہوئیں جس کے روح رواں آپ ہی تھے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں منعقد ہونے والے مجلس احرار کے سالانہ جلسے کے موقع پر آپ نائب سالار اعظم صوبہ یوپی کے لیے چنے گئے۔ پنڈت نہرو جب دیہاتوں کا دورہ کرنے امروہہ آتے تو رحمٰن صاحب مع اپنے رضاکاروں کے ان کے ساتھ رہتے۔

**رام ناتھ شرما:** کبھی کبھاریوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو سرے سے جانتے ہی نہیں، اس شخص کی کوئی وجہ شہرت بھی نہیں اور نہ وہ گھر کا کوئی رئیس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے جذبۂ محبت اور پیار کی صداقت سے اس کے ایسے خدوخال سامنے آتے ہیں کہ چند ہی ملاقاتوں میں وہ آپ کی پسندیدہ شخصیت اور آپ کے ذہن و ضمیر کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے رام ناتھ صاحب ہیں۔ میں انہیں سرے سے نہیں جانتا تھا، نہ ان کی شکل سے آشنا تھا اور نہ وہ ایسے کسی منصب پر فائز ہیں کہ جنہیں سب لوگ جانیں۔ لیکن جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں ایسے امیر ترین لوگوں میں پایا جو محبت اور پیار کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں۔ اپنی اس دولت کو بڑی فراخدلی سے خرچ کرنے میں وہ اپنے پرائے کا بھی امتیاز نہیں کرتے۔

رام ناتھ شرما ۱۱؍جولائی سنہ ۱۹۳۹ء کو امروہہ کے برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق راجہ ہرنند کے خاندان سے ہے جو مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں مراد آباد کے صوبہ دار تھے۔ محلّہ چوک امروہہ میں آپ کی رہائش ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت آپ نے اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ آپ کے والد صاحب نے، جنہوں نے خود بھی اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، اپنے سب بچوں کو پہلے اردو کی تعلیم دلائی۔ چنانچہ رام ناتھ نے ابتدائی تعلیم تحصیل کے پاس ایک مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد ہندو ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ مزید

تعلیم کے لیے آپ بریلی چلے گئے جہاں بریلی کالج سے بی-اے کیا-اس کے بعد D.S.College آگرہ سے آپ نے ایم-اے کی ڈگری حاصل کی- تعلیم سے فارغ ہوئے تو درس وتدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا- آجکل آپ نوگانواں کے قریب کسان کالج میں لیکچرار ہیں-

رام ناتھ صاحب انتہائی سادہ طبیعت، خوش اخلاق، منکسر المزاج اور بہت محبت کرنے والے انسان ہیں- میں رام ناتھ صاحب کو قطعی طور پر نہیں جانتا تھا لیکن دوچار ملاقاتوں کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ میرے بچپن کے دوست ہیں-زندگی میں دوست تو بہت ملتے ہیں لیکن ان جیسے سچے دوست بہت کم ملیں گے-

پنڈت رام ناتھ کے دو بیٹے یوگیش و شلیش اور ایک بیٹی کجلا ہے-رام ناتھ شعر وسخن کا بھی ذوق رکھتے ہیں-غزل، منقبت گیتوں اور بھجن میں طبع آزمائی کرتے ہیں-رتن آپ کا تخلص ہے-آپ کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہر طرف شیطان کا غلبہ نظر آتا ہے آج　　شکر ہے بھگوان کا جو دن گزر جاتا ہے آج
آج کا انسان راہِ حق سے کتنا دور ہے　　اس کو جانا ہے کہاں اور وہ کدھر جاتا ہے آج
عاقل و دانا کی گنتی ہے کہاں اس دور میں　　ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں وہ جدھر جاتا ہے آج
سسکیاں بھر بھر کے دل روتا ہے یہ سب دیکھ کر　　دیش کیسا تھا رتن کا یہ کدھر جاتا ہے آج

**رام بلبھ سرن:** آپ کا تعلق اگروال خاندان سے تھا-رام بلبھ سرن بی-اے-بی ٹی مرحوم اپنے خاندان میں پہلے فرد تھے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی-انگریزی علم وادب اور اقتصادیات کے ساتھ عربی اور فارسی ان کے مضامین میں داخل تھی-اس کے بعد آپ نے ایل-ٹی-کا بھی امتحان پاس کیا-درس وتدریس سے بے انتہا لگاؤ تھا اسی بناء پر آپ ہندو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے-لیکن زندگی نے وفا نہیں کی-۷ راگست سنہ ۱۹۲۱ء کو آپ کی وفات ہوئی-اسی خاندان میں امروہہ کے ایک مشہور ڈاکٹر پریم ناتھ ہوئے-

**رام کمار وید:** پنڈت رام کمار وید یہ امروہہ کے اہم سماجی کارکن تھے-وہ محلّہ کوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پنڈت گوند پرشاد محلّہ کوٹ کے یہاں ۱۹ر نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے-وید رام کمار کو ہندی اور سنسکرت کے علاوہ اردو زبان پر بھی عبور حاصل تھا-وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور اپنی تقریر سے سننے والوں پر جادو کردیتے تھے-انہیں جذبات کو برانگیخت کرنے کا فن خوب آتا تھا-۱۹۵۷ء میں یوپی اسمبلی کے الیکشن میں ایم ایل

اے منتخب ہوئے۔ الیکشن کے بعد آپ نے اس خلیج کو' جو الیکشن میں ہندو مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھی' پاٹنے کی بڑی کوشش کی۔ آپ نے امروہہ کے لوگوں کی بے انتہا خدمت کی۔

ویدرام کمار اپنی تعلیمی خدمات کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ امروہہ میں ایک ڈگری کالج کے قیام کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہا تھا۔ چنانچہ ویدجی نے اس سمت میں بڑی مثبت مہم چلائی۔ کہا جاتا ہے کہ ساہو جگدیش سرن کو آپ ہی نے اس ڈگری کالج کے قیام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ۶۳ سال کی عمر میں ۲؍ جنوری سنہ ۱۹۷۹ء کو آپ سورگباش ہوئے۔

**رؤف زیدی:** ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب ڈاکٹر تو نہیں تھے البتہ آپ کے والد ارشاد علی حیدر آباد دکن میں پولیس سرجن تھے۔ ارشاد علی صاحب نوگانواں میں عابدی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں جب عبدالرؤف صاحب کی ولادت ہوئی تو ارشاد علی صاحب نے نوگانواں کو خیرباد کہا اور سکونت امروہہ میں اختیار کرلی۔ عبدالرؤف صاحب نہایت شریف اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ امروہہ کی علمی' ادبی' تہذیبی' تمدنی اور سیاسی زندگی میں عبدالرؤف صاحب کا ایک منفرد مقام تھا۔ آپ کی سکونت محلہ نوبت خانہ میں تھی۔ آپ کے دیوان خانہ میں ہر روز ادبی اور شائستہ محفلیں جمی رہتی تھیں جس میں امروہہ کے نامور ادیب، شاعر اور سیاسی شخصیات آکر بیٹھا کرتی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد ان کی ساری اولاد پاکستان آگئی تو وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ آخر اولاد کی محبت سے مجبور ہو کر بہت دن بعد عبدالرؤف صاحب بھی پاکستان چلے آئے۔ آپ کے بیٹوں میں سید عبدالمعروف زیدی مرحوم' سید محمد عارف زیدی' سید مسعود حسن زیدی' سید مطلوب حسن زیدی مرحوم اور سید مسرور حسن زیدی مرحوم ہوئے۔ مسعود حسن زیدی کراچی میں Quality Builder کے نام سے ایک مشہور Firm چلا رہے ہیں۔

**رئیس نجمی:** سرزمین امروہہ نے جہاں نامور شعراء پیدا کیے وہاں ایسے ہی شہرت یافتہ افسانہ نگاروں کو بھی جنم دیا۔ دور حاضر کے ہندوستانی افسانہ نگاروں میں ہمیں ایک اہم نام رئیس نجمی کا ملتا ہے۔ رئیس الدین نجمی جنہیں رئیس نجمی کہتے ہیں ۸؍ مئی ۱۹۳۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج سے ہائی اسکول اور انٹر جے۔ ایس۔ ہندو انٹر کالج سے کیا۔ افسانہ نگاری کا شوق طالب علمی سے ہوا۔ آپ نے تین سو ۳۰۰ سے زائد افسانے لکھے جن میں بیشتر نہ صرف ہندوستان میں چھپے بلکہ پاکستان کے مشہور رسائل جائزہ، جام نو، محفل (لاہور) اور

مشرق کراچی میں بھی شائع ہوئے۔ آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "روتا ہوا آدمی" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا جو ہندوستان پاکستان میں بہت مقبول ہوا۔ آپکو حکومت اُتر پردیش نے بھی انعام واکرام سے نوازا۔

**رضی احمد صدیقی:** رضی احمد صدیقی سنہ ۱۹۳۶ء میں خانوادۂ سادات امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ہندوانٹر کالج سے میٹرک کرنے کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد رضی احمد پاکستان آگئے۔ یہاں حکومت پاکستان کے محکمہ جیالوجیکل سروے آف پاکستان سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت سفارت خانہ پاکستان ڈنمارک میں پانچ سال لیبر اتاشی کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ رضی احمد نے جینوا اور یونیسکو کے تحت مختلف ممالک میں کورس کیے۔ اقوام متحدہ کے ذیلی کمیشن کے اجلاس جنوبی کوریا میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ قومی و بین الاقوامی سائنس کانفرنسوں میں مقالات پیش کیے۔ اس سلسلے میں رضی احمد نے بہت سے ممالک کی سیاحت بھی کی ہے۔ حال ہی میں وادیٔ سینا اور کوہ طور کی زیارت بھی کی ہے۔ آپ کئی فنی کتابوں کے مصنف ہیں۔

سائنس کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی شغف ہے۔ رضی عزیزی کے نام سے افسانے بھی لکھتے ہیں۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مجاز خلیفہ ہیں اور پابندی سے ہر سال جد اعلیٰ حضرت خواجہ شاہ عبدالہادیؒ کا کراچی میں عرس منعقد کراتے ہیں۔

**رحمت علی صدیقی:** رحمت علی صدیقی ۱۰ر جنوری ۱۹۴۳ء امروہہ کے ایک ماہر معمار نوروز علی صدیقی کے یہاں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک نیک دل، خدا ترس اور پاکیزہ صفت انسان تھے۔ اگرچہ دولتمند اور صاحب ثروت نہ تھے مگر وہ انسانی اقدار جو ایک بلند کردار کے لیے ضروری ہوتی ہیں وہ ان میں موجود تھیں۔ وہ اپنے کام اور اپنے فن سے محبت کرتے تھے اور جانفشانی اور پوری سچائی کے ساتھ اکل حلال کے قائل تھے۔ ایسے پاکیزہ صفت باپ کے سایہ عاطفت میں رحمت علی پروان چڑھے۔ باپ کے ساتھ محنت مزدوری شروع کی اور اپنی غربت کو عیب نہ جانا۔ رحمت علی نے مسیح اللہ خاں کے کارخانے میں بیڑی بنانے کا کام سیکھا۔ انہوں نے سائیکلوں کی مرمت کا کام بھی کیا۔ لیکن زندگی کی دوڑ میں انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے اپنا بیڑی بنانے کا کام شروع کیا۔ خود بیڑی بناتے اور خود دکان دکان جاکر اپنی بیڑیاں پہنچاتے۔ آخر کار وہ وقت بھی محنت و لگن کے نتیجے میں آگیا کہ انہوں نے اپنی دکان کو ایک بڑے کارخانے میں تبدیل کرلیا اور آج وہ امروہہ کے بڑے کارخانہ داروں میں شمار ہوتے ہیں۔

وہ ایک درد مند دل رکھتے ہیں- سرمایہ دار ہونے کے بعد ان میں دولت کی محبت پیدا نہیں ہوئی- وہ مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے مزدوری دینے کے قائل ہیں- ان کے وہ ساتھی جو ان کے ساتھ بیڑیاں بناتے تھے ان کے کارخانے میں کام کرتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ بھی بڑی عزت اور محبت کا ہوتا ہے- وہ ان کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں-

رحمت علی قومی، ملکی، سماجی اور مذہبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں- میرے علم کے مطابق وہ متعدد عربی و فارسی اسکولوں کی مالی امداد کرتے ہیں- امروہہ میں دار العلوم اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، جامع حسینیہ چلہ، مدرسہ حنفیہ شاہی چبوترہ کو باقاعدہ مالی امداد فراہم کرتے ہیں- مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انہوں نے عبد الکریم خاں انٹر کالج ہی میں ایک کمرہ تعمیر نہیں کرایا بلکہ امام المدارس انٹر کالج کے سائنس بلاک کی تعمیر میں بھی مالی معاونت کی- ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک سچے مسلمان میں ہونی ضروری ہیں- وہ نیک ہیں، صالح ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں، لڑائی جھگڑے اور فتنوں سے دور رہتے ہیں- عالی ظرف ہیں، اپنے اثر رسوخ کو دوسروں کے لیے استعمال کر کے خوش ہوتے ہیں- اپنے ماضی پر فخر کرتے ہیں اور اپنی غربت کا تذکرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے- ایسے ہی لوگ دراصل انسانیت کے علمبردار ہوتے ہیں-

**رویندر نارائن شرما:** رویندر نارائن شرما پنڈت لکشمی نارائن شرما محلہ منڈی چوب کے فرزند ہیں- ۳۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- طالب علمی کے زمانے میں آپ بڑے ذہین اور ہونہار طلباء میں شمار کیے جاتے تھے- آپ نے پانچ مضامین، اکنامکس، پولیٹیکل سائنس، سوشیولوجی، ہسٹری اور ہندی" میں ایم- اے کیا- اس کے بعد N.P.Ed اور D.P.Ed. کی ڈگریاں بھی حاصل کیں- اس کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور کندن ماڈل کالج میں لیکچرار شپ سے اپنی سروس کا آغاز کیا- آپ نے انتہائی ذمہ داری اور دلچسپی سے اس کالج کے طلباء کو پڑھایا- اپنی صلاحیت کے سبب آج آپ اسی کالج کے پرنسپل ہیں- کالج کی ترقی آپ ہی کی مرہون منت ہے-

رویندر نارائن سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں- آپ کو کھیلوں سے بھی بہت دلچسپی ہے- جب بھی ضلع اور کمشنری لیول کے کھیل منعقد ہوتے ہیں تو آپ ان کے Organizer ہوتے ہیں-

**زائر حسین:** جو لوگ زندگی کا سفر نشیب سے شروع کر کے فراز تک پہنچتے ہیں وہ زندگی کی حقیقتوں سے

بخوبی واقف ہوتے ہیں-وہ کٹھن راستوں کی تکلیف اور سہل راستوں کا آرام بھی خوب جانتے ہیں- جب اپنے تجربات سے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہیں تو یہی نادیدہ لوگ دیدہ بلکہ پسندیدہ شکل اختیار کر لیتے ہیں- ایسے ہی لوگوں میں ایک شخصیت ہمارے سید زائر حسین صاحب کی ہے جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جب ان کے بارے میں پڑھا تو وہ آشناؤں سے بڑھ کر مجھے آشنا لگے-

زائر حسین ستمبر سنہ ۱۹۲۷ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ سید شاکر حسین کے فرزند ہیں - آپ کے جدِ اعلیٰ سید قطب علی موضع ناگولی قصبہ چاندپور ضلع بجنور سے امروہہ آئے تھے اور پھر یہیں سکونت اختیار کر لی- آپ کے والد سید شاکر حسین ایک خوش طبع' خوش اخلاق' پر مذاق اور محبت کرنے والے بزرگ تھے -ایسی خوبیوں کے مالک کا بیٹا ان خوبیوں سے کیسے محروم رہ سکتا تھا- چنانچہ دنیاوی محرومیوں کے باوجود ان کے فرزند نے اپنے اجداد کا نام روشن کیا اور اس کو چار چاند لگائے-

زائر حسین کا ابتدائی دور تکلیفوں، پریشانیوں اور اذیتوں میں گزرا لیکن وہ ان مشکلات سے کبھی نہیں گھبرائے-وہ صبر و تحمل اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے-اس راہ میں انہوں نے محنت و مشقت اور مزدوری کرنے سے نہ تو گریز کیا اور نہ اسے عیب سمجھا- آخر ایک دن اللہ تعالیٰ نے ان کی انتھک محنت ومشقت کا انعام دیا اور انہیں دولت و ثروت،عزت و وقار اور راحت و آرام سے مالا مال کر دیا- لیکن دولت کی فراوانی سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی -انہیں نہ دولت کا غرور ہے نہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی طمع ہے -وہ آج بھی منکسر المزاج اور دکھی انسانیت کا درد رکھنے والے شخص ہیں- قومی اور رفاہی اداروں،اسکول و مدارس کی دل کھول کر مالی امداد کرتے ہیں-ان کاموں میں وہ اپنا پرایا بھی نہیں دیکھتے- جہاں انہوں نے کریم خاں انٹر کالج کی مالی امداد کی تو دوسری طرف امام المدارس کالج کی سلور جوبلی کی تقریبات اور یوم انیس منانے میں بھی دل کھول کر روپیہ خرچ کیا-ایک طرف شاہ ولایت گیٹ کی تعمیر میں تو دوسری طرف تلسی اسمارک کی تیاری میں بھی برابر کی رقم خرچ کی- غریبوں کی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ ہو-

**سلطان احمد:** حکیم سلطان احمد کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان رضویہ سے تھا- آپ حکیم علی احمد کے فرزند تھے -سنہ ۱۹۱۳ء میں آپ کی پیدائش ہوئی-ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی- حکیم سلطان احمد نے عربی کی تعلیم حضرت مولانا سید رضا حسن صاحب اور فارسی منشی عبدالرب شکیب سے حاصل کی- طبی کتابیں مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی سے پڑھیں- تعلیم سے فارغ ہوئے تو اپنے والد بزرگوار کی سربراہی میں مطب شروع کیا

لیکن طبیہ کالج دہلی کے وائس پرنسپل کے مشورے پر طبیہ کالج دہلی میں داخل ہوگئے۔دوران تعلیم آپ نے دہلی کے معروف حکیم محمد احمد خاں اور حکیم ظفر خاں سے بھی استفادہ کیا۔

بنارس کے سوامی آنند صاحب کی نگرانی میں حکیم سلطان نے رامپور میں پرانے امراض کی ریسرچ کے لیے ایک ادارہ بھی قایم کیا۔آپ بڑے ذی علم، ماہر طب اور بہترین نباض تھے۔آپ نے بعض ایسے پیچیدہ امراض کے علاج کیے کہ بڑے بڑے ڈاکٹر آپ کے ماہرانہ علاج سے حیران رہ گئے۔

**سرفراز عثمانی:** سرفراز عثانی کا نام امروہے کے علمی اور ادبی ماحول میں ایک نمایاں اور منفرد نام ہے۔ علم و ادب ہی کیا اگر امروہے کی سیاسی زندگی پر کچھ لکھا جائے تب بھی سرفراز کے نام سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔سرفراز خالصتاً امروہے کے قدیم باشندے تو نہیں ہیں مگر امروہہ ان کی رگ وپے میں ایسا سمویا ہوا ہے کہ ان کو بدایونی کہنے کو نہ کسی کا دل چاہے گا اور نہ خود ان کا۔سرفراز حالانکہ بدایوں کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں علم وفن کی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔مولانا حامد بدایونی، مولانا عبدالقدیر مفتی اعظم حیدرآباد اور مولوی عبدالصمد جیسی برگزیدہ محترم ہستیاں اسی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔مگر سرفراز نے 'پدرم سلطان بود' پر اپنی زندگی کی اساس نہیں رکھی بلکہ اپنی دنیا آپ بنائی، اپنا ایک جداگانہ مقام پیدا کیا اور آج اس کی شخصیت کو امروہہ کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک انفرادیت حاصل ہے۔

سرفراز کی نانی میونسپل بورڈ امروہہ کے اسکول واقع محلہ چاہ غوری میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔وہ ان کے ہی سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے، ان کی ہی رہنمائی میں تعلیمی منازل طے کیں۔مرحوم سید ثروت حسن رضوی جیسی محبت کرنے والی ہر دلعزیز ذات نے سرفراز کو پدرانہ شفقتوں سے نوازا۔سرفراز نے ایم اے پاس کیا ہے اور ان کو پڑھانے کا اتنا شوق ہے کہ ایم اے کے طلباء و طالبات کو پڑھا کر ایک مسرت حاصل کرتے ہیں۔انہوں نے ثروت اکیڈمی قایم کرکے ثروت صاحب کے نام کو زندہ رکھا ہے۔سرفراز کی اہلیہ مستجاب جو حکیم کلب علی کی صاحبزادی ہیں اس اسکول کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہیں۔

سرفراز یوں تو نظریاتی اعتبار سے کمیونسٹ تھے، ترقی پسند تھے، روایت شکن تھے مگر وہ بہ یک وقت ایک سچے اور پکے مسلمان بھی ہیں۔ادب اور سیاست دونوں ہی آپ کے میدان ہیں۔وہ ایک لیڈر بھی ہیں اور ایک تنقید نگار بھی۔وہ چھوٹوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور بزرگوں کا احترام بھی۔ان کی طبیعت میں بے پناہ رواداری اور سوز و گداز بھی ہے۔سرفراز ایک اچھے مضمون نگار اور ایک اچھے افسانہ لکھنے والے ہیں۔ان کی شخصیت اتنی ہمہ

جہت ہے کہ میں اس کو احاطۂ تحریر میں لانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ میں اپنی دو تین ملاقاتوں میں ان کا ضرور اندازہ لگا سکا ہوں کہ وہ دوسروں کی ہمت بڑھانے والے انسان ہیں۔ میرے امروہہ کے دوران قیام سرفراز نے جس پیار و محبت سے "کشورِ اولیا" کے لکھنے کی طرف مجھے مائل کیا اور جس طرح میری ہمت افزائی کی وہ ان کی وسیع القلبی اور وسیع المشربی کا بیّن ثبوت ہے۔

**سومناتھ گپتا:** ڈاکٹر سومناتھ گپتا سنہ ۱۹۰۵ء کو امروہہ کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ امروہہ اور اس کے سوانگ پر آپ نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد مہاراجہ جسونت کالج جودھپور میں پروفیسر اور بعد میں پرنسپل رہے۔ علم و ادب سے آپ کو بڑا لگاؤ ہے۔ آپ کے فرزند اجیتابھ گپتا آئی۔پی۔ایس آج کل راجستھان پولیس کے ڈی۔جی۔پی ہیں۔ آپ اسلام آباد (پاکستان) میں بھارت ایمبیسی میں چیف سیکورٹی آفیسر بھی رہ چکے ہیں۔

**یحییٰ حسن نقوی:** سید یحییٰ حسن نقوی بن سید عسکری حسن (محلہ گذری) کیم نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ہوش سنبھالا ہی تھا کہ سر سے والد بزرگوار کا سایہ اٹھ گیا۔ ابتدائی آٹھ کلاس تک امام المدارس اسکول میں پڑھ کر گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد آپ علی گڑھ چلے گئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔بی۔ٹی۔ کیا۔ پھر آگرہ سے ایم۔اے۔ کیا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں امام المدارس ہائی اسکول میں مدرس ہوئے اس کے بعد دوسری شفٹ کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں امروہہ میں Suptt. of Education کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں امام المدارس انٹر کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ تاریخ پر دو کتابیں "اسلامی حکومت" اور "ہندو راج" لکھیں جو سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ انشائیوں اور کہانیوں کا ایک مجموعہ "نمک پارے"، ایک ناول "شیلا" اور "ہمارا قدیم سماج" وغیرہ اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ مرحوم انجمن ترقی اردو ہند شاخ امروہہ کے صدر بھی رہے۔ تاریخی موضوعات پر مختلف اخباروں میں مضامین چھپتے رہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی Talks نشر ہوا کرتی تھیں۔ ۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے آپ نے وفات پائی۔

**سبط یحییٰ نقوی:** سید سبط یحییٰ نقوی سید سبط ضامن نقوی کے فرزند ہیں آپ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء کو محلہ تر پولیہ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۶۱ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک اور سنہ ۶۲ء

میں انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا تھا- اس کے بعد آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا لیکن کم عمر ہونے کے سبب داخلہ نہ مل سکا- اس کے بعد آپ پاکستان آگئے اور ۱۹۶۵ء میں سندھ یونیورسٹی جام شورو سے بی-ایس-سی (آنرز) اور سنہ ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم-ایس-سی (میتھ) کے امتحانات پاس کیے- سنہ ۱۹۶۷ء میں آپ نے حیدر آباد میں میتھ کے لیکچرار کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا- ۱۹۶۹ء میں آپ حبیب پبلک اسکول میں میتھ کے لیکچرار ہوئے- سنہ ۱۹۷۲ء میں آپ پاکستان کی اعلیٰ ملازمت کا امتحان پاس کر کے منسٹری آف فارن افیئرس، فیڈرل گورنمنٹ آف پاکستان سے منسلک ہوگئے- ایک سال سی ایس ایس اکیڈمی لاہور سے ٹریننگ کے بعد انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج اسلام آباد سے عربی زبان کا کورس کیا- یحییٰ صاحب نے پاکستان ایمبیسی رومانیہ، پرتگال، لیبیا وغیرہ میں کئی سال منصبی خدمات انجام دیں- سنہ ۸۴ء سے ۱۹۸۷ء تک منسٹری آف فارن افیئرز کراچی میں ڈپٹی چیف پروٹوکول رہے- سنہ ۹۵ء سے ۱۹۹۸ء تک منسٹری آف فارن افیئرز میں آپ نے بحیثیت ڈائریکٹر جنرل مڈل ایسٹ اور ایکو(ECO) میں بھی خدمات انجام دیں- سنہ ۱۹۹۸ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو شام کا سفیر مقرر کیا- آپ بین الاقوامی کانفرنس جیسے Summit of Islamic Countries' اور Summit of ECO Countries اور Summit of Non allign Nation وغیرہ میں حکومت پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں-

**سبط مومن:** سید سبط مومن نقوی ۱۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کو محلہ ترپولیہ امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد سید سبط ضامن نقوی سادات امروہہ کے معزز شخص تھے- سبط مومن نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی- سبط مومن بھی اپنے برادر سبط یحییٰ کی طرح بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم رہے ہیں- سنہ ۱۹۶۳ء میں آپ نے الہ آباد بورڈ سے میٹرک اور ۶۵ء میں انٹر کیا- سنہ ۱۹۶۸ء میں آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے B.Sc.in Physics,Satistics اور سنہ ۱۹۶۹ء میں Business Administration میں ایک سال کا ڈپلومہ کیا اور اسی سال پاکستان آگئے- سنہ ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے آپ نے M.A. in Development Economics کرنے کے بعد سنہ ۱۹۷۸ء میں پاکستان کی اعلیٰ ملازمت کا امتحان CSS بڑی کامیابی کے ساتھ پاس کیا- سنہ ۱۹۷۳ء سے آپ Labour & Manpower Directorate Govt of Sindh میں بحیثیت ریسرچ آفیسر ہوئے- یہاں پر آپ نے دو قومی سیمینار بھی منعقد کرائے- آپ حکومت پاکستان کے مختلف اہم اداروں میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر نیپا، جنرل منیجر ایکسپورٹس وغیرہ کے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں- آجکل آپ

Board of pakistan Insurance Corporation کے سکریٹری ہیں-

**سید علی نقوی:** ماضی کے افق پر نظر جاتی ہے تو ایسی ایسی شخصیات سامنے آتی ہیں جن پر امروہہ کے ہونے پر فخر ہوتا ہے-ایسی ایک شخصیت سید علی نقوی کی ہے جنہیں میں اپنا بڑا بھائی کہتا ہوں کیونکہ وہ میرے برادر بزرگ محمد حسین صدیقی مرحوم کے اسکول ساتھی اور قریبی دوست ہیں-"سیاحتِ ماضی" میں بھی میں نے آپ کا ذکر کیا تھا- آپ کی پیدائش محلہ بگلہ امروہہ میں ہوئی- آپ سید مسعود احمد نقوی کے فرزند ہیں-

سید علی نے ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج میں حاصل کی- سنہ ۱۹۴۴ء میں میٹرک اور انٹر گورنمنٹ کالج مراد آباد سے کیا- سنہ ۱۹۵۱ء میں آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے .BSC.Civil Engg کیا اور پھر پاکستان آگئے- یہاں آنے کے بعد CentralEngg.Authority میں Ex.Engineer مقرر ہوئے- سنہ ۱۹۵۸ء میں منگلاڈیم میں ڈپٹی پروجیکٹ ڈائریکٹر ہوئے- منگلاڈیم کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد آپ سنہ ۱۹۶۹ء میں تربیلاڈیم میں ڈپٹی چیف انجنیر اور پھر ڈپٹی جنرل منیجر ہوئے- سروس کے آخری ایام میں کالاباغ ڈیم میں تبادلہ ہوا اور پھر سنہ ۱۹۸۰ء میں ایشین ڈیولپمنٹ بینک میں سینیر ایگزیکٹو رہے اور یہیں سے آپ ریٹائر ہوئے- ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آپ فری لانس انجنیرنگ پریکٹس کر رہے ہیں- آج بھی بیرون ملک بہت سی کمپنیاں آپ سے فائدہ حاصل کرتی ہیں-

**سخاءالحسنین:** سید سخاءالحسنین حکیم ضیاءالحسنین محلہ بقر قصاب کے فرزند تھے- حکیم صاحب اپنے عہد کے عربی اور فارسی کے ایک جید عالم اور علوم طب کے فارغ التحصیل تھے- انہوں نے "حمیات قانونِ شیخ" شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب کا ترجمہ کیا جو "درمکنون" کے نام سے طبع ہوا- سید سخاءالحسنین ان عظیم بزرگ کے فرزند تھے- انہوں نے میٹرک امروہہ سے کیا اور ایم اے ایل ایل بی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پاس کیا اور مراد آباد میں وکالت شروع کی- آپ طالب علمی کے ہی زمانے سے سیاسیات سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے- پہلی بار سنہ ۱۹۲۸ء میں میونسپل بورڈ امروہہ کے ممبر منتخب ہوئے اور انتخاب میں کامیابی کا سلسلہ برابر جاری رہا- سنہ ۱۹۴۵ء میں آپ میونسپل بورڈ کے چیرمین منتخب ہوئے اور نو سال تک متواتر چیرمین ہوتے رہے- ان کے عہد میں امروہہ میونسپلٹی نے بڑی ترقی کی- آپ کے ہی عہد میں امروہہ میں لازمی تعلیم کا آغاز کیا گیا اور ہر محلے میں میونسپلٹی کا ایک اسکول قایم ہوا- آپ ملازمین میں اپنی ہمدردانہ روش اور خلوص کی وجہ سے بہت مقبول تھے- آپ

نے ہمیشہ قومی معاملات میں دلچسپی لی۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ممبران میں سے تھے۔امروہہ میں جب انجمن اصلاح معاشرت کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے سرگرم کارکن تھے اور اس انجمن کے صدر بھی رہے۔انجمن تحفظ عزاداری امروہہ کے بھی آپ بانیوں میں سے تھے اور اس کے بھی صدر رہے۔آل احمد گرلز اسکول کی نیجری سے جب سید مسعود حسن وکیل بہ عزم ہجرت سبکدوش ہوئے تو آپ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور آپ ہی کی کوششوں سے یہ اسکول ہائر سیکنڈری اسکول ہوا۔

**سید محمد:** سید ابدال محمد محلّہ لکڑہ کی اولاد میں کئی بڑے طبیب گزرے ہیں جن کا تشخیص امراض کے سلسلے میں دور دور شہرہ تھا۔ان میں حکیم سید محمد فن طب میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے۔بیرون امروہہ بلائے جاتے تھے۔نواب فرخ آباد کے طبیب خاص تھے۔سید المدارس امروہہ کے بانیوں میں سے تھے۔آپ کے بعد آپ کے تین بیٹے حکیم میر محمد، حکیم میر احمد (اچھو) اور حکیم محمد طٰہ نامی گرامی اطباء میں تھے۔حکیم محمد طٰہ تو جراحت کے شعبہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔حکیم میر محمد کے صاحبزادے حکیم مرتضیٰ علی اور حکیم طٰہ کے صاحبزادے حکیم محمد مہدی آج بھی اپنے اجداد کے نقش قدم پر چل کر دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔

**سبطین نقوی:** سید محمد سبطین ڈپٹی ناظم حسین محلّہ قاضی زادہ ۲۴؍ فروری ۱۹۴۲ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم امام المدارس ہائی اسکول میں حاصل کی۔تقسیم کے بعد پاکستان آگئے۔سنہ ۱۹۶۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے M.A. کیا۔اس کے بعد آپ نے CSS کے مقابلے کا امتحان پاس کیا اور محکمہ انکم ٹیکس میں آفیسر گریڈ میں مقرر ہوئے اور انکم ٹیکس کمشنر رہے۔آجکل انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل میں ممبر کے نہایت اہم عہدے پر فائز ہیں۔سبطین نقوی بہت ہی بااخلاق وسیع القلب ادب نواز انسان ہیں۔

**ساہو سروپ ٹنڈن:** ساہو سروپ ٹنڈن اور کشن سروپ ٹنڈن دونوں حقیقی بھائی تھے۔ساہو سروپ ٹنڈن انتہائی قابل وکلاء میں شمار کیے جاتے تھے۔آپ کی ذہانت کی یہ مثال ہے کہ ضلع کے نامور بیرسٹر کیدار ناتھ بھی آپ سے اکثر مقدمات میں مشورہ لیا کرتے تھے۔آپ کا شمار امروہہ کے رؤساء میں ہوتا تھا۔آپ کے یہاں کھنڈسازی اور غلہ کی آڑت کا کام بھی تھا۔آپ کے تین فرزند ہوئے جن میں راجہ رام ٹنڈن بریلی اور بھگوتی سروپ ٹنڈن سیتاپور میں جا بسے۔تیسرے بیٹے راج کشن ٹنڈن امروہہ میونسپل بورڈ کے گردھاور ہوئے۔سنہ ۱۹۳۵ء میں ساہو سروپ ٹنڈن کا انتقال ہوگیا۔

**سراج الدین ہاشمی:** سراج الدین ہاشمی معروف سیاسی و سماجی کارکن اور دینی تحریکوں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ آپ انتہائی خوش اخلاق اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ آپ مہتاب الدین ہاشمی کے فرزند ہیں۔ ان کی انتھک کاوش سے والد کا قایم کیا ہوا دواخانہ ترقی پذیر ہے اور بڑی خدمات انجام دے رہا ہے۔

**شاکر حسین:** آپ کا نام سید شاکر حسین اور والد کا نام سید صابر حسین تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۸۶۳ء محلّہ سٹھی میں ہوئی۔ آپ کے دادا نے امروہے کی بود و باش ترک کر کے جے پور میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہاں کے مہاراجہ اور سنٹیل کالج میں فارسی کے پروفیسر ہوگئے۔ سید شاکر حسین نے جے پور ہی میں ۱۸۸۸ء میں امتیازی نمبروں سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے محکمہ گیرائی (پولیس) میں ملازم ہوگئے۔ مختلف دفاتر میں ملازمت کرتے ہوئے وہاں کے ہائی کورٹ میں نائب سرشتہ دار (ریڈر) ہوئے اور یہیں سے ۱۹۳۶ء میں پینشن لی اور ۱۹۴۸ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

سید شاکر حسین ایک نہایت عالم و فاضل انسان تھے۔ انہوں نے بیس جلدوں پر شامل "تاریخ عالم" لکھی جس میں سے چار سے پانچ جلدیں تاریخ ہند پر مشتمل ہیں اور ہر جلد میں پانچسو صفحات ہیں۔ بدقسمتی سے یہ اہم تاریخ آج تک نہ چھپ سکی اور نہ ہی اس کو پاکستان میں کوئی پبلشر میسر آسکا۔ مجبور ہو کر ان کے فرزند پروفیسر سید طاہر حسین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے پاکستان یا ہندوستان کے کسی میوزیم میں رکھوا کر محفوظ کردیا جائے۔

**شعیب احمد عباسی:** شعیب احمد عباسی اخلاق احمد کے فرزند تھے۔ امروہہ میں آپ کی سکونت محلّہ چاہ غوری میں تھی۔ شعیب احمد صاحب نے ہندوہائی اسکول امروہہ میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے وقت کے بہترین ڈبیٹر تھے۔ اس کے بعد پاکستان آکر آپ نے اعلیٰ تعلیم .C.S.S کا امتحان پاس کیا اور محکمہ انکم ٹیکس میں آفیسر گریڈ میں مقرر ہوئے اور ریجنل انکم ٹیکس کمشنر کے نہایت اہم عہدے تک پہنچے۔

کراچی کے علمی ادبی ماحول کا ان کے وطن عزیز کے پس منظر میں بڑا اثر ہوا۔ شعر و سخن سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ ایک دردمند انسان تھے اور کوئی ضرورت مند اگر ان کے پاس پہنچ گیا تو کبھی وہ اس کی مدد کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔ امروہہ کے لوگوں کی بلاتفریق مذہب خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ کراچی میں شہباز امروہوی مرحوم کا دیوان "ساز ظرافت" اور "طاظ" آپ ہی نے شائع کرایا۔ سنہ ۱۹۹۷ء میں آپ کی وفات ہوئی۔

**شمیم احمد خاں:** شمیم احمد خاں لودھی ۱۷ر جولائی ۱۹۱۸ء کو محلّہ کٹکوئی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے

والد عبداللطیف خاں اودھی کا شمار امروہہ کے معزز لوگوں ہوتا تھا- شمیم احمد خاں نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی پھر اینگلو عربک ہائیر سکنڈری اسکول دہلی سے میٹرک کیا- میٹرک کرنے کے بعد آپ لاہور آگئے اور یہاں آکر ریلوے میں ملازمت اختیار کرلی- محکمہ ریلوے سے آپ آفیسر گریڈ میں ریٹائر ہوئے- تقسیم ہند کے وقت جب مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آرہے تھے تو آپ دن رات ان کی مدد کرنے میں مصروف رہتے تھے- لاہور میں قایم ہونے والی امروہہ انجمن میں بھی بڑی خدمات انجام دیں-۲۸ اپریل سنہ ۱۹۸۱ء میں آپ کی وفات ہوئی-

**شمیم احمد سوری:** شمیم احمد خاں سوری سنہ ۱۹۳۳ء میں امروہہ کے سوری خاندان میں پیدا ہوئے- آپ کے والد حلیم احمد خاں تھے جو محلہ کٹکوئی میں سکونت پذیر تھے- شمیم سوری نے سنہ ۱۹۴۹ء میں ہندو ہائی اسکول امروہہ سے میٹرک کیا-۱۹۵۰ء میں آپ پاکستان آگئے -یہاں آکر آپ نے انٹر بی اے اور پھر معاشیات میں ایم-اے کیا- سنہ ۱۹۶۱ء میں ملازمت کا آغاز کیااور اسلامیہ کالج میں بحیثیت لیکچرار ملازم ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے ۱۹۸۴ء میں آپ گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہوگئے-اسلامیہ کالج کے بعد شمیم صاحب سراج الدولہ اور گورنمنٹ سٹی کالج کے بھی پرنسپل رہے- سنہ ۱۹۹۶ء میں آپ سینٹ پیٹرک کالج کے پرنسپل ہوئے اور ۹۳ء میں ریٹائر ہوگئے -ریٹائرمنٹ کے بعد تین سال تک آپ پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے-

آپ نے دو کتابیں "معاشیات پاکستان" اور "ہسٹری اینڈ کلچر آف پاکستان" تصنیف کیں جو بڑی مقبول ہیں- آج کل کراچی میں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں-

**شریف احمد:** سید شریف احمد یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ سید جمیل احمد مرحوم محلہ چاہ ملاامان کے فرزند ہیں-ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج اور ہندو ڈگری کالج میں ہوئی-بمبئی یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیااور پھر اردو لٹریچر میں پی ایچ ڈی کیا- تعلیم سے فارغ ہوئے کرناٹک کالج دھارواڑ، بمبئی یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی سری نگر اور دہلی یونیورسٹی میں ملازم رہے- موصوف نے کئی کتابیں لکھیں جن میں دو جلدوں میں تہذیب کی منزل (تاریخ)، مشاہدے (تنقیدی مقالات)، عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن اور "ساحل سمندر" ہمنگوے کی کتاب OLD MAN AND THE SEA کا ترجمہ کیا- آج کل آپ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں اور کوچہ رحمان، چاندنی چوک دہلی میں قیام ہے-

**شبیہ** : سید شبیہ احمد نقوی 'سید احسان احمد نقوی (محلّہ مناف کا گھیر ) کے فرزند ہیں۔شبیہ احمد امروہہ کی معروف سیاسی شخصیت ہیں۔بھارت کی سیاسی جماعت کانگریس 'حج کمیٹی اور امروہہ کی ریلوے کمیٹی کے سرگرم رکن ہیں۔آپ ہندو مسلمان سب ہی میں بہت مقبول ہیں اور سماجی و رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

**صیانت اللہ صدیقی** : حکیم صیانت اللہ صدیقی حکیم سعادت اللہ کے چھوٹے بھائی اور حکیم فرحت اللہ کے فرزند تھے۔ان کی پیدائش دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔آپ خاندانی طور پر طب یونانی کے پیشہ سے وابستہ تھے۔شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔سید المدارس کے اچھے اور ذہین طلباء میں شمار کئے جاتے تھے۔طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد محلّہ سدو میں باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔صیانت اللہ ہاکی کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ٹاؤن ہال کلب کی ٹیم میں فل بیک کی پوزیشن پر کھیلتے تھے۔بھاگنے کی تیزی اور گیند کو Carry کرنے کی صلاحیت قابل دید تھی۔نہ صرف امروہہ میں اپنے کھیل کی وجہ سے مشہور و مقبول تھے بلکہ امروہہ سے باہر بھی ان کی مقبولیت بہت زیادہ تھی۔حکیم صاحب نے آخری عمر میں کھیلنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اپنے پیشہ سے پوری دلچسپی اور والہانہ شیفتگی کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔

ان کے والد محترم حکیم فرحت اللہ امروہے کے ایک کامیاب سیاستداں 'کامل طبیب اور اہل خیر بزرگ تھے۔یوں تو حکیم صیانت اللہ کے اپنے ذاتی اوصاف ہی کیا کم تھے جن کی بناء پر انہوں نے فن طب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا وہاں وہ اپنے خاندانی وقار کے صحیح معنوں میں وارث بھی تھے۔حکیم صیانت اللہ کی طب قدیم کی خدمات نہایت گراں قدر تھیں۔انہوں نے طب کی عظیم کتاب "الحاوی" کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جو "نوائے ہند" میں شائع ہوا اور طبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔"ہمدرد صحت" دہلی میں بھی ان کے کئی علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ان کا مقالہ "خلط مبحث" کے عنوان سے جب شائع ہوا تو اس کو طب کا ایک شاہکار قرار دیا گیا۔حکیم صیانت اللہ آل انڈیا طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے 'علی گڑھ یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز علم الادویہ کے ممبر نامزد ہوئے اور انڈین میڈیسن بورڈ یوپی کے ممبر تھے اور کافی عرصے تک وہ آل انڈیا طبی کانفرنس یوپی کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔حکیم صیانت اللہ ایک نرم دل 'انسان دوست اور دردمند انسان تھے۔وہ کسی مجبور اور غربت کے مارے ہوئے شخص کو نہ صرف یہ کہ دوا مفت دیتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو پرہیز کی غذا کے لیے پیسے بھی خاموشی سے دیدیا کرتے تھے۔

# صادقین

آپ کے والد سید سبطین احمد نقوی نہایت شریف اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ صادقین مرحوم نے ہائی اسکول تک تعلیم امام المداس ہائی اسکول (موجودہ امام المدارس انٹر کالج) میں حاصل کی اور الہ آباد بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔کیا۔ میرے بڑے بھائی محمد حسنین کے انتہائی قریبی دوستوں میں تھے۔ صادقین کی طبیعت بچپن ہی سے مصوری کی طرف مائل تھی۔ وہ ایک پیدائشی مصور تھے جن کے مزاج ہی میں جدت پسندی اور نیاانداز تھا۔اس فن کار میں نہ تکبر تھا نہ غرور نہ اسے دولت کی طمع تھی نہ چین کی زندگی کا شعور تھا۔اس دھان پان سے شخص نے اپنی لگن میں کبھی ہمت نہیں ہاری۔اپنی رباعی میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

سختی سے چٹانوں کی نہ ہمت ہارا
پھر موم سے بھی نرم تھاسنگ خارا
چھوناو ہیں فوارۂ آب شیریں
کل سنگ پہ پھاوڑا جو میں نے مارا

صادقین نے ایسی بے شمار تصاویر بنائیں جو مشاہدات اور زندگی کے تجربات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔فنِ مصوری کے ساتھ ساتھ صادقین کو شعروسخن اور خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔شاعری کی اصنافِ سخن میں انہوں نے رباعی کا انتخاب کیااور سیکڑوں رباعیاں لکھیں جنہیں بے حد پسند کیا گیا۔

صادقین کی تصاویر کی سب سے پہلی نمائش سنہ ۱۹۵۴ء کو پاکستان میں ہوئی۔ یہیں سے آپ کے فن کی شہرت ہوئی جس نے آپ کو شہرہ آفاق شخصیت بنادیا۔مارچ سنہ ۱۹۷۰ء میں انہیں صدرِپاکستان کی طرف سے تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔اسی سال آل پاکستان نیشنل ایگزی بیشن میں انعام حاصل کیا۔اس کے بعد فرانس کی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن کی دعوت پر فرانس گئے اور اپنے وطن پاکستان کا نام روشن کیا۔سنہ ۱۹۷۱ء میں پیرس میں ہونے والے ایک مقابلہ میں شرکت کی۔اس مقابلہ میں آرٹ کے نقادوں کی بین الاقوامی جیوری نے آپ کو "بینالے انعام" سے نوازا۔ آپ کے فن کی کارکردگی کے اعتراف میں صدرِپاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

دنیا کی نظر میں ان کی قدر اور ان کے فن کے اعتراف کی تفصیل لکھنا بڑا محال ہے جس کو انہوں نے مختصر سی زندگی میں حاصل کر لیا تھا۔ صادقین جس ملک میں بھی جاتے تو ان سے ملنے کے لیے اس ملک کے سربراہ کی بھی خواہش ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۸۱ء میں جب آپ ہندوستان گئے تو اندرا گاندھی نے اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود صادقین سے ملنے کی خواہش کی اور ان کے استقبال کے انتظامات اس طرح کرائے گئے جیسے کسی ملک کے سربراہ کے کیے جاتے ہیں۔ منیر احمد شیخ (پریس کونسلر پاکستان سفارتخانہ دہلی) نے صادقین کا ذکر اپنے ایک مضمون "صادقین..... ایک عجوبۂ روزگار" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ صادقین آٹھ تاریخ کو امروہہ جانا چاہتے تھے لیکن وزیر اعظم اندرا گاندھی کی خواہش پر گیارہ تاریخ کو جانے کا پروگرام بنایا۔ منیر احمد شیخ لکھتے ہیں:

"گیارہ تاریخ جب آئی تو دہلی کے ریلوے پلیٹ فارم پر امروہہ جانے والی گاڑی میں صادقین کے لیے الگ ڈبہ لگایا گیا تھا جس پر جلی حروف میں "صادقین" لکھا ہوا تھا۔ جب یہ گاڑی امروہہ پہنچی تو اسٹیشن پر صادقین کو خوش آمدید کہنے کے لیے سارا شہر اُمڈ آیا تھا۔ کمشنر پولیس کے اعلیٰ افسران، عمائدین شہر اور دیگر حکام ہاتھوں میں ہار لیے کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک ہاتھی سجا ہوا کھڑا تھا۔ صادقین پھولوں سے لدے ہوئے اس ہاتھی پر سوار ہوا تو اوپر ہودے پر قدم رکھتے ہی اس نے نیچے اپنے ذاتی سکریٹری انور کو آواز دی اور کہا 'انور! اس طرح تو جواہر لعل بھی امروہہ میں نہیں آئے تھے۔"

صادقین ایک آزاد طبیعت انسان تھے جہاں جاتے وہیں کے ہو رہتے تھے۔ اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین کے مضمون سے ایک دلچسپ بات کا انکشاف ہوا۔ وہ لکھتے ہیں: "صادقین کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت داغ کی طرح یہ جہاں بیٹھ گئے وہیں بیٹھ گئے۔ ہندوستان سے پاکستان وہ اپنے بڑے بھائی سے ملنے کی غرض سے گئے تھے۔ لیکن جب وہاں گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ فرانس کی وزارت کلچر نے انہیں (۵) مہینوں کی دعوت پر پیرس آنے کی دعوت دی تو سات برس تک پیرس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ پیرس جیسے آرٹ کے بین الاقوامی مرکز میں اپنے آپ کو منوانے اور خوشحالی اور مادی آسائشوں کی دہلیز پر پہنچنے کے بعد ایک دن اچانک اپنے والد صاحب کے ساتھ مختصر عرصہ کے لیے پاکستان میں قیام کے ارادے سے کراچی واپس آئے تو پھر پاکستان ہی کے ہو رہے۔ ایک بار کراچی سے لاہور اس ارادے کے ساتھ گئے کہ پندرہ دن لاہور میں قیام کریں گے مگر لاہور میں دس برس کے لیے ٹک گئے۔"

پیرس میں ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے سے بڑا ہر شخص انہیں جانتا تھا۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر



[illegible]

"Kunfayakun [illegible]





صادقین کی خطاطی



صادقین کی ایک اور خطاطی

محمود الرحمٰن کے اس مضمون "صاد قین ان کی کہانی" سے لگائیے جو ڈاکٹر صاحب کو ان کے والد بزرگوار سے معلوم ہوئی۔

"صاد قین پڑھنے لکھنے میں بالکل جی نہیں لگاتا تھا۔ ہر وقت در و دیوار پر کوئلے سے الٹی سیدھی لکیریں بناتا رہتا تھا۔ گھر کی تمام دیواریں اس کی سیاہ لکیروں سے بھر گئیں تو محلے کی دیواریں تختۂ مشق بن گئیں...... محلے کے لوگ میرا خیال کر کے کچھ نہیں بولتے تھے۔ مجھے صاد قین کی اس حرکت پر غصہ آتا تھا۔......... ایک روز اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلوا بھیجا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھے اسکول کی تمام دیواریں اور دروازے دکھائے اور کہا کہ صاد قین اب حد سے بڑھ چکا ہے۔......... جب شام کو میاں صاد قین اسکول سے واپس آئے تو میں نے ان کی خوب مرمت کی اور اس قدر مارا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔" اس کے بعد صاد قین کے والد صاحب نے کہا: "اب جو میں اس کہانی کا دوسرا حصہ سناؤں گا اس کا تعلق اسی زمانے سے ہے جب صاد قین پیرس میں مقیم تھا۔ میں ان دنوں بہت علیل تھا۔ صاد قین کو خبر ہوئی تو اس نے مجھے خط لکھا کہ ابا! یہ دولت کس کام آئے گی۔ آپ پیرس آجائیے یہاں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر ہے' آپ کا بہت اچھے طریقے سے معائنہ ہو جائے گا۔...... جب میں کربلائے معلیٰ کی زیارت سے سرفراز ہو کر پیرس کی طرف محو پرواز تھا تو احتیاطاً اپنے بٹوے کو ٹٹولا تا کہ صاد قین کے ہاتھ کا لکھا ہوا پتہ نکال لوں مگر میں اس وقت حواس باختہ ہو گیا جب وہ پتہ والی پرچی نہیں ملی۔..... میری پیشانی پر پسینے آ گئے۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا۔ پیرس جیسے بڑے شہر کا ہوائی اڈہ! میں ایک نووارد' نہ انگریزی جانوں نہ فرانسیسی' کس طرح صاد قین کے ڈیرے تک پہنچوں گا۔......... اس ادھیڑ بن میں پیرس آ گیا۔...... سامان کی چیکنگ کرائی اور مہمان خانے میں آ کر بیٹھ گیا..... گھنٹوں اس طرح بیٹھا رہا جیسے کوئی عجوبہ چیز ہو۔ سلک کی سفید شیروانی' رام پوری سیاہ ٹوپی' چوڑی دار پاجامہ۔ ازار بند میں چابیوں کا گچھا۔ ارد گرد بقچہ' بقچی' پاندان' دیکھنے والوں کے لیے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔

جب اسی طرح بیٹھے کئی گھنٹے ہو گئے تو ایئر پورٹ کا کوئی افسر آیا اور اپنی زبان میں مجھ سے کچھ سوال کیا۔ مگر زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔ وہ بولتا رہا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔ آخر تھک ہار کر وہ چلا گیا۔......... کچھ دیر بعد ایک اور افسر آیا اور وہ بھی ناکام لوٹ گیا۔......... جیسے ہی ایک خاتون افسر پوچھنے پچھانے آئی' جھٹ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو سینے پر مار کر اشارہ کیا۔ صاد قین! فادر!......... جیسے ہی اس خاتون نے میرے منہ سے صاد قین! فادر! سنا' وہ دوڑتی ہوئی واپس کمرے میں گئی اور پھر بہت سارے افسران

تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آئے اور ہیٹ اتار کر مجھے سلام کیا پھر ہر ایک نے میرا سامان اٹھایا اور مجھے اشارے سے چلنے کو کہا۔ باہر مجھے گاڑی میں بٹھایا گیا اور تین چار افسر بھی اس میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک شاندار عمارت کے سامنے رکی۔ ایک افسر اترا اور دوڑتا ہوا اس عمارت میں گھس گیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ دیکھا کہ صادقین میاں ننگے پاؤں دوڑتے چلے آرہے ہیں۔ پاس پہنچے تو مجھے دیکھ کر بولے۔ ابا آپ؟ خبر کیوں نہیں کی؟ بیٹا۔ وہ پتے والی پرچی ہی راستے میں گم ہو گئی۔ اطلاع دیتا تو کیسے دیتا۔ مگر بیٹا! آج میں اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ بچپنے میں تم دیواروں پر کوئلوں سے جو الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے تھے یہ انہی کا اعجاز ہے کہ صرف "صادقین" کے لفظ پر اتنے بڑے بین الاقوامی شہر میں تمہارے پاس آن واحد میں پہنچ گیا۔ آج تمہیں زدوکوب کرنے پر میں بہت شرمندہ ہوں"

صادقین کو جگلری سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ بیٹھے بیٹھے کبھی ایسے کرتب دکھاتے تھے کہ دیکھنے والے حیران اور بڑا لطف اندوز ہوتے تھے۔ نورالحسن جعفری نے اپنے خاکوں میں صادقین کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جس میں صادقین کے ایک کرتب کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "........ ان دنوں کچھ کرتب 'Gimminckry' کے بھی کام کیے۔ الٹی بسم اللہ تو لکھا ہی کرتے تھے 'یہ تو لکیروں پر ان کی مکمل گرفت کا مظاہرہ تھا' اب کاغذ کے ٹکڑے اس طرح کاٹتے کہ جب آدھا حصہ کھلتا تھا تو صادقین دکھائی دیتا پھر دوسرا حصہ کھلتا تو تہ ہوئے کاغذ میں لفظ گیلری پڑھا جاتا۔ کاغذ کے پیچھے روشنی ہوتی" اسی طرح کا ایک کرتب ہندوستان کی وزیراعظم کو بھی دکھایا جب وہ سنہ ۱۹۸۱ء میں ہندوستان گئے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر منیر احمد شیخ (پریس کونسلر پاکستان سفارت خانہ دہلی) نے اپنے مضمون "صادقین..... ایک عجوبۂ روزگار" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دوسرے روز میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر وزیراعظم ہند کے دفتر پہنچ گیا۔ انتظار گاہ میں ہمارے سامنے لکڑی کے صوفے پر تین فوجی وزیراعظم سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً انہیں اسی وقت آنے کے لیے پہلے کہا گیا تھا۔ مگر وزیراعظم کے پرسنل سکریٹری نے آکر ان سے کہا کہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ مسز گاندھی پاکستان سے آئے ہوئے آرٹسٹ سے پہلے ملنا چاہتی ہیں۔

جب ہم وزیراعظم کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مصافحہ کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ صادقین ابھی بیٹھے ہی تھے کہ وزیراعظم نے چھوٹتے ہی کہا: 'آپ کے اخبارات ان دنوں مجھ پر بہت کیچڑ اچھال رہے ہیں!'۔ صادقین نے بڑی حیرت سے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میڈم! میں تو اخبار پڑھتا ہی نہیں'' اس غیر متوقع جواب پر مسز اندرا گاندھی ایک دم پشیمان سی ہو گئیں- اس کے بعد انہوں نے ملاقات کے دوران صادقین سے سیاست یا ہندوپاکستان کے باہمی تعلقات پر کسی قسم کی کوئی بات نہ کی- ہاں انہوں نے صادقین کو ہندوستان آنے پر خوش آمدید کہا اور اس سے پوچھا کہ وہ کب تک قیام کرے گا اور کہاں کہاں جانا پسند کرے گا- صادقین نے کہا کہ وہ کہیں اور جائے نہ جائے مگر اپنے آبائی شہر امروہہ ضرور جانا چاہے گا- گفتگو کے دوران صادقین نے کہا کہ میڈم آپ اپنی فائلیں دیکھتی جایئے اور میں اپنا کام کرتا رہوں- اور اپنی جیب سے ایک مارکر نکال کر سامنے پڑے ہوئے ایک سفید کاغذ پر اللہ کے حروف لکھے اور مسز گاندھی سے کہا کہ آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پڑھیئے کہ میں نے کیا لکھا ہے اور کاغذ کو ان کی جانب موڑا نہیں- وزیراعظم نے پڑھ کر کہا یہ ''اوم'' لکھا ہے- صادقین نے کاغذ کو ان کی جانب موڑ کے سیدھا کر کے کہا- اب پڑھیئے- مسز گاندھی نے کہا- ''اللہ'' مسز گاندھی نے حیرت سے پوچھا یہ کیسے ہوا؟ صادقین نے کہا- کچھ نہیں یہ محض ''جگری'' (استادی) ہے'' سادہ کاغذ دیکھ کر صادقین کے دل میں ایک عجیب امنگ پیدا ہو جاتی تھی- وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں: ''ہمیشہ کی طرح زمانۂ طفلی میں بھی کاغذ اور وہ بھی سادہ کاغذ میری کمزوری رہا ہے- سادہ کاغذ دیکھ کر میری آنکھوں میں روشنی اور دل میں خوشی کی لہر اٹھتی تھی- یاد نہیں مجھے کس عمر سے حرف شناسی آگئی تھی- مگر اس سے بھی پہلے مجھے لکھنا آتا تھا- یہ بات مجھے میرے ان بزرگوں نے بتائی جنہوں نے مجھے لکھتا ہوا دیکھا تھا-''

۱۹۸۵ء کا ذکر ہے جب میں کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں بحیثیت کنٹرولر آف بلڈنگ کام کر رہا تھا تو صادقین کے بھتیجے سلطان احمد اپنے کسی کام سے میرے پاس دفتر آئے- انہیں دیکھ کر میں نے کہا، سلطان میاں! بڑا اچھا ہوا کہ اس وقت تم میرے پاس آگئے اور پھر اپنی دراز کھول کر اپنی بھتیجی غزالہ حسین کی شادی کا کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ یہ کارڈ بھائی صادقین کو پہنچا دینا- میں نے سلطان سے کہا کہ کارڈ دینے میں خود آتا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ آجکل وہ کہاں پر مقیم ہیں- میں نے پھر سلطان کو یہ بھی بتایا کہ میرے بھائی محمد حسین صدیقی مرحوم اور صادقین امروہہ میں ہم جماعت تھے اور دونوں کی دوستی کی کچھ تفصیل بھی بتائی- سلطان نے بتایا کہ آجکل وہ کارڈیو ویسکلر (امراض قلب کا ادارہ) میں داخل ہیں، شاید وہ شادی میں شرکت نہ کر سکیں، اس لیے کہ ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کو منع کیا ہوا ہے- اس نے کہا، بہر حال یہ کارڈ ان تک ضرور پہنچا دوں گا-

شادی کے دن جب میں مہمانوں کے استقبال کے لیے شادی ہال کے گیٹ پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک کار آکر رکی- کار کا دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا بھائی صادقین کالی شیروانی اور علی گڑھ پاجامہ میں ملبوس نکلے- میں بھاگ

کران کے پاس پہنچا- پہلے تو میں نے ان کی خیریت دریافت کی پھر ان کی شرکت کا شکریہ ادا کیا- وہ مجھ سے گیٹ پر ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے- اس وقت انہوں نے مجھے بتایا' احمد حسین! ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کے لیے مجھے بہت سختی سے منع کیا ہے- لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں حسین کی بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کروں- وہ گیٹ پر کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے- اس وقت انہوں نے میرے دادا اور دادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اماں کے ہاتھ کا پکایا ہوا آلو گوشت اور اس پر چھڑکے ہوئے کو تھمیر (ہرا دھنیا) کا مزہ اب تک یاد ہے، میں نے اپنی خود نوشت میں بھی ان کا ذکر کیا ہے- آخر میں انہوں کہا، احمد حسین میں اب چلتا ہوں- ان کی بیماری کے سبب میں نے بھی انہیں نہیں روکا-

مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ میری ان سے آخری ملاقات ہوگی- آج صادقین کے بارے میں لکھا تو ۱۰ر فروری سنہ ۱۹۸۷ء کا وہ غم پھر تازہ ہو گیا جس دن دنیا کے اس عظیم مصور' لاثانی خطاط اور نادرہ کار شاعر صادقین اس دنیائے ناپائدار سے رخصت ہوئے- اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے-

**صفی مرتضیٰ:** مولوی سید صفی مرتضیٰ مولوی سید عطاالحسن محلہ گذری کے فرزند تھے- علوم عربی و فارسی کے فارغ التحصیل تھے- آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا- امام المدارس انٹر کالج میں اردو کے پروفیسر تھے- نہایت متقی' پرہیزگار' سادہ مزاج اور متدین انسان تھے- مسجد جوادیہ محلہ گذری کے مہتمم اور پیش نماز تھے- اسکول کے اکثر طلباء آل انڈیا تقریری مقابلوں میں آپ کی ہی لکھی ہوئی تقریریں کیا کرتے تھے اور ٹرافی جیت کر لاتے تھے- ان طلباء میں قمر رضی اور تہذیب السبطین خاص طور پر قابل ذکر ہیں- مولانا صفی مرتضیٰ بڑے اچھے نثر نگار تھے- ان کی دو کتابیں "اصناف ادب کا ارتقا" اور "کردار" (ڈاکٹر سیموئیل اسمائلز کی کتاب 'کیرکٹر' کا ترجمہ) میری نظر سے گذری ہیں- مولانا نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ ضروری اقتباسات کو اردو میں منتقل کیا ہے- عبارت کو زوردار بنانے کے لیے خطابیہ انداز اختیار کیا گیا ہے- ہر باب کے شروع میں نہ صرف یورپ کے مفکرین کے اقوال نقل کیے ہیں بلکہ اکثر جگہوں پر اردو شعراء کے کلام سے منتخب اور مناسبت رکھنے والے اشعار بھی لکھے ہیں- مولانا کی اور بھی کتابیں ہونگی اور ایسے مضامین بھی ہونگے جو یہاں پاکستان میں میری نظر سے نہیں گذرے- ان کے فرزند ڈاکٹر امام مرتضیٰ اردو کے ایک اچھے اسکالر ہیں-

**طفیل حسن رضوی:** ابو نظر حکیم طفیل حسن رضوی حکیم ابن حسن رضوی کے فرزند تھے- پنڈت

موتی لال نہرو حکیم ابن حسن کی حکمت سے بہت متاثر اور ہمیشہ آپ ہی سے علاج کراتے تھے۔ حکیم طفیل حسن بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح بڑے نامور حکیم ہوئے۔ بچپن ہی میں آپ اپنے والدین کے سایے سے محروم ہوگئے تھے۔ آپ کی پرورش آپ کے ماموں حکیم سید نوراحمد کی سرپرستی میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم امروہہ اور مراد آباد میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی میں حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے خاں سے طب عملی کی تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ نے امروہہ میں اپنا مطب شروع کیا۔

آپ کو ادبی، تحقیقی اور علمی مضامین لکھنے کا بہت شوق تھا۔ آپ نے "فلسفۂ محبت" "جمالیات و حقائق" اور "حسیات" کے نام سے تین تصانیف مرتب کی ہیں۔ آپ کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا اور دیوان مرتب کیا۔ آپ کے دیوان کے بارے میں مجھے کچھ تحقیق نہ ہو سکا۔ حالانکہ حال ہی میں، میں ان کے کچھ عزیزوں سے بھی امروہہ میں ملا تھا۔ آپ نے دو طویل مضمون "نظریۂ موت اور قرآن" اور "عذاب الٰہی اور قوانین فطرت" مرتب کیے۔

مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے معرکتہ الآرا اجلاس کے انعقاد پر آپ نے وہ بصیرت افروز خطبہ تحریر کیا جسے ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ تقسیم کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان آگئے اور انجمن سادات رضویہ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۸/اپریل سنہ ۱۹۵۶ء کو آپ کی وفات ہوئی۔

آپ کے ایک فرزند اقبال حسن رضوی جو کراچی میں ایک مشہور کمپنی پارک ڈیوس کے ڈائریکٹر رہے ہیں اب امریکہ میں مقیم ہیں۔ میرے بھائی محمد حسین کے ساتھ امروہہ ہی سے آپ کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ اقبال رضوی کی شادی پرنسس آف بھوپال سے ہوئی۔ آپ ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خاں کے ہم زلف ہیں۔

**طیب نقوی:** کموڈور طیب نقوی سید تصور حسین محلہ گذری کے فرزند ہیں۔ پاکستان نیوی میں خدمات انجام دیتے ہوئے اس اعلیٰ عہدے پر پہنچے ہیں۔ آپ کو حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز (ملٹری) سے نوازا۔ فرانسیسی نیوی کی طرف سے آپ کو KNIGHT OF THE NATIONAL ORDER OF MERIT کا اعزاز عطا کیا گیا۔ آپ پاکستان نیوی کے باصلاحیت جوان افسروں میں شمار ہوتے ہیں۔

**طیّب صدیقی:** محمد طیب صدیقی، رضی احمد صدیقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم پشاور یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں آپ نے ایم اے انگریزی (گولڈ میڈلسٹ) کیا۔ آپ پاکستان کے ممتاز سفارت کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ مختلف ممالک میں سفیر رہے ہیں۔ آج کل قاہرہ (مصر) میں پاکستان کے

سفیر ہیں-اقوام متحدہ کے نمیبیا کمیشن کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں-سفارتی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں-

**ظلِ احمد نظامی:** آپ عزیز احمد نظامی کے فرزند ہیں-آپ ۲۵ر مئی ۱۹۳۱ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی اور وہیں سے دو مضامین انگریزی اور میتھ میں اعزازی نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا-سنہ ۱۹۴۸ء میں سائنس میں انٹر کیا-اسکے بعد سنہ ۱۹۵۱ء میں آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں B.SC.Civil Engineering کا امتحان پاس کیا- تقسیم کے بعد آپ پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی-دوران سروس آپ نے پلاننگ ہاؤسنگ اینڈ ٹاؤن پلاننگ اور اربن سیٹلمنٹ کے کورس لندن یونیورسٹی، ہالینڈ اور برلن جرمنی سے پاس کیے-آپ پاکستان انجینئرنگ کونسل، انسٹی ٹیوٹ آف انجینئر پاکستان اور انسٹی ٹیوٹ آف ہاؤسنگ اینڈ ٹاؤن پلاننگ ہالینڈ کے ممبر بھی ہیں-آپ ورلڈ بینک کے ایڈوائزر بھی رہے-آپ نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے-

اپنی ملازمت کا آغاز ادارہ ترقیات میں بحیثیت Asstt.Engineer کیا-اس ادارے میں آپ کی کارکردگی بڑی نمایاں رہی-اپنی بہترین صلاحیتوں اور خدمات کے سبب ادارہ ترقیات کراچی کے ڈائریکٹر جنرل ہوئے-ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے تحت کراچی میں سرسید یونیورسٹی قایم کی جو آپ کا اہم کارنامہ ہے-آج کل آپ سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے چانسلر ہیں-

**ظفرالاحد:** ظفرالاحد صدیقی امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کے والد مولوی مظہرالحق صدیقی کا تعلق محلہ کٹکوئی امروہہ کے معزز خاندان صدیقی سے تھا-ظفرالاحد نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی-سنہ ۱۹۱۹ء میں آپ کراچی آگئے اور سنہ ۱۹۲۰ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ لینڈ سے منسلک ہوگئے-آپ مسلسل بیس سال تک ڈرائنگ سیکشن کے ہیڈ رہے-۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوئے اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۲ء میں آپ کی وفات ہوئی-

**ظفرحسن:** مولوی سید ظفر حسن سید دلشاد علی محلہ حقانی کے فرزند تھے-عربی اور فارسی کے منتہی تھے-پارکر اسکول مراد آباد میں فارسی کے استاد کے طور پر ملازم تھے-آپ نہایت عالم و فاضل انسان تھے-ایک رسالہ ''نور'' ہندوستان میں نکالتے تھے جس کو پاکستان آنے کے بعد بھی نکالتے رہے-مولانا ظفر حسن کو ادیب اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے-آپ نے بہت سی دینی کتابیں لکھی ہیں جن کی صحیح تعداد کا تو علم نہیں مگر یہ سیکڑوں میں

ضرور ہیں- آپ نے ایک تفسیر قرآن مجید بھی لکھی ہے جو خاصی مقبول ہوئی-مولانا ظفر حسن نہ صرف ایک اچھے انشاء پرداز تھے بلکہ ایک اچھے خطیب بھی تھے-ان کا شمار صف اول کے ذاکرین میں ہوتا ہے- آپ نے مدرستہ الواعظین کی شاخ پاکستان میں قایم کی اور جامعہ امامیہ ناظم آباد میں تعمیر کرایا جو ایک مشہور علمی درسگاہ ہے جہاں سے تعلیم وتربیت حاصل کر کے سیکڑوں واعظین تبلیغ دین کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں-

**ظفر احمد قریشی:** حاجی ظفر احمد قریشی امروہہ کے مشہور ومعروف شخص تھے- آپ کی سکونت محلہ نوبت خانہ میں تھی- آپ ہمیشہ رفاہی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے-دینی علوم سے بڑا لگاؤ تھا- آپ نے اپنی ایک عمارت میں مدرسہ حفظ القرآن بھی قایم کیا تھا- آپ نے امروہہ میں بہت سے رفاہی کام کیے- عید گاہ سے ملحق وضوخانہ اور کنواں آپ ہی کی یادگار ہے-

**علی مرتضیٰ خاں نقوی:** ڈاکٹر سید علی مرتضیٰ خاں ۱۹۲۵ء میں امروہہ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے- آپ سید علی مرتضیٰ خاں گھڑیال والے کے فرزند ہیں-ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی- سنہ ۱۹۴۹ء کو آپ پاکستان آگئے اور کراچی میں وزارت صنعت میں بحیثیت افسر اپنی سروس کا آغاز کیا-۵۹-۱۹۶۰ء کے تعلیمی سال میں چار سالہ ہومیوپیتھی کورس ایم-بی-ایچ-ایس پاس کیااور شام کے وقت دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے مطب کا آغاز کردیا-ہومیوپیتھی طریقۂ علاج پر آپ بھرپور مطالعہ اور تحقیق کرچکے ہیں-آپ نے ڈاکٹر کینٹ ایم ڈی امریکن کی بارہ سو صفحات پر مشتمل دنیائے ہومیوپیتھی میں مشہور کتاب "کینٹ ریپرٹری" کا اردو حروف تہجی میں ترتیب وترجمہ کیا ہے جسے "پاک امروہہ ہومیوپیتھی ریپرٹری اعظم" کے نام سے موسوم کیا ہے- علی مرتضیٰ خاں کی یہ کاوش ہومیوپیتھی طریقۂ علاج میں ایک اعلیٰ علمی خزانہ اور بنیادی کتاب ہے جو طباعت کے مراحل میں ہے اور عنقریب منظر عام پر آجائے گی-

**علی جعفر:** ڈاکٹر سید علی جعفر نقوی ولد سید اعجاز حسن محلہ بنگلہ سے تعلق رکھتے ہیں-آپ کے والد محترم نگینہ 'امروہہ اور قیام پاکستان کے بعد مختلف اسکولوں میں درس وتدریس سے متعلق رہے اور بحیثیت ہیڈماسٹر گورنمنٹ اسکول سے ریٹائیر ہوئے-ڈاکٹر علی جعفر نے میٹرک امام المدارس امروہہ سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا-باقی تعلیم کراچی میں مکمل کی-ایم بی بی ایس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے جہاں سے آپ نے MRCP میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی-کافی عرصے انگلینڈ میں پریکٹس کرتے رہے پھر جناح پوسٹ

گریجویٹ میڈیکل سینٹر سے وابستہ ہوگئے جہاں آپ نے امراض گردہ کا شعبہ قایم کیااوراس کے سربراہ ہوئے-یہ محکمہ JPMC میں آرگنائزیشن کے اعتبار سے ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا جس کا پوراکریڈٹ ڈاکٹر جعفر کو ہی جاتا ہے- تشخیص مرض میں آپ کو مہارت تامہ حاصل ہے-دوردور سے مریض آپ سے علاج کرانے کے لیے کراچی آتے ہیں-ڈاکٹر جعفرایک بڑے سماجی کارکن بھی ہیں- آپ ہی کی کوششوں سے کراچی میں "کڈنی سینٹر" کا قیام عمل میں آیا-JPMC سے ریٹائیر منٹ کے بعداب آپ ہی کے زیرانتظام وانصرام یہ ادارہ دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے- آپ کانام طب کی دنیامیں ایک بڑانام ہےاور اہل امروہہ کے لیے باعث افتخار ہے-

**عزیز جمال:** ڈاکٹر سید عزیز جمال نقوی سید نفیس حسن محلہ کٹکوئی کے فرزند ہیں-آپ سید محمد میر عدل کے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں-آپ کے والد محترم روسی زبان کے ماہر تھے-حکومت ہند نے ماسکو میں آپ کو ترجمان کی حیثیت سے متعین کیا تھا-ڈاکٹر عزیز جمال نے اسلامیہ کالج لکھنؤ سے میٹرک پاس کیااور ڈاکٹری کاامتحان ماسکو یونیورسٹی سے پاس کیا-FRCS کی تعلیم کے لیے آپ کو انگلینڈ بھیجاگیا جہاں آپ نے امتیازی طور پر کارڈیالوجی میں یہ امتحان پاس کیا-پندرہ سال تک انگلینڈ ہی میں مقیم رہے اورگرانقدر تجربہ حاصل کرکے کارڈیو ویسکولرانسٹی ٹیوٹ کراچی میں آپ کا تقرر خصوصی طور پر عمل میں آیا-ڈاکٹر جمال پاکستان کے مایۂ ناز سرجن ہیں اور آپ کو دل کی سرجری میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ دوردور سے آپریشن کرانے کے لیے لوگ ان کے پاس آتے ہیں-سرجن جمال نقوی کارڈیو ویسکولراور لیاقت نیشنل ہسپتال میں آپریشن کرتے ہیں-بڑاوردمند دل رکھتے ہیں اور مشہور ہے کہ اگر کوئی ایسا غریب مریض ہو جو آپریشن کے اخراجات برداشت نہ کرسکتا ہو تو اس کا مفت آپریشن کرتے ہیں-دل کی سرجری کے میدان میں ان کانام ایک معتبر نام ہے جس پر اہل امروہہ بجاطور پر فخر کرسکتے ہیں-

**عظیم الشان:** ڈاکٹر عظیم الشان ۲رستمبر سنہ ۱۹۴۴ء کو شاہ آباد ضلع کرنال میں پیدا ہوئے- آپ کے والد جلیل احمد خاں محلہ کٹکوئی امروہہ کے خاندان لودھی سے تعلق رکھتے تھے- ڈاکٹر عظیم الشان نے عارف ہائی اسکول لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے بی-ایس-سی پلاننگ اور انجینیرنگ یونیورسٹی لاہور سے ایم-ایس-سی ٹاؤن پلاننگ کے امتحانات پاس کیے-اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے آپ جرمنی چلے

گئے جہاں برلن میں ٹیکنیکل یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۷۶ء میں ریجنل پلاننگ میں پی-ایچ-ڈی کیا-

تعلیم سے فارغ ہوئے تو وطن واپس آ کر Lahore Development Authority میں ڈائریکٹر اربن پلاننگ کے اہم عہدے سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد آپ سعودی چلے گئے جہاں جدہ ریاض میں چیف ٹاؤن پلانر مقرر ہوئے اور دو سال تک خدمات انجام دیں-اس کے علاوہ عظیم الشان نے سینیئر پلانر کی حیثیت سے کئی سال تک PEPAC LTD. میں اور شارجہ میونسپلٹی میں بحیثیت چیف ٹاؤن پلانر خدمات انجام دیں-لاہور میں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں-آپ کا محبوب مشغلہ مطالعہ ہے-

**علی اعظم:** مولوی علی اعظم ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۰ھ کو محلّہ شفاعت پوتہ امروہہ میں پیدا ہوئے-علی اعظم صوفی نعمت اللہ چشتی نظامی کے فرزند تھے-صوفی نعمت اللہ حکیم محمد حسن چشتی امروہوی جو محلّہ ملانہ میں سکونت رکھتے تھے' کے مرید خاص اور خلیفہ تھے-علی اعظم نے قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی-مولوی مقبول حسین محلّہ دستار سیاہ سے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی انوار الحق سے مدرسہ چلہ میں پڑھی-سنہ ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحمید ولد منشی چاند خاں کے توجہ دلانے پر منشی کا امتحان پاس کیا-"مدرسہ مفید عام" محلّہ چاہ ملا امان میں پڑھاتے تھے-سنہ ۱۹۳۶ء کو مولوی عبدالحمید مرحوم کی شرکت سے کتب خانۂ اعظم کے نام سے عربی و فارسی کی کتابوں کی دکان بازار شفاعت پوتہ میں مسجد بھنی کی دکانوں میں کھولی-

۱۹۵۰ء میں بعض احباب کے ایماء پر کراچی آ گئے-۱۹۵۹ء انگلش میڈیم اسکول سی-ایم-ایس-اسکول میں دینیات' فارسی اور اردو پڑھانے پر ملازم ہو گئے-سی-ایم-ایس-اسکول میں حضرت قائداعظمؒ نے بھی تعلیم حاصل کی تھی-علی اعظم نے حصول علم میں بڑی جدوجہد کی-اسکول کی ملازمت کے دوران بھی پڑھتے رہے-آپ کو تصوف سے بڑا لگاؤ تھا-تصوف پر آپ نے ایک کتاب "بیان السلوک فی توضیح المطلوب" تصنیف کی ہے-

**علی رضا:** سید علی رضا نقوی' سید صفدر حسن محلّہ گذری کے فرزند ہیں-میٹرک امام المدارس سے فرسٹ ڈویژن میں کیا-بی اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا' ایم اے فارسی اردو کالج کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا-ایس ایم لا کالج سے ایل ایل بی کیا اور تہران یونیورسٹی سے فارسی میں ڈی لٹ کیا اور تہران یونیورسٹی سے ہی شیعہ فقہ و قانون میں اسپیشلائزیشن کیا-

ایران میں انگریزی روزنامے تہران جرنل میں بحیثیت سب ایڈیٹر اور انگریزی ہفتہ وار اکو نامسٹ میں

بحیثیت ایڈیٹر دس سال کام کیا۔اس کے بعد ادارۂ تحقیقات اسلامی میں بحیثیت ریڈر 'صدر شعبۂ فارسی اور انچارج شعبہ فقہ اور قانون کی حیثیت سے کام کیا۔خانۂ فرہنگ ایران میں فارسی پڑھاتے رہے اور چار سال مثنوی مولانا روم کا درس دیا اور آجکل مرکز تحقیقات فارسی میں شعبہ فارسی کے انچارج ہیں۔

آپ کی تقریباً دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جن میں ھیمالیا (پندرہ جدید شعراء کے مختصر حالات و منتخب کلام کا فارسی ترجمہ) 'تذکرہ نویسی فارسی در ہندوستان (فارسی میں تحقیقی مقالہ) اس کتاب کو شہنشاہ ایران نے "بہترین کتاب سال" کا انعام دیا۔یہ انعام آج تک برصغیر میں کسی کو نہیں ملا۔دوسری کتابوں میں دستگاہ قضائی پاکستان 'ایران کے عائلی قوانین 'ایران کی اسلامی جمہوریہ کا دستور (انگریزی ترجمہ) 'گلشن فارسی ' فرہنگ جامع فارسی انگریزی اردو لغت 'شیعہ قانون حدود و تعزیرات و قصاص و دیت 'فرہنگ استقلال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایران میں بحیثیت پاکستانی ڈاکٹر سید علی رضا نے امروہے کا نام علم وادب میں روشن کیا۔

**عتیق الرحمٰن:** سید عتیق الرحمن رضوی سید عزیز الرحمن رضوی (محلہ پیرزادہ) کے فرزند تھے۔سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان آگئے تھے۔آپ بہت کم عمری میں شعبہ کتابت سے وابستہ ہوگئے تھے۔بہادر شاہ مارکیٹ کراچی میں "اردو آرٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو بڑا معروف ہوا۔اب اس ادارے کو ان کے برادر خورد سید قیصر رضا رضوی جاری رکھے ہوئے ہیں۔عتیق نے اپنے فن میں بڑا نام پیدا کیا۔روزنامہ "حریت" کی لوح انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔"در مقصود" کراچی کی کتابت ہمیشہ آپ ہی کرتے تھے۔افسوس صرف ۳۴ سال کی عمر میں وہ دار فانی سے کوچ کر گیا۔

**علی رضوی:** سید علی رضوی 'سید عاشق علی رضوی کے فرزند ہیں۔۳۱ راگست سنہ ۱۹۵۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔۱۹۷۴ء میں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے M.A.Economics کیا اور ۱۹۷۵ء میں پاکستان ٹیلیوژن سے منسلک ہوگئے۔آپ پاکستان ٹیلی وژن کے مشہور و معروف پروڈیوسر ہیں۔حال میں آپ نے ایک لانگ پلے ڈرامہ "دلیس پردیس" کے نام سے اسکاٹ لینڈ جاکر ٹیلیوائز کیا ہے جس کی نمائش مستقبل قریب میں ہونے والی ہے۔آپ کے ڈراموں میں زیادہ تر لانگ پلے ڈرامے دکھائے جاچکے ہیں۔آپ پاکستان ٹیلیوژن کے پہلے Producer ہیں جنہوں BBC کو انٹرویو کارڈ کرایا اور ایک ورلڈ کپ کلچرل شو بھی کیا۔

**غفار ڈاکٹر:** ڈاکٹر غفار انیسویں صدی کے اختتام پر سنبھل ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد

کریم اللہ جو خود بھی ڈاکٹر تھے کلال خاندان کے ایک معزز شخص تھے۔ آپ کی رہائش محلہ شاہی چبوترہ پر تھی۔ آگرہ یونیورسٹی سے L.M.P کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر غفار مرحوم نے گورنمنٹ ہسپتال میں بحیثیت Medical Officer ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے تو اپنے مکان محلہ شاہی چبوترہ میں پریکٹس شروع کی۔ آپ اپنے وقت میں امروہہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ گردے میں پتھری کے آپریشن کی خاص مہارت تھی۔ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت نفیس خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے۔ غریب لوگوں کا علاج مفت کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ سفید لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۸۵ء میں آپ کا انتقال ہوا اور محلہ شاہی چبوترے کی مسجد میں مدفون ہوئے۔ ایسے مخلص اور غریب پرور لوگ اب ہم میں نہیں ہیں لیکن وہ امروہہ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

**غیور حسن:** غیور حسن کا تعلق محلہ شاہ علی سرائے امروہہ سے تھا۔ وہ امروہہ کے ان نثر نگاروں میں شامل ہیں جن کا نام شامل کیے بغیر نثر نگاروں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی۔ غیور حسن نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہرہ دون اور مراد آباد میں ملازمت کی۔ لیکن جب امروہہ میونسپل بورڈ میں انٹینڈنس آفیسر کی محکمۂ تعلیم میں جگہ پیدا ہوئی تو غیور حسن اپنی میرٹ پر اس جگہ پر ملازم ہو گئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ غیور حسن امروہہ کی ادبی اور سماجی زندگی میں خاصے فعال رہے ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ امروہہ کے اعزازی سکریٹری جنرل بھی رہے۔ ایک زمانے میں یہ انجمن ماہانہ ادبی تنقیدی نشستیں منعقد کرتی تھی جس میں ہندوستان کے نامور ادیب، شاعر شرکت کیا کرتے تھے۔ ان تنقیدی نشستوں کے انعقاد کے لیے لکھنے والوں کی نہ صرف ہمت افزائی ہوتی تھی بلکہ اشاعت سے پہلے اگر کوئی خامی بھی کہیں ہوتی تو وہ دور ہو جاتی تھی۔ غیور حسن نے اپنے لیے خاکہ نگاری کا میدان منتخب کیا۔ ان کے خاکے شہر کی مختلف اہم شخصیات پر لکھے گئے۔ خاکہ نگاری مشکل فن ہے۔ اس سے حلیہ بگڑ بھی سکتا ہے اور شیشۂ دل چکنا چور بھی ہو سکتا ہے۔ اگر خاکہ نگار صرف دکھتی ہوئی رگوں پر ہاتھ رکھے تو اس کو ذاتی عناد اور دشمنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے اور اگر صرف شخصیت کے تابناک پہلوؤں کو اجاگر کرے تو اس کو خوشامد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ اس فن کی نزاکت بڑی احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے۔

میں نے غیور حسن کی کتاب "ح خ" (حلیے اور خاکے) پڑھی اور متاثر ہوا۔ غیور مرحوم کے قلم میں بڑی جان تھی۔ ان کی تحریریں ان کی طبیعت کی نرمی، شائستگی احساس اور دردمندی کا اگر ایک طرف نمونہ ہیں تو انہوں نے دوسری طرف نہ صرف اس شخصیت کی کمزوریوں اور حماقتوں پر قہقہے لگائے ہیں بلکہ اپنے اوپر بھی بھرپور وار کیے

ہیں - ہو سکتا ہے کہ کچھ شخصیتوں کے بارے میں ان کی رائے زیادہ شدید رہی ہو اور اس کو ذاتیات کے زمرے میں شامل کیا ہو مگر اکثریت ایسے خاکوں کی ہے جو اس فن کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے - میں نے ان کے خاکوں کے دوسرے مجموعہ "آئینہ خانہ" کا اشتہار کتاب کی پشت پر دیکھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب شائع ہوئی کہ نہیں - غیور حسن کا نام ان کی کتاب "ت ش" کی اساس پر تاریخ اردو ادب کا حصہ بن چکا ہے -

**فرید احمد عباسی:** مولانا مولوی حکیم فرید احمد عباسی نے جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے تعلیم حاصل کی - دنیائے طب میں اتنے مشہور تھے کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں - ہندوستان و پاکستان میں موصوف کے ہزاروں شاگرد ہیں - حکیم فرید احمد صاحب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے دست راست تھے - سنہ ۱۹۴۷ء تک آپ طبیہ کالج دہلی کے پروفیسر 'ہاؤس فزیشین رہے پھر پاکستان میں سکونت پذیر ہو گئے اور یہیں آپ کی وفات ہوئی - سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ کو بابائے طب کے خطاب سے نوازا گیا - اس کے بعد پاکستان میں بھی آپ کو امام الاطباء کا خطاب ملا -

**قمر رضی:** سید قمر رضی ابن سید رضی حسن مرحوم کا تعلق محلہ دربار شاہ ولایت (لکڑہ) سے ہے جہاں ان کے دادا محلہ چھپوڑہ سے آ کر بس گئے تھے - قمر رضی امام المدارس سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے میونسپلٹی کے پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گئے - پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اردو 'ہندی' فارسی ادب میں گریجویشن کیا - دارالعلوم محلہ چاہ سے فارسی کے امتحانات منشی اور منشی کامل پاس کیے - امام المدارس میں بھی کچھ عرصے ٹیچر رہے اور اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول دیوبند میں بھی معلمی کے فرائض انجام دیے - K.G.K کالج مراد آباد میں ایم - اے - ایل ایل بی میں داخلہ لیا اور انگلش لٹریچر سال اول اور ایل ایل بی کا امتحان آگرہ یونیورسٹی سے پاس کیا - اپنے خسر سید مسعود حسن وکیل کے ساتھ پریکٹس کرنے کا ارادہ تھا مگر کمال امروہی کی خواہش پر بمبئی میں فلم انڈسٹری سے منسلک ہو گئے - جب حکومت ہند نے پونا میں فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا قائم کیا تو قمر رضی کا وہاں ایک اعلیٰ عہدے پر تقرر ہو گیا - پاکستان آ کر حبیب پبلک اسکول میں تقریباً پانچ سال انگریزی کے استاد رہے - وہاں سے حبیب بینک لمیٹڈ کراچی کے کمپیوٹر ڈویژن میں ملازمت اختیار کر لی - دوران ملازمت حبیب بینک کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے پرنسپل رہے اور بہ حیثیت سینئر وائس پریذیڈنٹ تعلقات عامہ اور پبلیسٹی کے محکموں کے سربراہ کی پوزیشن سے ریٹائر ہوئے -

قمر رضی جب تک امروہہ میں رہے انہوں نے مختلف انجمنوں' سماجی اور مذہبی اداروں میں اپنی بڑی خدمات انجام دیں-وہ امام المدارس امروہہ کی مجلس ٹریڈ یونین کے نائب صدر' انجمن تحفظ عزاداری امروہہ کے پہلے نوجوان جوائنٹ سکریٹری اور انجمن ترقی اردو شاخ امروہہ کے جنرل سکریٹری ہوئے-ہندی اور اردو مباحثوں میں اسکول کی طرف سے حصہ لیا اور ٹرافیاں اور انعامات جیتے-پاکستان آنے کے بعد انجمن سادات امروہہ پاکستان کے صدر رہے-شاہ ولایت ایجوکیشنل ٹرسٹ کی مجلس انتظامیہ اور شاہ ولایت پبلک اسکول کراچی کی گورننگ باڈی کے سرگرم کارکن رہے-سادات امروہہ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی کے چیف پروموٹر اور کئی سال تک اس کی مجلس انتظامیہ کے چیئرمین رہے-میری نظر میں قمر رضی کا اہم ترین کارنامہ حیات امروہوی کے کلام کو حیات اکیڈمی کے ذریعہ جمع کرکے "ساز زندگی" کے نام سے چھپوانا ہے جس کی وجہ سے امروہہ کے اس خوش نوا شاعر کا کلام ایک کتابی شکل میں اردو ادب کا حصہ بن گیا ہے-

قمر رضی کا شعر و ادب اور صحافت سے قریبی تعلق رہا ہے-ان کے اردو انگریزی مضامین اور نظمیں ہندوستان کے جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئیں اور پاکستان کے جرائد انشاء' عالمی ڈائجسٹ' اوراق اور روزنامہ جنگ میں شائع ہوتے رہے-ماشاء اللہ قمر کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں-ان کی اولاد میں سب ڈاکٹر ہیں اور داماد اور بہو بھی ڈاکٹر ہیں-یوں تو قمر رضی شعر بھی اچھا کہتے ہیں لیکن بقول جون ایلیا (جو اکثر غصے میں کہتے ہیں) شاعر کہلانے میں تنگ محسوس کرتے ہیں-ان کے چار شعر بطور نمونہ پیش ہیں-

کیوں ہم آنکھوں کو اشکبار کریں          خود کو کیوں خود سے شرمسار کریں
ایک موہوم سی امید پہ ہم          کس لیے اس کا انتظار کریں
ہم نہیں ہیں ستم پہ آزردہ          ان سے کہیے کہ بار بار کریں
دوستی ہم کو راس کب آئی          دشمنی ہم سے یار غار کریں
فلسفے زندگی سے ہار چکے          بس مشیت پہ اعتبار کریں
فقر میراث ہو قمر جن کی          کیوں وہ دنیا کا کاروبار کریں

**قمر علی عباسی:** قمر علی عباسی' محمد یعقوب علی عباسی محلہ ملانہ کے فرزند ہیں-پاکستان میں صحافت اور ادیب کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں-اخبار جنگ میں ان کے مضامین ہفتہ وار چھپتے ہیں-موصوف کی اہلیہ نیلوفر عباسی اسٹیج اور ٹیلیویژن کی ایک معروف اور پسندیدہ اداکارہ ہیں-قمر علی عباسی نے بی-اے آنرز' ایم اے

معاشیات اور ایم اے اردو کے امتحانات سندھ یونیورسٹی سے پاس کیے اور ریڈیو پاکستان سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۲ر جون ۱۹۹۸ء کو اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کراچی کے اہم عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

قمر علی عباسی بڑے اچھے مقرر اور قلم کار ہیں۔انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں بہادر علی کائیں کائیں میاؤں میاؤں‘شرارتی خرگوش‘ننا مچھیرا‘سمندر کا بیٹا‘بہادر شہزادہ‘رحم دل ڈاکو‘منزل مراد‘علامہ اقبال‘چودھری رحمت علی اور قائداعظم بہت مقبول ہوئیں۔

قمر علی عباسی نے دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر کیے ہیں اور ہر سفر کے بعد ایک سفر نامہ ضرور لکھا ہے۔ جن میں سے ۱۳ سفر نامے لندن لندن‘دلی دور ہے‘چل رے مسافر سنگاپور‘نیل کے ساحل‘بغداد زندہ باد‘امریکہ مت جیئو‘ ایک بار چلیں وینس‘واہ برطانیہ‘لا پیرس‘دل دریا(کالموں کا مجموعہ)‘قمر علی عباسی 2 3 ناٹ آؤٹ‘قرطبہ قرطبہ شائع ہو چکے ہیں۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ سفر نامے لکھنے کا اعزاز امروہہ کے اس ذہین اور قابل فرزند کو حاصل ہے جس طرح اردو کا پہلا منظوم سفر نامہ لکھنے کا اعزاز علی نظر امروہوی کو یا شمالی ہند کی پہلی اردو مثنوی لکھنے کا اعزاز اسمٰعیل امروہوی کو حاصل ہے۔

قمر علی عباسی کا ڈرامہ بہادر علی پاکستان ٹیلیویژن سے قسط وار دکھایا جاتا رہا اور پاکستان رائٹر گلڈز نے ان کی چار کتابوں ایوارڈ بھی دیا۔ قمر علی عباسی کو APNS نے ۱۹۹۲ء کا بہترین کالم نگار کا ایوارڈ دیا جبکہ ان کو یونیسکو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ آج کل موصوف جنگ گروپ آف نیوز پیپر کراچی میں بحیثیت ایڈیٹر انفولائن کام کر رہے ہیں۔

**قمر نفیس**: سید قمر نفیس نقوی محلہ دانشمندان کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد سید نفیس الحسن انگریزی حکومت میں قانون گو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ قمر نفیس نے امام المدارس کالج امروہہ سے چار مضامین میں Distinction کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔انٹر سائنس لکھنؤ سے فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔داخلے کے امتحانی مقابلے میں کامیابی حاصل کرکے "رڑکی انجینئرنگ یونیورسٹی" داخلہ لیا اور امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی جس کی بنیاد پر انہیں یوپی کے پی ڈبلیوڈی کے محکمے میں فوراً ملازمت مل گئی۔پاکستان ہجرت کے بعد انہوں نے KDA میں ملازمت اختیار کی۔دوران ملازمت انہوں نے بہت سے پلوں‘کثیر المنزلہ عمارت‘شاہراہوں اور ٹاؤن شپ میں تعمیراتی کام کی نگرانی کی۔ چیف انجینئر کی جگہ خالی ہونے کے سبب انہوں نے عارضی طور پر ایک دوبار چیف انجینئر کے بھی فرائض انجام دیے۔ قمر نفیس سماجی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔وہ سادات امروہہ سوسائٹی کے بانیوں میں سے ہیں اور انجمن سادات امروہہ پاکستان کے صدر بھی رہے۔

**کلبِ علی:** حکیم کلب علی نام اور تخلص شاہد ہے - ان کے بارے میں یہ لکھتے ہوئے کہ "میں حکیم کلب علی کو نہیں جانتا البتہ کبھی نام سنا تھا" مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے - اس ناواقفیت کی وجہ ظاہر ہے کہ نو عمری میں مجھے ترک وطن کرنا پڑا تھا - ابتدا میں کچھ لوگوں سے خط و کتابت ہوتی رہی اور وہ بھی آہستہ آہستہ ترک ہو گئی اور عرصہ دراز تک امروہہ سے رابطہ ٹوٹا رہا - ایک دو مرتبہ جانا بھی ہوا تو دو تین دن سے زیادہ نہ رہ سکا - حال ہی میں اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد امروہہ گیا تو مجھ سے کہا گیا کہ آپ حکیم کلب علی سے بھی مل لیں - میں نے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں تو مجھے آپ کی بابت بتایا گیا - جب ان کے متعلق سنا تو ان سے ملنے کے لیے دل بیتاب ہو گیا - چنانچہ ایک دن صبح کو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا - میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا تو مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب انہوں نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کچھ اس طرح کہا "سیا... سیا... حت..." میں فوراً ان کی بات کو سمجھ گیا اور کہا، جی ہاں سیاحت ماضی - پھر انہوں نے بہت ہی پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے تمہاری کتاب "سیاحت ماضی" پر چھ صفحہ کا تبصرہ لکھ کر بھیجا تھا، کیا وہ تبصرہ تمہیں مل گیا تھا؟ میں نے کہا، نہیں مجھے تو نہیں ملا - بہر حال ان کے اس قدر پیار، محبت اور شفقت سے میں بے حد متاثر ہوا اور سوچتا رہا یہ کیسی کم نصیبی ہے کہ ایسی ہستیوں کا قرب نصیب نہ ہوا -

پاکستان واپس آ کر خورشید مصطفیٰ کی مرتبہ کتاب "شخصیت اور فن" پڑھی تو ان کی شخصیت اور ان کے فن نے اور بھی حیرت میں ڈال دیا کہ امروہہ کی بہت سی قد آور اور علم دوست شخصیتیں بھی آپ کے حسن اخلاق، علمیت، ذوقِ سخن اور فنِ طب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں - ایسی شخصیتوں کے بعد ایک شخصیت کے بارے میں میرا لکھنا تو کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور نہ میں اس قابل ہوں کہ کچھ لکھ سکوں - بہر حال ان سے ملنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ کچھ تو لکھوں - حکیم صاحب کے بارے میں ماسٹر تقی حسن صاحب 'جو میرے بھی استاد تھے، کا خاکہ "ہمارے حکیم صاحب" اور اس کے علاوہ اور حضرات کی تحریریں پڑھ کر احساس ہوا کہ حکیم صاحب واقعی عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں - آپ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے ہیں - آپ کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو سمجھتا تھا وہی اے باغباں سمجھا تھا میں ابتدا ہی میں قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں
کہہ دیا میں نے انا الحق بھی تو اس سے کیا ہوا اپنے منہ میں جبکہ تیری ہی زباں سمجھا تھا میں
نیلگوں پردے تھے 'وہ تیری حریم ناز کے اپنی کم فہمی سے جن کو آسماں سمجھا تھا میں

عرصۂ محشر میں اک اک راز افشا کر دیا — میرے ان اعضا نے جن کو رازداں سمجھا تھا میں
شعبدے تھے وہ کسی کے حسن عالم سوز کے — جن حجابات نظر کو درمیاں سمجھا تھا میں
اُف مری نظروں نے مجھ کو کس قدر دھوکے دیے — اپنے دردِ دل کو گردِ کارواں سمجھا تھا میں
وہ شکستِ دل کی میرے آخری آواز تھی — نزع کے عالم میں جن کو ہچکیاں سمجھا تھا میں
منزلِ دل میں ملی شاہد وہ جنسِ مدعا! — جس کو اب تک کارواں در کارواں سمجھا تھا میں

حکیم کلب علی شاہد امروہے کی تہذیب و ثقافت کی ایک زندہ اور تابندہ مثال ہیں۔امروہے کی شعری اور ادبی تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے مگر اس کو بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ اس بزرگ شاعر، ادیب، عالم اور جامع صفات شخصیت سے امروہے کا کوئی بھی فرد ان یادداشتوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کرا سکا۔اگر ایسا ہو سکتا تو تذکرۂ شعرائے امروہہ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے مرتب ہو سکتا۔

**کامریڈ:** شرافت کامریڈ امروہہ کی ایک ایسی شخصیت تھی جسے لوگ آج بھی نامور لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔کامریڈ کا اصل نام تو سید شرافت حسین رضوی تھا لیکن ان کے جذبۂ خدمت کے تحت انہیں لوگ کامریڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ابھی آپ زیرِ تعلیم تھے کہ دکھی لوگوں کی خدمت کرنا، ہر انسان کو برابری کا درجہ دینا، لڑائی جھگڑوں اور فتنوں کو دور کرانا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔ایک نیک نفس صاحبِ حیثیت انسان کے ایسے کام کرنے اور ایک غریب کی ایسی خدمت گزاری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔کامریڈ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن اپنی غربت میں وہ وہ کارنامے انجام دیے کہ نئی اور پرانی نسل کے سب ہی لوگ آپ کی طرف کھنچتے ہی چلے گئے۔یہی وجہ تھی کہ جب اسمبلی کے الیکشن ہوئے تو MLA کی سیٹ کے لیے آپ کو کھڑا کیا گیا۔امروہہ کے یہ پہلے غریب اور کم عمر نوجوان MLA تھے کہ جنہوں نے اسقدر ووٹ لینے کہ امروہہ میں ایک ریکارڈ قایم کر دیا۔اس الیکشن میں سید زید حسن رضوی (مرحوم) محلہ پیرزادہ کامریڈ کے چیف آرگنائزر تھے۔

کامریڈ امروہہ کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ ان کے والد محترم دانشمندان کی پولیس چوکی پر ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد امروہہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔امام المدارس سے میٹرک پاس کیا اور دارالعلوم چلہ سے الہ آباد بورڈ کے منشی کا امتحان پاس کیا۔آپ بچپن ہی سے کمیونزم کی طرف مائل تھے۔مجھے ان کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں معلوم ہو سکی لیکن یہ کیا کچھ کم اہم ہے کہ ہر شخص آج بھی آپ کو اچھے نام سے یاد کرتا ہے۔بیشک دنیا میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو اپنی خوشیوں کے عوض دوسروں کے دکھ خرید لیتے ہیں۔

# کمال امروہی

سید امیر حیدر نام اور کمالؔ تخلص تھا- سید امیر حسن مغفور کے فرزند تھے- آپ کا خاندان علمی اور ادبی روایات کے لیے امروہہ میں ہمیشہ سے مشہور رہا ہے- کئی پشتوں سے شعر و شاعری خاندان میں تواتر سے چلی آرہی ہے- رئیس امروہوی ' سید محمد تقی صدرؔ اور جونؔ ایلیا ان کے چچازاد بھائی ہیں- کمال امروہی بھی بچپن سے شعر کہتے تھے- پنجاب سے موصوف نے اردو اور فارسی کے امتحانات پاس کیے- گھر کا ماحول چونکہ زیادہ مذہبی تھا اور کمال کے یہاں روایات سے بغاوت کا عنصر بہت نمایاں تھا- پس ''انہوں نے اپنے خاندان کے مذہبی ماحول سے بغاوت کی اور لاہور آگئے- یہاں وہ ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے اور پھر کلکتہ جاکر تھیٹر سے منسلک ہوگئے- کلکتہ سے بمبئی پہنچے اور سہراب مودی کے ساتھ باقاعدہ فلم انڈسٹری سے منسلک ہوگئے- وہ برصغیر کے پہلے ادیب تھے جس نے فلم میں کہانی کی طاقت اور اہمیت کو تسلیم کرایا- فلمی دنیا میں ان کی حیثیت ایک نامور کہانی نویس' ایک لاجواب مکالمہ نگار اور بہترین ڈائریکٹر کی ہے- جیلر' پکار اور پھول نے ان کو کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا جبکہ محل' دائرہ' پاکیزہ اور رضیہ سلطان نے ان کو نہ صرف کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کرایا بلکہ ایک عظیم ڈائریکٹر کے روپ میں پیش کیا- دل اپنا اور پریت پرائی ان کی ایک کامیاب پروڈکشن ہے- ایک عرصے کے بعد جب وہ انجمن سادات امروہہ پاکستان کے عالمی مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تو ان سے ان کی رومانی نظمیں اور غزلیں پہلی بار سنیں-

مینا کماری سے ان کی دوسری شادی ہوئی تھی مگر کوئی اولاد نہ ہوئی جبکہ پہلی بیوی سے ان کے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں جو ان کے فلمی کاروبار کو چلا رہے ہیں- ان کا اپنا ایک ''Open Air'' اسٹوڈیو ہے جو کمالستان کے نام سے مشہور ہے اور کئی ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے- امروہہ سے باہر بہت سے لوگ امروہہ کو صرف کمال امروہی کے توسط سے جانتے ہیں- چنانچہ قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' کی جلد اول میں محلہ دربار شاہ ولایت (لکڑہ) کے عنوان کے تحت لکھا ہے: ''امروہہ جو پہلے اپنے علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھا' اب اسے لوگ چند نامور فلمی شخصیتوں کی وجہ سے جانتے ہیں-'' موصوف کا یہ ریمارک حقیقت سے بہت دور ہے چونکہ فلمی دنیا سے تو صرف نجم نقوی' کمال امروہی' منظور امروہی اور منور سعید منسلک ہیں جبکہ شعر و ادب' تنقید' فلسفہ' انجینئرنگ' آرکیٹیکچر' مجسمہ سازی اور مصوری کی دنیا میں امروہہ برصغیر کے دوسرے

شہروں اور بستیوں کے مقابلے میں نہایت مشہور اور انفرادیت کا حامل ہے۔

**کریم خاں:** امروہہ کی کیسی کیسی شخصیتیں تہذیب و تمدن، علوم و فنون، جاہ و حشمت، شان و شوکت کے تماشے دکھا کر گمنامی اور فنا کے تاریک پردوں میں روپوش ہو گئیں۔ بظاہر تو وہ اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کارہائے نمایاں، کردار، فراخ دلی اور ان کی غریب پروری انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ عہد ماضی کے افق پر ایک عظیم شخصیت عبدالکریم خاں رئیس امروہہ کی ہے جو نہ صرف رئیس امروہہ تھے بلکہ اعلیٰ کردار کے مالک، دکھی انسانیت کے ہمدرد، قومی ترقی کے حامی اور مخلص انسان تھے۔ عبدالکریم خاں سنہ ۱۹۰۱ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں اینگلو عربک ہائیر سکنڈری اسکول دہلی سے میٹرک کیا۔

عبدالکریم خاں نے میٹرک کرنے کے بعد ملازمت کے بجائے اپنا کاروبار کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں آپ نے بیڑی بنانے کے کارخانے کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں عبدالکریم خاں نے تین آدمیوں کو نوگانواں سے بیڑی کا کام سیکھنے کلکتہ بھیجا اور ان تینوں افراد کے اہل خانہ کی اس مدت تک مالی امداد کی جب تک وہ بیڑی کا کام سیکھ کر نہیں آگئے۔ عبدالکریم خاں نے امروہہ میں ایسی صنعت کی داغ بیل ڈالی جو آج تک ہزاروں غریب لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔ ابتدا میں آپ نے اپنا کارخانہ گول بازار امروہہ میں پھر دوسرا کارخانہ نوگانواں سادات میں کھولا۔ ابتدا میں ریڈیو مارکہ بیڑی تیار ہوتی رہی اس کے بعد تمباکو والی اور پھر ۴۷ نمبر کی ہینجو بیڑی تیار کی گئی۔ ہینجو بیڑی اسقدر مشہور ہوئی کہ کم بننے کے سبب راشن کارڈ سے دستیاب ہوتی تھی۔ آپ نے کئی بڑے شہروں میں اپنے کارخانے قایم کیے۔

عبدالکریم خاں نے امروہہ میں جہاں بیڑی کی صنعت قایم کر کے غریب لوگوں کو روزگار مہیا کیا وہاں انہوں نے ان کے لیے ایک ہائی اسکول، جو اب کریم خاں انٹر کالج کے نام سے موسوم ہے، کی بنیاد رکھ کر کار نمایاں انجام دیا۔ رفاہی، سماجی اور تعلیمی اداروں کی امداد کے ساتھ وہ غریب اور مسکینوں کی بھی مدد کرتے تھے۔ ۲۱ر جولائی سنہ ۱۹۷۷ء میں یہ ہر دلعزیز شخصیت دار فانی سے کوچ کر گئی۔ آپ کالج کی مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔

**کاظم علی خاں:** امروہہ میں حکیموں کا خاندان ایک بڑا خاندان تسلیم کیا جاتا تھا جو اپنے علم و فضل و کمال کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ امروہہ کے پہلے بیرسٹر حامد علی خاں جن کا تذکرہ میں نے زیر نظر کتاب میں علیحدہ سے

گیا ہے اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان محلہ صدو اور چہلی تک آباد تھا۔

حکیم کاظم علی خاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کے والد محترم ڈپٹی رفعت علی خان سرکار انگلشیہ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ کاظم علی خان پیشہ ورانہ طور پر وکیل تھے۔ آپ عرصہ دراز تک امروہہ میں اسپیشل مجسٹریٹ درجہ اول تک فائز رہے۔ کاظم علی خان نیشنلسٹ مسلمان تھے اور کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ ان کی خدمات قومی اور ملی معاملات میں تسلیم کی گئی ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے محمد علی خان آج بھی امروہہ کے سماجی حلقوں میں ایک معروف حیثیت کے حامل ہیں جنہوں نے موضع جویا میں خدمت خلق کے جذبے کے تحت ایک ہسپتال بھی قایم کیا ہے۔

**کرامت اللہ سوری:** کرامت اللہ سوری سنہ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ قدرت اللہ سوری محلہ کٹکوئی کے فرزند ہیں۔ کرامت اللہ سوری نے سنہ ۱۹۴۶ء میں ہندو ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج مراد آباد سے انٹر کیا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آگئے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں بحیثیت سیکشن آفیسر منسٹری آف کامرس سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں آپ پاکستان ایمبیسی کویت میں کمرشیل سکریٹری ہوئے۔ اس کے بعد تین سال تک آپ کمرشیل سکریٹری پاکستان ایمبیسی انڈیا میں رہے۔ آخر میں آپ ڈائریکٹر جنرل ایکسپورٹ پروموشن بیورو ہوئے اور یہیں سے سنہ ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

**کامتا پرشاد:** پنڈت کامتا پرشاد محلہ کالا کنواں امروہہ میں ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ سنسکرت اور علم نجوم کے بڑے عالم تھے۔ ہندو مسلمان سب ہی کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کے فرزند پنڈت گیانا نند جی بھی علم جیوتش کے مشہور عالم تھے۔ موجودہ دور میں جیوتش کے مشہور عالم پنڈت وکرم دت ترویدی شمار ہوتے ہیں۔

**کبیر خاں:** اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلیہ عہد حکومت کے آخری دور میں جب یہ علاقہ (امروہہ، سنبھل، مراد آباد، بجنور وغیرہ) روہیلوں کی طاقت کا مرکز بنا، تو شاہی توپ خانہ کے ایک ممتاز روہیلہ پٹھان سردار صادل خاں کے بڑے بیٹے کبیر خاں المعروف بہ بھمبو خاں امروہہ میں اپنے زمانہ کی مشہور شخصیت تھے۔ کبیر خاں ایک بڑے لحیم شحیم، قوی الجثہ آدمی تھے۔ اسی بناء پر وہ ''بھمبو خاں'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کی

رہائش محلہ چاہ ملاماں میں نزد مسجد عتیق اللہ تھی - کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی پوری وضعداری کے ساتھ سر پر اونچی باڑ کی پھندنے والی قطب مینار جیسی ترکی ٹوپی اور لمبا انگرکھا پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں نکلتے تھے تو بلاامتیاز چھوٹے بڑے ہر شخص کی نگاہ کا مرکز بن جاتے تھے - بھمو خاں کے ایک بیٹے وزیر خاں تھے ان کی اولاد میں ایک بیٹی حاجرہ جن کی شادی سالار پور میں ہوئی تھی زندہ ہیں

امروہہ سے چند میل دور جرنیلی سڑک پر موضع جونے کے پاس "بھمبو گڑھ" نام کی مشہور بستی آپ ہی کے نام سے موسوم ہے - یہ تمام آراضی و باغات آپ کے نامور والد صادل خاں کو فوجی خدمات کے عوض دربار مغلیہ سے عطا ہوئے تھے -

**گنگا سرن شیل:** پنڈت گنگا سرن شیل سنہ ۱۹۰۵ء میں محلہ کٹرہ بختاور سنگھ امروہہ میں ایک متوسط برہمن خاندان میں پیدا ہوئے - آپ ہندی اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے - آپ نے بھگتی رس پر بہت سی رچنائیں گیت اور بھجن وغیرہ لکھے جو ہندو گھرانوں میں آج بھی مقبول ہیں - سنہ ۱۹۹۱ء میں آپ کا دھانت ہوا -

**گنگا ناتھ:** مہان سنت بابا گنگا ناتھ آپ اٹھارویں صدی ہجری کے ابتدائی دور کے سنت تھے - انہوں نے اپنے زمانے میں سخت ریاضت کی جس سے انہیں علم معرفت حاصل ہوا -

**گوئل:** ڈاکٹر کرشن کیشو گوئل امروہہ کے گوئل گھرانے محلہ کوٹ میں ۲۰/ جون سنہ ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے - تعلیم لکھنو اور کانپور میں حاصل کی - ایم بی بی ایس آگرہ سے پاس کیا اور امروہہ آکر پریکٹس شروع کی - ڈاکٹر گوئل امروہے کی ایک مقبول شخصیت تھے - آپ بلا تفریق مذہب انسانیت کی خدمت کے قائل تھے اور تادم آخر خدمت کا یہ جذبہ ان کی زندگی کا محور رہا - وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے - امروہہ کے وہ ایک اچھے سماجی کارکن تھے - روٹری انٹرنیشنل سے تاحیات تعلق رہا - وہ روٹری ڈسٹرکٹ ۳۱۰ کے گورنر بھی منتخب ہوئے - امروہہ میں انہوں نے پیس میکر بینک کیا جس میں نجانے کتنے لوگوں کو نئی زندگی بخشی - اس ادارے کے ذریعے چھوٹے بچوں اور حاملہ عورتوں کی جانیں بچانے کے لیے قابل قدر کام کیے گئے - ڈاکٹر گوئل نے امروہہ میں پہلا مونٹیسری اسکول قایم کیا جو آج ہائی اسکول کا درجہ حاصل کر چکا ہے - روٹری انٹرنیشنل نے مرحوم کو "Rotary Foundation Meritorious Award" اور "Distinguished Service Award" بھی دیے - ڈاکٹر صاحب مرحوم سے امروہہ کے دوران قیام میرا بھی قریبی تعلق رہا ہے - میں نے اپنی کتاب

"سیاحت ماضی" میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ بلا شبہ ایک خلیق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ میرے علم کے مطابق ان کے تین لڑکے ہیں جن میں سے ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر رام جیٹھو مل۔ امروہہ میں میرے ملنے والے دوست اس نوجوان ڈاکٹر کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتے ہیں۔

**لئیق حسن فاروقی:** لئیق حسن فاروقی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ شفیق حسن فاروقی محلہ جھنڈا شہید کے فرزند ہیں۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔ لئیق حسن کے بھائی خوشنود امروہوی تھے جنہوں نے امریکہ میں ادب پر بہت کام کیا اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ لئیق نے حال ہی میں ایک کتاب "ڈائریکٹری احباب امروہہ" لکھ کر شائع کی ہے۔ اس کتاب میں کراچی میں مقیم امروہہ کے تقریباً تمام باشندوں کے نام اور پتوں کے ساتھ کچھ شخصیات کا مختصر حال بھی تحریر کیا ہے۔

**محمود احمد عباسی:** محمود احمد عباسی امروہہ کے مقتدر علمی و دینی خاندان میں ۱۴/ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار سید علی محمد عباسی امروہہ کے مشہور و معروف وکیل تھے۔

عباسی صاحب کو بچپن ہی سے ذی علم اور نامور شخصیات سے فیض صحبت حاصل کرنے اور عمدہ کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی محمد داؤد صاحب کے توسط اور اپنے ذاتی علمی شوق سے آپ کی رسائی مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا عبدالحلیم شرر جیسی نامور شخصیتوں سے ہوئی۔ جب ایسے قد آور اور ذی علم حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو آپ کو کتب تاریخ و سیر، قومی لٹریچر اور اخبارات و رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ آپ خود قومی کاموں میں عملی طور پر حصہ لینے لگے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔

عباسی صاحب اپنی عمر کا طویل عرصہ باہر گزار کر جب اپنے وطن واپس آئے تو امروہہ کی تاریخ امروہہ کے خاندانوں کے شجرے اور امروہہ میں آسودہ خاک اولیاء کرام کے حالات، ان کی خدمات و تعلیمات اور ان کی آمد امروہہ سے متعلق تحقیق و جستجو میں لگ گئے۔ انہوں نے بے شمار مستند قلمی کاغذات اور تاریخی کتابوں سے بیش قیمت مواد حاصل کیا اور بہت سی کتابیں بڑی تحقیق کے بعد لکھیں اور تالیف کیں جن میں "تاریخ امروہہ" "تذکرۃ الکرام"، "حقیقت قوم کمبوہ" اور "خلافت معاویہ و یزید" وغیرہ ہیں جس کا مواد انہوں نے انتھک محنت اور بڑی کاوشوں سے حاصل کیا اور کتابی شکل میں پیش کیا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آ گئے اور یہاں بھی تالیف

وتصنیف کا سلسلہ جاری رکھا-سنہ ۱۳۹۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی-

**محمد علی جان:** پیر محمد علی جان کا اصلی نام نذیرالدین رضوی تھا سنہ ۱۸۲۷ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ سید امین الدین کے فرزند تھے-ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی اس کے بعد کم سنی میں ہی آپ کے نانا آپ کو بریلی لے گئے-آپ نے وہاں عربی وفارسی کی اعلی تعلیم حاصل کی اور پھر قانون کا مطالعہ شروع کیا-سنہ ۱۸۵۲ء میں وکالت اور منصفی کے امتحانات اول درجہ میں پاس کیے اور بریلی میں وکالت شروع کردی-اسی زمانے میں آپ کا تقرر بلاسپور کی منصفی میں ہو گیا-لیکن آپ نے وکالت کے آزادانہ پیشے کو ترجیح دی-وکالت شروع کیے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ تمام ملک میں سنہ ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی شروع ہو گئی اس پے آپ امروہہ تشریف لے آئے-اسی زمانے میں نواب کلب علی خاں سے جو اپنے باپ نواب علی خاں کے ساتھ بہ حیثیت ولی عہد ریاست رامپور آپ کے مکان پر مقیم ہوئے تھے' آپ کے تعلقات یگانگت پیدا ہو گئے-

بغاوت کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد آپ نے پھر بریلی میں وکالت شروع کردی-آپ کی علمی قابلیت اور قانونی مہارت نے بہت جلد آپ کو بریلی ہی میں نہیں بلکہ الہ آباد کی کورٹ کے وکلا کی صف اول میں کھڑا کردیا-مسٹر ایلین ہیوم سابق ڈسٹرکٹ جج بریلی جو بعد میں ہائی کورٹ کے جج بھی رہے آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

> "آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ مقدمہ کے مطابق ہوتا ہے اور دیگر وکلا کے مقابلے میں اس امر کا اندازہ بہت جلد کرلیتے ہیں کہ اپنے مقدمہ کے کمزور پوائنٹ اور مخالف کے زبردست پوائنٹ کون سے ہیں-وہ کم بولتے ہیں-لیکن جو کچھ بولتے ہیں تو وہ عام طور پر برمحل اور مناسب ہوتا ہے-"

چالیس سال وکالت کرنے کے بعد وکالت سے آپ کنارہ کش ہو کر ۱۸۹۴ء میں وطن واپس آگئے-امروہہ کی مشہور حویلی علی جان منزل میں متعدد عمارتیں آپ ہی نے اپنی اولاد کے لیے تعمیر کرائی تھیں-آپ کی تصانیف سلک جواہر' مفید عام در باب نزلہ زکام ہیں-۵/دسمبر ۱۹۰۵ء کو آپ نے وفات پائی-

**منوّر علی خاں نقوی:** سید منور علی خاں نقوی سنہ ۱۹۳۶ء کو گھڑیال منزل امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ سید علی اختر نقوی مرحوم کے فرزند ہیں-ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی-.B.Ed کا امتحان علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی سے پاس کیا اور خاص طور سے English پڑھانے میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد پاکستان آگئے۔ کراچی یونیورسٹی سے M.A.English کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ کراچی میں آپ D.J. اور Sindh Govt.Science College میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بھی انگریزی پڑھائی۔ تقریباً چار سال آپ نے کراچی یونیورسٹی میں بھی Head Examiner and paper setter in English(Compulsory) کی خدمات انجام دیں۔ گورنمنٹ کالج فارمین سے آپ بیس گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آپ کی خدمات اب بھی لی جاتی ہیں جس میں امتحانی پیپر تیار کرنا اور چیکنگ وغیرہ شامل ہیں۔

**مناظر حسن:** مناظر حسن انصاری امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ اختر حسین انصاری کے فرزند ہیں جن کی سکونت پہلے محلّہ ترپولیہ اور بعد میں محلّہ قریشی میں تھی۔ امروہہ کے نامور شاعر افسر امروہوی کا نام مناظر حسن کے دادا اظفر انصاری نے رکھا تھا۔ مناظر حسن نے پانچ چھ کلاس تک ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی اور تقسیم کے بعد اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آگئے۔

مناظر حسن نے بی اے کے بعد ایم اے انگریزی اور ایم اے لسانیات کیا۔ دوران تعلیم کچھ دن ادارہ ترقیات کراچی میں کام کیا لیکن تعلیم سے فارغ ہو کر وہ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ ابتداء میں آپ اسلامیہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے اور اس کے بعد فیض احمد فیض کی محبت میں ہارون کالج چلے گئے۔ فیض احمد فیض سے آپ کا بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ مناظر میرے بھائی محمد حسین صدیقی مرحوم کے بہت عزیز شاگردوں میں تھے اور آپ بھی بھائی صاحب سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی ظفریاب مرحوم بھی بھائی صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے۔ مناظر حسن برج کے بہترین کھلاڑی اور مطالعہ کے بہت شوقین ہیں۔ بھائی صاحب کے انتقال کے بعد برج کھیلنا تو بالکل بند کر دیا لیکن مطالعہ اب بھی ان کا عزیز مشغلہ ہے۔ آج کل آپ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں

**محمد علی خاں:** سید محمد علی خاں سنہ ۱۹۲۰ء میں امروہہ کے ایک معروف خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ سید علی اختر خاں (گھڑیال منزل) کے فرزند ہیں۔ گورنمنٹ اسکول امروہہ سے میٹرک پاس کر کے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں بی اے پاس کیا۔ علوم شرقیہ کی تعلیم سید المدارس میں حاصل کی اور منشی کامل کا الہ آباد

بورڈ سے امتحان پاس کیا۔ آپ "منشور" دہلی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایڈ پاس کیا اور حلیم کالج" کانپور میں بحیثیت ٹیچر خدمات سے آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں امام المدارس میں بھی ٹیچر رہے۔ پاکستان ہجرت کے بعد شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۸۰ء میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

محمد علی خاں کا خاندان امروہہ اور ملکی سیاست میں خاصا مشہور رہا ہے۔ یہ خاندان متمول اور بااثر خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ تحریک خلافت میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جن کی والدہ "بی اماں" مظفر علی خاں محلہ کالی پگڑی کی صاحبزادی تھیں کے ساتھ مل کر سید علی متقی خاں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلافت کمیٹی کا دفتر بھی گھڑیال منزل میں تھا۔ مولانا شوکت علی نے دہلی میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی تھی جس کے بعد انہوں نے مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا امروہہ میں آغاز کیا اور محمد علی خاں صاحب اس کے پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ علی گڑھ میں اپنی تعلیم کے دوران وہ یونیورسٹی کی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ آپ نے ڈاکٹر سر ضیاءالدین مرحوم کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی کے مسلم لیگی طلباء جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی الیکشن کے سلسلے میں پنجاب کا دورہ بھی کیا۔ محمد علی خاں صاحب امروہہ کی تاریخ پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور ان کی یاد میں بہت سے ایسے تاریخی واقعات محفوظ ہیں جنہیں اگر ریکارڈ پر لے آیا جائے تو ایک مختصر رسالہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اگر زندگی بخیر رہی تو میں اس سلسلے میں کوئی عملی قدم ضرور اٹھاؤں گا۔

**محمد میاں رضوی:** مرحوم سید محمد میاں رضوی کا تعلق امروہہ کے رضوی خاندان سے تھا۔ آپ ۱۸ر جون ۱۹۱۱ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید سردار علی شہر کے مشاہیر اور عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ محمد میاں کا اصل نام انظار حسنین رضوی اور تخلص انظار تھا۔ آپ کی تعلیم امروہہ میں ہوئی اور انگریزی تعلیم گھر پر حاصل کی۔

محمد میاں امروہہ کی ایک یادگار سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ آپ جمعیت علماء ہند اور کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ آپ کا دیوان خانہ تمام قومی تحریکوں اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن بحیثیت مہتمم مدرسہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کا آپ ہی کے گھر پر قیام تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے قومی رہنما آپ کے ہی گھر قیام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں امروہہ میونسپل بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے اور تین سال تک اس منصب کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ ۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۸۲ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

# مشتاق حسین نواب وقار الملک

مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک امروہہ کی ایک عظیم شخصیت تھے کہ جن کا ذکر اس کتاب میں کرنا ایسا ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا-ان کے بارے میں تو کئی ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں-

نواب صاحب ۲۹/ محرم ۱۲۵۷ھ، مطابق ۲۴/ مارچ ۱۸۴۱ء کو موضع مرادہ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے- تاریخی نام چراغ احمد ہے-ماں کے تعلق سے آپ کا تعلق امروہہ کے ایک مقتدر اور معزز خاندان کنبوہ سے تھا- یہ خاندان امروہہ کے محلہ بادشاہی چبوترہ میں آباد تھا-آپ کے والد بزرگوار منشی فضل حسین سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے-فضل صاحب کو فارسی پر عبور حاصل تھا اور عربی سے بھی بخوبی واقف تھے-آپ کا جدی سلسلہ دیوان عبدالمومن تک پہنچتا ہے جو سنبھل کے امیر تھے-نواب وقار الملک کی والدہ ماجدہ بتول النساء بیگم، انتہائی نیک نفس اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں، کمبوہ خاندان کے حکیم محمد منیر ساکن امروہہ کی پوتی تھیں-وہ اپنے وقت کے قابل طبیب تھے-

آپ ابھی چھ ماہ کے بھی نہ ہوئے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے-والد کے انتقال کے بعد آپ کی والدہ اپنے والد مولوی انور علی کے پاس امروہہ آ گئیں-والدہ صاحبہ نے، جو خانگی تربیت اور مذہبی معاشرت سے بخوبی واقف تھیں، نواب صاحب کی تعلیم وتربیت کا ابتدا ہی سے خیال رکھا-انہوں نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم سے بہرہ ور کیا-جب مشتاق حسین چار سال کے ہوئے تو آپ کو مکتب میں داخل کر دیا-والدہ کی تعلیم وتربیت کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا اور پنج وقتہ نماز کے پابند ہو گئے-

مکتب کی معمولی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد امروہہ کے ایک عالم 'مولوی سید رافت حسین' سے خانگی طور پر کسی قدر عربی بھی پڑھی-سنہ ۱۸۵۴ء میں ضلع مراد آباد میں تحصیلی مدارس قائم ہوئے تو مشتاق حسین ایک مدرسہ میں داخل ہو گئے-اگرچہ درمیان میں کچھ مدت کے لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع بھی ہو گیا، تاہم اوائل ۱۸۵۹ء تک یہاں تعلیم پاتے رہے-تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ کو ملازمت کا خیال آیا-ملازمت کا دستور آپ کے خاندان میں بزرگوں سے چلا آتا تھا-آپ کے بزرگوں میں بیشتر شاہی ملازم تھے-

آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز بحیثیت منشی امروہہ کے اسی اسکول سے کیا جہاں خود انہوں نے تعلیم پائی تھی-لیکن چند روز بعد ہی ملازمت چھوڑ کر انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے روڑکی چلے گئے-جہاں وہ سول

انجنیئرنگ ٹامسن کالج میں داخل ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۰ء تک آپ اس کالج میں پڑھتے رہے۔اسی سال آپ تحصیل مراد آباد میں محرر انکم ٹیکس مقرر ہوئے۔اس محکمے میں آپ نے بڑی محنت اور دیانت سے کام کیا۔ آپ کی محنت اور دیانت داری سے متاثر ہو کر جان اسٹریچی کلکٹر نے آپ کو فارسی کا پروانہ دیا جس میں اس نے خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔

سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں شدید قحط تھا' کلکٹر جان اسٹریچی نے مراد آباد میں سر سید احمد خاں کے زیر اہتمام ایک محتاج خانہ قائم کیا تھا۔ سر سید نے محتاج خانے کے انتظام میں منشی امام الدین اور مولوی مشتاق حسین کو بھی شامل کر لیا تھا۔ یہیں پر مشتاق حسین کا تعارف سر سید سے ہوا۔ محتاج خانے کے انتظام میں سر سید کا انہماک دیکھ کر ان کو سر سید سے ایک عقیدت اور ان کے ساتھ قومی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ جب ضلع کے دوسرے مقامات میں محتاج خانے قائم کیے گئے تو امروہہ میں محتاج خانے کا پورا انتظام مولوی مشتاق حسین نے بذات خود کیا۔

جب سرکاری ملازمت کے سلسلے میں علی گڑھ تبدیل ہو گئے تو سر سید احمد خاں کی صحبت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے سر سید کے جس قومی کام میں ان کو شرکت کا موقع ملا وہ سائنٹفک سوسائٹی کا کام تھا۔ چنانچہ آپ اس سوسائٹی کے رفیق اور معاون مقرر ہوئے۔ یہاں آپ نے زیادہ تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور پریس کے کام کیے۔ سوسائٹی کے کام کے دوران آپ نے اپنے دو دوستوں' منشی گلزاری لال اہلکار دفتر ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور بابو گنگا پرشاد، سر دفتر انگریزی عدالت ججی کی مدد سے ایک انگریزی کتاب ''ریوولوشن اینڈ نپولین'' ''Revolution and Npoleon'' کو اردو میں ترجمہ کیا جو سنہ ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے ''سرگزشت نپولین بوناپارٹ'' کے نام سے شائع ہوا اور بہت مقبول اور بار بار چھپتا رہا۔

جس زمانے میں آپ منصرم عدالت کے فرائض انجام دے رہے تھے تو آپ تحصیلداری کے امتحان کی بھی تیاری کر رہے تھے۔ چنانچہ اپریل سنہ ۱۸۷۲ء میں انہوں نے میرٹھ ڈوزن سے تحصیلداری کا امتحان دیا اور شعبہ فوجداری میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانے میں وہ صیغۂ مال میں جانا چاہتے تھے تو مسٹر بریکلے نے ان کے متعلق یہ ریمارک دیے:

> ''مشتاق حسین منصرم ججی ماتحت کا تین برس سے زیادہ مقرر ہے' اور یہ شخص محکمہ مال میں داخل ہونے کی خواہش کرتا ہے' جہاں ہم یقیناً کہتے ہیں کہ وہ اپنی لیاقت اور محنت سے ترقی حاصل کرے گا۔ اور میری رائے میں یہ شخص کماحقہ

تحصیلداری کے قابل ہے"(وقار حیات)

سنہ ۱۸۷۴ء میں بنگال کے چند اضلاع میں قحط پڑا تو وہاں امداد پہنچانے کے انتظام پر سر جان اسٹریچی نے نواب صاحب کو (قایم مقام سررشتہ دار) مقرر کیا۔ آپ کی یہ تقرری سر سید احمد خاں کی درخواست پر کی گئی تھی۔ یہاں بھی انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔

۱۸/اگست سنہ ۱۸۶۸ء کو جب سر سید احمد خاں کا بنارس تبادلہ ہو گیا اور علی گڑھ سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے نواب صاحب کی سروس بک میں لکھا:

"منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی اور نہایت کارگزار، نہایت زود نویس و خوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر۔ حقیقت میں جناب بریٹلے صاحب بہادر کا اس محکمے پر بڑا احسان ہے جو ایسے لائق اور دیانت دار شخص کو اس محکمے کی افسری کے لیے مقرر کیا۔ جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔"(وقار حیات)

نواب صاحب ابتدائے عمر سے نماز کے سخت پابند تھے، ایام ملازمت میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ مسٹر کلوِن کلکٹر نے، جو کسی دوسری جگہ سے تبدیل ہو کر آئے تھے، دفتری اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا لیکن نواب صاحب نے کلوِن کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مسٹر کلوِن نے سختی برتی تو ۱۴/جنوری ۱۸۷۵ء کو رخصت کی درخواست دیدی لیکن مسٹر کلوِن نے درخواست لینے سے انکار کر دیا، اور حقیقتاً یا دھمکی کے طور پر استعفا دینے کے لیے کہا۔ چنانچہ ۱۵/جنوری کو انہوں نے دوسری درخواست پیش کی جس میں پہلے تو انہوں نے یہ لکھا کہ مذہباً مجھ پر نماز فرض ہے اور میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، لہذا نماز کی وجہ سے جو تھوڑی سی غیر حاضری ہوا کرتی ہے اس کی مجھ کو اجازت دی جائے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو چھ ماہ کی رخصت مرحمت فرمائی جائے جس کا مجھ کو حق ہے۔ آخر میں درخواست کو ان الفاظ پر ختم کیا "اگر یہ درخواست بھی منظور نہ ہو تو اس درخواست کو استعفا سمجھا جائے جو حسب ارشاد حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔

ادھر مولوی مشتاق حسین کا مسٹر کلوِن سے جھگڑا چل رہا تھا ادھر ریاست حیدر آباد سے ان کی طلبی آ گئی۔ اس وقت سر سالار جنگ اول ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے سر سید احمد خاں سے کچھ مستعد کارکن مہیا

کرنے کی درخواست کی تو سر سید احمد خاں نے ایک خط میں مولوی مشتاق حسین کے اوصاف نہایت پرزور الفاظ میں بیان کیے۔ مولوی مشتاق حسین حیدر آباد روانہ ہونے لگے تو اس وقت مسٹر کلون نے بھی ان کی محنت، دیانت اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

مولوی مشتاق حسین نے حیدر آباد پہنچ کر دیکھا کہ ریاست کے دفاتر کی حالت بے حد خراب اور کل ریاست کا نظم و نسق ابتر ہے۔ انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس نظام کو درست کیا اور بہت جلد آپ کی محنت کے نتائج بر آمد ہوئے۔ اسی زمانے میں نواب صاحب نے سر سالار جنگ کی رائے سے انگریزی ملازمت سے استعفا دیدیا۔

سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد نواب وقار الملک مشتاق حسین صاحب ہی تھے جنہوں نے تعلیمی و سماجی اصلاح کو فروغ دیکر مسلمانوں کو صحیح راستے پر گامزن کیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اکیسواں اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی نے کی۔ قبل انعقاد جلسہ کچھ ایسے حالات سے دوچار ہوا کہ جلسہ کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن اس جلسے کا انعقاد نواب صاحب نے ممکن کر دکھایا۔ اس اجلاس کا تذکرہ سید الطاف علی بریلوی کی کتاب ''علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں'' میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس اجلاس کی دعوت سردار محمد یعقوب خاں وزیر ریاست خیر پور کی طرف سے دی گئی تھی مگر سردار صاحب انعقاد اجلاس سے قبل ہی وفات پاگئے اور نواب محسن لملک بہادر نے بھی رحلت فرمائی۔ ان دو عظیم سانحوں کے باوجود کانفرنس کے نئے آنریری سکریٹری نواب وقار الملک مشتاق حسین اور جوائنٹ سکریٹری آفتاب احمد خاں نے ہر ممکن تدبیر عمل میں لاکر کراچی (سندھ) میں اجلاس کے انعقاد کو ممکن کر دکھایا۔'' (علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں)

سنہ ۱۹۱۶ء میں اس عظیم ہستی نے عالم بقا کو کوچ کیا اور امت مسلمہ اس فرشتہ خصلت رہنما سے محروم ہو گئی۔ اسی سال آپ پر فالج کا سخت حملہ ہوا تو آپ کی قوت جواب دے گئی۔ مراد آباد کے سول سرجن ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کے زیر علاج رہے، بہت علاج معالجہ ہوا لیکن جانبر نہ ہو سکے۔ ۲۵،۲۴ جنوری کی درمیانی شب ایک بجے کے بعد آپ کو قے ہوئی اور لرزہ طاری ہو گیا۔، بخار جب

۱۰۴ ڈگری تک پہنچا تو فوراً آپ کے صاحبزادہ مشتاق احمد کو، جو دہرہ دون میں تھے، تار دیا گیا۔ وہ ۲۶ جنوری کو امروہہ آگئے۔ جس وقت انہوں نے 'اباجان' کہہ کر پکارا تو نواب صاحب نے آنکھیں کھول دیں، اور محبت بھرے لہجے میں کہا 'آگئے' اس کے بعد آپ پر غفلت طاری ہوگئی جو دوسرے دن تک رہی۔ ۲۷، ۲۸ جنوری کی شب تقریباً پونے دس بجے بخار تو اتر گیا، لیکن بخار کے اترتے ہی شمعِ حیات بھی گل ہوگئی۔

آپ کی وفات کی خبر جب علیگڑھ پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ آپ کی میت کو علی گڑھ میں دفن کرنے کے لیے علیگڑھ سے کچھ لڑکے امروہہ پہنچے لیکن آپ کو سپردِ خاک کیا جاچکا تھا۔ آپ کا مزار درگاہ شاہ ولایت سے نوگانواں جاتے ہوئے روضہ درویش علی خاں کے پاس واقع ہے۔ راقم الحروف جب آپ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مزار کی خستہ حالت دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا۔ جس قوم کی وہ ساری عمر خدمت کرتے رہے آج وہ قوم اتنا بھی نہیں کرسکتی کہ ان کی قبر کا کچھ نشان تو باقی رہ جائے۔ اہلِ امروہہ ان کے نام پر تو بڑا ناز کرتے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے نہیں ہوا کہ ان کی ٹوٹی ہوئی قبر کو درست ہی کرادیتے۔ قبر کو ٹھیک کرانا تو کجا بہت سے پڑھے لکھے امروہویوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ قوم پر مرمٹنے والی یہ شخصیت انہی کے شہر امروہہ میں آسودہ خاک ہے۔

شیخ محمد اکرام کی کتاب 'رودِ کوثر' میں نواب وقار الملک مشتاق حسین کی وفات پر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ایک خط اور ایک تار کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے نواب صاحب کی وفات پر لکھے تھے:

خط: "ہم لوگوں کی مادہ پرست اور نوق ابھڑک زندگیوں میں جو انقلاب نظر آتا ہے، اس کو پیدا کرنے والی نواب صاحب مرحوم کی سادہ اسلامی زندگی کی مثال تھی۔ جو احسانات نواب صاحب مرحوم نے ہم نوجوان مسلمانوں پر کیے، اس کا اجر تو خدا سے ان کو ضرور ملے گا۔ ان کی زندگی نے اسلامی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھادیا اور ہم کو دکھادیا کہ اس بیسویں صدی میں بھی مسلمان آسانی کے ساتھ دینی اور اسلامی زندگی بسر کرکے قوم اور ملک کی خدمت کرسکتا ہے۔"

تار: "ہندوستان اپنے فرزند بزرگ سے اور ہم اپنے باپ سے محروم ہوگئے۔ خدا ہماری مدد کرے۔"

نواب وقار الملک کی وفات پر علامہ اقبال نے ایک نادر قطعہ لکھا ہے

نواب وقار الملک وملت　　افشاند سوئے جناں رکابش
سر لوح مزار اونوشتم　　انجام بخیر باخطابش

وقار الملک انجام بخیر ۱۳۳۵ھ　علامہ اقبال

نواب وقار ملک نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے جو خدمات انجام دی تھیں ان کے اعتراف کے طور پر یونیورسٹی کے ایک ہال کا نام "V.M.Hall" ہے-انہوں نے اپنے عہد میں امروہہ میں بھی کچھ تعلیمی اداروں کا قیام کیا تھا جس میں "تاج المدارس" کافی زمانے تک چلا مگر وہ بھی دوسرے اداروں کی طرح بند ہو گیا-

**مسعود حسن ایڈووکیٹ:** سید مسعود حسن صاحب کا تعلق امروہہ کے محلہ سدو سے تھا- آپ کے والد محترم بھی ایک مشہور وکیل تھے اور مراد آباد میں پریکٹس کرتے تھے- سید مسعود حسن وکیل کا شمار اپنے عہد کے مشہور و معروف اور کامیاب ترین وکلاء میں ہوتا تھا- ضلع مراد آباد کے اکثر کامیاب وکلاء نے ان سے اکتساب کیا اور جونیئر کی حیثیت میں ان کے ساتھ کام کیا- امروہہ میں ایک کسٹوڈین کیس میں مسعود حسن صاحب میرے بھی وکیل رہے ہیں اور ان کی وجہ سے مجھے اپنے کیس میں کامیابی ہوئی تھی- اس واقعہ کا ذکر میں اپنی پہلی تصنیف "سیاحت ماضی" میں بھی کر چکا ہوں-

پاکستان ہجرت کے بعد وہ آسٹریلیشیا بینک (الائیڈ بینک آف پاکستان) کے قانونی مشیر بھی رہے- کراچی کی ایک قانونی فرم سے منسلک رہنے کے دوران جن نوجوان وکلاء نے ان سے شاگردی کا شرف حاصل کیا انہوں نے اپنے پیشہ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں- جبکہ کئی شاگرد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج بھی مقرر ہوئے- مشہور دستوری اور قانونی ماہر خالد انور جو ان دنوں وزیر قانون ہیں مسعود حسن کے تربیت یافتہ شاگرد ہیں- انجمن سادات امروہہ نے ان کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا تھا جس کی صدارت ان کے شاگرد سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس وجیہہ الدین احمد نے کی اور ان کے کئی شاگرد وکیلوں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا-

**مسعود حسن زیدی:** سید مسعود حسن زیدی ۳۱ر اگست سنہ ۱۹۳۲ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد سید عبدالرؤف زیدی تھے جو محلّہ نوبت خانہ میں سکونت پذیر تھے- مسعود حسن نے امام المدارس انٹر کالج سے میٹرک پاس کیا- کالج میں آپ کا شمار ذہین ہونہار اور بہترین مقرر کے طور پر ہوتا تھا- تقریری مقابلوں میں آپ ہمیشہ سرفہرست رہتے تھے- دوران تعلیم آپ سیاست میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے اور اسی زمانے میں مسلم

لیگ پارٹی سے منسلک ہو کر اپنی بڑی خدمات انجام دیں-اس سلسلے میں آپ نے صوبہ UP کے لیول پر ایک تقریری مقابلہ "United India is a conception of British Imperialism" میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تقاریر کر کے پہلا انعام حاصل کیا-

اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ اپنے برادر بزرگ کے ساتھ کراچی آگئے اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا- سنہ ۱۹۵۴ء میں آپ نے اسلامیہ کالج سے بی-اے کیا-یہاں پر آپ کی ملاقات میرے برادر بزرگ محمد حسین صدیقی (مرحوم) سے ہوئی-محمد حسین مرحوم نے آپ کو امروہہ اور کراچی میں بھی پڑھایا تھا اور انہوں ہی نے مسعود حسن کو میونسپل کارپوریشن کے محکمہ آرکیٹیکٹ میں ملازم کرایا-ابتدا میں آپ میونسپل کارپوریشن سے ریڈیو پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن بعد میں کہیں دوسری جگہ ملازمت کا ارادہ ترک کر کے آخر تک میونسپل کارپوریشن کی ملازمت میں رہے-اپنے ادارے میں مسعود حسن کی کارکردگی اسقدر اعلیٰ رہی کہ آپ کے لیے ایک اسامی Asstt. Architect(Adminstration) کی نکالی گئی اور اس جگہ پر آپ کا تقرر کیا گیا- سنہ ۱۹۷۴ء میں جب میں اس محکمہ کا Architect(Control) تھا تو آپ نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیکر تعمیرات کا کام شروع کر دیا- آہستہ آہستہ آپ اپنے اس کام میں بڑی ترقی کی- کراچی میں Quality Builder Construction Co. آپ ہی نے قائم کی ہے جو اپنی کارکردگی میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے-مسعود حسن کا بہترین مشغلہ کتابوں کا مطالعہ ہے- آپ کا پسندیدہ مضمون اسلامک ہسٹری ہے-

**محمد علی صدیقی:** ڈاکٹر محمد علی صدیقی ۱۹۳۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان آگیا- محمد علی نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور پاکستان اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کیا- صحافت سے ان کا بڑا گہرا اور قریبی تعلق طالب علمی سے رہا ہے-روزنامہ "ڈان" کراچی میں "Aerial" کے قلمی نام سے ہفتہ وار ادبی موضوعات پر متواتر لکھتے رہے-انہیں اردو اور انگریزی زبان دونوں پر عبور حاصل ہے-انگریزی بھی وہ اتنی ہی اچھی لکھتے ہیں جتنی اپنی مادری زبان اردو-ان کا تعلق مختلف ادبی اور علمی تنظیموں سے رہا ہے- جیسے پاکستان رائٹرز گلڈز' اے آئی سی ایل (بین الاقوامی تنظیم نقادان ادب' یورپی تنظیم ادبا اور سائنسداں-روم اور آرٹس کونسل آف پاکستان وغیرہ-ان کی کتاب "توازن" کو' جو ۱۹۷۶ء میں چھپی تھی' پاکستان رائٹرز گلڈز کا انعام ملا جبکہ ان کی دوسری کتابیں "کروچے کی سرگزشت (ترجمہ)' نشانات' پاکستانیات' مضامین ' اشارے' "An Aerial View of Pakistan Literature" وغیرہ نے پاکستان کی ادبی دنیا میں ان کو ایک منفرد مقام دلایا

ہے -ان کتابوں کے بعد بھی اردو تنقید پر ان کی دوسری کتابیں شائع ہو چکی ہیں- محمد علی کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے جہاں سے وہ Deputation پر کئی سال تک "قائداعظم اکیڈمی" کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے- محمد علی اس دور کے بہت بڑے ادبی نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کو تخلیق بنادیا ہے اور انہوں نے ادبی دنیا میں لافانی مقام اور شہرت دوام حاصل کی ہے-

**منظر عباس نقوی:** ڈاکٹر منظر عباس نقوی خلف سید عسکری حسن نقوی نومبر ۱۹۳۳ء کو امروہہ محلہ گذری میں پیدا ہوئے- عہد عالمگیر ثانی میں پنج ہزار منصب دار میر غلام اسداللہ خاں عرف میر کلو سے آپ کا خاندانی تعلق ہے- آپ کے دادا برطانوی فوج میں صوبیدار میجر تھے- پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جو سات ہندوستانی فوجی ڈاکٹر انگلستان کے جشن فتح میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے تھے ان میں آپ کے دادا بھی تھے جنہیں وکٹوریہ کراس سیکنڈ سے نوازا گیا تھا-

منظر نقوی نے جے-ایس-ہندو انٹر کالج سے سنہ ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول اور سنہ ۱۹۵۲ء میں انٹر کیا- اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ علی گڑھ چلے گئے جہاں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی-اے-، بی-ایڈ، ایم-اے- (اردو) پھر پی-ایچ-ڈی- کیا- سنہ ۱۹۶۴ء میں علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ترقی کرتے کرتے اسی شعبہ کے سربراہ (ڈپٹی ڈین) جیسے ممتاز عہدہ تک پہنچے- آپ کی اعلیٰ قابلیت پر ۱۹۹۳ء میں آپ کو میر اکیڈی کی جانب سے "امتیاز میر" سے نوازا گیا- آپ نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں وحیدالدین سلیم (حیات اور ادبی خدمات)، خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (انگریزی سے اردو ترجمہ)، نثر نظم اور شعر (تنقیدی مظامین کا مجموعہ)، حسرت موہانی "ایک تعارف"، "مولانا آزاد کا اسلوب" (غبار خاطر کے حوالے سے) اور اردو تنقید وغیرہ ہیں- آجکل آپ انگریزی کے متفرق شعراء کی مشہور نظموں کا اردو زبان میں ترجمہ کررہے ہیں-

**محمد مستحسن:** حکیم محمد مستحسن، سید محمد محسن محلہ بچدرہ کے صاحبزادے تھے- طبیہ کالج دہلی کے فارغ التحصیل تھے- تشخیص امراض میں بڑی مہارت حاصل تھی- عام معلومات کا ذخیرہ تھے- تاریخ سے بھی بڑی دلچسپی تھی- شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور علم عروض کے ماہر تھے- شعر کے حسن و قبح کو بر سر محفل واضح کردیتے تھے- ان کا تذکرہ میں نے پہلے بھی اپنی تصنیف "سیاحت ماضی" میں کیا ہے-

**مزمل اللہ خاں:** آپ عبدالکریم خاں رئیس امروہہ کے فرزند ہیں- ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج

سے حاصل کی۔امام المدارس کالج میں آپ میرے ساتھیوں میں تھے۔عزیز اللہ نے مزید تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔اپنے والد کی طرح آپ بھی سماجی اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔آج آپ امروہہ کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔امروہہ میں ہندو مسلم ملاپ کے لیے بھرپور جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔الیکشن کے زمانے میں مختلف پارٹیوں کے امیدوار آپ کی مدد چاہتے ہیں۔

**مبین صدیقی:** محمد مبین صدیقی ۲؍جولائی سنہ ۱۹۲۴ء کو محلہ چاہ شور امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ محمد یمین صدیقی کے بڑے بیٹے ہیں۔آپ نے سنہ ۱۹۳۹ء میں امام المدارس انٹر کالج سے میٹرک اور انٹر بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹر میڈیٹ اسکول یوپی سے کیا۔اس کے علاوہ آپ نے ادیب ماہر، ادیب کامل، فارسی میں منشی، کامل اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز کے امتحانات پاس کیے۔اس کے بعد ۲۰؍جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کو چیف کنٹرولر آف پرچیز (سپلائی) گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم ہوئے۔

تقسیم ہند کے وقت آپ نے پاکستان آپٹ کیا اور اپنے دفتری ریکارڈ کے ساتھ پاکستان آگئے۔یہاں چالیس سال تک اپنے محکمہ کی خدمات انجام دے کر ۱۹۸۱ء میں ریٹائر ہوئے۔آپ کو ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔آپ کی تصنیف "Pakistan in Perspective" ہے جس کی اشاعت ابھی نہیں ہو سکی۔

**منور سعید:** منور سعید پاکستان کے اسٹیج، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے نامور فنکاروں کی صف اول میں شامل ہوتے ہیں۔ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور فلموں میں منور سعید نے کیریکٹر رول اور ولن کے کردار ادا کیے ہیں۔ہر سطح پر ان کی خداداد صلاحیتوں کو سراہا گیا ہے۔منور سعید امروہہ کے نامور وکیل سید مسعود حسن محلہ سدو کے صاحبزادے ہیں۔امام المدارس سے میٹرک اور گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹر میڈیٹ کے امتحان پاس کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔وہاں جناب بشیر حسن زیدی، وائس چانسلر کی اہلیہ کی قائم کردہ ڈرامیٹک سوسائٹی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔پاکستان ہجرت کے بعد آٹو موبائل انجینئرنگ میں صوبہ سندھ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔اس دوران مشہور ڈرامہ نویس خواجہ معین الدین کے مختلف ڈراموں میں کلیدی کردار ادا کر کے اسٹیج کی دنیا میں نام پیدا کیا۔منور سعید ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک ہیں۔

**منور علی خاں:** منور علی صاحب امروہہ میں محلہ چاہ ملا امان کا کنواں پر ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے والد کا نام الحاج قطب الدین ہے جو گورنمنٹ آف پاکستان میں منسٹری آف لیبر میں سپرنٹنڈنٹ

تھے - منور علی صاحب نے لدھیانہ سے میٹرک اور گریجویشن رہتک سے کیا - آپ نے منسٹری آف ایجوکیشن ' ہیلتھ اینڈ لینڈ گورنمنٹ آف انڈیا سے ملازمت کا آغاز کیا - اس کے بعد پولیس سروس اختیار کی پھر پاکستان آ گئے جہاں وہ ایس - ایس - پی 'ڈی آئی - جی - کرائم اور ڈی - آئی - جی کراچی بھی رہے - ۱۹۸۵ء میں آپ ریٹائر ہوئے - آجکل کراچی میں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں -

**محمد احسن عباسی:** ڈاکٹر محمد احسن عباسی مولوی علی محمد وکیل کے فرزند تھے آپ کے دادا شاہ احمد علی شاہ ایک صوفی بزرگ تھے - ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم ملانہ امروہہ میں پائی اس کے بعد مزید تعلیم مراد آباد اور آگرہ میں حاصل کی - آگرہ میڈیکل کالج سے MBBS کی ڈگری حاصل کر کے سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گئے - آپ اپنے وقت کے معروف سرجن تھے - سنہ ۱۹۲۵ء میں ریٹائر ہوئے - سنہ ۱۹۴۵ء میں آپ نے وفات پائی - عابد وزاہد بزرگ تھے - طریقہ چشتیہ میں مجاز تھے - شاعر بھی تھے - سالک آپ کا تخلص تھا - اکثر نعت و منقبت امروہہ کے رسالہ "در مقصود" میں شائع ہوتی رہی ہیں -

**محمد احمد:** پروفیسر محمد احمد شاہ جہانپور میں پیدا ہوئے - آپ اعجاز علی کے فرزند ہیں - محمد احمد نے ابتدائی تعلیم شاہ جہانپور میں حاصل کی - معاشیات میں بی - اے اور پھر بریلی سے ایم - اے کیا - پاکستان آکر انگلش میں ایم - اے کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے - آپ سکھر کالج میں انگلش کے پروفیسر پھر پرنسپل ہوئے - سنہ ۱۹۸۰ء میں آپ ریٹائر ہو گئے لیکن درس و تدریس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے -

میں نے "سیاحت ماضی" میں "میری فیس" کے نام سے پروفیسر محمد احمد کا ذکر کیا تھا - لیکن اس وقت مجھے یہ قطعی علم نہ تھا کہ آپ کے اجداد کا تعلق بھی امروہہ سے تھا - آپ کے دادا مزاج علی امروہہ کے معتبر خاندان کنبوہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے شاہ جہانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی - مزاج علی کے چچازاد بھائی رحمت علی کسی ریاست میں کلکٹر تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے آبائی محلّہ بادشاہی چبوترہ امروہہ میں رہائش پذیر ہو گئے تھے -

**محمد میاں:** مولانا سید محمد میاں عرف بنے میاں مولانا احمد حسن محدث کے فرزند تھے - ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ حاصل کی - پانچ چھ سال کی عمر میں جب میاں شاہ قیام الدین جعفری نے بسم اللہ پڑھائی تو انہوں نے فرمایا کہ انشاءاللہ یہ بچہ حافظ قرآن ہوگا - چنانچہ حضرت ممدوح کی دعا سے پدر بزرگوار کی حیات ہی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا - بعد ازاں مولانا سید محمد نے مولانا سید رضا حسین اور مولانا حافظ عبدالرحمان

صدیقی صدر مدرس کی نگرانی میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ امروہہ میں جملہ علوم عربی معقولات فلسفہ حدیث و تفسیر کی تکمیل کی۔ پھر دیوبند جاکر حدیث میں مہارت حاصل کیا۔ وہاں سے واپس آکر امروہہ میں مدرسہ عربیہ جامع مسجد میں مہتمم خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں محکمۂ تعلیمات میں معقول مشاہرہ پر آپ کا تقرر ہو گیا۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد امروہہ آگئے۔ دینی و قومی کاموں میں ہمیشہ آپ کو دلچسپی رہی۔ ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں جمعیت علماء کے ساتھ کافی خدمات انجام دیں۔

**منظور:** ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں کمال امروہی نے مکالمہ نویسی اور ڈائریکٹر پروڈیوسر کی حیثیت میں اور نجم نقوی نے ایک ہدایت کار کی حیثیت میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کیا ہے۔ جبکہ منظور امروہی نے آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی ہے۔ منظور امروہوی نے آرٹ ڈائریکشن میں اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔ منظور امروہی کا تعلق محلہ دربار شاہ ولایت (لکڑہ) سے ہے۔ آپ کے والد محترم سید فصیح الحسن صاحب نہایت شریف اور خوش مزاج انسان تھے۔ منظور فلم انڈسٹری میں ایک اچھے تاجر اور آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے مشہور ہیں اور امروہہ میں رفاہی کاموں سے خاصے متعلق رہتے ہیں۔

**نبی ہادی:** سید نبی ہادی ولد سید ہادی علی وکیل کرم علی خان بانی گھیر کرم علی خان کے خاندان سے تھے۔ رؤسائے امروہہ میں سید نبی ہادی ممتاز حیثیت کے مالک اور درباری رئیس تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک میونسپل کمشنر رہے۔ سنہ ۲۸-۱۹۳۰ تک میونسپل بورڈ امروہہ کے چیئرمین اور ساتھ ہی ساتھ سنہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک اسمبلی کے ممبر رہے۔ خان بہادری کے خطاب سے سرفراز تھے۔

**نثار احمد فاروقی:** امروہہ کی ایک نامور شخصیت جناب نثار احمد فاروقی کی ہے جنہیں علم کا سمندر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نثار احمد فاروقی ۲۹ رجون ۱۹۳۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام تسنیم احمد فاروقی ہے۔ آپ کے خاندان کے بیشتر لوگوں کی امروہہ کے محلہ جھنڈا شہید میں سکونت ہے۔ نثار احمد نے جامعہ اردو علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ۱۹۷۷ء میں دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کیا۔

فاروقی سنہ ۱۹۶۳ء سے دہلی یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور آج کل وہاں عربی کے پروفیسر ہیں۔ انہیں علمی تحقیقی تصنیفات اور خدمات کے صلہ میں صدارتی امتیازی سند دی گئی اور ۱۹۹۵ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال، رامپور رضا لائبریری بورڈ، علامہ اقبال اکیڈمی پاکستان اور دیگر

تحقیق اور تعلیمی انجمنوں کے ممبر ہیں- سنہ ۹۰-۱۹۸۵ء میں آل انڈیا عربک ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سکریٹری رہے- انہوں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا- ۱۹۵۲ء میں ان کا پہلا مقالہ منظر عام پر آیا جبکہ ان کی عمر صرف سولہ سال تھی- سنہ ۶۲-۱۹۶۴ء میں دہلی کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے- اس کے علاوہ بہت سے مشہور عربی' فارسی اور اردو میگزین کو ایڈٹ کیا- سنہ ۱۹۵۳ء سے آل انڈیا ریڈیو کے سینیئر براڈ کاسٹر ہیں-

آپ نے اسی علمی تحقیق اور لیکچر زدینے کے سلسلے میں ایران' پاکستان' یو-اے-ای' سعودی عرب' اردن' شام' مصر' برطانیہ اور امریکہ کے دورے کیے اور تحقیقی مقالے پڑھے- آپ نے عربی' فارسی اور اردو میں بہت سی کتب تصنیف اور تالیف کی ہیں- جہاں وہ غالب' میر اور مصحفی پر قلم اٹھاتے نظر آتے ہیں وہاں وہ سیرت' قرآن' تصوف اور اسلامی تاریخ پر بھی عبور رکھتے ہیں- میر کی آپ بیتی' غالب کی آپ بیتی' تلاش غالب' تذکرۂ حضرت نظام الدین اولیا' چشتی تعلیمات اور عہد حاضر میں ان کی معنویت' انوار القرآن' شاہ ولی اللہ کے مکتوبات' عالم بشریت کے لیے سیرت طیبہ کی اہمیت' عربوں کی تاریخ نویسی آپ ہی کی تصانیف و تالیفات ہیں-

**نواب عالم فاروقی:** پروفیسر نواب عالم فاروقی امروہہ کے ان فرزندوں میں ہیں جنہوں نے پاکستان آکر شعبہ تعلیم و تدریس میں اہم خدمات انجام دیں اور نمایاں مقام حاصل کر کے امروہہ اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کیا- آپ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ سید عالم فاروقی محلہ دکیلان نزد محلہ ترپولیہ کے فرزند ہیں- ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی- سنہ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ انٹر کالج امروہہ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا- اس کے بعد رضا کالج رامپور سے انٹر اور بی-اے اور ایم-اے علی گڑھ یونیورسٹی سے پاس کیا- سنہ ۱۹۵۰ء میں نواب عالم امروہہ سے پاکستان آگئے- یہاں پر آپ نے گورنمنٹ کالج سکھر میں لیکچرار معاشیات سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا- اس کے بعد سندھ پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر پروفیسر معاشیات آپ کی ترقی ہوئی- آپ نے بحیثیت پروفیسر گورنمنٹ کالج شکارپور اور گورنمنٹ کالج میرپور خاص میں بھی خدمات انجام دیں-

سنہ ۱۹٦۰ء میں آپ گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں پرنسپل مقرر ہوئے اور دو سال کے بعد آپ کو گورنمنٹ کالج سکھر کا پرنسپل بنا کر بھیجا گیا- اپنی بہترین کارکردگی کی بنیاد پر سنہ ۱۹٦۵ء میں آپ کو بحیثیت سینئر پروفیسر ترقی دی گئی اور گورنمنٹ ڈگری کالج اینڈ پوسٹ گریجویٹ سینٹر سکھر کا اضافی چارج دیا گیا- ۱۹۸۴ء میں چیئرمین انٹرمیڈیٹ بورڈ مقرر ہوئے- اس کے بعد نواب عالم نے مختلف تعلیمی اداروں جیسے سنڈیکیٹ کراچی

یونیورسٹی سینٹ یونیورسٹی ڈسٹرکٹ اسکالر آف بورڈ وغیرہ میں بحیثیت ممبر خدمات انجام دیں- آپ سندھ پبلک سروس کمیشن کے آٹھ سال تک ممبر رہے- آپ انگریزی اور اردو پر کامل دسترس رکھتے ہیں اور ان دونوں زبانوں میں آپ نے مضامین لکھے ہیں جو شائع بھی ہوتے رہے ہیں- آپ انتہائی خلیق، محبت کرنے والے اور ہمدرد انسان ہیں-اہل امروہہ سے آپ کی محبت مثالی ہے-

**نہال احمد:** سید نہال احمد ولد ڈاکٹر سید آل احمد نقوی دربار کلاں سید محمد میر عدل کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے-اپنے علم و فضل کے حوالے سے امروہہ میں ان کا ایک معتبر نام ہے-انہوں نے بریلی سے میٹرک پاس کیا اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے ایم-اے-ایل-ایل-بی پاس کیا-ایل ایل ایم کے لیے بمبئی میں داخلہ لیا مگر آگرہ اور حیدر آباد دکن کے ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بیٹھ گئے-حیدر آباد کا رزلٹ پہلے آگیا جس میں موصوف کامیاب ہو گئے تو والد کے حکم پر حیدر آباد چلے گئے جہاں مجسٹریٹ کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے-

موصوف نہایت عالم و فاضل انسان تھے -اردو اور فارسی زبان پر بڑی قدرت تھی-حافظہ نہایت قوی تھا ہزاروں اشعار اور اقوال اردو اور فارسی کے نوک زبان تھے- تاریخ کے ایک اچھے طالب علم تھے-"تاریخ سادات امروہہ" آپ نے اپنے بڑے بیٹے سید خصال احمد کے نام سے لکھی اور اس کتاب کی ایک ہزار کاپیاں طبع کروا کر اپنے فرزند کے ولیمہ کے بدلے امروہہ میں مفت تقسیم کیں- تاریخ سادات امروہہ بڑی محنت کاوش اور تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے-یوں تو موصوف نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں مگر "ناصبان ملک عضوض یا تاریخ معاویہ و یزید" ان کی ایک مبسوط تاریخ ہے-

**نانک چند رجی:** مہشری ویشیوں میں چودھری نانک چند رجی کا امروہہ کی قابل احترام شخصیات میں شمار ہوتا ہے- آپ سنہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک امروہہ میونسپل بورڈ کے چیئرمین رہے-اپنی چیئرمین شپ کے زمانے میں بہت سے کام کیے- سماجی اور رفاہی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے-

**نبی احمد:** یہاں ہم مصوری کے حوالے سے ایک ایسے آرٹسٹ سید نبی احمد رضوی کا ذکر کر رہے ہیں جو چاول کے دانے پر کمال کی مصوری کرتے تھے- آپ سید رشید الدین رضوی کے فرزند تھے-۲۸ر نومبر سنہ ۱۹۱۳ء کو آپ علی جان منزل محلہ قریشی امروہہ میں پیدا ہوئے-ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے

آپ حیدر آباد دکن چلے گئے - آپ کو بچپن سے مصوری کا شوق تھا- سنہ ۱۹۳۸ء میں 'طالب علمی کے زمانے میں' آپ نے چاول کے ایک دانے پر تاج محل 'دوسرے دانے پر جارج پنجم اور تیسرے چاول پر کوئین میری کی رنگین تصویر کندہ کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا- نڈیا ہاؤس کے نمایش ہال میں ان چاولوں کی نمایش بھی کی گئی- جب یہ خبر لندن کے اخباروں میں چھپی تو ہائی کمشنر انڈیا ٹریڈ ڈپارٹمنٹ سے آپ کو شکریہ کا خط بھی لکھا گیا-ان کے علاوہ بھی بہت سی تصاویر کندہ کیں جن میں، جان ایف کینیڈی، ملکہ الیزبتھ، کرشن جی وغیرہ کی رنگین تصاویر شامل ہیں-ایک چاول پر بارہ مختلف تصاویر بھی بنائی گئی ہیں-

**نور نبی عباسی:** نور نبی عباسی ۱۳/اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے-ابھی آپ نو سال ہی کے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا-نو عمری میں یہ سانحہ آپ کی تعلیم میں خلل کا سبب بنتا رہا- بہر حال آپ کے بھائیوں نے جو اسوقت اندور میں تھے آپ کی ہر طرح نگہداشت کی-

آپ نے ورناکیولر مڈل کا امتحان رورل کمیونٹی اسکول بیجے پور (اندور) سے پاس کر کے گنیش ودیا مندر اندور سے ۱۹۴۹ء میں ہائی اسکول پاس کیا-اس کے بعد آپ مدھیہ بھارت کے شہر ممبئی چلے گئے جہاں آپ نے ایک مقامی کالج میں داخلہ لے کر پہلا سال مکمل کیا-لیکن مالی حالات ایسے نہ تھے کہ اپنی تعلیم جاری رکھتے -لہذا آپ نے ایک پندرہ روزہ اخبار ''رہبر'' میں ملازمت اختیار کرلی- یہاں انگریزی میٹر کا ہندی میں ترجمہ کرتے تھے -''رہبر'' میں دو سال معاون کی حیثیت سے کام کر کے آپ نے ایک اشاعتی ادارے میں ملازمت کر لی-اس کے بعد آپ دہلی چلے آئے جہاں آپ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا جو درمیان میں چھوٹ گیا تھا- سنہ ۱۹۵۵ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم -اے کیا-اپنی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے سنہ ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی سے ہندی میں ایم-اے کیا-دہلی آنے کی اپنی تین سال کی مدت میں آپ نے مشہور انگریزی کتابوں کے ہندی میں ترجمے کیے جس میں ہاورڈ فاسٹس کا مشہور ناول ''فریڈم روڈ'' (۱۹۵۴ء) گورکی کا Luciciss Paval (۱۹۵۴ء) اور لوسنر کی تصنیف ''The True Story of AhQ)'' اور سعادت حسن منٹو کی مختصر کہانیوں کے مجموعے ''منٹو کی کہانیاں'' شامل ہیں-

نور نبی ایک مشہور و معروف مترجم ہیں آپ نے سیکڑوں مضامین، کتب اور ناولوں کا ہندی ترجمہ کیا-ہندی میں ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں ہندی اکادی اور ساہتیہ اکادمی نے انعامات سے نوازا-اب آپ ریٹائرز زندگی گزار رہے ہیں لیکن ترجمہ کا کام جاری وساری ہے-

**نقی الدین رضوی:** سید نقی الدین رضوی پسر محسن الدین کے فرزند اور پسر محمد علی جان کے پوتے تھے-
امروہہ کے معزز خاندان رضویہ سادات سے آپ کا تعلق تھا- آپ سنہ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے-ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی پھر میرٹھ جاکر آپ نے ایف اے کا امتحان پاس کیا-ابھی بی-اے میں پڑھ رہے تھے کہ والد نے اپنی ناسازی طبیعت کی بنا پر بلالیا تاکہ زمینداری کے امور انجام دے سکیں-لیکن زمینداری کے امور کے ساتھ ساتھ آپ نے C.T. کا امتحان پاس کیا اور لکھنؤ جاکر عربی کی تعلیم بھی حاصل کی-اس کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور امام المدارس انٹر کالج میں لیکچرار مقرر ہوگئے-سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۶۲ء تک آپ امام المدارس کالج میں پڑھاتے رہے-نقی الدین صاحب' جن سے راقم الحروف نے بھی علم حاصل کیا ہے' انگریزی کے قابل استاد تھے-ان کے پڑھانے کا انداز بڑا منفرد تھا-وہ ہمیشہ Grammar پڑھانے پر بہت زور دیتے تھے تاکہ طالب علم صحیح معنوں میں انگریزی سیکھ سکے-

نقی الدین صاحب ہمیشہ خوش وضع لباس میں ملبوس رہتے تھے-سنہ ۱۹۵۶ء میں وہ پاکستان آئے تو اپنے بڑے بیٹے سے' جنہوں نے ایک پٹھان لڑکی سے شادی کی تھی' ملنے پشاور گئے تو آپ کی پٹھان بہو نے آپ کے بیٹے کو بتایا کہ کوئی انگریز ملنے آیا ہے-آپ طبیعتاً کم گو، خوش مزاج اور بہت محبت کرنے والے استاد تھے-سنہ ۱۹۷۱ء میں سائیکل کے ایک حادثہ میں آپ کا انتقال ہوگیا-

**نجم الحسن نقوی:** سید نجم الحسن نقوی جو نجم نقوی کہلاتے تھے، سید فیض الحسن محلہ دربارکلاں کے ساکن تھے-گھر کا ماحول خالص مذہبی تھا-والد محترم نہایت دیندار شخص تھے اور اچھے مرثیہ خواں بھی-نجم نقوی علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہے تھے کہ فلم انڈسٹری کی نامور شخصیت ہمنسورائے ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تلاش میں یونیورسٹی تشریف لائے-وہاں نجم نقوی سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو وہ ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے ساتھ فلم انڈسٹری میں کام کریں-موصوف کے والد محترم نے بہ اکراہ اجازت دیدی اور اس طرح نجم فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوگئے-ہمنسورائے جیسے عظیم شخص کی تربیت کے نتیجے میں جلد ہی نجم نقوی فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹر کے طور پر ابھر کر آئے-انہوں نے اپنی فلموں میں دلیپ کمار اور پردیپ کمار کو Introduce کیا-بمبئی اور پونا میں اپنے شاندار فلمی کیریر میں انہوں نے کئی فلموں میں ہدایت کاری کی-جن میں اکثر نے گولڈن جوبلی کی-ان کی مقبول فلموں میں "پرائی آگ"،"پرتھوی

راج سجو گتا"، "تصویر"، "نتیجہ"، "نردوش" اور سمراٹھ کے نام قابل ذکر ہیں-پاکستان آکر انہوں نے "نغمۂ دل"، "قیدی"، "ایک تیر اسہارا"، "پائل کی جھنکار اور "کنواری بیوہ" تخلیق کیں-ان فلموں کا شمار سلور جوبلی فلموں میں ہوتا ہے- نجم اپنے کردار، اپنی تعلیم اور اعلیٰ ثقافتی اقدار کی وجہ سے فلم انڈسٹری کی ایک محترم اور قابل عزت شخصیت تھے-ان کے بیٹوں اور بیٹیوں نے ماشاءاللہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی-

**ناظر حسین رضوی:** آپ سید جمیل حسین رضوی مرحوم کے فرزند ہیں-والد محترم کی وفات کے بعد رضویہ سادات کے آپ ہی سجادہ نشین ہیں اور حضرت شاہ ابّن بدر چشتی کا سالانہ عرس آپ ہی کی نگرانی میں منعقد ہوتا ہے-آپ نے اپنے جدامجد کے مزار کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا اور موجودہ گنبد اور جالیاں وغیرہ بھی آپ ہی کی تعمیر کردہ ہیں-

**نثار محمد:** سید نثار محمد سید ابو محمد فوٹو گرافر کے فرزند ہیں-اپنے والد کی طرح آپ بھی فوٹوگرافی میں ماہر ہیں-آپ کھیلوں میں بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں-نثار محمد جو ایتھلیٹ چیمپین ہیں، نے پورے اتر پردیش میں سو میٹر کی دوڑ میں پہلا انعام حاصل کیا-آپ کی اس جیت پر پورے امروہہ میں ایک جشن منایا گیا-

**وقار احمد رضوی:** کراچی میں درس وتدریس اور علمی وادبی حلقوں میں ایک منفرد اور نمایاں نام پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی کا ہے-آپ ۵/دسمبر ۱۹۳۶ء کو امروہہ کے معزز خاندان رضویہ میں پیدا ہوئے-آپ کا سلسلہ نسب حضرت پیر شاہ ابّن بدر چشتیؒ سے ملتا ہے-آپ کے والد مولوی سید محمد نے بہت کم عمری میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا-وقار احمد کے دادا سید العلماء مولانا سید احمد حسن محدثؒ ایک جید عالم تھے جنہوں نے ۲۷ سال جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ میں ہزاروں تشنگان علوم کو درس دے کر فیض پہنچایا-

وقار احمد نے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں حاصل کی-علوم شرقیہ کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ایم-اے (اردو) ایم-اے (عربی) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے-تعلیم سے فارغ ہوئے تو اپنے اجداد کا پیشہ درس وتدریس اختیار کیا-کچھ عرصہ اینگلو عربک کالج دہلی میں درس دیتے رہے پھر آپ پاکستان آگئے-یہاں پی-ایچ-ڈی کرنے کے بعد آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے منصب سے کیا-۱۸/جون سنہ ۱۹۷۳ء سے ۵/دسمبر ۱۹۹۶ء تک کراچی یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیے-

۵/دسمبر ۱۹۹۶ء کو سبکدوش ہونے کے بعد بھی اب تک کراچی یونیورسٹی میں ایوننگ کلاسیں لیتے ہیں-اس کے علاوہ آپ یونیورسٹی کے ایم-فل اور پی-ایچ-ڈی کے طلب کو اپنی نگرانی میں ریسرچ کراتے ہیں-

درس وتدریس کے علاوہ آپ ایک نامور مصنف بھی ہیں-آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں "تاریخ جدید اردو غزل"، "معروضی تنقید"، "ہندی ریڈر(چار حصص)"، "مسلم سائنسداں"، "اخلاقیات"، "شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام شاہ جو رسالو کا چار جلدوں میں اردو نثری ترجمہ"، "تاریخ ادب ہندی"، "محاضرات القرآن"، "افکار ادبی"، "شذرات" اور "تاریخ نقد" وغیرہ بہت مقبول ہوئیں-

آپ کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو انعامات سے بھی نوازا گیا-شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام "شاہ جو رسالو" کا چار جلدوں میں اردو نثری ترجمہ کرنے پر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جانب سے گورنر سندھ نے اعتراف فضل وکمال کی شیلڈ دی-انجمن اساتذہ جامعہ کراچی کی طرف سے اعتراف عظمت علم کی شیلڈ دی گئی-اس کے علاوہ آپ نے سیکڑوں تحقیقی اور علمی مضامین لکھے جو برصغیر پاک وہند کے مشہور رسائل وجرائد میں شائع ہوئے-آپ نے ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں بھی حصہ لیا اور انگریزی اور ہندی میں تقریریں نشر کیں-وقار احمد رضوی نے سیمینار اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی اور اپنے مقالے پیش کیے-ایشیا کی who is who میں آپ کا نام بطور مشہور عالم موجود ہے-

**وکرم دت ترویدی:** پنڈت وکرم دت ترویدی ۷/جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو محلہ منڈی چوب امروہہ میں پیدا ہوئے-آپ کے والد پنڈت بنسواری لعل ترویدی ایک نیک دل انسان تھے-پنڈت وکرم دت نے ایم-اے ہندی اور ایم-اے پولیٹیکل سائنس کیا اور جیوتش وشارد کی تعلیم پائی-اس کے بعد درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا-آپ گورنمنٹ نارمل اسکول بڑھنپور کے پرنسپل ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہو کر امروہہ آگئے-موجودہ دور میں آپ امروہہ کے ذہین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں-علم جیوتش پر آپ کو بڑی مہارت حاصل ہے-اس علم کا شوق رکھنے والے امروہہ کے متعدد لوگ آپ کے شاگرد ہیں-آج کل علم جیوتش پر آپ ایک کتاب "سرل جیوتش" تصنیف کر رہے ہیں-

**وشنو سہائے:** وشنو سہائے اور بھگوان سہائے دونوں حقیقی بھائی ہیں-دونوں بھائیوں نے آئی-سی-ایس کیا اور اہم عہدوں پر فائز رہے-وشنو سہائے آسام اور ناگالینڈ کے گورنر رہے-

**یٰسین قریشی:** حاجی یٰسین امروہہ کی مشہور و معروف شخصیت تھے-امروہہ شہر میں چھوٹے سے بڑا کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو آپ کو نہ جانتا ہو- آپ امروہہ میونسپلٹی کے چیئرمین اور ایم-ایل-اے رہے-انتہائی خوش مزاج اور نیک انسان تھے-دولت مند ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں بے انتہا انکساری تھی-یٰسین چھوٹے بڑے کسی شخص کو یہ موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کو سلام کرے بلکہ یٰسین پہلے سلام پیش کردیا کرتے تھے- آپ کی سکونت پہلے قصائی خانہ میں تھی اس کے بعد آپ اسٹیشن روڈ پر اپنی کوٹھی میں منتقل ہوگئے تھے-

-☆☆-

# امروہہ کی خواتین

## بی اماں

امروہہ کی مردم خیز سرزمین نے ایک نامور خاتون ام احرار آبادی بیگم (بی اماں) کو بھی جنم دیا- برصغیر کی شہرت یافتہ خاتون بی اماں نے سیاست میں اسوقت حصہ لیا جب انگریزوں کا اقتدار آدھی دنیا پر مسلط تھا اور ہندوستان کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے-

محمود احمد عباسی نے "تحقیق الانساب" میں لکھا ہے:

"درویش علی خاں منصبدار پنج ہزاری کا خاندان سربرآوردہ متمول اور معزز خاندان ہے-سنہ ۱۸۵۷ کے ہنگامۂ غدر میں شہنشاہ ہند کا ساتھ دینے کے جرم میں اس خاندان کی املاک اور جاگیریں ضبط کرلی گئیں اور افرادِ خاندان کو بجرم وفاداری بادشاہ و بغاوت پھانسی دی گئی-ان کی اولاد میں مولوی احمد حسین خاں اسوقت موجود ہیں- زمانۂ حال کے پرجوش قائدین مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جوہر اسی خاندان کے نواسے ہیں"

اس خاندان کے ایک بیٹے مظفر علی خاں کے یہاں سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء کو امروہہ میں پیدا ہونے والی بچی کا نام مظفر النساء 'آبادی بانو بیگم' رکھا گیا- یہ بہادر شاہ کا عہد تھا-

آبادی بیگم نے ذرا ہوش سنبھالا تھا کہ ان کا پھلتا پھولتا شاد و آباد گھرانا تباہ و برباد کردیا گیا- خاندان کے اکتالیس آدمیوں کو انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا اور حویلیوں کو بارود سے اڑا دیا- خواتین نے اپنے بچوں کے ساتھ

کس طرح اپنی جانوں اور عزتوں کو بچایا یہ ایک اور المناک داستان ہے۔

آبادی بیگم نے عیش و عشرت' آلام ومصائب' عروج وزوال' دوستی ودشمنی' ظلم ومظلومی' نفرت و محبت' عزت وذلت اچھے برے سارے ہی وقت بچشم خود دیکھے۔ اپنے خاندان کے مظلوم بے گناہوں کی شہادت کے واقعات کو وہ زندگی بھر نہ بھول سکیں۔ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت تھی اور انتقام کی آگ اندر ہی اندر لاوے کی شکل میں اختیار کرتی رہی۔

علی بخش کے چھوٹے بیٹے عبدالعلی خاں سے آبادی بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ ذرا تصور کریں اس ماحول میں انہوں نے کس طرح زندگی بسر کی ہوگی۔ بچپن سے جوانی تک راضی برضائے الٰہی رہنے والی خاتون حادثات اور صدمات سے نہ تو دل گیر ہوئیں اور نہ دل برداشتہ۔ ان کا خاندان مذہبی تھا۔ نماز روزے کی پابندی اور عبادت ان کا معمول تھا۔

آبادی بیگم نے تیرہ سال اپنے شوہر عبدالعلی کی رفاقت میں بسر کیے۔ پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں کو جنم دیا۔ محمد علی شیر خوار تھے کہ ان کے والد عبدالعلی نے وفات پائی۔ اب اس بے یار ومددگار خاتون پر سات چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذمہ داری بھی آپڑی۔ وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ بچوں کی تعلیم وتربیت کرتی رہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ اس پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ "میں اپنی والدہ کو کبھی نہیں بھول سکتا' میں جو کچھ اور جیسا بھی ہوں وہ اپنی ماں کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ناامیدی اور مایوسی سے ہمیں دور رکھا۔ ہماری ہمتیں بڑھائیں' ہمیں حوصلہ دیا اور عزم ویقین کو اس حد تک مضبوط بنادیا کہ بزدلی اور کمزوری ہماری سرشت میں داخل ہی نہ ہو سکی یہ شیر دل خاتون درویش علی خاں کے خانوادہ کے شہیدوں کی بیٹی ہے۔ مجھے اپنی ماں اور ان کے خاندان پر فخر ہے۔" مولانا محمد علی جوہر نے اپنی کسی تحریر اور تقریر میں اپنے والد کا ذکر نہیں کیا سوائے اس ایک جملے کے کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا۔ میں دو سال کا تھا جب ان کا انتقال ہوا۔ یہ آبادی بیگم کی تربیت کا اثر تھا کہ ان کے دو بیٹے برطانوی سامراج کے خلاف زندگی بھر سر بکف رہے۔ یہ اس دلیر خاتون کی ہمت تھی کہ جس نے علی برادران جیسے بیباک اور بہادر بیٹوں کو اس قابل بنایا کہ وہ" تحریک آزادی" کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار کیے جاتے ہیں

آبادی بیگم کا خاندان مذہب کا سختی سے پابند تھا۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی مگر قرآن کریم گھر کی اور لڑکیوں کی طرح انہیں از بر تھا۔ مذہب سے ان کو جو شغف تھا اس مشہور واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو اس وقت کے

اخباروں میں شائع ہوا- جب وہ حج کے لیے گئیں تو انہوں نے غلاف کعبہ پکڑ کر یہ دعا کی "یااللہ! میں نے اپنے ان دو بیٹوں کو اس لیے پالا پوسا ہے کہ ان سے تو دین اسلام اور اہل اسلام کی خدمت لے- جب تک یہ جئیں تیری عظمت ان کے دلوں پر نقش اور زبانوں پر جاری رہے- تیری کتاب اور تیرے رسولؐ کا اتباع کرنے کی توفیق نصیب ہو اور اگر یہ خدانخواستہ اس کے اہل نہ ہوں تو مجھے ان کی زندگی کی طمع نہیں ہے' تو بیشک انہیں دنیا سے اٹھا لے" مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جوہر سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں پہلی بار جیل بھیج دیے گئے تو آبادی بیگم چھندواڑہ جیل میں ان سے ملنے گئیں- اتفاق سے اس وقت وہاں ایک نامور مسلمان رئیس انگریز افسر کے ساتھ موجود تھے جو علی برادران کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انگریزوں کی مخالفت سے باز رہیں- یہ گفتگو جاری تھی کہ آبادی بیگم جنہوں نے یہ گفتگو سن لی تھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھیں اور گرج کر کہا "میرے بیٹے انگریزوں کی کسی شرط کو نہیں تسلیم کریں گے- اگر اسوقت انہوں نے کمزوری دکھائی اور ڈر گئے تو خدا کی قسم میں اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی" ... یہی وقت تھا جب ان کے جگر گوشے پابند قید و سلاسل تھے- مسلم گھرانے کی پردہ نشین آبادی بیگم عوام الناس میں نمودار ہوئیں- پاک و ہند کی یہ پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے جلسہ عام میں تقاریر اور اپنے ملک کے فرزندوں کی رہنمائی کی اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی نئی لہر دوڑادی- ان کی تقریر کے سوز و گداز سے ایسا اثر ہوتا تھا کہ مخالفت کرنے والوں کے دل بھی موم ہو جاتے تھے- عوام کی ہمتیں اور حوصلے بلند ہو جاتے تھے- آبادی بیگم نے انداز تکلم کی خوبی وراثت میں پائی تھی- ان کی تقریروں نے عورتوں اور مردوں کے مزاج کو حالات کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالنے میں بڑی مدد کی اور یوں آبادی بیگم پاک و ہند ہندو اور مسلمانوں کی بی اماں کہلانے لگیں- بی اماں کہنے والوں میں ہندوستان کے مہاتما گاندھی جی بھی شامل ہیں-

آخر اس صوم و صلوٰۃ کی پابند باہمت خاتون نے ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء بروز جمعرات بعمر ۹۲ سال داعی اجل کو لبیک کہا- حسب وصیت دہلی ترکمان دروازہ میں مشہور خانقاہ شاہ غلام علی میں سپرد خاک کی گئیں جہاں مرزا مظہر جان جاناں شہید بھی محو خواب ہیں-

## زیبا امروہوی

جہاں امروہہ کے شہرۂ آفاق فرزند صادقین اور اقبال مہدی نے فن مصوری میں امروہہ کا نام روشن کیا ہے

وہاں ایک دختر امروہہ نے بھی مصوری کی دنیا میں تہلکہ مچادیا ہے- آپ کا نام زیبا ہے- آپ کے والد سید مختار حسین تاباں ایک نامور شاعر اور معزز شخصیت کے مالک ہیں- فن شاعری اور فن مصوری دو علیحدہ علیحدہ صنف ہیں لیکن دونوں کا مزاج ایک ہی ہوتا ہے- شاعر شعر کہتا ہے تو مصور اس میں رنگ بھر دیتا ہے- اسی طرح تاباں کی شاعری میں زیبا کی مصوری نے خوبصورت رنگ بھر دیے- لہذا اگر یہ کہا جائے کہ زیبا کو فن مصوری وراثت میں ملا تو بے جا نہ ہوگا-

زیبا نے اپنی تعلیم امروہہ میں پائی- آپ نے جے- ایس- ہندو ڈگری کالج سے ایم- اے کیا- بچپن ہی سے آپ کو مصوری میں بڑی دلچسپی تھی- آپ لوگوں کے Portrait کو Canvas پر بڑے خوبصورت انداز میں بناتی ہیں- ۶ر اپریل سنہ ۱۹۸۷ء کو زیبا نے سویت یونین کے صدر گورباچوف کا Portrait بنا کر سویت یونین کے سفارت خانہ کو بھیجا- یہ اسقدر خوبصورت Portrait تھا کہ صدر گورباچوف نے آپ کو ماسکو آنے کی دعوت دی- چنانچہ صدر گورباچوف کی دعوت پر آپ اپنے بھائی کے ہمراہ ماسکو گئیں جہاں آپ کے فن کی بڑی پذیرائی ہوئی اور آپ کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے رکھا گیا-

زیبا کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ان کے بنائے ہوئے دو Portrait ہندوستان کی پارلیمنٹ کے سینٹرل ہال میں آویزاں ہیں- ان دونوں Portrait میں ہندوستان کے ایک سابق وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ اور دوسرا بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کا ہے- زیبا کے بنائے ہوئے Portrait کی نمائش دہلی، شملہ اور ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں ہو چکی ہے- سرکاری اور غیر سرکاری طور پر آپ کو بہت سے انعامات سے بھی نوازا گیا- آج کل آپ کا قیام اپنے بھائی کے ساتھ دہلی میں ہے-

**بادشاہ بیگم:** امروہہ کے جس گھرانے میں علی برادران کی والدہ بی اماں پیدا ہوئیں اسی گھرانے میں ایک اور ذی علم، ادب نواز اور صوم و صلاۃ کی پابند خاتون بادشاہ بیگم نے جنم لیا- آپ مولوی احمد حسین خاں کی صاحبزادی ہیں- یہ خاندان جس کے جد امجد درویش علی خاں پنج ہزاری تھے امروہہ کا سربرآوردہ متمول اور معزز خاندان ہے- درویش علی خاں کا مقبرہ حضرت شاہ ولایتؒ کے مزار کے قریب جانب شمال واقع ہے- انیسویں صدی کے اواخر میں امروہہ سے شعری گلدستہ 'نسیم چمن' آپ ہی کے والد احمد حسین خاں شائع کرتے تھے- جس گھرانے میں علم و ادب کی شمع روشن تھی تو اس کی روشنی سے بادشاہ بیگم کیسے محروم رہ سکتی تھیں- آپ نے تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی- سید حبیب احمد افق امروہوی بھی آپ کے استاد رہے ہیں- آپ کا

مطالعہ بڑا وسیع ہے اور اپنے والد کی طرح علم و ادب کا بڑا ذوق رکھتی ہیں۔

بادشاہ بیگم کراچی میں رہائش پذیر ہیں اور کراچی کی اکثر ادبی محفلوں میں آپ کو ضرور بلایا جاتا ہے۔ گلدستہ "نسیم چمن" کی کاپیاں اور بی اماں سے متعلق معلومات مجھے آپ ہی نے فراہم کیں جس کا میں تہہ دل سے ان کا ممنون ہوں۔

**ڈاکٹر الیاس فاطمہ:** الیاس فاطمہ حافظ شفیق احمد ایڈوکیٹ محلہ کالی پگڑی کی صاحبزادی تھیں۔ شفیق احمد کے والد حکمت اللہ ایک بڑے ٹھیکیدار تھے۔ الیاس فاطمہ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اس کے بعد پاکستان آکر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئیں تو گورنمنٹ کالج ملتان میں لیکچرار ہو گئیں اور اسی کالج میں پرنسپل کے عہدے تک پہنچیں۔ آپ نے دوران ملازمت فارسی زبان میں پی ایچ ڈی بھی کیا۔ مرحومہ کو درس و تدریس سے خاصا شغف تھا۔

## ماجدہ رضوی:

جسٹس مسز ماجدہ رضوی کا تعلق محلہ پیر زادہ امروہہ سے ہے۔ آپ سید الطاف حسن رضوی کی صاحبزادی ہیں۔ آپ کے والد جو علوم مشرق اور انگریزی تعلیم یافتہ اور بڑے دیندار تھے امروہہ سے حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے تھے۔ لہذا ماجدہ رضوی کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی تعلیم حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ آزادی کے بعد آپ کے والد بمع خاندان پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں ماجدہ رضوی نے کراچی یونیورسٹی سے M.A.LLB کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سنہ ۱۹۶۳ء میں آپ نے مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں سول پریکٹس سے آغاز کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اپنے پیشہ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور آپ کا شمار مشہور و معروف اور کامیاب ترین وکلاء میں ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۸۱ء سے آپ نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں بھی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ آپ نے وکالت کو صرف آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ نادار اور مظلوم لوگوں کی خدمت اور انہیں انصاف دلانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ اس کے علاوہ بھی اپنے پیشہ کی بے انتہا مصروفیات کے باوجود سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کو ان کے جائز حقوق دلانے میں آپ بڑی جانفشانی سے کام کرتی ہیں اور ایسے کاموں میں غریب اور نادار لوگوں کی بغیر کسی معاوضہ کے اپنی خدمات انجام دیتی ہیں۔

سنہ ۷۲-۱۹۷۳ء میں آپ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی جوائنٹ سکریٹری رہیں- پاکستان یونیورسٹی خواتین فیڈریشن اور خواتینِ پاکستان کے تجارتی اور زراعتی ادارے کی آپ تاحیات ممبر ہیں- آپ نے سنہ ۱۹۶۴ء میں دہلی، ۶۸ء میں تہران، ۷۳ء میں پینانگ (ملائشیا) اور سنہ ۱۹۷۵ء میں ہمبرگ جرمنی میں خواتین وکلاء کی انٹرنیشنل فیڈریشن میں شرکت کی اور بہترین مقالے پڑھے- ان کے علاوہ بھی آپ نے بہت سی انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے- سنہ ۱۹۷۲ء میں آپ نے بطور ممبر پاکستان میڈیکو انٹرنیشنل مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں کی کورنگی میں آبادکاری کے لیے بہت کام کیا- سنہ ۸۳-۱۹۸۵ء میں آپ نے یورپ اور امریکہ کے دورے کیے اور وہاں کی مختلف مشہور NGOs کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کیں- آپ ایک اچھی رائٹر بھی ہیں- اتنی مصروفیات کے باوجود ماجدہ رضوی سنہ ۱۹۶۴ء سے مسلسل خواتین اور اطفال کے لیگل مسائل اور ان کے حل کے لیے بڑے بڑے مضامین اخبارات اور رسائل میں لکھتی رہتی ہیں-

آپ کی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت کے پیشِ نظر آپ کو جون سنہ ۱۹۹۴ء کو سندھ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا- ہائی کورٹ کے مقدمات میں آپ کی دلچسپی، دیانتداری اور آپ کے صحیح فیصلوں کے معترف نہ صرف آپ کے ساتھی ہیں بلکہ جج صاحبان بھی آپ کو خاص مقام دیتے ہیں- آپ انتہائی خوش اخلاق، منکسر المزاج اور انصاف پسند خاتون ہیں جس پر اہلِ امروہہ دل کی گہرائیوں سے آپ پر فخر کرتے ہیں-

**سبھاگیہ وتی:** شری متی سبھاگیہ وتی امروہہ کی ایک نامور خاتون تھیں- آپ امروہہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر پریم ناتھ گپتا محلہ کوٹ کی دختر تھیں- آپ کی شادی لہیڑا ضلع مظفر نگر (یوپی) میں مسٹر ستیہ پرکاش کے ساتھ ہوئی- شری متی سبھاگیہ وتی ایک اعلیٰ ظرف اور نیک خاتون تھیں- تعلیم کی ترقی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں- وہ امروہہ کے جے- ایس- ہندو ڈگری کالج کی Founder Member تھیں- وہ برسوں تک کانگریس کی Active Member رہیں- سنہ ۱۹۶۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ایم ایل اے کا الیکشن لڑا جس میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی لیکن سنہ ۱۹۶۸ء کے الیکشن میں کامیاب ہوئیں اور سنہ ۱۹۷۴ء تک امروہہ کی ایم ایل اے رہیں-

تقریباً پچاس سال کی عمر میں سبھاگیہ وتی کا انتقال ہو گیا- اس وقت وہ چاچی کولڈ اسٹوریج رسول پور میں ڈائریکٹر تھیں- سبھاگیہ وتی کے بڑے بھائی جو اے ڈی ایم ریٹائر ہو چکے ہیں دہرہ دون میں رہتے ہیں- سبھاگیہ وتی کا ایک ہی فرزند ستیہ سدھیر کمار سہنگل ہیں جو دہلی میں ڈالمیا گروپ میں مینجنگ ڈائریکٹر ہیں-

**سنیتا شاستری:** علم و ادب کی دنیا میں امروہہ کی جن خواتین نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ان خواتین میں ڈاکٹر سنیتا شاستری دختر امروہہ کا نام بھی بہت مشہور و معروف ہے۔آپ محلہ منڈی چوب امروہہ میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد وید پرکاش رستوگی ہومیوپیتھی کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ڈاکٹر سنیتا نے ایم اے تک تعلیم امروہہ کے جے۔ایس ہندو ڈگری کالج سے حاصل کی پھر .Ph.D کیا۔اس کے بعد آپ نے کے۔جی۔کے کالج مراد آباد سے سنسکرت میں ایم۔اے کیا۔ہندوستان کے اخبارات میں آپ کے آرٹیکل، فیچر اور افسانے چھپتے رہتے ہیں۔ڈاکٹر سنیتا کے دو منظوم کلام "ابھینو چستن" اور "ٹوٹے رشتے" شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ آپ کی ایک اور تصنیف "بھارت کے مہانگر" بھی شائع ہوئی جس کی بڑی شہرت ہوئی۔آپ انگریزی زبان کی بڑی مخالف ہیں اس سلسلے میں مقالے پڑھنے پر ہریانہ میں آپ کو انعام سے بھی نوازا گیا۔

**نسیم جعفر:** ڈاکٹر نسیم جعفر نقوی میجر سید تصویر حسین محلہ گذری کی صاحبزادی اور پاکستان کے مشہور نیفرولوجسٹ ڈاکٹر سید علی جعفر نقوی کی اہلیہ ہیں۔آپ نے پشاور یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا اور انگلینڈ کی لیڈز یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔آپ کافی عرصے تک گلیکسو پاکستان میں اہم عہدوں پر فائز رہیں۔آپ کو امروہہ کی پہلی خاتون پی ایچ ڈی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

**سیمار ضوی:** سیما کا تعلق امروہہ کے مقتدر خاندان رضویہ سے ہے۔آپ کے والد محمد بن عاشق، جو کنزرویٹیو پارٹی کی طرف سے اسکاٹ لینڈ کے ممبر بھی ہوئے، نے ایک آئرش خاتون سے شادی کرنے کے بعد مستقل لندن میں سکونت اختیار کرلی تھی۔اسی آئرش خاتون کے بطن سے اسکاٹ لینڈ میں سیمار ضوی پیدا ہوئیں۔سیمار ضوی کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ ہے۔وہ خود بھی غزلیں گاتی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں وہ اپنے چچا کے پاس پاکستان آئیں تو PTV پر مشہور غزلیں گا کر بڑا نام پیدا کیا۔TV کے مشہور آرٹسٹ معین اختر کی فلم Mr.K-2 میں بحیثیت ہیروئن کے کام بھی کیا۔کچھ عرصہ پاکستان میں رہ کر آپ واپس لندن چلی گئیں اور آجکل LLB کی تیاری کر رہی ہیں۔

**شاداب فاطمہ:** شاداب فاطمہ بنت سید علی حسین عابدی محلہ نوگیاں سید کمال رضا نقوی جو حکومت پاکستان میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں، کی اہلیہ ہیں۔آپ نے میٹرک سے لیکر ہر امتحان فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا۔فزکس میں ایم ایس سی اسلام آباد یونیورسٹی سے پاس کرنے کے بعد

Pinstech سے نیوکلیئر ری ایکٹر ڈیزائننگ میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن سے ایم ایس سی پاس کیا اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں شمولیت اختیار کی اور آجکل ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس سال آپ کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں پرائڈ آف پرفارمینس (فزکس) سے نوازا۔ آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ امروہہ کی پہلی خاتون ہیں جن کو یہ اعزاز عطا کیا گیا ہے۔

اُمِ حبیبہ: پاکستان ریڈیو اور ٹیلیوژن کی معروف نعت خواں خاتون اُم حبیبہ کا تعلق امروہہ کے رضویہ خاندان سے ہے۔ آپ قاری سید فخر الحسن رضوی کی صاحبزادی ہیں۔ آپ کی پیدائش جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی اور BA.B.Ed جامعہ ملیہ ملیر سٹی سے کیا۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں آپ کی شادی خلیل الرحمٰن کیانی سے ہوئی۔ پاکستان ریڈیو اور ٹیلیوژن کی خوش آواز نعت خواں ہونے کے ناطے آپ کو پی ٹی وی ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ آجکل آپ کا قیام شکاگو امریکہ میں ہے۔

-☆☆-

# امروہہ کی مجذوب شخصیتیں:

امروہہ میں چار پانچ مجذوب شخصیات بھی بڑی شہرت رکھتی تھیں۔ یہ معصوم لوگ اپنے دریدہ لباس میں سارا دن گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ انہیں نہ کھانے کی فکر تھی نہ سونے کی، اور نہ ان کو کبھی ہاتھ پھیلاتے دیکھا گیا، بس اگر کسی نے کچھ دیدیا تو کھالیا ورنہ بھوک پیاس میں بھی مست رہتے تھے۔ یہاں ان کا بھی ذکر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے ذکر سے امروہہ کے اس دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب یہ مجذوب لوگ کچھ عجیب عجیب حرکتیں کر کے لوگوں کو بڑا لطف اندوز کرتے تھے۔

متا: امروہہ کے مجذوب لوگوں میں ایک مشہور شخصیت متا کی تھی جو خاصے مشہور تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی معصومیت ہوتی تھی۔ گرمی، سردی یا برسات ہو لیکن ان کا لباس صرف ایک چھوٹی سی لنگوٹی ہوتا تھا جسے باندھے سارے شہر کی گلیوں میں بس یوں ہی چکر لگاتے تھے۔ ان کا چہرہ چینیوں سے ملتا جلتا تھا، سر کے بال ہمیشہ استرے سے منڈے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ لوگ خود ہی ترس کھا کر انہیں کچھ

کھانا وغیرہ کھلادیا کرتے تھے۔ یہ حضرت بچوں سے پیٹ کھلواتے اور پھر کہتے پیٹ پھُلاؤ۔ لیکن بچے موقع پاکر اس پر اکثر پتھروں کی بارش کردیا کرتے تھے جس سے کبھی کبھی وہ غریب لہولہان ہوجاتے تھے۔

شفیعہ: شفیعہ کو کبھی کھڑے ہوکر چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سارا دن اُکڑوں گھسٹ گھسٹ کر سارے شہر میں گھومتے تھے۔ ان کی جیبوں میں کوئلے بھرے ہوتے تھے۔ جگہ جگہ کوئلے سے لکیریں بناتے چلے جاتے تھے۔ بھیک نہیں مانگتے تھے۔ بس کوئی کچھ دیدیتا تو کھا لیتے تھے۔ شادی کے نام سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اگر ان کے آگے راستے میں کوئی دوسرا آدمی کوئلے سے لکیر کھینچ دیتا تو پھر واپس چلے جاتے تھے۔

جودا گرم: یہ بھی ایک عجیب شخصیت تھی۔ رات دن ایسی تیزی سے گھومتے جیسے کوئی بہت ہی ضروری کام سے جارہے ہوں۔ کبھی انہیں کہیں سوتے ہوئے نہیں دیکھا رات کو بھی گھومتے ہی رہتے تھے۔ سخت گرمی کے باوجود پھٹے پرانے دو دو تین تین کوٹ اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر بڑا جلال ہوتا تھا اور ان کی سرخ آنکھیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ جب بچے ان کا نام لیکر انہیں چھیڑتے تو ڈنڈا، جو ہر وقت ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا، لے کر بچوں کے پیچھے دوڑتے تھے۔ ان کے متعلق یہ روایت عام تھی کہ وہ بڑے پہنچے ہوئے ولی ہیں۔ اکثر لوگ اپنی پریشانیاں دور کرانے کے لیے ان سے دعا بھی کراتے تھے۔

باؤلی رئیسہ: یہ ایک خاتون تھیں جو باؤلی رئیسہ کے نام سے خاصی شہرت رکھتی تھیں۔ ان کا چہرہ ایسا خوفناک تھا کہ دیکھ کر ان سے ڈر لگتا تھا۔ اُلجھے بال کاندھے پر لکڑی میں لٹکی ہوئی پوٹلی لیے سارا دن گلی کوچوں کا طواف کرتی پھرتی تھیں، اگر کوئی انہیں چھیڑتا تو اس کی وہ پتھروں سے خبر لیتی تھیں۔

۔☆☆☆۔

# شعراء

امروہہ کے قدیم شعراء سے متعلق مظاہر حسین مومن "حیات حاذق صفحہ ۵-۶ مطبوعہ ۱۳۵۲ھ" میں لکھتے ہیں کہ:

"یوں تو امروہہ کی ادب نوازی اور علم پروری قدیم الایام سے شہرہ آفاق رہی ہے لیکن بقول شخصے زبان اردو کی علمی اور ادبی خدمات کے لحاظ سے اب سے ۳۰-۳۵ سال پیشتر کا زمانہ ایک عجیب و غریب زمانہ تھا- مرکز ادب امروہہ کی فلک اساس زمین پر بہتر سے بہتر اساتذہ رونق افروز تھے- سخن گوئی و ادب نوازی کا بازار گرم تھا- عروس سخن کی شباب آگینی بزم شعر کو پر رونق اور اپنا شیفتہ بنائے ہوئے تھی چنانچہ ناطق الملک سید الشعراء سید مومن حسین صفی مرحوم، عمدۃ الشعراء سید ابوالحسن فرقتی مغفور، مولوی ابوالحسن صاحب ساکت، نور اللہ مرقدہ انیس ثانی فرزدق ہند مولانا سید جواد حسین صاحب شمیم علی اللہ مقامہ کا طوطی بول رہا تھا اور ان اساتذہ کے فیضان صحبت و ادبی خدمات سے دہلی، لکھنؤ، بریلی، اجمیر، رامپور، مراد آباد وغیرہ اکثر مقامات ہند بالسادات مستفید ہو رہے تھے-"

مسیح اللہ خاں عطا دیوان شبیر صفحہ ۳ حصہ دوم کا دیباچہ لکھتے وقت امروہہ کے ادبی ماحول کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

"امروہہ کی مردم خیز سرزمین نے جہاں اور متفرق کسب و ہنر میں کامل و اکمل ہستیاں پیدا کیں وہاں فن

شاعری میں بھی سیکڑوں شاعر شیریں مقال و ناظم باکمال اور استاد زمانہ انسان پیدا کیے۔"

آب حیات میں محمد حسین آزاد نے مصحفی امروہوی کے باب میں جب مصحفی کی زبان کا ذکر کیا ہے تو اس میں "امروہہ پن" بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد کا مصحفی کے لیے لفظ "امروہہ پن" کا استعمال ہی امروہہ کی انفرادیت تسلیم کرنے کا ثبوت ہے۔

خدائے سخن، بادشاہ غزل استاد الاساتذہ دہلی اسکول کے صف اول کے شاعر میر تقی میر نے بھی سعادت امروہوی کے مشورے پر ریختہ کی جانب توجہ کی۔ میر نے اپنے تذکرہ میں بھی سعادت سے اپنے تعلق کا ذکر کیا ہے۔

دوسری طرف مصحفی امروہوی جیسا استاد بھی اسی سرزمین نے پیدا کیا کہ اردو شاعری میں استادی کے اس درجے پر شاید ہی کوئی فائز ہوا ہو۔ لکھنؤ اسکول میں آتش اور دو اہم مرثیہ نگار ضمیر اور خلیق بھی مصحفی کے ہی شاگرد تھے۔ اس طرح امروہہ اسکول نہ ہونے کے باوجود دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کا سرچشمہ ہے۔ امروہے کی زبان کے بارے میں مولوی سید شفیق حسن ایلیا کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

الله! الله! شان امروہہ    زہے طرز بیان امروہہ
دہلی و لکھنؤ کا ہے اوسط    معتدل ہے زبان امروہہ

محشر لکھنوی کے استاد اسی امروہہ کے مومن حسین صفی امروہوی تھے۔ جنھوں نے امروہہ اپنی آمد پر کہا تھا۔

امروہہ در حقیقت ایوان شاعری ہے    مولد ہے مصحفی کا محشر ذرا سنبھل کر

نواب رامپور کلب علی خاں کے استاد سید احمد نذیر امروہوی تھے۔ نواب باقر علی خاں فہیم جانشیں کے استاد فرزدق ہند نسیم امروہوی تھے۔ نواب رضا علی خاں رضا رامپور کے استاد حافظ محمد اسرائیل خوبی امروہوی تھے۔ ابوالحسن فرقتی امروہوی کے شاگرد سعید مراد آبادی اور زار بلند شہری ہوئے۔ دور حاضر پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو شاعر آل محمد حضرت نسیم امروہوی کے فیض صحبت سے ہندوپاک میں سیکڑوں فنکار مستفید ہوتے رہے۔ آج پاکستان اور ہندوستان میں نسیم امروہوی سے زیادہ کسی کے شاگرد مرثیہ نگار نہیں ہیں یہ تو صرف چند شعرائے امروہہ کے ذریعے دیگر مقامات کے شعراء کا کسب علم و فن کا ذکر تھا۔ ورنہ مصحفی و سعادت سے نسیم تک اور بھی بہت سے ایسے فنکار اس سرزمین نے پیدا کیے جن سے اردو کے بے شمار شعراء نے فیض حاصل کیا۔

دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شعرائے امروہہ کو بادشاہوں، نوابوں اور راجاؤں کے دربار میں بھی

بڑی عزت حاصل رہی ہے۔ اسمٰعیل امروہوی اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں دامن شاہی سے وابستہ ہوکر دکن میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار میں جو عزت و وقار حافظ سید محمد اسمٰعیل حافظ امروہوی کو حاصل تھا وہ بھی کچھ کم قابل فخر نہیں ہے۔ نواب مومن نے حافظ امروہوی کو سید الحفاظ کا خطاب دیا۔ اسی طرح ریاست رامپور میں نواب حامد علی خاں کے دربار سے ہی حضرت شمیم امروہوی کو فرزدق ہند کا خطاب ملا تھا اور نواب موصوف خود امروہہ سے شمیم امروہوی کو اپنے ساتھ رامپور لے گئے تھے اس کے ساتھ ہی بہت سے اساتذہ سے شعرائے امروہہ کو بھی بڑی قربت رہی ہے۔ علیم اللہ صوفی امروہوی استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ عاقل امروہوی اور صادق امروہوی داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ میر انیس جیسے شاعر جن کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ اپنے قرابت داروں کے علاوہ کسی کو شاگرد بنانا کم پسند کرتے تھے۔ لیکن سراج الدین احمد سراج امروہوی کو میر انیس سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ملک الشعرا شیخ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی نے اپنا جانشین یعقوب علی معجز امروہوی کو بنایا تھا اس کے علاوہ ذکی کے شاگردوں میں صفی امروہوی اور سرفراز امروہوی بھی ہوئے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگرد سید احمد نذیر امروہوی تھے۔ نذر الحسن طپش امروہوی کو پہلے ناسخ اور پھر میر عشق کی شاگردی کا موقع ملا۔ حاتم علی مہر کے شاگرد مظفر امروہوی ہوئے اور مولانا صفی لکھنوی کے مخصوص شاگرد طالب امروہوی تھے۔ مرزا دبیر کے شاگرد سید امجد علی اور میر سلیس کے شاگرد سید ماجد حسین تھے۔ میر انیس کے شاگرد وحید امروہوی تھے۔

امروہہ کی شاعری میں ایک بڑا حصہ مذہبی شاعری کا رہا ہے مثلاً حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، مناقب، مناجات، سلام مرثیہ، نوحہ اور ماتم وغیرہ۔ اور وہ تمام قدیم شعراء یہ شاعری زیادہ تر حصول ثواب کے لیے کرتے تھے۔ نام و نمود اور شہرت کی کبھی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کلام کی تشہیر کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ یہ جذبہ یہاں تک تھا کہ اپنے کلام میں بہت سے شعرا تخلص کا بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ شہرت مد نظر نہیں تھی ثواب پیش نظر تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ بہت سے شعراء کے مزاج کی انا کی رہی جو زیادہ تر اسلاف کے خون سے ملی ہے۔

ادبی تخلیقات کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات ادبی ماحول کا قایم ہونا ہے۔ اور یہ ماحول مرثیہ نگار شاعر کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ بغیر ماحول کے مذہبی شاعری ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ جب ہم اس حیثیت سے امروہہ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً اردو کے بہت سے نامور شعرا

کی امروہہ میں آمد، مجالس، محافل، ادبی نشستیں اور مختلف جلسوں کا انعقاد وغیرہ۔ اردو کے قدیم شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں دہلی سے امروہہ تشریف لائے اور سید اسد اللہ صاحب عرف میر کلو کے مدرسے میں قیام فرمایا۔

یہ امر یقیناً قابل غور ہے کہ ایک اتنی مختصر بستی نے اتنے شعراء پیدا کیے اور اس میں کافی تعداد میں مرثیہ نگار بھی ہوئے۔ مرثیہ نگاروں کا یہ تناسب اور تعداد ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم امروہہ کو اردو مرثیے کا ایک اسکول اور شمالی ہند میں لکھنؤ کے بعد دوسرا اسکول تعبیر کریں۔ امروہہ کے شعراء اور مرثیہ نگاران کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان کے اور ان کے کلام کے بارے میں لکھنا بے حد مشکل ہے۔ بہر حال چند مرثیہ نگاراں اور شعراء کا ذکر اور مختصر کلام ان کے تخلص کے حروف تہجی کے مطابق پیش کر رہے ہیں۔

## اسمٰعیل:

میر سید اسمٰعیل شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار تھے۔ اسمٰعیل کے مورث اعلیٰ مشہور صوفی بزرگ سید شرف الدین حسن شاہ ولایتؒ تھے۔ میر اسمٰعیل کے اخلاف میں سید غلام علی حقیقی بھتیجے عہد شاہ جہانی میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ امروہہ میں محلہ کٹرہ غلام علی ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اسمٰعیل کی ایک مثنوی جو بی بی فاطمہؑ کے عنوان سے ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے "شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی" کے عنوان سے سہ ماہی "اردو" کراچی جولائی سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع کی ہے۔

علی فاطمہؑ کوں جو دیکھا مردہ ہوئے لیٹی ہیں اس جائے پے
بولے روئے کر فاطمہؑ نیک بخت ہمن کو دیا دکھ موں سخت

-----

اپنے وطن امروہہ اور وہاں کی "سوت" ندی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ۔

نبی پیروی بیچ رہا اسمٰعیل قیامت کوں بخشے گا رب جلیل
وطن امروہا میرا ہے شہر نام اسی جائے پر میرا ہے گا قیام
دلّی کے گرد بیچ وہ شہر ہے ندی سوت کی بھی وہاں لہر ہے

-☆☆-

## افق کاظمی (شاعرِ اسلام)

صانعِ قدرت نے کھینچی ہے مٹانے کے لیے

میں بھی اک تصویرِ عبرت ہوں زمانے کے لیے

مولوی سید حبیب احمد افق کاظمی نقشبندی مجددی خلف اصغر حافظ سید یوسف علی ۲۳ رمضان ۱۳۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام سید محمد محفوظ علی تھا جو طویل ہونے کی وجہ سے استعمال نہیں ہوا۔ ابھی چار سال کی عمر تھی کہ سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ ان کی والدہ (بی بی فاطمہ) مولوی عبدالقادر دہلوی امروہوی خوشنویس کی برادرزادہ مولانا سید عبدالحئی دہلوی مہاجر امروہہ کی صاحبزادی تھیں۔ وہ اردو کی خاصی تعلیمیافتہ اور تحریر پر قادر تھیں۔ انہوں نے اپنے فرزند کو بچپن ہی سے عمدہ تربیت کے ساتھ قرآن کریم اور اردو کی ابتدائی تعلیم دی۔ افق نے سات سال کی عمر میں اپنے عم محترم حافظ حاجی سید یعقوب علی شاہ کی خدمت میں صحت قرأت کے ساتھ قرآن مجید دہرایا اور چند پارے حفظ کیے۔ فارسی کی ابتدا مولوی سید عبدالعزیز و مولوی ولایت حسین عارف و مولوی سید شبیر علی سے ہوئی۔ پھر مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں مولوی سید اصغر علی سے منتہی درسیات فارسی کی تحصیل کے ساتھ ہی فخر المحدثین حضر مولانا سید احمد حسنؒ محدث امروہوی سے عربی کا آغاز کیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد میرٹھ میں مولوی اختر شاہ خاں اختر امروہوی سے فارسی کی تکمیل اور صرف و نحو عربی کی تحصیل کی۔

زمانہ طالب علمی میں ہر زبان کی ادبیات سے فطری ذوق تھا اس لیے شاعری و مضمون نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عرصہ تک دفتر "رسالہ اسوۂ حسنہ" دہلی و شعبہ تالیفات خواجہ حسن نظامی دہلوی میں عربی فارسی کتب کے ترجمے کیے۔ اکثر مولفین کی تالیفات پر اصلاح کی مصر کے مشہور علامہ مفتی محمد عبدہٗ سید توفیق بکری علامہ طنطاوی جوہری اور بہت سی عربی فارسی تصنیفات کا مطالعہ اور بعض کا ترجمہ کیا ہے۔ کتب بینی کے اتنے عاشق تھے کہ شب و روز مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رہتے تھے۔ چنانچہ کثرت مطالعہ سے آپ کی صحت پر برا اثر پڑا اور اکثر بیمار رہنے لگے۔

روشن خیال اور اصلاح اور جدت پسند فاضل تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ صرف و نحو کی مختصر تعلیم کے بعد ادب و تاریخ و جغرافیہ اور عربی زبان حاصل کرنے پر زیادہ زور دیا جائے۔ طلبہ کو شروع ہی سے انگریزی طرز تعلیم کے مطابق عربی بولنے کی مشق کرائی جانی چاہیے اور جب عربی تکلم و تفہیم میں کافی ملکہ پیدا ہو جائے تو قرآن حکیم کا

سبقاً سبقاً درس دیا جائے اور سلیس معنی خیز ترجمہ زبانی سمجھایا جائے۔ اس کے بعد تفاسیر متقدمین میں سے کوئی جامع اور صحیح ترین تفسیر اور پھر حدیث شریف وفقہ علم کلام اور فلسفہ وہئیت وغیرہ کی تعلیم ہو۔ مغربی زبانیں بھی ضرور سیکھی جائیں۔

آپ نے پانچ دوادین اشعار کے علاوہ "اسلام اور شاعری"، "تریاقِ مشرق"، "سیر امروہہ"، "تذکرہ شعراء"، "صحیفہ مصحفی"، "قرآن اور نئی روشنی کا ترجمہ"، "علامہ طنطاوی مصری کی کتاب القرآن والعلوم المصریہ کا سلیس ترجمہ"، "تعارف غریب"، "ناسور غم" اور بہت سی تصنیفات و تالیفات چھوڑی ہیں۔

شاعری کا شوق آپ کو اوائل عمر ہی سے تھا۔ ۱۵ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری میں آپ کے استاد غریبؔ سہارنپوری تھے۔ مولانا حالی اور علامہ اقبال کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اتقی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے اپنی قوم میں جذبۂ آزادی، اسلامی اخوت و مساوات کا پیغام پہنچایا۔ یہاں آپ کی ایک طویل نظم "ہمارا ماضی اور حال" کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

اک زمانہ تھا کہ مسلم آشنائے غم نہ تھے ۔۔۔ آفتیں ایسی نہ تھیں صدمات یہ پیہم نہ تھے
دیدۂ تر اشک ریزاں صورت شبنم نہ تھے ۔۔۔ مبتلا الجھن میں گیسو کی طرح ہر دم نہ تھے
طبع سنجیدہ گرفتار پریشانی نہ تھی
اضطراب غم سے بحر دل میں طغیانی نہ تھی

تھے فلاح دو جہاں سے خرم و دلشاد ہم ۔۔۔ ہر مصیبت سے جدا ہر فکر سے آزاد ہم
عالم و فاضل تھے ہم ہر فن کے تھے استاد ہم ۔۔۔ شاہ عالم میر ملت صاحب ارشاد ہم
شاہد مقصود سے دن رات ہم آغوش تھے
دست بازو میں توانائی دلوں میں جوش تھے

ارتباط باہمی کے ساتھ سب ہوتے تھے کام ۔۔۔ رات دن رہتا تھا گھر گھر میں خوشی کا اہتمام
کاربائے دین و دنیا کا مکمل تھا نظام ۔۔۔ محو رہتے تھے عبادت میں خدا کی خاص و عام
دین و دنیا کی ترقی کے تمام اسباب تھے
کامیابی کے کشادہ ہر طرف سے باب تھے

آج وہ آرام و راحت کی فراوانی نہیں ۔۔۔ جمع ہیں اسباب غم وہ عیش سامانی نہیں

خشک ہے بحر سہولت بوند بھر پانی نہیں　　مشکلیں ہی مشکلیں ہیں نام آسانی نہیں
وہ مروت وہ خوشی وہ شادمانی اب کہاں
کامیابی اب کہاں وہ کامرانی اب کہاں

اب نہ وہ علم و ہنر ہم میں نہ وہ فضل و کمال　　اب نہ وہ فکر و نظر ہم میں نہ پاکیزہ خیال
اب نہ وہ زور و اثر ہم میں نہ وہ شان مقال　　اب نہ وہ اموال و زر ہم میں نہ وہ حسن و جمال
زور جسمانی نہیں وہ جوش روحانی نہیں
آن ایمانی نہیں شان مسلمانی نہیں

مل گیا سب خاک میں اپنا وہ دیرینہ وقار　　اٹھ گیا اقوام عالم میں ہمارا اعتبار
اب غلامی اور محکومی ہوا اپنا شعار　　جس نے ہم کو دنیا میں کیا رسوا و خوار
ہوگئے محروم رفعت گر پڑے پستی میں ہم
پائمال نیستی ہیں محفل ہستی میں ہم

ترک کردیں ہم نے وہ باتیں جو تھیں اسلام کی　　اب نہیں ہوتیں کسی مجلس میں باتیں کام کی
ہوگئیں خوگر زبانیں غیبت و دشنام کی　　گاؤخر دل میں زباں ذکر خدا کے نام کی
بھول بیٹھے روزہ کہتے ہیں کسے کیا ہے صلوٰۃ
رمز حج معلوم ہے ہم کو نہ مقصود زکوٰۃ

طاق نسیاں پر اُٹھا کر رکھ دیا قرآن کو　　لے کے رسمیں کفر کی غارت کیا ایمان کو
حج کو جائے کون دے تکلیف اپنی جان کو　　جب خدا رزاق ہے کیوں دیں زکوٰۃ انسان کو
ہائے کیا الٹی سمجھ الٹا عقیدہ ہو گیا
طالع بیدار اپنا جاگتا تھا سو گیا

کون تھا تم ہی تو تھے شمع شبستان علوم　　کون تھے وہ مچ رہی تھی جن کی اک عالم میں دھوم
کانپتے تھے نام سن کر اہل چین و شام و روم　　شان و شوکت سے تزلزل میں تھی اک اک مرز بوم
آسمان سلطنت کے نیر اعظم تھے تم
غیرت دارا و اسکندر رشک جم تھے تم

اے خدا پھر تو مناجات افق میں دے اثر ۔۔۔ مل کے پھر آپس میں ہم ہوں صورت شیر و شکر
پھر بنے ہر فردِ مسلم صاحبِ فکر و نظر ۔۔۔ پھر ہمیں ممتاز کر دے دولتِ علم و ہنر
اے خدا پھر اوج پر پستی سے پہنچا دے ہمیں
اے خدا پھر شوکت اسلام دکھلا دے ہمیں

-------

اس شاعرانہ پیام رسانی کے سلسلہ میں "مدوجزر"، "اسلام آشوب"، "ہماراماضی وحال"، "فغان جرس" "توصیف امروہہ" اور "تریاق مشرق" آپ کی قابل ذکر تصنیفات ہیں۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

عکس افگن ہے مرا باطن میری تحریر میں ۔۔۔ دیکھ لیں اہل نظر مجھ کو مری تصویر میں
صانع قدرت نے کھینچی ہے مٹانے کے لیے ۔۔۔ میں بھی اک تصویر عبرت ہوں زمانے کے لیے

-----

افق صاحب نے مرثیہ نگاری بھی کی ہے۔ یہاں محبتِ اہل بیت میں کہے گئے دو شعر بطور نمونہ پیش ہیں ؎

جسم اطہر پر تھے اسی زخم ہائے تیغ و تیر
پھر بھی رو گرداں نہ تھا وہ پہلوانِ کربلا
کر دیا تم نے یزیدی کی پلیدی کو فنا
اے جزاک اللہ حسینی کاروانِ کربلا

-----

تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور مستقل سکونت آپ نے ملتان میں اختیار کی۔ ۱۸/اگست سنہ ۱۹۷۶ء کو وفات پائی اور ملتان کے مشہور قبرستان حسن پروانہ میں مدفون ہوئے۔ ایسے عظیم شخص کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اس سلسلے میں، میں ان کے ایک عزیز کے پاس ملتان بھی گیا لیکن ان سے مل کر اس قدر مایوسی ہوئی جو یہاں تحریر نہیں کی جا سکتی۔

-☆☆-

# افسؔر امروہوی

نغمۂ وحدت کا مظہر کیوں نہ ہو سازِ حیات
جس قدر پردے ہیں، سب میں ایک ہی آواز ہے

تاریخی نام منظور حسن تھا۔ جس سے سال ولادت ۱۳۱۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ مگر منظور احمد نام رہا۔ افسؔر تخلص کرتے تھے۔ آپ کا یہ تاریخی نام حافظ مظہر علی انصاری محلہ تر پولیان (پروفیسر مناظر حسن کے پردادا) نے رکھا تھا۔ افسؔر امروہوی محلہ کالی پگڑی امروہہ میں ۹ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ امروہہ میں تعلیم حاصل کی اور اس زمانے کی نارمل اسکول ٹریننگ کے بعد کسی اسکول میں پڑھانے لگے۔ شعر و شاعری کا اسی زمانے میں آغاز ہوا۔ حبیب احمد افقؔ کاظمی کے دوستوں میں تھے۔ خلیفہ سید فضل حسین سعیدؔ امروہوی آپ کے استاد تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک حضرت مضطرؔ خیر آبادی سے اصلاح لی۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک شوقؔ قدوائی سے اصلاح لیتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے سنہ ۱۹۲۷ء میں کراچی آگئے۔ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس تمام عرصے شاعری اور علم و ادب سے ان کا گہرا رشتہ رہا۔ ان کے مضامین "نگار" "لکھنؤ"، "ادب لطیف"، "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ "معارف" اعظم گڑھ میں بھی علمی و تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ سب سے زیادہ مضامین ماہنامہ "قومی زبان" کراچی اور سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوئے ہیں۔ خمخانۂ جاوید جلد پنجم میں صدیقی کے تخلص سے کلام شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی سے تاحیات وابستہ رہے۔ اس دوران ساری توجہ ادبی تحقیق پر مرکوز رہی اور شعر و شاعری کو تقریباً خیرباد کہہ دیا تھا۔

افسؔر صدیقی کا پہلا مجموعہ کلام "برق تخیل" اور دوسرا "رباعیات افسر" کے نام سے امروہہ کے دوران قیام شائع ہوئے۔ لغت "ہادی المجمع" محبوب پریس دہلی سے شائع ہوئی۔ "تابش خیال" کے نام سے غزلیات کا ایک مجموعہ کراچی سے شائع ہوا۔ ان کی دوسری مطبوعات میں سے چند یہ ہیں:

(۱) شہاب تخیل ۱۹۳۹ء کراچی (۲) آٹھ جلدوں پر مشتمل مخطوطات انجمن ترقی اردو (۳) تذکرۂ عروس الاذکار (۴) بیاض مراثی (۵) مصحفی۔ حیات و کلام (۶) تلامذۂ مصحفی وغیرہ وغیرہ۔

افسر صدیقی کو شعر کے فنی نکات پر کامل قدرت حاصل تھی۔ سنہ ۲۰-۳۰ کے عہد کی شاعری میں مضمون آفرینی

پر توجہ دی جاتی تھی۔ افسر کے یہاں بھی اس عہد کی شاعری میں یہ رنگ غالب ہے۔ مثلاً

ظالم نے یہ کہہ کر دل افسر کو مٹایا — وہ شے نہ رہے جس سے ہو امکان تمنا
(۱۹۲۴ء)

مرا دل سختیٔ غم میں سلامت رہ نہیں سکتا — وہ شیشہ کیا بچے گا روز جو لڑتا ہے پتھر سے
(سنہ ۱۹۲۶ء)

شناور بن کہ تجھ کو گوہر مقصود حاصل ہو — نہ گھبرا پاٹ چوڑا دیکھ کر دریائے الفت کا
(سنہ ۱۹۲۶ء)

جدید رنگ میں ایک غزل اور ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

رات دن ایک سرگرانی ہے — دردِ سر ہے کہ زندگانی ہے

بس یہ ہے حسن و عشق کا انجام — ایک باقی ہے ایک فانی ہے

مرحبا اے وفور ناکامی — اب تو امید کامرانی ہے

دیکھ اے تہہ نشین بحر حیات — موج میں کس قدر روانی ہے

ہے بیاں رنج و درد کا افسر — اب غزل کیا ہے نوحہ خوانی ہے

چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نغمۂ وحدت کا مظہر کیوں نہ ہو سازِ حیات
جس قدر پردے ہیں، سب میں ایک ہی آواز ہے

یہ اس کی جوانی کی ہے تعریف مکمل — اک نشۂ نو قیامت انساں میں نہاں ہے

تری چشم مخمور کا ہے تصور — نئے رنگ کی میری مے خواریاں ہیں

شکایت پر خفا کیوں ہو؟ محبت کا تقاضا ہے — نہیں ہوتی شکایت تو محبت بھی نہیں ہوتی

دیکھ کر افسر ناشاد کو مجبور حیات — اپنی آغوش میں کھینچا شبِ تنہائی نے

مری نگاہ میں یہ فلسفہ ہے سجدے کا — کہ اتصال میں آجائیں ساجد و مسجود

افسر صدیقی کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ ایک لڑکی تھی جس کی شادی امروہہ میں کر دی تھی۔ اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ نواسی نواسے دہلی میں مقیم ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے پاسپورٹ کی تجدید کی درخواست دیکر آفس سے باہر آرہے تھے کہ سڑک پر گرے اور انتقال فرما گئے۔ سال وفات سنہ ۱۹۸۴ء ہے۔ کراچی میں سخی حسن کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

-☆☆-

**انیس:** سید انیس الدین رضوی آپ کا نام اور تخلص انیس تھا۔ آپ سید رئیس الدین کے فرزند تھے۔ ۲۲؍جولائی ۱۹۰۳ء کو امروہہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک سال میرٹھ میں رہے۔ آیندہ سال سیکنڈ ایر میں علیگڑھ میں داخلہ لیا۔ تاریخ وسیاست میں بی۔اے آنرس اور تاریخ میں ایم۔اے۔ کیا اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ایل ایل بی کیا۔

بچپن ہی سے شعر و سخن اور افسانہ نویسی میں دلچسپی تھی۔ ذوق شعری کی تکمیل کے لیے سید محامد حسین وفا امروہوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ یونیورسٹی کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔ یونیورسٹی کی سلور جوبلی کے موقعے پر سنہ ۱۹۲۵ء میں طلائی تمغہ ملا اور انجمن حدیقۃ الشعر کے سکریٹری بنائے گئے۔ یونیورسٹی یا یونین کی وہ تقریب کامیاب نہ سمجھی جاتی تھی جس میں آپ کی نظم نہ ہوتی ہو۔ اسی زمانے میں "علیگڑھ میگزین" کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے۔ نیرنگ خیال کے علاوہ "ہمایوں" "سروش" اور "ادیب" وغیرہ میں بھی آپ کے مضامین نظم ونثر شائع ہوتے رہے۔ ۶؍جولائی ۱۹۵۴ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

آیا نہ لب پہ شکوۂ بیداد آج تک　　کرتا رہا ہوں دل ہی سے فریاد آج تک
ٹوٹی ہوئی امیدیں، شکستہ مسرتیں　　دنیائے دل انہی سے ہے آباد آج تک

**ایلیا:** مولوی سید شفیق حسن نام اور تخلص ایلیا تھا۔ ۱۴؍جولائی سنہ ۱۸۸۵ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین حسین شاہ ولایتؒ کی اولاد میں ہیں۔ ایلیا نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے دادا سید امیر حسن امیر اور والد سید نصیر حسن نصیر سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ آپ نے سید اولاد حسن سقیم سے درس حاصل کیا اور شاعری میں بھی انہی کے شاگرد تھے۔ آپ عربی فارسی اور سنسکرت زبانوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ علم ہیئت پر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں آپ کے لیکچرس ہوا کرتے تھے۔ آپ ایک جید عالم تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں "حقیقۃ المسیح" کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ آپ کے لائق اخلاف سید محمد تقی، رئیس امروہوی اور جون ایلیا نے بھی آپ کا نام بڑا روشن کیا۔ ۸؍جنوری سنہ ۱۹۵۶ء کو آپ کی وفات ہوئی۔

ایلیا کو ہر صنف سخن پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ غزل، نظم، قصیدہ، منقبت، نعت، سلام، نوحہ، قطعہ، رباعی اور مرثیہ کہتے تھے۔ آپ نے ایک طویل نظم ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم "کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں" کے جواب میں لکھ کر علامہ اقبال کو بھیجی تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہاں اے شفیقؔ! بات کوئی اب نئی سناؤ یہ بزم رشک طور بنے رنگ وہ جماؤ!
لوانتہائے عرش سے آگے قدم بڑھاؤ محفل کو حولنے کی ہوا باندھ کر دکھاؤ
اسریٰ سے ہے عروج رسولِ کبیر کا
لاہوت میں ہو نور سمیع اور بصیر کا

---

غیر تو غیر ہیں کب اپنے ہیں کوئی اپنا نہیں سب اپنے ہیں
آپ حریم ناز میں شوق سے آئیں بے حجاب اب وہ جنوں جنوں نہیں اب وہ نظر نظر نہیں

-☆☆-

**احسان:** سید علی احسان، سید علی مستحسن محلہ بگلہ کے فرزند تھے۔احسانؔ تخلص کرتے تھے۔مولانا محمد عبادت کلیم ان کے استاد تھے۔جبکہ ان کے شاگردوں میں جمال احسانی بڑا نام پایا۔مجھے ان کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں لیکن یہ ضرور پتہ چلا کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے اور انہوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی مذہبی شاعری کے کئی مجموعے "مولود کعبہ" اور "شمع عرفان" وغیرہ سنا ہے کہ شائع ہو چکے ہیں۔ان کی ایک غزل پیش خدمت ہے ؎

عشق کی مشکلات میں عمر تمام ہو گئی جاگنا فرض ہو گیا نیند حرام ہو گئی
دے گئی جانے کیا مجھے اک نگہ التفات جیسے کہ ساری کائنات میرے ہی نام ہو گئی
میکدۂ جمال میں پینے کا کس کو ہوش تھا جب وہ نگاہ اٹھ گئی گردش جام ہو گئی
ڈوب رہا ہے آفتاب، دور ہے منزل امید جذبۂ شوق کیا کرے راہ میں شام ہو گئی
برق جمال یار نے چوم لیے لب کلیم طور پہ لکنت لطیف اوج کلام ہو گئی

-----

غنچے واقف ہی نہیں انجام سے کھیلتے ہیں رنگ صبح و شام سے

-☆☆-

**اخترؔ:** مولوی محمد اختر شاہ خاں نام اور تخلص اخترؔ تھا۔آپ حبیب شاہ خاں قوم افغان ساکن محلہ گھیر بدر علی

کے فرزند تھے۔ آپ کے والد حبیب شاہ خاں ریاست دھولپور میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ اس لیے اخترؔ نے ابتدائی تعلیم وہاں کے سرکاری اسکول سے حاصل کی۔ فارسی عربی کی درسیات امروہہ میں مولانا شبیر علی سے اور سہارنپور و دیوبند میں مولانا احمد علی اغوانپوری سے پڑھیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ اس فن میں خلیفہ مراد علی مرادؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں خوب ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا جب مالٹا سے ہندوستان تشریف لائے تو ان کے خیر مقدم میں ۳۲ شعر کی ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ پہلے ایک رباعی درج کیجاتی ہے ؎

ہے دار فنا کی آنی جانی ہر شے — اور دار بقا کی جاودانی ہر شے
باقی جو لیے ہوگی جو فانی اخترؔ — باقی ہے وہی باقی ہے فانی ہر شے

------

پھر بہار گلشن اسلامیاں آنے کو ہے — یعنی باغ علم دیں کا باغباں آنے کو ہے
آپ جو ئے رفتۂ باغ علوم دیو بند — مالٹا سے جانب ہندوستاں آنے کو ہے
جس کے اخلاق حسن کا شہرہ ہے آفاق گیر — وہ جہان فقر کا صاحبقراں آنے کو ہے
زال دنیا کا چلا جس پر نہ ہرگز داؤ پیچ — عرصہ تسلیم کا وہ پہلواں آنے کو ہے
آندھیوں سے جو حوادث کی کبھی ہلتا نہیں — وہ وقار و علم کا کوہ گراں آنے کو ہے
جس کے پروانوں کے آگے پر بچھاتے ہیں ملک — وہ چراغ محفل دانشوراں آنے کو ہے

-☆☆-

**اکملؔ:** سید اعجاز حسن نام اور تخلص اکملؔ تھا۔ آپ حضرت سید حسین صاحب کاملؔ امروہوی کے برادر خورد تھے۔ آپ کی غزل کے چند اشعار جو 'نسیم چمن' فروری ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئے۔ ملاحظہ ہوں ؎

جس دن سے مہرباں وہ مرا مہ لقا نہیں — ہوش و حواس اپنے کسی دم بجا نہیں
کس کو دکھائیں حالت دل ہجر یار میں — مونس نہیں انیس نہیں آشنا نہیں
ہمکو وصال ہجر میں رہتا ہے رات دن — وہ ہم سے گو جدا ہے پہ ہرگز جدا نہیں
اکملؔ کلام وہ ہے کہ مضمون بول اٹھے — ہر چند بے زبان کوئی بولتا نہیں

**اوجؔ:** سید غلام نبی نام اور تخلص اوجؔ تھا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سید آل نبی ساکن محلہ دربار کلاں کے فرزند تھے۔ آپ سنہ ۱۹۲۶ء میں کراچی آئے اور پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں روزنامہ نظام کراچی سے جاری کیا جو تقسیم کے بعد بند ہو گیا۔ آپ کا کلام گلدستوں میں اور اپنے اخبار میں نیز ماہنامہ ''تنویر'' میں 'جو افسر صدیقی امروہوی کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا' چھپتا رہا۔ اپنا کوئی مجموعہ شائع نہ کرا سکے۔ اسطرح آپ کا کلام ضائع ہو گیا۔ کراچی میں وفات ہوئی۔ افسوس کہ ان کا ایک شعر بھی میسر نہ آسکا۔

-☆☆-

**ان پڑھؔ:** امروہہ کے ایک نامور شاعر حاجی مختار احمد تھے جن کا تخلص ان پڑھؔ تھا۔ محلہ بڑوال میں آپ کی سکونت تھی۔ نوبت خانے میں پنڈول کی دکان تھی۔ تعلیم نہ ہونے کے باوجود بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ سنا ہے کہ آپ کے فرزند نے آپ کا کلام بھی شائع کیا ہے جو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وقت یہ دو خوب ہیں انپڑھ خدا کی یاد کے — رات کو سونے سے پہلے صبح اٹھ جانے کے بعد
کہاں تک ہم بچائیں آنکھ کو چشم حسیناں سے — گلی کوچوں میں آتا ہے نظر ان کا نقاب الٹا

-☆☆-

**الطافؔ:** سید الطاف حسین نام اور تخلص الطاف ہے۔ آپ کی رہائش دربار کلاں میں تھی۔ ''بزم سخن'' جنوری سنہ ۱۹۱۶ء کے شمارے میں آپ کی غزل شائع ہوئی جس کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

مانا خیال و خواب خیالِ وصال ہے — لیکن مرے خیال میں اچھا خیال ہے
ان ٹوٹے آئینوں سے بھی دل میں کدورتیں — مایوس خاطروں سے یہ کیسا ملال ہے
الطافؔ اس کا لطف ہے از بس کہ عام لطف — تعریف لطف حق میں زباں میری لال ہے

-☆☆-

**بسملؔ:** بانکے لعل نام بسملؔ تخلص تھا۔ آپ کا شمار امروہہ کے ممتاز شاعروں میں ہوتا تھا۔ آپ کے اور آپ کے کلام کے بارے میں تفصیل نہیں مل سکی۔ مجھے انتہائی دکھ ہے کہ ہندو شعراء میں برج باسی لال عاصیؔ، گل کشور شبنمؔ، پیارے لال پیارےؔ، منشی کوڑی سنگھ عاقلؔ، رام سروپ بسملؔ، نند کشور بیدلؔ، ہرسرن گلزارؔ، چھوٹے لال محشرؔ اور موہن لال مشتاقؔ جیسے نامور اور خوبصورت شعراء کے بارے میں کچھ نہ مل سکا اور نہ ہی ان کا کلام مل

سکا۔ لیکن ان تمام شاعروں کا شمار امروہہ کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔

**بھگوانداس برہمن:** شاگرد جناب مولوی آل نبی مضطر امروہوی۔ 'نسیم چمن' نومبر ۱۸۹۵ء کے شمارے میں آپ کی شائع ہونے والی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کچھ نگاہ مہر و کرم میرے حال پر | کچھ دیجیئے جواب سوال وصال پر
اس سنگدل کے دل پہ خدایا اثر نہیں | غیروں کو رحم آتا ہے مجھ خستہ حال پر
مانا رقیب نحس کو بوسہ نہیں دیا | پھر داغ کیوں نمود ہے اس گورے گال پر
بھگوانداس وصل پہ اس گل نے یوں کہا | بے وجہ ضد نہ کیجیئے امر محال پر

-☆☆-

**باقی:** عبدالباقی نام اور تخلص باقی تھا۔ آپ کی رہائش محلہ کوٹ میں تھی۔ مفصل حال تحقیق نہو سکا۔ آپ کی غزل کے چند اشعار جو "بزم سخن" جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی تھی بطور نمونہ پیش ہیں ؎

جس کے فراق میں مجھے جینا وبال ہے | یہ بھی نہ پوچھا اس نے کہ کیا تیرا حال ہے
کیا چھپ سکے گا حشر میں خوں بیگناہ کا | خنجر گواہ ہو نہ ہو دامن تو لال ہے
ہے آسرا مجھے تری رحمت پہ اے خدا | ورنہ گنا ہگار مرا بال بال ہے
پھر میرے دن نہ آئینگے کیا مجھے اے فلک | آخر زوال کو بھی تو اک دن زوال ہے
باقی میں تجھ سے کیا کہوں فرقت کا ماجرا | اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ میرا حال ہے

-☆☆-

**بیدار:** منشی محمد فاضل خاں نام اور تخلص بیدار تھا۔ محلہ افغانان میں آپ کی رہائش تھی اور امروہہ کے اطراف میں کسی کانجی ہاؤس میں ملازم تھے۔ بیدار کے تین شعر جناب لاغر امروہوی نے عنایت کیے ہیں۔ لاغر صاحب نے اس غزل سے متعلق ایک واقعہ بھی سنایا: "شام کا وقت تھا۔ بیدار کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ پتھروں سے بنی ہوئی سڑک کے کسی پتھر سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ ان کے پاؤں میں اسقدر چوٹ لگی کہ خون نکل آیا۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے اور پوچھا کیا ہوا بیدار صاحب؟ اس وقت انہوں نے یہ شعر کہا:

غم ٹھوکروں کا کیا ہے جوانی عیش نے | پیری میں انتقام لیا ہے کبھی کبھی

ملاحظہ ہوں یہ تین شعر۔

دل سے زباں کا کام لیا ہے کبھی کبھی　　یوں بھی کسی کا نام لیا ہے کبھی کبھی
غم ٹھوکروں کا کیا ہے جوانیٔ عیش نے　　پیری میں انتقام لیا ہے کبھی کبھی
پامال کر کے عشق کے خوددار ولولے　　دامن کسی کا تھام لیا ہے کبھی کبھی

-☆☆-

**بزمؔ:** سید محمد نام اور بزمؔ تخلص ہے۔سنہ ۱۹۲۲ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محمد عبدالہادی انصاری تھے۔ابھی آپ شیر خوار ہی تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔آپ کی بہن نے آپ کی پرورش کی۔عہد طفلی میں والدین کی وفات آپ کے لیے بہت بڑا غم تھا جس نے آپ کو شاعری کی طرف مائل کر دیا۔بزمؔ خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:"میں نے امروہہ کی سخن پرور سرزمین سے اپنی شعر گوئی کا آغاز اس وقت کیا جب بقول خود۔

ابھی تو دن تھے مرے عیش و شادمانی کے　　ابھی تو معنی بھی سمجھے نہ تھے جوانی کے

زندگی کے سولہویں برس میں تھا کہ زندگی کے انتہائی نامساعد اور ناسازگار حالات سے پیدا شدہ غم نے مجھے شعر گوئی کی طرف مائل کیا ....."

سید محمد جعفر حیاتؔ امروہوی سے بڑا قریبی تعلق رہا۔طبیعت نظم گوئی کی طرف مائل تھی مگر حیاتؔ کی صحبت میں وہ غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ صنفِ غزل میں ایک معتبر نام بن گیا۔رئیس امروہوی سے اتنی قربت تھی کہ شاید ہی کسی کی رہی ہو۔بزمؔ انصاری نے مختلف ادارے رئیس امروہوی کی سرپرستی میں قایم کیے مثلاً کاسموپولیٹن ایجوکیشنل سوسائٹی'پاک عربین کوآپریٹو بینک کاغان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اور رئیس امروہوی فاؤنڈیشن۔خدمت خلق کے ہر شعبہ سے گہری دلچسپی رہی۔آپ کا کلام "آب جو" کے نام سے نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

دل و دماغ میں باہم تھیں قربتیں کیا کیا　　اسے بھلا کے بھی یاد آئیں صحبتیں کیا کیا
سفر تمام ہوا دے کے داغ ہم سفری　　خیال و خواب ہوئی ہیں رفاقتیں کیا کیا
ٹھہر ٹھہر کے بجھا آخرش شرارۂ دل　　دھواں دھواں ہوئیں گھٹ گھٹ کے حسرتیں کیا کیا
وہ ہم سے چھن بھی گیا جاں سے ہم گئے بھی نہیں　　وفا نے آج دلائی ہیں غیرتیں کیا کیا

ابھی تو عذرِ ملاقات ہی تک آئے ہیں — ابھی تو دیکھیے ہوں گی قیامتیں کیا کیا
وہ بزم جو دل و جاں سے عزیز تھا ہم کو — اسی عزیز نے دی ہیں اذیتیں کیا کیا

-☆☆-

**بے تابؔ سوری:** یٰسین الرحمٰن نام اور تخلص بے تابؔ ہے۔ آپ امروہہ کے معزز سوری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹی۔ جی۔ سی ہندو ہائی اسکول، جے ایس انٹر کالج امروہہ اور کے۔ جے۔ کے، کالج مراد آباد میں حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے بی اے ایل ایل بی کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۶۳ء میں لنکنز ان لندن سے بار ایٹ لا کیا اور وہیں پر اپنی پریکٹس شروع کر دی۔

شاعری کے ابتدائی دور میں کوثر امروہوی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مسلم امروہوی شہبازؔ سے اصلاح لی۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن محبوب صنف قطعہ اور نظم ہے۔ آپ کی تصنیفات "عذرا کے نام خطوط"، "کماؤ بیوی" اور "پلے بوائے کلب" آپ کے طنز و مزاح کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ شعری مجموعہ زیرِ اشاعت ہے۔ آپ کی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

آج مقتل میں خبر ہے کہ چراغاں ہوگا — گر یہ سچ ہے تو مرے قتل کا ساماں ہوگا
آج وہ پھول چڑھائیں گے مری تربت پر — رشکِ گلزارِ جناں مرقدِ ویراں ہوگا
آج گر بزمِ سخن ہے تو چلو ہم بھی چلیں — سننے میں آیا ہے بے تابؔ غزل خواں ہوگا

-☆☆-

**بلندؔ:** ترغیب حسین نام اور تخلص بلندؔ ہے۔ آپ سنہ ۱۹۴۲ء میں امروہہ کے معزز خاندان نقوی سادات میں پیدا ہوئے۔ ترغیب بلندؔ کے والد عین الحسن جریؔ کا شمار امروہہ کے استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ ترغیب بلندؔ کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ اس کے بعد پاکستان آگئے اور آج کل کوپن ہیگن ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ ترغیب بلندؔ ایک خوبصورت شاعر ہیں اور یہ شعری ذوق آپ کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملا ہے۔ حال ہی میں وہ ڈنمارک سے پاکستان آئے تو اپنی تالیف "سرمایۂ شعراء" کی ایک جلد مجھے دی۔ اس سے پہلے میں ان سے قطعی طور پر واقف نہیں تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ آپ جریؔ کے فرزند ہیں۔ "سرمایۂ شعراء" دیکھی تو میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے دیارِ غیر میں بیٹھ کر ۹۴۰ صفحات پر مشتمل قدیم و جدید شعراء کے موضوعاتی کلام کو ایک

جاا کھٹا کر کے ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے- آپ کی تالیف کا ڈھنگ بھی نرالہ ہے جس میں مختلف عنوانوں کے تحت مختلف شاعروں کے انداز بیان کے فرق کو نمایاں کیا گیا ہے- آپ کی ایک غزل بطور نمونہ کلام پیش ہے -

کسی کا عہد طفلی جا رہا ہے — قیامت کا زمانہ آ رہا ہے
مجھے دم توڑتے اس نے جو دیکھا — کہا بیمار صحت پا رہا ہے
وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہے ہیں — مرا دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
ہجوم یاس و حسرت ہے مرے ساتھ — عدم کو کون تنہا جا رہا ہے
نہ ہو ناز اس بہار گل پہ، بلبل! — خزاں کا بھی زمانہ آ رہا ہے
محبت میں کسی کے سنگِ در سے — بلند! اپنا بھی سر ٹکرا رہا ہے

-☆☆-

**تاباںؔ نقوی:** سید مختار حسین نام اور تخلص تاباںؔ ہے- سنہ ۱۹۱۵ء کو محلہ بیگم سرائے کلاں میں پیدا ہوئے- شعر و شاعری کا ذوق شروع ہی سے تھا- حیات امروہوی، رئیس امروہوی، حکیم کلب علی شاہدؔ اور مولانا محمد عبادت کلیمؔ کی رفاقت میں کاروان شاعری میں شامل رہے- ایک نستعلیق انسان ہیں- شائستہ فکر اور تہذیبی و تمدنی لوچ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے- صحافت سے گہرا تعلق رہا ہے- امروہہ کے اولین صحافیوں میں شمار ہوتے ہیں- حیات امروہوی کے بمبئی جانے کے بعد ان کے اخبار "اتحاد" کے مدیر رہے- رئیس امروہوی نے جب روزنامہ "جدت" مراد آباد کو چھوڑا تو تاباںؔ نقوی کو مولانا عمر دراز بیگ مراد آبادی نے ادارت کی ذمہ داریوں کے لیے منتخب کیا- تاباںؔ کے لیے ادارتی ذمہ داریاں نبھانی مشکل نہ تھیں مگر ان کے واسطے رئیس امروہوی کے ان شاگردوں کو روزانہ غزلیں لکھ کر دینا جیسا کہ رئیس کیا کرتے تھے ممکن نہ تھا- پس تاباں نے ۱۹۴۹ء میں اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار "نوائے ہند" جاری کیا-

تاباںؔ کا ادب میں ایک اعلیٰ مقام ہے- وہ ایک اچھے شاعر ہیں مگر ان کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام میری نظر سے نہیں گزرا- وہ بڑے زود حس اور جذباتی انسان ہیں مگر ان کی شائستگی اور متانت، فطری ضبط اور اعتدال ان کی شخصیت کو نکھار دیتے ہیں- ایک شعر ملا ہے جو پیش خدمت ہے -

نظر آ گیا جو وہ جلوہ نہیں ہے — اسے دیکھنا کچھ تماشا نہیں ہے

-☆☆-

**تبسم:** سید متین حسن آپ کا نام اور تبسم تخلص تھا بعد کو مخزون تخلص اختیار کیا۔ حضرت جرجی امروہوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی غزل کے چند اشعار جو "بزم سخن" جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہوں ؎

وہ ناز کی وہ بانکپن اور وہ جمال ہے ۔۔۔ جس کے بیاں کو آمد مضموں محال ہے
محفل سے ان کی آج نکالا گیا حریف ۔۔۔ خس کم جہان پاک کی صادق مثال ہے
بیمار ہجر کا تو بدن گھل چکا تمام ۔۔۔ اللہ رے شوق اب بھی خیال وصال ہے

-☆☆-

**ثمر:** لئیق احمد نظامی نام اور ثمر تخلص تھا۔ جناب کرار نوری اور نہال سیوہاروی کے شاگرد تھے۔ ۴؍ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم عزیز احمد نظامی میرٹھ میں وکالت کرتے تھے لہذا ثمر نظامی کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ دہلی میں ادبی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ پاکستان آکر ثمر نظامی روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ، روزنامہ "اسلامی نظام" کراچی، روزنامہ "جدید نظام" لاہور، روزنامہ "اردو ڈان" وغیرہ میں قطعات لکھتے رہے۔ آپ کے دو دیوان "رت جگے" اور "دن ڈھلے" کے نام سے شائع ہوئے۔ آپ کی ایک غزل اور ایک قطعہ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

اپنی فطرت کے تقاضوں کو بدل کے دیکھوں ۔۔۔ برف بن جاؤں تو سانسوں سے پگھل کے دیکھوں
تھک گیا ہوں کوئی پہلو تو بدل کے دیکھوں ۔۔۔ زندگی تیرے حصاروں سے نکل کے دیکھوں
ایک تو ہی تو نہیں اور بھی ہوں گے لیکن! ۔۔۔ تجھ سے روٹھوں تو کہیں اور نکل کے دیکھوں
انگلیاں خون میں ڈوبیں تو محافظ کہلائے ۔۔۔ میں بھی اے ذوق ستم پھول مسل کے دیکھوں
اب مجھے کتنے سرابوں سے بہلنا ہو گا ۔۔۔ میں ترے ساتھ ذرا دور تو چل کے دیکھوں

----

قطعہ

خواہشِ بے ثبات کرتے ہیں
آرزوئے حیات کرتے ہیں

چند لمحوں کی زندگی پا کر
لوگ برسوں کی بات کرتے ہیں

-☆☆-

**جاوید** جاوید فاروقی جون سنہ ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوئے- آپ کے والد اکرم فاروقی محلہ چلہ امروہہ کے فاروقی خاندان سے تعلق ہے- جاوید فاروقی ایم-اے انگریزی، اردو، بی-ایڈ اور ریسرچ اسکالر ہیں- کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا جو آپ کو اپنے والد صاحب سے ورثہ میں ملا- آپ کے والد اکرم فاروقی بھی ایک نامور شاعر ہیں-جاوید فاروقی نے درس وتدریس کو اپنا پیشہ بنایا اور آجکل کانپور میں کسی کالج میں لیکچرار ہیں-شاعری میں آپ کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں- جاوید ایک اچھے شاعر ہیں اور بہت ہی خوبصورت غزلیں کہتے ہیں- آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

نہ تم آئے نہ شاخوں پر گلاب آئے تمہارے بعد موسم کے عذاب آئے
اُسے دیکھا تو یوں پلکیں چمک اٹھیں کہ جیسے جاگتی آنکھوں میں خواب آئے
دعا ہونٹوں پہ آکر سہم جاتی ہے نہ جانے اُس طرف سے کیا جواب آئے؟
دلوں کی سب کتابیں ہم نے پڑھ ڈالیں کہیں سے پھر کوئی تازہ کتاب آئے

------

جلتی راہوں کے مسافر کا سفر دیکھے گا کون بے بصارت سب کے سب ہیں چشم تر دیکھے گا کون
ہم تو اپنا شہر کر آئے ہیں نذرِ شہریار اب ہمارے بعد جلتے بام و در دیکھے گا کون
گرد بن کر اڑ رہے ہیں منزلوں کے سب نشاں آندھیوں میں نقش ہائے معتبر دیکھے گا کون
بستیوں میں چھوڑ کر آئے ہیں ہم جلتے چراغ دشت ظلمت سے نکل کر اپنا گھر دیکھے گا کون

-------

یقیں سے بھی گئے احتمال سے بھی گئے ہم اپنے عہد میں خواب وخیال سے بھی گئے
ہمارا ذکر ہے دیمک زدہ کتابوں میں ہم اہل علم و ہنر تھے مثال سے بھی گئے

-☆☆-

# جونؔ ایلیا

ہے بکھرنے کو یہ محفلِ رنگ و بو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر، سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں
وقت کی اِس مسافت میں بے آرزو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

امروہہ کی سرزمین کو ہمیشہ سے مردم خیز قرار دیا گیا ہے۔ اس مرزبوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ہر شعبۂ زندگی کے باکمال لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں صوفیائے کرام نے اسلام کی روشنی پھیلانے میں اہم خدمت انجام دی ہے، جب کہ یہاں کے مختلف دارالعلوموں کو فارسی، عربی ادب، فقہ اور حدیث کی تعلیم کے لیے منفرد مقام حاصل رہا ہے اور برصغیر کے اکثر علماء یہاں درس و تدریس میں مصروف رہے ہیں۔ دوسری طرف یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے امروہے کا جو نام برصغیر میں روشن کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ اور شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار اسماعیلؔ، میر تقی میرؔ کے ریختہ گوئی میں استاد میر سعادت اور رئیسؔ امروہوی، امروہہ ہی کی رچی بسی ادبی فضاؤں کے پروردہ تھے جبکہ جونؔ ایلیا ہمارے عہد میں امروہہ کی اعلیٰ علمی، شعری اور ادبی روایات کے ورثہ دار ہیں۔ جونؔ ایلیا کا نام سید حسین جون اصغر ہے اور ان کا تعلق امروہہ محلہ دربار شاہ ولایت (لکڑہ) کے ایک ایسے خاندان سے ہے جو کئی پشتوں سے دادِ سخنوری دے رہا ہے۔ جونؔ کے والد علامہ شفیق حسن ایلیاؔ ایک عالم باعمل تھے۔ ان کو عربی، فارسی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک مستعند شاعر اور ادیب تھے۔ جونؔ، رئیسؔ امروہوی اور مشہور فلسفی اور روزنامہ جنگ کے سابق ایڈیٹر سید محمد تقیؔ کے برادر خورد ہیں۔ اپنے بارے میں جونؔ کیا کہتے ہیں ان کے ہی الفاظ میں سنیے:

"میں دو آبہ گنگ و جمن کے حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر امروہہ میں پیدا ہوا۔ امروہے میں نہ جانے کب سے ایک کہاوت مشہور چلی آ رہی ہے کہ 'امروہہ شہر پائے تخت ہے، گزران یاں کی سخت ہے، جو چھوڑے وہ کم بخت ہے'...... مجھے نہیں معلوم کہ شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار سید اسماعیلؔ امروہوی، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، نسیم امروہوی، رئیسؔ امروہوی، سید محمد تقیؔ، سید صادقین احمد اور اقبال مہدی نے امروہہ چھوڑ کر اپنے آپ کو کم بخت محسوس کیا تھا کہ نہیں مگر میں نے...... بہر حال"

جون نے اپنے مجموعہ کلام "شاید" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ وہ عربی ادب اور فلسفہ میں امروہہ کے علمائے دیوبند کے شاگرد رہے ہیں- جون عربی فارسی ادب وزبان کے منتہی ہیں- انہوں نے بہت سی عربی وفارسی کتابوں کے ترجمے مختلف اداروں کے لیے کیے جو چھپ بھی چکے ہیں- ان کی تقریباً بیس کتابوں کا تو راقم الحروف کو خود علم ہے جن میں مسیح بغداد' حلاج' مطالعہ طواسین' جوہر صقلی' قاطیغوریاس (Categories)' عدد (Number)' مسائل تجرید وغیرہ- جون کا جشن دبئی میں بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا- اس موقع پر ایک ضخیم مجلہ بھی شائع ہوا' جس میں سیکڑوں تنقیدی مضامین جون پر شائع ہوئے- حال ہی میں انجمن سادات امروہہ پاکستان نے ایک انوکھے انداز سے جون پر ایک ادبی عدالت قایم کر کے مقدمہ چلایا جس میں جون کی شاعری پر مختلف اعتراضات کے بارے میں پاکستان کے بڑے بڑے ناقدین اور مفکرین نے جون کا دفاع کیا اور جون کو اس عہد کا ایک بڑا شاعر قرار دیا- ممبران جیوری جو ڈاکٹر جمیل جالبی' پروفیسر ڈاکٹر سید ذکی حسن اور حق نواز اختر پر مشتمل تھی' نے جون پر عائد تمام الزامات کو غلط قرار دیا-

جون ایک بہترین ڈرامہ نگار اور نثر لکھنے والا ہے- اس کے انشائیے اردو زبان وبیان اور علم و فکر کے اعلیٰ نمونے ہیں- اگرچہ اس کا صرف ایک ہی شعری مجموعہ "شاید" ابھی تک شائع ہوا ہے مگر اس کی غزلیں اور نظمیں اتنی تعداد میں اس کے پاس محفوظ ہیں کہ کئی شعری مجموعے ایک وقت میں شائع ہو سکتے ہیں- جون بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے جب کہ اس کی نظمیں بھی تغزل کا انوکھا اور منفرد انداز رکھتی ہیں- بیسویں صدی بلکہ انشاءاللہ اکیسویں صدی کے عظیم اور معتبر شاعروں کا جب جب تذکرہ لکھا جائے گا جون ایلیا کے عہد ساز تذکرے سے صرف نظر ممکن نہیں ہوگا- اسے اپنے مولد امروہہ سے کتنا پیار ہے اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یہاں ایک غزل پیش خدمت ہے جس میں امروہہ کی "بان ندی" کا ذکر کس انداز سے کیا ہے- ملاحظہ فرمائیے -

عمر گزرے گی امتحان میں کیا — داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا
میری ہر بات بے اثر ہی رہی — نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا
اے مرے صبح و شام دل کی شفق — تو نہاتی ہے اب بھی "بان" میں کیا
یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو — کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
ہے نسیم بہار گرد آلود — خاک اڑتی ہے اس مکان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا — ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

ایک غزل اور ملاحظہ ہو ؎

ہم تو جیسے وہاں کے تھے ہی نہیں　　بے اماں تھے اماں کے تھے ہی نہیں
ہم کہ ہیں تیری داستاں یکسر　　ہم تری داستاں کے تھے ہی نہیں
اب ہمارا مکان کس کا ہے　　ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں
ہو تری خاکِ آستاں پہ سلام　　ہم ترے آستاں کے تھے ہی نہیں
اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا　　جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

-☆☆-

**جوھرؔ:** مولوی زاہد حسین نام اور جوھرؔ تخلص تھا- حضرت شمیم امروہوی کے شاگرد تھے- 'نسیم چمن' نومبر ۱۸۹۵ء کے شمارے میں آپ کی شائع ہونے والی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

موقوف اپنا وصل ہے روزِ وصال پر　　ہے زیست کا مدار مرے انتقال پر
کھایا ہے داغ چاند نے حسن و کمال پر　　حیرت ہے آئینہ کو تمہارے جمال پر

-☆☆-

**جرّیؔ:** سید عین الحسن نام اور جرّیؔ تخلص تھا- جناب محسن حسین نخی محلہ گذری کے فرزند اور ان ہی کے شاگرد تھے- آپ کے ایک فرزند ترغیب بلندؔ ڈنمارک میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کی شعر و ادب کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں- جرّیؔ کا شمار بہترین خوشنویسوں میں ہوتا تھا- اور فن خطاطی میں آپ کا خاندان آج بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے- شعر اچھا کہتے تھے- نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

یوں ترے کوچے سے اک بے سروساماں نکلا　　ساتھ جو نکلا وہ با دیدۂ گریاں نکلا
مضطرب نکلا، نہ حیراں نہ پریشاں نکلا　　حشر ہمراہ لیے خلد سے انساں نکلا
جائے انصاف ہے اے جانِ کرم، روحِ کرم　　کوئی حسرت مری نکلی کوئی ارماں نکلا؟
مجھ پہ جو گزری وہ گزری تجھے کیا اس کا ملال　　شکر کی جا ہے کہ قاتل ترا ارماں نکلا
اے جرّیؔ میں نے اسے قلب و جگر نذر دیے　　جس کماں سے مری تقدیر کا پیکاں نکلا

-☆☆-

**جاوید:** جاوید عالم نام اور جاوید تخلص ہے۔ والد کا نام عبدالاحد کوثر القادری' محلّہ شاہ علی سرائے امروہہ میں سنہ ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ معاشیات میں ایم اے کی ڈگری کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ڈیفینس ہاؤسنگ اتھارٹی میں بہت زمانے تک اکاؤنٹنٹ رہے اور آجکل ہومیو پیتھی کی پریکٹس کرتے ہیں۔

جاوید کے والد کوثر القادری امروہہ کے مقبول شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ شاعری کا مزاج ورثہ میں ملا۔ مگر ان کے والد ان کو شاعری سے دور رکھنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام "منتشر حروف" کے پیش لفظ میں اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: "میری شاعری روایتی شاعری ہے۔ یہ ایک عام آدمی کی زبان و خیالات پر مبنی ہے لہٰذا اس میں کسی حکمت کے راز کو تلاش کرنا یا کسی پیغام کی تلاش بے سود ہی ہوگی۔ میں نے کبھی کسی سے اصلاح وغیرہ نہیں لی۔ اس لیے مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے سب میرا ہے۔" نمونہ کلام کے طور پر متفرق اشعار:

نرم خو اسقدر نہیں ویسے ہنس کے ملنا ہماری عادت ہے

برہنہ کر دیا تہذیب کو سر بازار دکھا رہی ہیں تماشا ثقافتیں کیا کیا

نغمۂ زیست ہے مقصود کوئی بھی چھیڑے ایک مفہوم ہے گو طرز ادا اور سہی

رات کے بعد سحر لازم ہے ٹھہر یہ تیرگی ہے کچھ دم کی

جاوید نفرتوں کے اس اجڑے دیار میں جو اہل دل ہیں ان کو گلے سے لگایئے

**جمشید امروہوی:** سید جمشید کمال نقوی نام اور قلمی نام جمشید امروہوی ہے۔ آپ سید علی رہبر نقوی محلّہ بگلہ کے فرزند ہیں۔ آپ نے انگریزی میں ایم اے اور (تاریخ) (اردو)۔ بی ایڈ کیا۔ ہندوستان کے ادبی رسائل اور اخبارات میں آپ کا کلام اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر آل انڈیا ریڈیو سے تقاریر بھی نشر ہوتی ہیں۔ آجکل روہیلکھنڈ یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ شعر و سخن سے بڑا لگاؤ ہے اور بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔ آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

فقط زخموں سے سجوایا گیا ہوں میں خون دل سے نہلایا گیا ہوں

فقط سچ بولنے کے جرم پر ہی صلیبوں تک پہ لٹکایا گیا ہوں

بجھائی تھی جہاں کی آگ میں نے وہیں شعلوں میں ڈلوایا گیا ہوں

کسی کے دل کی تربت میں عزیزو بہت چپکے سے دفنایا گیا ہوں
جہاں ناقدریوں کا تھا نشانہ وہاں پر اب میں تجوایا گیا ہوں

-☆☆-

چناںؔ: شیخ محمود علی نام اور چناںؔ تخلص تھا۔ شمیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ 'نسیم چمن' دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے میں آپ کی شائع ہونے والی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

الاپی زہرہ وش نے آج کیا ب تال سب سر کی رکھب کو تر کیا مد ہم کو وہ گندھار کر بیٹھے
نہ چھیڑو تم ابھی کراوں گا میں بیپار بانسوں کا نہ عاشق رام گنگا جی میں بیڑا پار کر بیٹھے
سو اجب ہو گئی سردی تو ٹھنڈے ہو گئے چناںؔ جب آخر ہو گیا کاتک تو کتنے بار کر بیٹھے

-☆☆-

حاذقؔ: راحت علی خاں نام اور تخلص حاذقؔ تھا اور مولوی اولاد حسین سلیم کے اچھے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ حکیم نیاز علی کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۸۳ء کو امروہہ میں ولادت ہوئی۔ آپ خود بھی حاذق طبیب تھے۔ ان کے بھائی حکیم رفعت علی خاں تھے جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ادا وہ کس قیامت کی دم رفتار کر بیٹھے کہ سب عاشق تڑپ کر اپنے دل افگار کر بیٹھے
یہ لاشہ کوچۂ قاتل سے لے آنے کے قابل تھا الٰہی کیسی نادانی مرے غمخوار کر بیٹھے
ہزاروں قصر دل پھٹ پھٹ کے گر جائیں گے اے ظالم کسی دن ہم اگر نالہ پس دیوار کر بیٹھے
نظر آئے گی اب کیا وصل کی صورت ہمیں اے دل کسی کی یاد میں آنکھوں ہی کو بیکار کر بیٹھے

-☆☆-

حلیمؔ: عبد الحلیم شاہ عباسی نام اور حلیمؔ تخلص تھا اور تلمذ ذکی دہلوی سے حاصل تھا۔ سنہ ۱۲۷۸ھ کو آپ مولوی عبد الکریم کے یہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور آغاز جوانی میں جے پور چلے گئے جہاں محکمہ فوج میں حصہ دار رہے۔ کئی سال کے بعد ملازمت چھوڑ کر حضرت شاہ زماں خاں نقشبندی سے بیعت ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کو جے پور میں وفات ہوئی۔ تذکرہ شعراء جے پور میں آپ کا ذکر ملتا ہے۔ آپ صاحب دیوان

شاعر تھے - آپ کے کلام میں توحید و تصوف کا غلبہ تھا - نمونہ کلام کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

کیا پوچھنا ہے چشم حقیقت طراز کا ۔۔۔ جمتا نہیں نگاہ میں نقشہ مجاز کا

---

نہ جفاؤں کی شکایت نہ وفا سے مطلب ۔۔۔ اس کے طالب کو ہے تسلیم و رضا سے مطلب

**حیاتؔ:** سید حیات النبی رضوی نام اور تخلص حیاتؔ ہے - آپ سید خورشید حسن رضوی کے فرزند ۱۹۴۱ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے - کراچی میں آرکیٹیکچر میں تعلیم پائی - کراچی میں ایک اسکول بھی قایم کیا ہے - انجمن اصلاح و ترقی ساداتِ رضویہ کراچی کے جنرل سکریٹری ہیں اور سالانہ مجلہ "درِ مقصود" کے مدیر ہیں - آپ کی ادارت میں اس مجلہ کو خاصی ترقی ہوئی ہے اور جملہ اہل خاندان کے لیے مزید رابطہ کا باعث بن گیا ہے - "درِ مقصود" میں اہل امروہہ کے لیے عموی و خصوصی مضامین ہوتے ہیں جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں -

ویسے تو موصوف ایک آرکیٹیکٹ ہیں اور میرے ساتھ ہی آرکیٹیکچر میں تعلیم پائی لیکن انہیں علم و ادب سے بھی بڑی دلچسپی ہے - خطاطی، مصوری اور شاعری سے بھی بڑا لگاؤ ہے - شعر اچھا کہتے ہیں - کلام ملاحظہ ہو ؎

چارۂ درد رولا دوا اسکے سوا نہ ہو سکا ۔۔۔ جس دن جدا ہوئے تھے تم وہ دن جدا نہ ہو سکا

گذری ہے اضطراب میں اپنے ہی پیچ و تاب میں ۔۔۔ آئینۂ خیال بھی چہرہ نما نہ ہو سکا

کہنا تھا جو نہ کہہ سکا اتنا وفورِ شوق تھا ۔۔۔ حامل صوت ہو کے بھی اپنی صدا نہ ہو سکا

جادو بھری تھی ہر نظر مجھ پہ ہے آج تک اثر ۔۔۔ قرضِ نگاہِ مہوشاں مجھ سے ادا نہ ہو سکا

تیرا حیاتؔ نیم جاں یعنی قتیل دوستاں ۔۔۔ صاحبِ شعر ہو تو ہو مرد ذکاء نہ ہو سکا

آپ کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

دل ہے جو بہت سوچ کے ٹکتا ہے کسی جا ۔۔۔ یہ واعظِ ناداں کا مصلےٰ تو نہیں ہے

بچوں سے جو بنواتی ہے مٹی کے گھروندے ۔۔۔ کھوئی ہوئی جنت کی تمنا تو نہیں ہے

نئے ہیں لوگ نیا سلسلہ الم کا ہے ۔۔۔ جو تیر کر نہ سکے وار وہ قلم کا ہے

متاع علم و ہنر داستان پارینہ ۔۔۔ یہ مرثیہ ہے عرب کا کہ عجم کا ہے

-☆☆-

## حیاتؔ امروہوی

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے ـــ بج رہا ہے اور بے آواز ہے
کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے ـــ اک تری اور اک مری آواز ہے

سید محمد جعفر حیاتؔ بن سید محمد احسن شرف الدین شاہ ولایت کی اولاد میں سے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں حیاتؔ کی ولادت امروہہ میں ہوئی۔ تعلیم کا آغاز سید المدارس سے شروع ہوا جو اس دور کا واحد مدرسہ تھا جہاں علوم شرقیہ کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ آپ کے ہم سبقوں میں مولانا سید محمد عبادت کلیمؔ امام جمعہ و جماعت (اشرف المساجد) اور سید محمد مہدی رئیس امروہوی مرحوم قابل ذکر شخصیات تھیں۔ اسی دور میں حیات امروہوی شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اپنی ادارت میں ایک ماہنامہ "حیات" امروہہ سے نکالا جو زیادہ عرصہ نہ چلا۔ اس کے بعد ذریعہ معاش کی غرض سے میرٹھ تشریف لے گئے جہاں "دارالعلوم منصبیہ" میں ملازمت کے ساتھ ساتھ مزید تعلیم حاصل کی۔ کچھ دن بنگلہ اسکول میں بحیثیت مدرس بھی رہے۔ کمال امروہی اور دیگر احباب کے اصرار پر آپ ممبئی چلے گئے جہاں کئی فلموں کے لیے بہت خوبصورت گانے لکھے جو آج بھی بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ۲۰ راکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء کو حیات امروہوی نے حیات سے رشتہ توڑ دیا اور ملک عدم کوچ کیا۔ ایک غزل جو حیاتؔ امروہوی نے فلم "پکار" کے لیے لکھی تھی ملاحظہ ہو :

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے ـــ بج رہا ہے اور بے آواز ہے
کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے ـــ اک تری اور اک مری آواز ہے
لے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی ـــ زندگی آواز ہی آواز ہے
ہائے خالی ہو گیا جام شراب ـــ اور در توبہ ابھی تک باز ہے
ان کے دیوانے کے پیچھے ہے جہاں ـــ عشق میں بھی حُسن کا انداز ہے
اب کفن منہ سے نہ سرکا دو مرے ـــ اس میں پوشیدہ کسی کا راز ہے
وہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں حیاتؔ ـــ مجھ کو اپنی زندگی پر ناز ہے

-☆☆-

**حزیںؔ:** شعیب احمد آپ کا نام اور حزیںؔ تخلص تھا۔ آپ کا تعلق امروہہ کے عباسی خاندان سے تھا۔ آپ

کے والد ڈاکٹر محمد احسن عباسی امروہہ کے مشہور و معروف سرجن تھے۔سنہ ۱۹۴۷ء میں شعیب احمد کے برادر بزرگ مولانا مولوی حکیم فرید احمد عباسی کو بابائے طب کے خطاب سے نوازا گیا۔اس کے بعد پاکستان میں بھی آپ کو امام الاطباء کا خطاب ملا۔شعیب احمد مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔حیدر آباد اور امروہہ کے ادبی و شعری ماحول کا ان کی طبیعت پر اثر ہونا فطری امر تھا۔ چنانچہ آغاز جوانی میں شعر کہنے لگے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آگئے۔لاہور میں روزنامہ امروز کے اڈیٹر رہے۔اس کے بعد وہ کراچی آگئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے اور پھر یہیں سے ریٹائر ہوئے۔شعیب حزیں کی ایک غزل اور دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

یوں غرق تھا ان جلووں میں حزیں نظریں بھی اٹھانا بھول گیا
خود عین فسانہ بن تو گیا عنوانِ فسانہ بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھیں مانا وہ تبسم شعلہ تھا
دل برق کی زد پہ خود آیا یہ بات زمانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اسکی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوائیں کیا کرتیں دل ہوش میں آنا بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں، میں نظریں جھکانا بھول گیا

---

حزیں کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

احساس کے سارے کھیل ہیں یہ ہر حال میں غم غم ہوتا ہے
اک سانس میں کچھ بڑھ جاتا ہے اک سانس میں کچھ کم ہوتا ہے

-----

ہم تو حزیں یہ سمجھے ہیں دامن جو بھگودے پانی ہے
آنسو تو وہی ایک قطرہ ہے پلکوں پہ جو تڑپے بہہ نہ سکے

-☆☆-

**حیدرؔی:** شیخ حیدر بخش نام اور حیدریؔ تخلص تھا- آپ شیخ قادر بخش کے فرزند اور مولوی جواد حسین جمیم امروہوی کے شاگرد تھے- آپ کا کلام حاصل نہ ہوسکا البتہ ایک مثنوی کے چند اشعار جناب خاورؔ امروہوی نے عنایت کیے ہیں- آپ ایک انگریز جیمس الیگزینڈر کے نجی ملازم تھے جس کی فرمائش پر ایک مثنوی لکھی تھی جس کا سن تصنیف ۳/اپریل سنہ ۱۸۳۸ء ہے- مثنوی میں کابل کے شاہ محمود شاہ اور شاہ شجاع کے حالات نظم کیے ہیں- اس مثنوی کا نام "ولایت نامہ" ہے جو اشاعت سے محروم رہی لیکن اس کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں "شیرانی کلکشن نمبر ۸۴۷" میں موجود ہے- مثنوی کے اشعار ملاحظہ ہوں-

الٰہی دے وہ میرے منہ میں زباں — کہ کچھ وصف قدرت ہو تیرا بیاں
وہ گویا مرا طوطی خامہ ہو — کہ بلبل کے چاک عقل کا جامہ ہو
ہر اک تجھ میں قدرت ہے پروردگار — تو ہے ہر دو عالم کا آمرزگار
جو چاہے تو پربت کو رائی کرے — زمیں پر فلک جبہ سائی کرے

---

غرض ایک دن آپ دلشاد ہو — لگے مجھ سے فرمانے اے نیک خو
کہ شعراؤں میں تو بہت دور ہے — لقب حیدری تیرا مشہور ہے
لکھ احوالِ کابل کی اک مثنوی — تو اے حیدری ساکنِ امروہوی

-☆☆-

**حامدؔ امروہوی:** حامد حسین مرزا نام اور تخلص حامدؔ ہے- آپ ۲۰/ جنوری ۱۹۳۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد ماسٹر عبدالرؤف امام المدارس ہائی اسکول میں استاد اور ہندوستان کے ممتاز نعت گو شاعر تھے- حامدؔ نے ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج امروہہ میں حاصل کی- وہ راقم الحروف کے بھی اسکول ساتھیوں میں رہے ہیں- حامدؔ کو بھی نعت گوئی ورثہ میں ملی- آپ کے بھائی احمد حسین اور ساجد حسین بھی امروہہ کے ممتاز شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں- حامدؔ نے تلمذ حضرت کوثر القادری سے کیا- آجکل آپ کا قیام شکاگو امریکہ میں ہے جہاں آپ ادبی محفلوں کے روحِ رواں ہیں- آپ کے کتنے دیوان شائع ہوئے یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن ایک نعتوں کا مجموعہ "مدحت کے پھول" شائع ہوا ہے- آپ کے دیوان سے ماخوذ آپ کی ایک نعت ملاحظہ ہو-

زباں پر شکوۂ رنج و الم لایا نہیں کرتے — نبیؐ کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے
یہ وہ در ہے جہاں ملتا ہے بے مانگے ہوئے سب کچھ — ارے ناداں! یہاں دامن کو پھیلایا نہیں کرتے
یہ دربار رسالتؐ ہے، یہاں اپنوں کا کیا کہنا — یہاں سے ہاتھ خالی غیر بھی جایا نہیں کرتے
جو وابستہ ہیں انؐ کے دامن دولت سے اے حامدؔ — کسی کے سامنے وہ ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے

-☆☆-

**حبابؔ امروہوی:** مولوی محمد قدرت اللہ نام اور حبابؔ تخلص تھا۔ آپ کفایت اللہ محلہ گھیر مناف کے فرزند اور حضرت سیمابؔ کے شاگرد تھے۔ آپ کی ایک غزل جو گلدستہ "نسیم چمن" میں شائع ہوئی پیش ہے۔

ماتم میں میرے روتے ہیں کس کس خیال پر — وہ یاد کر کے قصۂ ماضی کو حال پر
کیا سر چڑھا کے اس کو بگاڑا ہے یار نے — بل کر رہی ہے زلفِ سیاہ بال بال پر
کس سرو قد کے آنے کا گلشن میں شور ہے — بلبل نہال بیٹھے ہیں شاخِ نہال پر
صیاد میں اسیر ہوں اک رشک ماہ کا — لٹکا نیو قفس مرا شاخِ نہال پر
سیراب ہو شراب تمنا سے جو حبابؔ — موقوف ہے یہ ساقیِ کوثر کے لال پر

آپ نے نخبۃ التواریخ مولف مولانا سید آل حسن کے لیے یہ قطعہ تاریخ لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

نقشہ کھنچا ہے نخبہ تاریخ کا عجب — خجلت ہے جس کے مضموں سے برہمہ جبین کو
مولانا سید آل حسن نے بکلک وضع — کندہ کیا کتاب نسب کے نگین کو
تھی فکر بہر گوہر تاریخ اے حبابؔ — اس بادشاہ جامع شرع متین کو
بیساختہ لکھا قلم نکتہ زانے یوں — آئینہ ہے نسب کا یہ ہم ناظرین کو

-☆☆-

**حسنؔ:** حسن امام نقوی نام اور تخلص حسنؔ ہے۔ حسنؔ کے والد سخی حسن، جو میرے بھی استاد تھے، امام المدارس انٹر کالج کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ آپ کے برادر بزرگ علی امام نقوی میرے ماتحت افسر تھے جو امروہہ کے شعراء کا کلام جمع کر کے شعراء پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حسنؔ امروہہ کے ایک خوبصورت نوجوان شاعر ہیں۔ مشاعروں میں اپنا کلام بڑے دلفریب انداز اور ترنم

سے سناتے ہیں- آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

نور جیسے تیرگی کے ساتھ ساتھ — غم ہے وابستہ خوشی کے ساتھ ساتھ
پاسبانِ گلستاں کو دیکھیے — رہزنی کی، رہبری کے ساتھ ساتھ
الجھنیں، ناکامیاں، بے چینیاں — مسلک ہیں زندگی کے ساتھ ساتھ
خود تلاشِ ذات میں ایسا لگا — ہمسفر ہوں اجنبی کے ساتھ ساتھ
کسقدر آپس میں نفرت ہو گئی — آدمی کو آدمی کے ساتھ ساتھ
اس میں خودداری ہے، گذرے جو حسن — زندگی شائستگی کے ساتھ ساتھ

-☆☆-

**خواہاں:** میر قاسم علی نام اور خواہاں تخلص تھا- آپ کے والد سید ولایت علی امروہہ سے ترک سکونت کر کے بریلی جا بسے تھے- ایک اچھے خوشنویس بھی تھے اور شاعر بھی- اپنے ماموں خلیفہ امیر الدین آزاد کے شاگرد تھے- سنہ ۱۹۳۸ء میں وفات پائی- موصوف کے دو قطعات حاصل ہو سکے ہیں جو پیش خدمت ہیں ؎

ہوتی انہیں منظور نظر کیوں نہ سکونت — کاخِ دلِ پُر شوق ہوا دار مکاں تھا
اس عشق مجازی سے ملا عشق حقیقی — جو بت تھا وہ منزل کا مری سنگ نشاں تھا
بے کیف بزم ہے چمن میں جو تو نہیں — آہیں کھنچی ہیں سرد، لب آبجو نہیں
ہر رو نکلتا ہوا تن خاکی میں شعلہ زن — مٹی کا تیل ہے یہ ہمارا لہو نہیں

-☆☆-

**خاور:** ڈاکٹر خورشید خاور کا تعلق امروہہ کے صدیقی خاندان سے ہے- ان کی ولادت ۱۶؍ دسمبر ۱۹۲۳ء کو امروہہ میں ہوئی- آپ کا تاریخی نام خورشید حیدر ہے- آپ کے والد بزرگوار کا نام مولوی فیاض علی صدیقی تھا- آپ کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی اسکے بعد ایم- اے (اردو) ایم- اے تاریخ اسلام اور پھر پی- ایچ- ڈی کیا اور عنقریب D.Lit. کی ڈگری ملنے والی ہے-

شعر و سخن کا شوق فطری ہے- حضرت احسان دانش اور افسر امروہوی سے تلمذ ہے- آپ کے برادر بزرگ لاغر امروہوی کا بھی امروہہ کے نامور شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے- خاور امروہوی کا دیوان "ہشت بہشت"

کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں 'مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ، تاثرات قلب، قومی نظموں کا مجموعہ وغیرہ' تصنیف کر چکے ہیں۔۱۹۶۵ء میں آپ کو ادبی و سماجی ادارہ کی طرف سے "ابو الفہیم" خطاب ملا۔۱۹۶۵ء میں رزمیہ منظومات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس پر صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے ۱۹۶۹ء میں صدارتی ایوارڈ دیا۔۷۷-۱۹۷۴ء میں سابق گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے اکیڈمک ایوارڈ دیا۔ محبان پاکستان اور سیز کی طرف سے گولڈ میڈل پیش کیا گیا۔ آجکل سر سید احمد خاں یونیورسٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی میں بحیثیت پروفیسر اسلامیات تعلیم دے رہے ہیں۔ آپ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

درد دل کی دوا وہاں بھی نہیں — چارہ گر کوئی اب یہاں بھی نہیں
دیکھ کر چپ ہوں خار زار حیات — زیر لب کوئی داستاں بھی نہیں
بجھ چکے سب محبتوں کے چراغ — ان کے بجھنے کا اب دھواں بھی نہیں
لکھی خاور نے خون دل سے غزل — دوستوں میں چنیں چناں بھی نہیں

-☆☆-

خمار : سرور عالم خمار فاروقی کا تعلق امروہہ کے فاروقی خاندان سے ہے۔ان کی ولادت دسمبر ۱۹۴۳ء کو امروہہ میں ہوئی۔ان کے والد کا نام رئیس عالم ہے۔۱۹۵۷ء میں خمار اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے۔یہاں پنجاب اور کراچی یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی اور اب حکومت پاکستان کے شماریات ڈویژن، وزارت مالیات میں گزیٹڈ افسر کی حیثیت سے ملازم ہیں۔

خمار کی شاعری کا آغاز حسب روایت غزل گوئی سے ہوا۔ان کی غزلوں کا مجموعہ "ناکشیدہ" منظر عام پر آچکا ہے خمار کے استاد تابش دہلوی ہیں اور ان کے مراثی پر اصلاح نسیم امروہوی نے کی ہے۔خمار نے خود اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہیں اصول مرثیہ نسیم امروہوی نے بتائے اور مرثیے پر اصلاح بھی کی۔ آپ کا کلام ملاحظہ ہو ؎

اجزاء حیات کون و مکاں کے ہزار ہیں — ان میں سے چند ہیں جو چمن کی بہار ہیں
آب و ہوا و آتش و گل آشکار ہیں — دنیائے رنگ و بو کا یہ دارومدار ہیں

ان سے کتاب زیست کا خاکہ لکھا گیا
انوار پنجتن کا ضمیمہ لکھا گیا

آپ کی ایک غزل بھی ملاحظہ ہو ؎

اب وہ دنیا ہے نہ دنیا کی رعنائی ہے پھر بتا ذمرے کس کام کی بینائی ہے
دل دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آتی اب تو عالم شوق میں تنہائی سی تنہائی ہے
بادبانوں کی طرح پھولے ہوئے سانس کے ساتھ زندگی درد کے ساحل پہ اتر آئی ہے
کس کے قدموں کے نشاں ڈھونڈتا ہے ریت پہ تو ساعتیں بیت گئیں جن کا تمنائی ہے
بستیاں ڈوب گئیں سیل بلا میں لیکن پھر بھی دنیا کی وہی انجمن آرائی ہے
کس کو میں اپنا کہوں کس کو پرایا سمجھوں شہر کا شہر تماشا اپنا تماشائی ہے

-☆☆-

**داد علی عباسی:** "مولوی سید داد علی بن ہدایت علی عباسی تقریباً سنہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے- ابتدا میں مولوی سید غلام نبی رامپوری سے علوم دینیہ کی اور حکیم محمد کفایت اللہ خاں امروہوی سے طب کی تعلیم حاصل کی- آپ کا تفصیل سے ذکر اولیائے کرام کے باب میں کیا گیا ہے- مولوی سید داد علی کی موزونی طبع بھی خداداد تھی- شعر بامزہ کہتے تھے- حضرت ظفر کی مشہور غزل کی جس کا مطلع ہے ؎

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

اس طرح تضمین کی ہے ؎

ہوا فرہاد کا جا کر سر کہسار پہ خوں قیس بیچارہ ہوا دشت کے اندر مدفوں
غل ہے زنجیر کا کیوں شور قیامت سے فزوں پائے کوباں کوئی زنداں میں بنا ہے مجنوں
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

لاکھ معشوق ملے مجھکو سراپا جادو ایسے ایسے کہ جنہیں یاد تھے صدہا جادو
نہ چلا پر نہ چلا مجھ پہ کسی کا جادو تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

پوچھتا ہوں دل بیتاب سے میں یہ ہر بار کہ نہ تو برق، نہ سیماب، نہ شعلہ، نہ شرار
پھر جو تو مضطرب اتنا ہے بتا تو اے یار لے گیا کون ترا چھین کے اب صبر و قرار
بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

-☆☆-

داؤد: مولوی محمد داؤد خلف مولوی علی محمد عباسی (وکیل) ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۸۶۴ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ سال کی عمر میں محمڈن کالج علیگڈھ میں داخل ہوئے اور ۲۴ برس کی عمر میں بی۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ شعر و سخن کا ذوق آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہوا۔ احباب کی تفریح طبع کے لیے اکثر نظمیں لکھیں۔ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تو طرحی غزلیں پڑھتے۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں آپ محمڈن کالج ہی میں معلم مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد پرنسپل کی سفارش سے نائب تحصیلدار ہوگئے۔ آپ تحصیل اترولی، آگرہ کا سگنج وغیرہ میں نائب تحصیلدار رہے۔ آخر میں فتح آباد ضلع آگرہ میں جاکر مستقل عہدہ پایا۔ سنہ ۱۹۰۰ء کو بمقام فتح آباد ضلع آگرہ میں وفات پائی اور وہیں احاطہ عید گاہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ناصح کی گفتگو سے مرا ناک میں دم ہے — آتے ہیں دیکھیئے شتر بے مہار سے
سن کر پیامبر سے مرا نام یوں کہا — وہ ہی نہ دبلے پتلے نحیف و نزار سے
معلوم ہے مجھے بڑے استاد ہیں جناب — یوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے
خود مجھکو تجربہ ہے بس اب کیا بیاں کروں — خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

جناب الطاف علی بریلوی اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے ایک کتاب "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" سنہ ۱۹۷۰ء میں کراچی سے شائع کی جس میں علی گڑھ تحریک سے متعلق مختلف اجلاس میں شریک ہونے والے ممتاز افراد کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے آٹھویں اجلاس منعقدہ علی گڑھ (۱۸۹۳ء) میں جن افراد نے شرکت کی ان میں مولوی رفعت علی، شبلی نعمانی، خوشی محمد ناظر اور داؤد بھائی امروہوی کا تذکرہ کیا ہے اور ایک عربی نظم صفحہ ۱۱۲ پر چھاپی ہے۔ جس کے بارے میں تحریر کیا ہے "مندرجہ ذیل عربی نظم مولوی داؤد بھائی (امروہوی) نے بوقت شب حاضرین کے روبرو پڑھی۔" پوری نظم ۶۴ شعروں پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے چند شعر پیش خدمت ہیں۔

یا اُمتہ المختار یا خیرَ الامم — یا زبدۃ العرب الکرام والعجم
یا صبغۃ اللہ القدیر المالک — یا فاتحی الملوک والممالک
قال کتاب اللہ یا اہل الصفاء — انّ لنا لاسوۃ فی المصطفی
وہو الامین الطاہر الجیوب — اطلعہ اللہ علی الغیوب
لم یال کل منہم فی جہدہ — بنفسہ و مالہ و جدہ

واعتمو والفرصۃ یااولی النھیٰ　　ولیس للانسان الا ما سعیٰ

داؤد کی طبیعت میں چونکہ شوخی کا مادہ زیادہ تھا اس لیے کہیں کہیں وہ طنز و مزاح کا رنگ بھی اختیار کرتے تھے۔ یہاں بطور نمونہ ایک نظم پیش ہے۔

ایک دن کچھ آدمی بیٹھے ہوئے　　کر رہے تھے گفتگو باہم گر
ان میں تھا اک شخص ایسا بھی کہ جو　　کر چکا تھا غیر ملکوں کا سفر
ہوتے ہیں چالاک ایسے لوگ سب　　وہ مگر اوروں سے تھا چالاک تر
جھوٹ کہتا تھا مگر سچ کی طرح　　اس کی باتیں تھیں نہایت پر اثر
ہو رہا تھا تذکرہ ہر قسم کا　　کر رہے تھے بحث ہر مضمون پر
باتوں باتوں میں کہا سیاح نے　　میں عرب میں بھی رہا ہوں سال بھر
سن کے یہ بات اور تو سب چپ رہے　　سب نے اس کا قول سچ سمجھا مگر
ایک کے دل میں یہ شک پیدا ہوا　　کیا تعجب جھوٹ کہتا ہو اگر
اس سے کچھ حالات واں کے پوچھیے　　سوچکر یہ اس نے قصہ مختصر
ان سے پوچھا آپ کا ہوتا تھا واں　　خدمتِ زمزم میں بھی گاہے گزر
سن کے اس کے منھ سے یہ سیاح نے　　سمجھا زمزم نام ہے کوئی بشر
بولے جی ہاں ان کی خدمت میں تو میں　　روز حاضر ہوتا تھا وقت سحر
آج دنیا میں نہیں ان کا جواب　　ہے تقدس ختم ان کی ذات پر
اب تو بوڑھے ہوتے جاتے ہیں بہت　　کیوں نہ ہوں ہیں بھی تو ستر سے ادھر
سن کے یہ سب نے لگایا قہقہہ　　اور کہا تمکو نہیں یہ بھی خبر
اک کنوئیں کا نام ہے زمزم وہاں　　آپ یہ سمجھے کہ ہے کوئی بشر
جب نہ بن آئی کوئی معقول بات　　تب کہا سیاح نے یوں جھینپ کر
اس زمانے میں تو تھے وہ آدمی　　ہوگئے ہوں گے کنواں اب کیا خبر

-☆☆-

داؤد: 　　شیخ داؤد علی نام اور تخلص بھی داؤد تھا۔ آپ شیخ بنیاد علی (محلہ دانشمندان کوٹ) کے فرزند اور حکیم

امروہوی کے شاگرد تھے- آپ امروہہ کی تحصیل میں پٹواری تھے- تین شعر "پیام عاشق" قنوج جولائی ۱۸۸۸ء سے انتخاب بطور نمونہ پیش ہے۔

ظلم سے دونی محبت ہوگئی　　یہ قیامت پر قیامت ہوگئی
صبح ہونے آئی دم بھر سو رہو　　ہو چکی تکرار حجت ہوگئی
مرتے ہو داؔد اس محبوب پر　　آپ کو بھی اتنی ہمت ہوگئی

-☆☆-

درخشاںؔ: رفیق احمد عباسی نام اور تخلص درخشاںؔ تھا- آپ عبدالحکیم عباسی محلہ ملانہ کے فرزند تھے- آپ ایک اچھے نعت گو شاعر تھے- ان کی ایک نعت آپ کے نواسے افسر صدیقی نے عنایت کی جو یہاں پیش خدمت ہے۔

کریں گے کرم شہریار مدینہ　　بناؤں میں سرمہ غبار مدینہ
کرم کے تصدق عنایت کے قرباں　　رہوں رات دن میں نثار مدینہ
خدائی کے مالک شفاعت کے دولہا　　وہی ہیں وہی تاجدار مدینہ
کبھی قبلہ رو، اور قبلہ ادھر کو　　ذرا دیکھو عز و وقار مدینہ
نکل جائے حسرت الٰہی کبھی تو　　درخشاںؔ بھی دیکھے بہار مدینہ

سنہ ۱۹۵۳ء کے شمارہ "دُرِ مقصود" امروہہ میں شائع ہونے والے دو شعر اور ملاحظہ ہو۔

ہے زندگی کی چاہ تو دلدارِ زندگی　　کرماںؔ سے لے تو درس، طلبگارِ زندگی
کر زندگی کے واسطے مٹنے کی جستجو　　جلتے ہیں زیرِ خاک ہی آثارِ زندگی

-☆☆-

دانش: سید عقیل احمد آپ کا نام اور دانش تخلص ہے- ۱۵ر جولائی ۱۹۴۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ سید جمیل احمد کے فرزند ہیں جن کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان سے ہے- سنہ ۱۹۵۲ء میں دانش پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی اور یہیں پر تعلیم حاصل کی- سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے بی اے اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا- آپ ایک ذہین طالب علم تھے لہذا دوران تعلیم کراچی

یونیورسٹی آپ کو وظیفہ دیتی رہی-ایم اے ایسے اعزاز کے ساتھ پاس کیا کہ آپ کو تمغۂ بابائے اردو سے نوازا گیا-

تعلیم سے فارغ ہوئے تو ایک سال تک نیشنل ڈگری کالج کراچی اور چار سال تک گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں طلبا کو فیض پہنچایا-اس کے بعد انگستان چلے گئے جہاں بی بی سی کی فارن سروس سے منسلک ہوگئے-اس کے ساتھ ساتھ بہت دنوں سے لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں طلبا کی دستگیری بھی کرتے ہیں-آپ ایک خوبصورت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب،ناقد،صحافی،کالم نگار،براڈکاسٹر اور اردو کے بہترین استاد بھی ہیں-تمغۂ بابائے اردو کے ساتھ حکومت پاکستان نے آپ کو تمغۂ اقبال سے بھی نوازا-

آج کل آپ لندن میں مقیم ہیں-کئی سال سے آپ روزنامہ "جنگ لندن" اور "نیشن" کے لیے ہفتہ وار کالم اور روزانہ ایک قطعہ لکھ رہے ہیں-پاکستان میں بھی ریڈیو پاکستان کے لیے ہفتہ وار فیچر لکھتے رہے-ان خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی خوبی آپ کی یہ ہے کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت قراءت سے کرتے ہیں یعنی آپ ایک خوش آواز قاری بھی ہیں-آپ کے چند اشعار جو آپ نے ہمیں لندن سے بھیجے ہیں پیش ہیں؎

بے فیض کیسا اپنا زمانہ ہے دوستو     اپنی صلیب اپنا ہی شانہ ہے دوستو

دل کتنا پریشاں ہے نظر کیوں نہیں آتے     اب شام ہوئی لوٹ کے گھر کیوں نہیں آتے

ہر لمحہ بکھر بکھر کے دانش     تنظیم حیات کر رہا ہوں

محفل کتنی دیر کی ہے اور کب تک دے گی ساتھ     اپنی یکی ساتھی تو بس تنہائی ہے

دیش سے ہم کو ملا جب بھی خط ان کا دانش     یاد پردیس میں آنے لگے گھر کے سایے

ہمیں یقیں ہے کہ ہم پر ستم تمام ہوئے     ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہوں گے

-☆☆-

دلؔ: حکیم پیر سید ضیاء الحسن رضوی خلف پیر بدرالدین رضوی تخلص دلؔ اور تلمیذ مولوی غلام نبی عباسی شاعؔر-آپ نے محکمہ سروے اور پولیس کی ملازمت ترک کرکے فن طب اختیار کیا اور ایک عرصہ تک شکارپور (سندھ) میں مطب کرتے رہے-۲۷ مئی ۱۹۱۸ء کو وفات پائی-آپ کی تصنیفات میں دو دیوان "لخت دل" اور آئینہ دین و دنیا" ایک مثنوی "کل جگ کی نشانی" ہیں-فن طب میں "آئینہ جراحت" "آئینہ کیمیا" اور "انتخاب لاجواب کیمیا" آپ کی یادگار ہیں-ان کی طبیعت میں ظرافت کا مادہ بھی تھا-امروہہ میں ایک منصف جو قوم کے بنیے تھے تبدیل ہو کر امروہہ آئے تو اس پر دلؔ نے کہا؎

میزانِ عدالت ہوئی بنیئے کے حوالے ہر شخص کو لازم ہے قدم تول کے ڈالے

آپ کے چند اور شعر پیش ہیں:-

دکھائی شان غیروں کو ہمیشہ مہرباں ہو کر کبھی اس دل میں آ جاؤ نصیبِ دشمناں ہو کر
فلک تو دور تھا کیسا یہ دشمن زیر پا نکلا ستاتی ہے زمیں بھی مجھکو ہر دم آسماں ہو کر
ابھی قاصد نہ پہنچا تھا کہ میرا حال کہنے کو لفافے کے دہن سے خط نکل آیا زباں ہو کر
یہی تعبیر ہے اے دلؔ رہائی سخت مشکل ہے نظر آئے وہ گیسو خواب میں جو بیڑیاں ہو کر

-☆☆-

دلیرؔ: ماسٹر افتخار الحق عثمانی نام اور تخلص دلیرؔ تھا۔ آپ ابرار الحق عثمانی ساکن محلّہ کالی پگڑی کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، امروہہ میں ٹیچر ہوئے۔ شعر و سخن کا ذوق طالب علمی سے ہوا۔ انہوں نے اپنے ماموں منشی وقار علی تاجؔ امروہوی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

بغیر سوز کے کچھ زندگی نہیں ہوتی بغیر ساز کے دل کو خوشی نہیں ہوتی
نثار کرتے ہوئے ہم کو شرم آتی ہے کہ چار روز کی بھی زندگی نہیں ہوتی
مرے نصیب سے میری طرف دلیرؔ کبھی نگاہ ناز محبت بھری نہیں ہوتی

-☆☆-

ذکیؔ: نام سید ذکی حسن اور تخلص ذکیؔ تھا۔ آپ حاجی سید اصغر حسین مولف "تاریخ اصغری" کے فرزند اور اقدسؔ کے برادر خورد تھے۔ چونکہ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا لہذا بچپن ہی میں شعر کہنے لگے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور چھوٹی ہی عمر میں وفات پائی۔ ایک سلام ملاحظہ ہو۔

سلام

مجرئی شبیر کا لخت جگر ملتا نہیں ڈھونڈتے ہیں ہر طرف نور نظر ملتا نہیں
شاہ فرماتے تھے کیوں دیتے ہو تم ایذا مجھے کچھ ستانے سے مرے اے اہل شر ملتا نہیں
رن میں اکبر کو ندا دیتے تھے شاہ کربلا تیر الا شہ مجھکو اے نور نظر ملتا نہیں

کہتی تھی رو کر سکینہ شہ سے ہوں میں تشنہ لب — دم مرا ہو گا فنا پانی اگر ملتا نہیں
اے ذکی گریاں ہو غم میں حضرت شبیر کے — بے غم سبط نبیؐ جنت میں گھر ملتا نہیں

**راہیؔ امروہوی:**...... تفصیلات حاصل نہیں ہو سکیں۔"بیسویں صدی" دہلی مارچ ۱۹۶۱ء سے چند اشعار ملے ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

تغافل سے ہم شادماں اور بھی ہیں — وہ اس بات سے بدگماں اور بھی ہیں
کھلے ہیں ابھی وہ تکلم کی حد تک — حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں
ابھی اور ر و ئینگے اہل زمانہ — سنانے کو ہم داستاں اور بھی ہیں
ہمیں صرف راہیؔ نہیں اس کے حامی — نگہبان اردو زباں اور بھی ہیں

-☆☆-

**راغبؔ:** سمن لعل آپ کا نام اور تخلص راغبؔ تھا۔ میرا خیال ہے کہ سمن لعل راغبؔ کے بارے میں امروہہ میں بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ وہ کتنے بڑے شاعر تھے کہ جن کی متفرق تصنیفات بزبان اردو بخط شکست مکتوبہ ۲۶ر مئی سنہ ۱۸۴۷ء برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ کی گئیں۔

آپ پندرہ سال کی عمر میں روزگار کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے تھے۔ معاشی حالت درست کرنے کے لیے مثنوی قصہ راجہ چترمکٹ اور رانی چندر کرن بزبان اردو تصنیف کی جسے سر ہنری ایلٹ کے نام منسوب کیا ہے۔ یہ منظوم رومانی قصہ (مثنوی) ۲۰۳۷ سطروں پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد مصنف اپنی تصنیف کے ان تمام حصوں کے مضامین بیان کرتا ہے جو اس نے سنہ ۱۸۴۶ء میں چھ ماہ محنت کر کے مکمل کیے۔ اس کتاب کو بھی سر ہنری ایلٹ کے نام سے ہی منسوب کیا۔ اس کتاب کا نام "علم منجلی" ہے جس میں پانچ باب ہیں۔ پہلے باب میں صحیفہ علم حساب ۲۵ فصلوں پر مشتمل ہے، دوسرے باب میں قانونی دستاویزات کے نمونے اور تعریفی جملوں کی فہرست کے ساتھ ایک مکتوب معلم دیا ہے جو بیشتر فارسی میں ہے۔ فارسی زبان میں فلسفیانہ مصطلحات کی تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں مردوں اور عورتوں کے مختلف اقسام اور ان کے جنسی تعلقات کوک شاستر سے لیکر منظوم بزبان ہندی تالیف کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو زبان میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ اس میں اصول راگ، رقص اور دیگر تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔

چوتھے باب میں ۱۱۶ لطیفے اور قصے ہیں اور پانچویں باب میں ایک چارٹ دیا ہے جس کے ذریعہ سنہ ۱ء سے سنہ ۳۰۰۷ء تک کسی بھی مہینے کا دن معلوم کیا جاسکتا ہے-آپ کا کلام تو نہیں مل سکا- حمد کے دو شعر جو عظیم امروہوی نے عنایت کیے ملاحظہ ہوں ؂

کرتا ہوں پہلے توحید حق کی بیاں　　　کہ ہو جامری جس سے رطب اللساں
سمن لعل معروف ہوں در جہاں　　　تخلص ہے راغبؔ مرا دوستاں

-☆☆-

راؔز ور رحماؔن:　　منشی عبدالرحمٰن خاں محمود خاں کے فرزند تھے-ابتدا میں تخلص راؔز پھر رحماؔن اختیار کیا- آپ کی سکونت محلہ بازار رزاق یا کالا کنواں پر تھی اور شبیر خاں شبیرؔ امروہوی کے بھائی کے شاگرد تھے- آپ کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

دل کی لگی کا میرے دلسوز ایک تو ہے　　　پہلو سے میرے ہرگز سوز جگر نہ جانا
ہم دل لگا کے تم سے طوفانِ غم میں ڈوبے　　　خشکی تری نہ سمجھے کچھ بحر و بر نہ جانا
گلیوں سے ان بتوں کی رحماؔن بچ کے چلنا　　　چاہے جدھر تو جانا لیکن ادھر نہ جانا

دو متفرق شعر ؂

بہت سی خوبیاں ہیں اے بتو تم میں خدائی کی　　　برائی صرف اتنی ہے کہ تم سب دل کے پتھر ہو
گھر سے باہر جا کے پایا کرتے ہیں عزت تمام　　　جب سے اشک آنکھوں سے نکلے صورت گوہر بنے

-☆☆-

راہؔی:　　رکھبیر سرنؔ دواکر نام اور راہؔی تخلص ہے-۷ ۲ر مارچ ۱۹۱۴ء کو محلہ کوٹ امرہہ کے جین گھرانے میں جنم لیا-گورنمنٹ کالج امروہہ سے میٹرک کیا--مراد آباد سے انٹر میڈیٹ اور میرٹھ میں بی-اے-ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی-انہوں نے ایم اے کی سطح تک ہندی میں تعلیم حاصل کی-پیشے کے اعتبار سے ایڈوکیٹ ہیں اور صحافت سے آپ کا گہرا تعلق رکھتے ہیں-تیرہ برس تک آپ رامپور سے ایک ہندی ہفت روزہ "پردیپ" نکالتے رہے-راہی رام پور جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رہے-راہی انتہائی سادہ طبیعت کے مالک ہیں-تمام مذاہب پر گہرا مطالعہ کیا ہے-پیدائشی طور پر جین مت سے تعلق ہے لیکن ذاتی طور پر انسانیت پر یقین

رکھتے ہیں اور مخلوق کی خدمت کو سچا مذہب مانتے ہوئے اس عبادت کے قائل ہیں۔

جاؤ زاہد! کسی مظلوم کے آنسو پونچھو     پھر کہیں جاکے یہ سمجھو گے، عبادت کیا ہے

سنہ ۱۹۸۳ء میں دواکر راہی انجمن ساداتِ امروہہ کراچی کے دعوت نامے پر پاکستان بھی تشریف لاچکے ہیں۔ راہی نے اپنی شاعری کے بارے میں بتایا کہ

''جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے اس کی عمر چوبیس برس ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں طالب علمی کے زمانے میں کچھ شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ لیکن جسے شاعری کہتے ہیں اس کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا اور ڈرامائی طور پر۔ میں اپنے شاعر دوست کے کلام پر تنقید کر رہا تھا کہ ان کا کلام اچھا ہے لیکن یہ بڑی کمی ہے کہ اس کلام میں کوئی پیغام نہیں ہے۔ ادب خواہ نثر میں ہو یا نظم میں 'اور وہ زندگی کی عکاسی نہیں کرتا' کوئی پیغام نہیں دیتا' اتحاد اور امن کے مقصد کو تقویت نہیں دیتا' معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کی ترغیب نہیں دیتا تو وہ ادب ناکارہ ہے۔ جب میں اپنے شاعر دوست سے یہ کہہ رہا تھا تو اس وقت میرے ساتھی ایڈوکیٹ نے مجھ پر طنز کیا کہ 'تم خود تو شعر کہہ نہیں سکتے اس لیے حسد کے مارے طنز کر رہے ہو' بس یہ الفاظ نشتر کا کام کر گئے۔ یہ واقعہ ۲۴ر جنوری ۱۹۶۵ء کا ہے۔ بس اسی تاریخ سے میں نے شعر کہنا شروع کیا۔ اسی دن میں نے یہ اشعار کہے۔''

عمل مفقود ہو اور کام چلتا ہو سہاروں سے     بشر پھر پوچھتا ہے حالِ مستقبل ستاروں سے

خزاؤں نے بلایا تھا' بہاریں ساتھ لایا ہوں     یہی سیکھا ہے میں نے لامکاں کے رازداروں سے

راہی کہتے ہیں کہ میری شاعری میں بھرپور تغزل ہے۔ میری شاعری کی بنیاد انسانیت ہے اور میں خدا سے بات کرتا ہوں۔ آپ کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں پہلا مجموعۂ کلام ''منزل کی طرف'' دوسرا ''چراغ منزل'' بہت مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ ''بڑھتے قدم'' ''نقوشِ راہ'' اور ''سنگریزے'' وغیرہ کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کبھی میں نے اسے دیکھا نہیں ہے     مگر وہ ہے مجھے اس کا یقیں ہے

نظامِ خالقِ عالم میں غیر ممکن ہے     کہ ہم حساب تو لے لیں مگر حساب نہ دیں

پتھروں سے سوال کرتے ہو     بت پرستو! کمال کرتے ہو

آپ نے ہندی میں بھی شاعری کی اور اس کا ایک دیوان 'بکھرے ہوئے پھول' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ میں اسیر ہوں تو لیلائے اردو کی زلفوں کا، اردو غزل پر میں فریفتہ ہوں اور دعوے سے

کہہ سکتا ہوں کہ اردو شاعری لاجواب ہے، بے مثال ہے۔ بھارت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں دو اکر راہیؔ نے فرمایا کہ 'اردو ایک زبان ہے اور زبان کوئی ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بھارت میں اس نے جنم لیا اور یہیں یہ پروان چڑھی اردو ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اس کا ایک کلچر ہے جس کا کسی مذہب سے واسطہ نہیں ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے یہاں سب ہی فرقوں کے لوگ کوشاں ہیں۔ ہر صوبے میں اردو اکیڈی ہے۔ انجمن ترقی اردو اور دیگر انجمنیں اس مشن کے لیے جدو جہد کر رہی ہیں۔

-☆☆-

رشیدؔ: سید حسین نام اور تخلص رشیدؔ تھا۔ حضرت سعید امروہوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی ایک غزل جو گلدستہ "نسیم چمن" میں شائع ہوئی پیش ہے ۔

مت کر غرور حسن سریع الزوال پر | پیارے زوال آتا ہے اک دن زوال پر
اس شعلہ خو کے کوچہ میں آنے لگا رقیب | کیوں کر ہماری طبع نہو اشتعال پر
کافی ہے خوش خرامی مہرو کے وصف میں | کبک دری بھی مست ہو اس بت کی چال پر
اس شمع رو کی سنگدلی کیا لکھوں رشیدؔ | آیا کبھی نہ رحم ذرا میرے حال پر

-☆☆-

رضاؔ: سید رضا حسن بن سید واد علی بن سید اصغر علی ویکسینیٹر تھے۔ آپ کی سکونت محلہ قاضی زادہ میں تھی۔ عربی فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ آپ خوش گو شاعر کے ساتھ خوشنویس بھی تھے۔ ابتدا میں حضرت صفیؔ سے استفادہ کیا پھر فرقتیؔ امروہوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ آپ کی کوئی غزل تو نہیں مل سکی البتہ دو شعر ملے ہیں 'ملاحظہ ہوں ۔

منزل عشق میں کام آتی ہے بس تنہائی | یار ہمراہ نہ ساتھی رفقا ہوتے ہیں
دل مشاق کے جوہر کوئی دیکھے تو سہی | برق سوزش میں 'برسنے میں گھٹا ہوتے ہیں

-☆☆-

ریاضؔ: منشی مہدی علی آپ کا نام اور تخلص ریاضؔ و مہدیؔ تھا۔ شیخ (خلیفہ) مراد علی مراد کے فرزند تھے۔ آپ کی رہائش محلہ چوک امروہہ میں تھی۔ ابتدا میں شمیم امروہوی کے شاگرد ہوئے پھر حضر منیرؔ شکوہ پوری سے

اصلاح لیتے رہے- آپ نے دو دیوان مرتب کیے تھے -ایک دیوان عاشقانہ کلام پر مشتمل اور دوسرا ''بوستان خیالت''ہزلیات کا مجموعہ تھا-نہ معلوم یہ دونوں دیوان چھپے یا نہیں-آپ کی ایک غزل کے چند اشعار جو گلدستہ ''نسیم چمن'' میں شائع ہوئی پیش ہے-

تمھیں باغ جناں تک کون آنے دے گا اے واعظ — کنارہ جا لیا رندوں نے جس دم حوض کوثر کا
شب غم میں اکیلی جان پر کیا کیا مصیبت ہے — جگر میں درد' دل بے چین' رونا دیدۂ تر کا ہے
جہاں میں پھر کے جل تھل ہم کو رو کا ابرِ باراں نے — ریاض آنکھوں سے اپنا قصد تھا پیر ان کلیر کا

----

کسی سے دل کو لگایا تھا دل لگی کے لیے — ترس گیا غم فرقت میں جی خوشی کے لیے
کرو خدائی کا دعویٰ یہ میں نہیں کہتا — غرور تھوڑا سا لازم ہے دلبری کے لیے
بہار آئی ہے زاہد چلو شراب پئیں — کہ شغل چاہیئے کچھ لطفِ زندگی کے لیے
ریاض مرتے ہو کیوں ان بتوں کی صورت پر — خدا کو بھولے ہو دو دن کی زندگی کے لیے

-☆☆-

رؤف: ماسٹر مرزا عبدالرؤف بیگ بن مرزا شفیع اللہ بیگ محلّہ (صدو) ۲۰ر صفر ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے- آپ نے ۱۹۱۵ء میں میٹرک کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایف اے کیا- سنہ ۱۹۲۰ء میں امام المدارس کالج میں مدرس ہوئے-شاعری میں باقاعدہ کسی سے تلمذ نہیں البتہ ۱۹۱۵ء میں نگینہ، ضلع بجنور کے ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے گئے تو حضرت جگر مراد آبادی کے اصرار پر غزل کہی جس پر جگر صاحب نے اصلاح دی-رؤف راقم الحروف اور میرے بڑے بھائی محمد حسین صدیقی کے بھی بزرگ و محترم استاد تھے-تقریباً ۷۰ برس سے ان کے دولت خانہ پر ہر جمعہ کو نماز کے بعد نعتیہ مشاعرہ کی محفل منعقد ہوتی ہے-آپ انتہائی نیک، سچے عاشق رسولؐ اور بڑے متقی پرہیز گار تھے-حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو مدینہ اس طرح بلایا گیا کہ دنیا حیرت زدہ ہو گئی-آپ کی مدینہ طلبی کا حال کچھ اس طرح ہے-

سنہ ۱۹۷۷ء میں قمرالاسلام صاحب نے، جو بسلسلۂ ملازمت مدینہ میں مقیم تھے، اپنے برادر کلاں جناب شجرالاسلام صاحب امروہوی کو مدینہ سے ایک خط لکھا-وہ لکھتے ہیں-

''جناب بھائی صاحب مدظلہ- میں ایک روز نمازِ عصر پڑھ کر مسجد نبوی میں کچھ مراقبہ میں تھا کہ یکایک

ایک آواز کانوں میں آئی کہ 'عبدالرؤف کو اپنے صرفہ سے مدینہ بلاؤ' میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون شخص ہیں۔فوراً ہی پھر آواز آئی کہ 'سیفی کے والد'۔ آپ ان حضرت کو یہ مژدہ سنا دیجئے کہ اللہ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ بلایا ہے۔ میں ان کے مصارف کے لیے ایک ڈرافٹ بھی ارسال کر رہا ہوں۔ان کی آمد و رفت کے تمام اخراجات میرے ذمہ ہیں۔"

شجر الاسلام صاحب نے جب یہ خط رؤف صاحبؒ کو دیا تو وہ حیران ہو گئے۔ یہاں ایک اور حیرن کن بات یہ ہے کہ قمر الاسلام صاحب ماسٹر صاحب سے واقف بھی نہیں تھے۔اس موقع پر ماسٹر صاحب نے اپنی نعت کے چار شعر، جو انہوں نے ایک سالانہ نعتیہ مشاعرہ میں پڑھے تھے، سنائے۔ملاحظہ ہوں ۔

آپ کی بندہ نوازی سے تو کچھ دور نہیں ہاں بلانا ہی مرا آپ کو منظور نہیں
کونسی ایسی خطا ہے مری فرمایئے تو بندۂ عشق ہوں سرکش نہیں مغرور نہیں
آپؐ ہیں مالکِ کونین شفیعِ محشر اور میں جس کو کسی طرح کا مقدور نہیں
آپؐ سا تو کوئی خالق نے کیا ہی نہیں خلق آپ تو احمدِ مختارؐ ہیں مجبور نہیں

اب محفل نعت کا اہتمام ان کے نیک فرزند جناب احمد حسین صاحب کراتے ہیں۔

-☆☆-

**رفیق**: حکیم محمد شفیع خان نام اور تخلص رفیق تھا۔ باوجود کوشش کے آپ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آپ کی ایک غزل گلدستہ "گلشن سخن" امروہہ سنہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔اس غزل سے منتخب ذیل میں تین شعر پیش خدمت ہیں ۔

زمانہ بھر میں دو پردہ نشیں ہم نے جو دیکھے ہیں
بس اک وہ شوخ ہے اور ایک میرے دل کی حسرت ہے
کہا میں نے کہ کب تک کھائیں گے غم تیری فرقت میں
کہا اس سے زیادہ اور کیا دنیا کی نعمت ہے
رفیق خستہ خاطر دل لگانا سخت مشکل ہے
نہیں ہے بہتری اس میں کوئی ذلت ہی ذلت ہے

## رئیس امروہوی

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں　　وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں
ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو　　لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

سید محمد مہدی نام رئیس تخلص تھا- والد بزرگوار شفیق حسن خود بھی شاعر تھے جن کا تخلص ایلیا تھا- آپ حضرت شرف الدین شاہ ولایت کی اولاد سے ہیں- ۲۱/ شوال سنہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۲/ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو آپ کی ولادت امروہہ میں ہوئی- آپ کی تعلیم و تربیت خاندان میں ہوئی- ۱۹۴۷ء میں امروہہ سے ہجرت کی اور کراچی کو اپنا وطن ثانی بنایا- رئیس امروہوی ایک بلند پایہ صحافی اور شاعر تھے- پاکستان کی صحافت پر آپ آخری سانس تک چھائے رہے- شاعری میں ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے- ۴۷ء سے اپنی زندگی کے آخری دن تک پاکستان کے کثیر الاشاعت 'روزنامہ جنگ' کے لیے روز ایک نیا قطعہ لکھتے رہے- ۲۲/ ستمبر سنہ ۱۹۸۸ء کو یہ دانشور صحافی، یہ نامور شاعر اور علم و ادب کا روشن چراغ گل ہو گیا- رئیس امروہوی کو اس دار فانی سے کوچ کیے برس گزر گئے لیکن آج بھی جب ہم 'روزنامہ جنگ' اٹھاتے ہیں تو قطعہ کی صورت میں آپ کا پیغام ملتا ہے۔

صبح دم کتنی کلیاں شگفتہ ہوئیں　　شام تک پھول سارے بکھر جائیں گے
موت کوئی نیا حادثہ تو نہیں　　تم بھی مر جاؤ گے ہم بھی مر جائیں گے

قطعات کے علاوہ منقبت، قصیدہ، سلام، نوحے، غزل اور نعت گوئی میں بھی رئیس امروہوی کا اعلیٰ مقام تھا- آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں　　وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں
سنا ہر بار میرا کلمۂ صدق　　مگر ہر بار جھٹلایا گیا ہوں
کبھی ماضی کا جیسے تذکرہ ہو　　زباں پر اس طرح لایا گیا ہوں
ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو　　لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں
دوامی عظمتوں کے مقبرے میں　　ہزاروں بار دفنایا گیا ہوں
ترس کیسا کہ اس دار البلا میں　　ازل کے دن سے ترسایا گیا ہوں
نہ جانے کونسے سانچے میں ڈھالیں　　ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

میں اس حیرت سرائے آب و گل میں بحکم خاص بھجوایا گیا ہوں

-☆☆-

رضی: ڈاکٹر سید زیرک حسین آپ کا نام اور تخلص رضی تھا- آپ سید مومن حسین صفی کے فرزند تھے- ۹ر ربیع الاول سنہ ۱۲۸۸ھ کو امروہہ میں پیدا ہوئے- اردو' فارسی اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آگرہ میڈیکل اسکول سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی- شفاخانہ بھٹنڈہ میں ڈاکٹر تھے- سنہ ۱۳۱۵ھ ریاست پٹیالہ کی فوج کے ساتھ جنگ افغانستان میں تعناتی ہوئی- اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دینے کے صلے میں آپ کو تمغہ' تلوار اور بندوق سے نوازا گیا- فن شاعری میں اپنے والد محترم کی شاگردی اختیار کی- آپ کی غزل کے چند شعر پیش ہیں:-

میں رات ہالہ دار تھا خود اپنے چاند کے وہ چاندنی پہ بزم میں جلوہ فروش تھا

زندہ رہا تو خاک نشین تھا میں خاکسار موت آگئی تو زیر زمیں خاک پوش تھا

ہے عندلیب سدرۂ اوج سخن رضی جو شعر پڑھ دیا وہ نوائے سروش تھا

-☆☆-

رفعت: محمد رفیع انصاری نام اور تخلص آپ کا رفعت ہے- آپ کے والد بزرگوار کا مریڈ محمد شفیع انصاری مشہور سیاسی و سماجی کارکن تھے- رفعت ۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۳۴ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- امروہہ میں انٹر کامرس تک تعلیم حاصل کی- تعلیم سے فارغ ہو کر میونسپل بورڈ امروہہ میں بحیثیت ٹیکس انسپکٹر اپنی ملازمت کا آغاز کیا- شعر و سخن کا ذوق آپ کو اپنے والد محترم سے ورثہ میں ملا- آپ ابھی طالب علم ہی تھے کہ شعر کہنے لگے- آپ ایک خوبصورت شاعر اور ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں- آپ کا کلام و نثر مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں- بزم ادب امروہہ کے زیر اہتمام مقامی ہمعصر شعراء کے ساتھ آپ کا ایک خوبصورت مثنوی گلدستہ "ابھرتی موجیں" شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے اور تازہ مثنوی کا مجموعہ زیر ترتیب ہے-

رفعت نظم' قطعات' رباعیات اور منقبت و نعت میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے- اس کے علاوہ آپ اسلامی مضامین اور سیاسی تبصرے بھی خوب لکھتے ہیں- آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ گہرائی' تاثر' حقیقت بیانی اور زندگی کے اہم مسائل و واقعات کی عکاسی ہوتی ہے- آپ کی ایک

غزل بطور نمونہ پیش ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قتل و فساد فطرت انساں ہے آجکل | گم ہیں حواس عقل پریشاں ہے آجکل
جھگڑے ہیں رنگ و نسل کے مذہب کا ہے جنوں | شیطاں سے بھی سوا کہیں انساں ہے آجکل
عقل و شعور بخش گئے جسکو وہ بشر | انسانیت سے کتنا گریزاں ہے آجکل
ہر شے گراں ہے جو ہے ضرورت کی ان دنوں | انسان کا لہو ہے کہ ارزاں ہے آجکل
دنیا کو امن و صلح کا جو دے رہے ہیں درس | رنگیں لہو سے ان کا ہی داماں ہے آجکل
اب تو خود اپنے سایے سے لگنے لگا ہے ڈر | جس سمت دیکھو موت ہی رقصاں ہے آجکل
ہے زندگی کا کرب ہر اک لفظ سے عیاں | شاعر بھی اس ادا سے غزلخواں ہے آجکل
وحشت، جنوں، درندگی، نفرت، عناد و بغض | بربادیوں کا اپنی یہ ساماں ہے آجکل
رفعتؔ نہ صرف تم کو پڑوسی کا ہے خطر | ہمسایہ خود بھی تم سے ہراساں ہے آجکل

-☆☆-

**رشکؔ خلیلی:** رئیس الرحمان نام اور رشکؔ تخلص ہے۔ آپ خلیل الرحمان کے فرزند ہیں۔ کم عمری میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ کی پرورش آپ کے تایا مصطفی علی نے کی۔ تقسیم ہند کے وقت دہلی سے لاہور آگئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں "میرے دل میں شاعر کہلانے کی تمنا پیدا ہوئی تو شعر گوئی سے پہلے ہی تخلص منتخب کر لیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں اور میرا تایازاد بھائی انتظار علی اکٹھے بیٹھے تھے کہ اچانک شاعر بننے کا شوق ہوا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں شاعر تھے" بہر حال ان کی یہ تمنا بر آئی اور آج وہ ایک خوبصورت شاعر ہیں اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ آپ کے دیوان "حوالہ" کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

کیا خبر کب تک چمن میں تازگی باقی رہے | دیکھنے والا تو کوئی آدمی باقی رہے
موت کی زد پر ہی چاہے زندگی باقی رہے | اک یہی تو روشنی ہے روشنی باقی رہے
نت نئے چرکے لگاتا ہے زمانہ اس لیے | زخم بھی تازہ رہیں اور درد بھی باقی رہے
چل دیے خوابوں کے رسیا محفل شب چھوڑ کر | جو سحر کے منتظر تھے بس وہی باقی رہے
دوسروں کے درد کو محسوس کرنا چاہیے | رشکؔ جب تک بھی یہ دل کی بیکلی باقی رہے

-☆☆-

زآر: سید فصاحت حسین نام اور تخلص زآر تھا۔ آپ سید ثروت حسین عابدی (محلہ نوگیاں) کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۹۷ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ مسلم اسکول کاندھلہ' مظفر گڑھ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد امروہہ آئے اور یونائیٹڈ کرکٹ کلب کی بنیاد ڈالی۔ شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ فن شاعری میں کس کے شاگرد ہوئے تحقیق نہ ہو سکا۔ آپ کے چند شعر پیش ہیں ؎

ہم قفس شاید گلستاں میں پھر آئی ہے بہار — خود بخود اک جذبہ' پروازِ بال و پر میں ہے

ناز پروردہ ہوں آفات تلاطم ساز کا — آشیاں اپنا فضائے دامن صرصر میں ہے

غنچہ لب تیرے تبسم کی نشاط افزائیاں — روح پرور اک تموج چشمۂ کوثر میں ہے

کہہ رہی ہے زآر یہ خاموشیٔ شمع سحر — سوز محفل دفن پروانوں کی خاکستر میں ہے

-☆☆-

زبیر رضوی: زبیر احمد رضوی مولوی سید محمد رضوی کے فرزند اور مولانا احمد حسنؒ محدث کے پوتے ہیں۔ شعر و سخن کا شوق کم عمری سے ہوا۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی اور پھر دہلی منتقل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں اردو میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے۔ کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے ہیں۔ جدید شعراء کی صف میں معروف و ممتاز ہیں۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں آپ کے کلام کا مجموعہ "لہر لہر ندیا گہری" شائع ہوا جس کی نظمیں اور گیت بہت مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو "آجکل" دہلی دسمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئے تھے ؎

دل کہ ہے کشتۂ بے رنگئی حالات بہت — یاد آئے ہے حسینوں کی مدارات بہت

شیشۂ دل میں نہ اترا کوئی عکس تحریر — شہر خوباں سے صبا لائی پیامات بہت

جور بے مہریٔ احباب بھی دولت ہے زبیر — چھیڑ مت تذکرۂ لطف و عنایات بہت

-☆☆-

زاہد: سید زاہد حسین تلمیذ میر انجم امروہوی اور زاہد تخلص تھا۔ زاہد کا حال معلوم نہ ہو سکا البتہ ان کی ایک غزل "نسیم چمن" امروہہ جو جنوری سنہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا' سے ملی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

وہ کونسا مرض ہے کہ جس کو شفا نہیں — لیکن ہمارے درد کی ممکن دوا نہیں

کس کو سنائیں حال کوئی آشنا نہیں　　ہمراز ایک دل تھا سو وہ بھی رہا نہیں
اس گل کی جستجو میں پڑھے سیکڑوں عمل　　لیکن ہزار حیف وہ اپنا ہوا نہیں
غیرت یہ کہہ رہی ہے کہ تو ان سے اب نہ مل　　اور دل یہ کہہ رہا ہے کہ میں مانتا نہیں
زاہد کسی حسین سے اب کیا لگائیں دل　　وہ ہم نہیں رہے وہ زمانہ رہا نہیں

-☆☆-

زیبا: شجاع احمد آپ کا نام اور زیبا تخلص ہے۔ آپ ضیاء احمد خاں محلہ کنکوئی کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں آپ نے گورنمنٹ کالج امروہہ سے میٹرک پاس کیا اور اسی سال علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹر آرٹس میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد آپ نے اردو ادب میں ایم اے اور پھر ایل ایل بی کیا۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں زیبا صاحب پاکستان آگئے اور "ڈان اردو" میں بحیثیت نائب مدیر ملازمت کا آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں زیبا صاحب انجمن ترقی اردو سے منسلک ہوئے اور اردو کالج میں لیکچرار ہوئے۔ اس کے بعد آپ اسلامیہ کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اسی دوران آپ کو نیپا کی ٹریننگ کے لیے لاہور بھیجدیا گیا۔ ٹریننگ کے مکمل ہونے پر آپ کو نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم میں پرنسپل مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۸۶ میں سراج الدولہ کالج کراچی کے پرنسپل ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

سنہ ۱۹۸۹ء میں آپ نے وفات پائی۔ آپ نے دو کتابیں "ڈپٹی نظیر احمد اور علی گڑھ تحریک" اور "اردو ادب میں خاکہ نویسی" تصنیف کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ شعر و سخن سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ ان کا کلام تادم تحریر حاصل نہ ہو سکا۔ ایک قطعہ تاریخ جو آپ نے ماسٹر عبدالرؤف مرحوم کی وفات پر لکھا تھا بطور نمونہ پیش ہے ؎

از دردِ داو بہشت آباد شد　　دہر چوں در ہجر او ناشاد شد
سال رحلت گفتم۔ از قید جہاں　　ماسٹر عبدالروف آزاد شد　　۱۴۰۷ھ

-☆☆-

ساجد: مرزا ساجد حسین ماسٹر عبدالرؤف صاحب کے نیک فرزند ہیں۔ محلہ سدو میں آپ کی سکونت ہے۔ شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ساجد تخلص ہے۔ آپ کے کلام کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

سر فروشی کی ادا بھول گئے دیوانے　　　عام یوں ہی تو مذاقِ رسن و دار نہیں
عشق کرنا ہی نہ تھا اے دلِ آرام طلب　　　یہ وہ بستی ہے جہاں سایۂ دیوار نہیں
گو تباہی ہے مری مرحلۂ آخر میں　　　دل مگر شکوہ گذارِ نگۂ یار نہیں
لیے پھرتا ہوں چراغاں سر مژگاں ساجدؔ　　　یہ وہ موتی ہیں کوئی جن کا خریدار نہیں

----

بن کے حدِ امتیاز بے ہنری رہ گئی　　　روٹھ گئی آگہی بے خبری رہ گئی
گلشنِ احساس پر برق گری بار بار　　　شاخِ تمنا مگر پھر بھی ہری رہ گئی
بے عملی سے ملی مملکتِ بے حسی　　　سلطنتِ دل چھنی دربدری رہ گئی
زیست کے ملبوس میں ٹانک لیے مہر و ماہ　　　دامنِ احساس کی بخیہ گری رہ گئی

-☆☆-

**ساحلؔ:** سید منور رضا نام اور ساحلؔ تخلص تھا۔ مرحوم سید حامد حسین کے فرزند تھے۔ امام باڑہ نخشی امروہہ میں مدفون ہوئے۔ صاحبِ دیوان بتایا جاتا ہے۔ دیوان کسی پبلشر نے دہلی میں چھپوا کر جلد بندی کے لیے دیا ہوا تھا کہ اچانک فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گیا۔ ساحلؔ کا انتقال ۱۹۴۶ء میں بعمر ۳۰ سال امروہہ میں ہوا۔ غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ڈھونڈتی پھرتی ہے کیوں برقِ تپاں میرا　　　مرا سوزِ نہاں خود پھونک دے گا آشیاں میرا
پسِ مردن خیالِ یادِ عصیاں سے لرزتا ہوں　　　اٹھے گا کس طرح احباب سے بارِ گراں میرا

-☆☆-

**ساحرؔ عباسی:** ساحرؔ عباسی کا نام معشوق علی تھا۔ مگر ان کا تخلص ہی ان کا نام بن گیا۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو امروہہ محلہ ملانہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام صابر علی عباسی تھا جن کا امروہے کے معززین میں شمار ہوتا تھا۔ الف' ب' کی تعلیم امام المدارس امروہہ کی نرسری بنگلہ اسکول میں حاصل کی سینٹ اسٹیفن اسکول دہلی سے میٹرک پاس کیا جبکہ باقی تعلیم اینگلو عربک کالج دہلی میں ہوئی۔

ساحر عباسی کی ذہنی نشو و نما میں حضرت رئیس امروہوی کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے مقبول

عوامی شاعر تھے-ان کی قومی نظموں پر مشتمل ایک کتابچہ قاضی عزیز احمد عباسی مرحوم نے پاکستان کلب امروہہ سے پہلی بار شائع کیا-ساحر نے اپنی قومی نظمیں ان جلسوں میں پڑھیں جن کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی-ان کی ایک نظم جس کا ایک مصرعہ یہ تھا...... باطل کے پرستاروں سے کہو وابستۂ پاکستان ہیں ہم...... قائد نے بہت پسند کی اور very good اور well recited کہہ کر انہیں داد دی-

ساحر کم عمری ہی میں صحافت سے وابستہ ہو گئے تھے-روزنامہ "انصاری" دہلی کے مدیر رہے- پاکستان آکر "انجام" کراچی سے وابستہ ہوئے-اپنا ذاتی ماہنامہ "ساون" اور ہفتہ وار انگریزی اخبار "Pioneer" نکالا-اربن اینڈ ایگریکلچر بینک کے ڈائریکٹر اور پاک عربین کوآپریٹیو بینک کے منیجنگ ڈائریکٹر رہے-

ساحر ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے-مترنم بحریں' مہک الفاظ' نغمگی اور غنائیت ان کے کلام کی دل کشی اور دل آویزی کا خاصہ تھی-پاکستان آکر شاعری تقریباً ترک کر دی تھی-مگر زندگی کے آخری ایام میں بہت سی غزلیں کہیں-ان کا کلام "ابر صحرا" سنہ ۱۹۷۸ء میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا- آپ کا کلام ملاحظہ ہو-

ابھی جان و دل کے قریب تھے' ابھی جان و دل سے گزر گئے
نگہ طلب پہ نہ کھل سکا وہ کدھر سے آئے کدھر گئے

نہ جنونِ شوق بہل سکا جو شریک اہل جنوں ہوئے
نہ ملا فروغ نظر کبھی جو قریب اہل نظر گئے

ہو ترا ارادۂ زندگی ازل و ابد سے بلند تر
یہ حیات کوئی حیات ہے ابھی جی اٹھے ابھی مر گئے

تری آرزو کی یہ برکتیں تری انجمن کی یہ رونقیں
جو اٹھے وہ آہ بلب اٹھے جو گئے بہ دیدۂ تر گئے

وہ کمال عالم بے خودی' وہ جنوں کی جذبہ طرازیاں
وہ نگاہ کیسی نگاہ تھی جو بگڑ گئے تھے سنور گئے

وہ تجلیٔ رخ جانفزا' وہ شباب دل کش و دل ربا
جو ذرا عتاب میں آگئے بخدا وہ اور نکھر گئے

یہ نسیم صبح کی شوخیاں کہ بہار کی ہیں شرارتیں

جو چنے تھے تم نے مرے لیے وہ تمام پھول بکھر گئے

آپ کی غزل چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

ہم نے سینچا تھا جنہیں اے دوست ارمانوں کے ساتھ ۔ بجلیاں اب کھیلتی ہیں ان گلستانوں کے ساتھ
روت بے جذبہ 'نظر بے نور' سینے بے چراغ ۔ دیکھیئے شہروں کی ویرانی بھی ویرانوں کے ساتھ
مختصر یہ ہے فسانہ بزم سوز و ساز کا! ۔ شمع محفل بھی رہی ہے اپنے پروانوں کے ساتھ
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ساحر آج خود اپنا پتہ! ۔ سمتِ منزل کیوں چلے تھے آپ انجانوں کے ساتھ!

-☆☆-

ساز: پیرزادہ عبدالصمد رضوی نام اور تخلص ساز تھا- عبدالحکیم رضوی (پیرزادہ) آپ کے والد تھے- آپ کی تعلیم و تربیت دکن میں ہوئی- سنہ ۱۹۳۷ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) سے بی-اے، ایل ایل بی کر کے وارنگل میں وکالت کرتے رہے- وکالت کے ساتھ ساتھ آپ عوامی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور سنہ ۱۹۳۹ء میں تو آپ باقاعدہ مزدور تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے- تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان آگئے- لاڑکانہ (سندھ) میں سکونت اختیار کی اور یہیں پر اپنی وکالت کرتے رہے -اخبارات و رسائل میں صمد رضوی کے نام سے مشہور ہوئے- سنہ ۱۹۶۷ء میں آپ کا مجموعہ کلام "سحر نغمہ" کے نام سے شائع ہوا- ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو ۶۰ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی- ان کے نزدیک شاعری محض کوئی تفریح طبع نہیں تھی بلکہ ان کی شاعری اپنے وجدان اور ضمیر کی پیروی' عوام کی زندگی کا سدھار اور ان کے مصائب کے اظہار کا آئینہ دار تھی- اسی حوالے سے آپ کی ایک مخمس ملاحظہ ہو ؎

عصمتیں بکتی ہوں جس کے کوچہ و بازار میں
جرم و عصیاں پل رہے ہوں جبہ و دستار میں
زندگی بیمار ہو آثار میں، افکار میں
اک جمود بزدلی ہو نغمہ و تلوار میں
"ایسی آبادی کو دنیا سے مٹانا ہے مجھے"
مال داروں کو جہاں ترکہ میں عزت ہو نصیب
خونِ دہقاں سے زمینداروں کو شوکت ہو نصیب

ہر قدم پہ اہل علم و فن کو ذلت ہو نصیب
اور جاہل مفت خوروں کو شرافت ہو نصیب
"ایسی آبادی کو دنیا سے مٹانا ہے مجھے"
مفلسوں کو دیں جہاں تعلیم تسلیم و رضا
صبر کے پھول اور تقدیر و قناعت کی غذا
پردہ پوش اہل زر ہو خانقاہوں کی ریا
بھوک کے ماروں کو دیتی ہو سبق اخلاق کا
"ایسی آبادی کو دنیا سے مٹانا ہے مجھے"

صمد نے اپنی شاعری میں واقعات، حادثات اور تجربات کی بڑی عکاسی کی ہے۔ آپ کے مسدس کے دو بند اور ملاحظہ ہوں

کتنے فرعون خدا دوست نظر آتے ہیں — کتنے شداد غریبوں پہ ترس کھاتے ہیں
کتنے ابلیس فرشتوں کی جگہ پاتے ہیں — کتنے کافر ہیں جو ایمان کے گن گاتے ہیں
زندگی نغمۂ خیام نہیں ہے اے دوست
یہ جہاں شاہدِ گلفام نہیں ہے اے دوست
کتنے مہتاب اندھیروں نے چھپا رکھے ہیں — کتنے طوفان غریبوں نے دبا رکھے ہیں
کتنے جادو ہیں جو عسرت نے جگا رکھے ہیں — کتنے فتنے ہیں جو دولت نے اٹھا رکھے ہیں
زندگی نغمۂ خیام نہیں ہے اے دوست
یہ جہاں شاہدِ گلفام نہیں ہے اے دوست

----

دو شعر

ایک سنجیدہ خموشی ہے زمیں پر حکمراں — ایک گہری نیند میں سویا ہوا ہے آسماں
چاند شب کی آخری منزل کی جانب ہے رواں — اور ساکن دودھیائی بادلوں کے بادباں

-☆☆-

## سعادتؔ

سید سعادتؔ علی شہنشاہ غزل کہے جانے والے میر تقی میرؔ کے استاد میر سعادتؔ علی امروہوی نے اگر انہیں ریختہ گوئی کہنے کا مشورہ نہ دیا ہوتا تو آج اردو ادب میر تقی میرؔ کے بہترین کلام سے محروم رہ جاتا- میر تقی میرؔ نے ان کا تذکرہ اپنی تصانیف "نکات الشعراء" اور "ذکر میر" میں کیا ہے- نکات الشعراء میں میر سعادت اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں-

"از سادات امروہہ بود، سلیم الطبع، کم سخن، متواضع،
سعادت تخلص می کرد، فی الجملہ چاشنی درویشی داشت،
شعر او خالی از لطف نیست، با بندہ ربط بسیار داشت"
(نکات الشعراء مطبوعہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۲۷)

ذکر میرؔ میں ان الفاظ میں سعادت کا ذکر کیا ہے:

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود بر خوردم آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بہ زبان اردوے معلائے بادشاہ ہندوستان و دراں وقت رواج داشت کرد خود کشی کردم و مشق بہ مرتبہ رساندم کہ موزو نان شہر را مستند شدم و شعر من تمام شہر گردید و بگوش خورد و بزرگ رسید" (ذکر میر- مطبوعہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۶۷)

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی میر تقی میرؔ کو سعادتؔ کا شاگرد کہا ہے- سید سعادتؔ علی بن سید میرؔ علی سنہ ۱۱۲۲ھ میں محلہ حقانی میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم و تربیت امروہہ میں ہوئی- ان کے والد اور دادا شاہی منصب دار تھے- اسی لیے سعادت علی کی نوعمری کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا- اٹھارہ سال کی عمر میں آپ بھی قلعۂ شاہی میں ملازم ہوگئے- دربار شاہی میں شعر و شاعری شباب پر تھی جس کا فطری اثر یہ ہوا کہ آپ کی طبیعت بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہوگئی- سعادت علی فطری شاعر تھے- یہی وجہ ہے کہ دربار شاہی کے سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور شاہ مبارک آبروؔ ہم عصر شاعروں میں ممتاز تھے- غزل کے علاوہ مثنوی نگار اور مرثیہ گو بھی تھے- انہوں نے اپنا ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا جو اب دستیاب نہیں ہے- نسیم امروہوی کی تحقیق کے مطابق میر سعادتؔ علی کی ولادت سرزمین امروہہؔ میں تقریباً ۱۶۹۸ء میں ہوئی- ان کے کلام سے "سواری" کے

چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہوئی یثرب نگر پر جب چڑھائی — علی نے غیظ میں تیوری چڑھائی
بڑھا گھوڑے کی جانب وہ فدائی — فرس کی ٹاپ سے آواز آئی
سواری ہے امیر المومنین کی
سواری ہے نبی کے جانشین کی

نقارا حیدر صفدر کا گرجا — ڈرے سن کر سبھی راجا و پرجا
مخالف کو پکارا بوق مرجا — گزر اب صعب ہے جاں سے گزر جا
سواری ہے امیر المومنین کی
سواری ہے نبی کے جانشین کی

علی کے ہاتھ میں ظالم کا سر ہے — جدھر دیکھا ہے اب آمد ادھر ہے
لجام اسپ پر دست ظفر ہے — سعادت نعرہ زن با کروفر ہے
سواری ہے امیر المومنین کی
سواری ہے نبی کے جانشین کی

ان کے چند مختلف شعر ملاحظہ ہوں۔

اللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا — ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا
ہوش کھو دیتی ہیں میرا اسکی آنکھیں مے پرست — بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست
کس سے پوچھوں دل مرا چوری کیا زلفوں نے رات — ایک جو شانہ ہے سو وہ تیل میں ڈالے ہے ہات
بے محابا زلف کے کوچے میں جائے گا چلا — سر چڑھلیا ہے بہت تم نے میاں شانے کہ تئیں

"خمخانۂ جاوید" جلد پانچ میں یہ شعر بھی ملتا ہے۔

مثل آئینہ سادہ رویوں کی — منہ ہی دیکھے کی آشنائی ہے

امروہے کی بد قسمتی یہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے صاحبان کمال اور استاد شاعر پیدا ہوئے مگر ان کے کلام یا تو ضائع ہو گئے یا لوگوں نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا ہے کہ شاید کبھی کوئی باذوق اس کو چھاپ دے۔

-☆☆-

**سلامیؔ:** سلام اللہ خاں نام اور سلامیؔ تخلص تھا- آپ حضرت سعید کے شاگرد تھے- آپ کی ایک نعت کے چند اشعار جو گلدستہ "نسیم چمن" میں شائع ہوئی پیش ہیں ؎

سب خوبیاں ہیں ختم نبی کے جمال پر بعد ان کے شان حق سے مسلم ہیں آل پر
ان کے سبب سے دولت ایماں ہوئی نصیب بھیجو درود ان پہ پھر اصحاب و آل پر
نام رسول لے کے اذاں میں فنا ہوئے ہے عاشقی کا خاتمہ حضرتِ بلال پر
شق القمر کے معجزہ سے تھے جو بدیقیں عاشق ہوئے حضور کے فضل و کمال پر
در پر حضور کے ہے سلامیؔ پڑا ہوا باشکلِ سائلانہ امیدِ وصال پر

**ساقیؔ:** قایم رضا نام اور ساقیؔ تخلص کرتے ہیں- آپ کا تعلق سادات امروہہ کے معزز خاندان سے ہے- شعر و سخن کی بستی امروہہ میں پیدا ہوئے لہذا ادبی و شعری ماحول کا ان کی طبیعت پر اثر ہونا فطری امر تھا- چنانچہ آغاز جوانی میں شعر کہنے لگے تھے- ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی- تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو وطن ثانی بنایا- "افتاد" کے نام سے آپ کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے- آپ کی شہرت اور مقام ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ایک بڑا نام ہے- آپ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش خدمت ہے- ملاحظہ ہو ؎

جب کبھی اس کا سراپا لکھا ہم نے ہر لفظ انوکھا لکھا
ہم سے لکھا نہ گیا رات کو دن لکھنے والوں نے تو کیا کیا لکھا
جس نے اپنا کبھی سمجھا نہ ہمیں ہم نے اس شخص کو اپنا لکھا
ہم نے قاتل کو بھی قاتل نہ کہا جیسا دیکھا اسے ویسا لکھا
زخم کو زخم نہ لکھا ہم نے اس کو اعجاز مسیحا لکھا

دو شعر ایک غزل کے اور پیش خدمت ہیں ؎

کم اپنے مقدر کا اندھیرا نہیں ہوتا سورج تو نکلتا ہے سویرا نہیں ہوتا
اس پیڑ کے سایے میں سکوں کس کو ملے گا جس پیڑ پہ چڑیوں کا بسیرا نہیں ہوتا

-☆☆-

**ساکتؔ:** مولوی ابوالحسن نام اور ساکتؔ تخلص ہے- آپ حکیم عبدالصمد عباسی کے فرزند تھے- سنہ

۱۲۵۲ھ میں محلہ ملانہ میں پیدا ہوئے-ابتدائی تعلیم رام پور میں ہوئی فارسی کی تعلیم جن اساتذہ سے رامپور میں حاصل کی-ان میں ان کے ایک درسی استاد کا نام مولانا جمال رامپوری بتایا جاتا ہے-عربی کی تعلیم انہوں نے اپنے عم محترم حکیم محمد حسن چشتی نظامی صاحب تفسیر شاہی و مقدمہ غایۃ البرہان سے حاصل کی-فن شاعری میں نظام شاہ نظامؔ رامپوری سے تلمذ تھا-ریختی بھی کہتے تھے اور بندیؔ تخلص کرتے تھے-۱۳۱۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی-
مشاعروں میں ریختی پڑھتے وقت دوپٹہ اوڑھ لیتے، آرسی پہن لیتے تھے اور تالیاں بجاتے تھے-خود فرماتے ہیں ؎

کہے گر ریختی کوئی تو کچھ مشکل نہیں بندیؔ      مگر آساں نہیں پڑھنا کہ بجانا ہے تالی کا

-------

ایک مشاعرے میں کسی شاعر نے طرح مشاعرہ کو غیر شگفتہ بتایا تو انہوں نے اپنی ایک اور غزل کے مقطع میں یوں چوٹ کی:

بندیؔ نے اس زمین میں بھی گل کھلا دیے      کہتے تھے مردوے کہ شگفتہ زمیں نہیں

ایک غزل ملاحظہ ہو

تیر مژگاں سے جو تاکا کبھی صیاد نے صید      دل و جاں کے مری بندھ بندھ کے نشانے آئے
چونک اٹھا فتنۂ محشر یہ قیامت دیکھو      بخت خفتہ کو مرے جب وہ جگانے آئے
بعد رنجش جو مرے پاس وہ بیٹھے مل کر      یاد دونوں کو بہت پچھلے فسانے آئے
بزم عشاق میں وہ آئے ہیں شرمائے ہوئے      دل چرانے کے عوض آنکھ چرانے آئے

ان کی غزل کا ایک پیارا شعر ملا مگر پوری غزل نہ مل سکی ؎

بال بکھرائے ہوئے، حال پریشاں، ساکتؔ      اک تماشا سر بازار بنے بیٹھے ہیں

-☆☆-

سحرؔ: سید ضامن حسین نام اور سحرؔ تخلص تھا-آپ سید ابوالحسن عابدی کے فرزند اور قوتیؔ امروہوی کے شاگرد تھے-رہائش محلہ نوگیاں میں تھی-'نسیم چمن' سے لیے گئے چند اشعار ؎

ٹھہری ہے جاں وہی جو صنم کے وصال پر      باندھیں گے ہم کمر سفر انتقال پر
طول شب فراق کا اور روز وصل کا      جھگڑا ہے ختم تفرقۂ ماہ و سال پر
اب کر غزل تمام سحرؔ وقت شام ہے      احمدؐ پہ پڑھ درود اور احمدؐ کی آل پر

**سائل:** شیخ نبی بخش نام اور تخلص سائل تھا۔ حاجی رحیم بخش (سرائے کہنہ و پچدرہ) کے فرزند تھے۔ آپ اس قدر خوش اخلاق انسان تھے کہ ہر شخص پہلی ملاقات میں آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ سائل ایک بہترین شاعر تھے۔ خاص طور پر چار بیت کہنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ زبان نہایت شستہ تھی۔ سائل عرصۂ دراز تک حکیم علی احمد رضوی کے یہاں ملازم رہے۔ دوران ملازمت حکیم صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی اور پھر خود بھی مطب کرنے لگے۔ فن شاعری میں حضرت لائق حسین قوّی امروہوی کے شاگرد تھے۔ زیادہ تر چار بیت کہتے تھے۔ آپ کا ایک دیوان "گلشنِ چار بیت" نام سے شائع ہوا جو میری نظر سے گزرا۔ اسی دیوان سے لی گئی ایک خوبصورت چار بیت ملاحظہ ہو۔

ہجر میں تیرے صنم دل میرا گھبرائے ہے
ماہی بے آب کی صورت مجھے تڑپائے ہے

کوکتی ہیں کوئلیں پی پی پپیہے کا شور — اور عجب شان سے ناچتے ہیں بن میں مور
چھائی فلک پر گھٹا بدلی میں بجلی کا زور — دیکھ سیاہ رنگ ڈھنگ یاد تری آئے ہے
جھولے پڑے باغمیں جھولے ہیں سکھیاں تمام — اور مجھے ہے فقط نیر بہانے سے کام
گاویں ہیں ملہار سب میں کروں نالے مدام — جان پر مورے بنی اور سب کو مزہ آئے ہے
سونی سجریا مجھے کرنے لگی بیقرار — پاس نہیں تو پیا پڑتی ہے مینہہ کی پھار
بہتا ہے دریائے خوں روتی ہے اب چشم زار — دل سے نکلتی ہے آہ لب پہ مرے ہائے ہے
دل مرا غم سے جلے اور نہ لے تو خبر — بجلی کی صورت سے میں تڑپوں ہوں آٹھوں پہر
کب مرے سائل پیا تم مجھے آئے نظر — کونسی بیرن ہے وہ جو تمہیں بہکائے ہے

---------

حقیقت پر نظر کرتا ہوں جب دنیائے فانی کی — بہاریں خاک میں مل جاتی ہیں سب زندگانی کی

-☆☆-

**سعید:** سید فضل حسین بن سید صادق علی محلہ مجاپوتہ سنہ ۱۸۰۳ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ فن شعر و سخن میں حضرت مہدی علی ذکی مرادآبادی سے تلمذ تھا۔ ممتاز شعراء میں تھے۔ آپ کے شاگردوں میں افسر امروہوی

سر فہرست ہیں-۱۰۲سال کی عمر پا کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا-فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے-دو دیوان، قصائد، مراثی اپنی یادگار چھوڑے ہیں-'نسیم چمن' اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ء میں شائع ہونے والے کلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں-

چھڑکا نہ ضد سے اس نے رخ بے مثال پر     میرے غبار کا ہوا جو شک گلال پر
اس رشک گل کو دیکھ لے بلبل جو اک نظر     پروانہ وار صدقہ ہو شمع جمال پر
جان عزیز مانگے تو حاضر کروں یہ دل     مرتا ہوں ایک شاہد یوسف جمال پر
آنے سے خط کے صاف یہ عقدہ کھلا سعید     اختر کمال حسن کا آیا زوال پر

-☆☆-

سعدؔ: سعدؔ امروہوی دور حاضر کے بہت خوبصورت اور خوش گو شاعر ہیں-ابتدا میں اپنے والد بزرگوار سے تعلیم و تربیت حاصل کی-اس کے بعد مدرسہ عربیہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں تعلیم پائی-آپ حضرت مولانا سید طاہر حسن امروہوی کے فرزند ہیں جو دارالعلوم میں حدیث کا درس دیتے ہیں-سعدؔ مشاعروں میں بڑی داد و تحسین لیتے ہیں، بڑے برجستہ شعر کہتے ہیں-ایک دن کا ذکر ہے وہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور گفتگو کا موضوع اس وقت ہاتھ کی لکیریں تھا-سعدؔ نے اسی وقت ہاتھ کی لکیروں پر ایک غزل کہہ ڈالی-ملاحظہ ہو-

موت تو ہے اگر حیات نہیں     آپ بھی جائیں کوئی بات نہیں
کچھ نہیں ہاتھ کی لکیروں میں     وہ بھی تو خوش ہیں جن کے ہاتھ نہیں
غم بھی دنیا میں ہیں مداوا بھی     خودکشی حاصل نجات نہیں
سعدؔ کیا اعتبار دنیا کا     اپنا سایہ بھی اپنے ساتھ نہیں

-☆☆-

سکتہؔ: سید علی مستحسن نام اور سکتہؔ تخلص تھا-سید علی محسن (بگلہ) کے فرزند اور عظیم امروہوی کے شاگرد تھے-ابتدائی تعلیم مکتب واقع محلہ بادشاہی چبوترہ میں مولوی رحیم بخش جد بزرگوار حضرت افسر صدیقی امروہوی سے حاصل کی-۷ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو وفات ہوئی-چند اشعار

کوئی حسرت نہ تمنا دل ناچار کی ہے     آرزو ہے تو فقط اک ترے دیدار کی ہے

جان کھونے میں مجھے عذر نہ سر دینے میں	سر بھی سرکار کا ہے جان بھی سرکار کی ہے
میں جو یوں بیٹھا ہوں حیران و پریشان سکتہ	پیش تصویر کسی آئینہ رخسار کی ہے

-☆☆-

**سکوتؔ:** منشی ناظر الحق نام اور سکوتؔ تخلص تھا- آپ مولوی عبدالرحمٰن باقیؔ عباسی کے فرزند تھے- فن شاعری میں اپنے ماموں زاد بھائی ساکتؔ امروہوی کے شاگرد تھے- دو تین سال کے مختصر عرصہ میں اتنی مشق سخن کی کہ ایک دیوان مرتب ہو گیا- ۲۵ برس کی عمر میں فن طب کی تکمیل کی اور اسی سال وفات ہوئی- چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

نہ ہم سچے نہ تم سچے رکھو یہ روز محشر پر	خدا کے سامنے قصہ چلے گا حق و باطل کا
ٹھہرا جو وقت ذبح ذرا ہاتھ یار کا	ارماں مچل گیا دل امیدوار کا
حسرت مری حسرت ہے کہ پوری نہیں ہوتی	مطلب مرا مطلب ہے کہ حاصل نہیں ہوتا

-☆☆-

**سوزؔ؛ عیشؔ:** شیخ نورالہدیٰ نام اور عرفیت شیخ محمد نوراللہ تھی- شیخ محمد شفیع، شفیعؔ امروہوی کے فرزند تھے- ابتدائے شاعری میں شاعرؔ امروہوی سے اصلاح لی- اس کے بعد یاورؔ امروہوی کی شاگردی اختیار کی- شروع میں اپنا تخلص سوزؔ اور پھر ۱۸۹۴ء میں عیشؔ اختیار کیا- "پیام یار" لکھنؤ، "گلشنِ سخن"، "گلدستہ گلچیں"، "نسیم چمن" میں کلام شائع ہوتا رہا- چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

رقیبوں کی کہانی لطف کی ہے	مزا کیا دل جلوں کی داستاں میں
رُکی جب آہ پھونکا دل، جگر کو	جو نکلی پڑ گئے چھالے زباں میں
کسی پہلو کسی کروٹ نہیں کل	کچھ ایسا درد ہے زخم نہاں میں
ملا کیا خاک پھر ہم کو اے سوزؔ	کچھ اپنا ہی گیا عشق بتاں میں

--

عاشق کو کوسنے نہیں یا بد دعا نہیں	کمبخت نامراد کی قسمت میں کیا نہیں
وہ حسرتیں کہاں گئیں ارمان کیا ہوئے	بیکس کی نعش پر کوئی اہل عزا نہیں

نکلے جو آرزو مری ایسی نہیں کوئی　　چھوڑے جو ساتھ ایسا کوئی مدعا نہیں
دفنا کے قبر میں بھی نہیں موت کا یقین　　سچ ہے کہ اعتبار نہیں خاک کا نہیں
کہتے ہیں روئیے دل مضطر کو اپنے گھر　　یہ بزم عیش ہے کوئی ماتم سرا نہیں

-☆☆-

**سلیم**: مولانا سید اولاد حسن سلیم کا تذکرہ اولیا اور علما کے باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے- آپ ایک عالم و فاضل ہی نہ تھے بلکہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے اور امروہے کے بہت سے شعراء نے آپ ہی سے اصلاح لی ہے- شگفتہ مزاج، موزوں طبع، شاعر شیریں مقال تھے، سلیم تخلص تھا- غزلیات کے علاوہ اردو و فارسی میں قصائد و قطعات و سلام و مراثی کا ذخیرہ موجود ہے- ۱۳۳۸ھ میں وفات پائی- آپ کے سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں-

مجرئی ہے کس قمر کے غم میں مضطر آفتاب　　کس کے ماتم میں نکلتا ہے کھلے سر آفتاب
ہیں جو عالی منزلت بیجا کبھی پھرتے نہیں　　اپنے جادہ سے کہیں جاتا ہے باہر آفتاب
کب ہے لرزاں بے جہت بام فلک پر آفتاب　　مانتا ہے رعب عباسِ دلاور آفتاب
دونوں خادم ہیں رواقِ روضۂ شبیر کے　　رات بھر حاضر ہے در پر ماہ دن بھر آفتاب
نور کی بیتیں لکھی ہیں واہ تو نے اے سلیم　　اس بیاں کی داد دیگا روز اٹھ کر آفتاب

-☆☆-

**سہیل - اعجاز**: مولوی اظہار الحق نام اور سہیل اور اعجاز تخلص کرتے تھے- مولوی عبد الحق عباسی کے یہاں ۱۳۱۷ھ میں پیدا ہوئے- امروہہ، مرادآباد اور دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا اور اسلامیہ ہائی اسکول گجرانوالہ میں عربی اور دینیات کے معلم ہوئے- دیگر مدارس میں بھی عربی و فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کیا- ملازمت چھوڑ کر ضلع گجرات میں ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی- شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی- فن شاعری میں اول عبد القیوم شفق امروہوی کی شاگردی اختیار کی لیکن بعد میں حضرت جلیل مانکپوری کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا- ابتدا میں اعجاز اور پھر سہیل تخلص اختیار کیا- فارسی شاعری میں قدماء کا رنگ اختیار کیا جبکہ اردو میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی پیروی نہیں کی- بے ردیف و قافیہ نظمیں بھی لکھتے تھے- کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں-

تمناؤں میں رونا پڑ گیا ارمان چلا ئے
مجھے حسرت بہت روئی جو نکلی تن سے جاں میری

----

دیوانہ جان کر سر محفل اٹھا دیا حال تباہ نے مری حالت تباہ کی

-----

تمہارے حسن کی خوبی کا کچھ بیان نہیں زباں میں آنکھ نہیں آنکھ میں زبان نہیں

-☆☆-

سراؔج : سید سراج الدین احمد نام اور تخلص سراؔج تھا- آپ سید نجیب الدین صفدر (شفاعت پوتہ) کے فرزند اور شاعری میں میر انیسؔ لکھنوی کے شاگرد تھے-ابتدائی عہد محمد علی شاہ میں کوتوالی لکھنو کے محرر رہے- آپ ریاست بھوپال کی تھانیداری اور پھر تحصیلداری پر بھی مامور رہے- سراؔج کو شاعری ورثے میں ملی آپ کے والد صفدرؔ بھی شاعر تھے- چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

اسی تمنا میں میرے مولا تمہارے در پر قیام ہوگا کبھی تو جاگے گی اپنی قسمت کبھی تو اپنا سلام ہوگا
سیاہ کاری میں عمر کاٹی، نہیں ہے بخشش کی کوئی صورت اسی تصور میں جان دیں گے اسی میں قصہ تمام ہوگا
نظر عنایت کی مجھ پہ کرنا کہ ہوں گناہوں سے اپنے نادم تمہاری امت پہ جب خدا کی طرف سے مولا انعام ہوگا
حبیب خالق کے زلف و رخ کی لکھی مدح سراؔج تم نے تمہارے مضمونِ نو کا چرچہ جہاں میں ہر صبح و شام ہوگا

-☆☆-

سیفؔ : شیخ مہدی حسن نام اور سیفؔ تخلص تھا- مولوی عبدالحمید عباسی کے یہاں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے-امروہہ میں عربی، فارسی، اردو اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے کچھ عرصہ کوئٹہ پھر بنگال چلے گئے اور تقریباً سنہ ۱۸۹۵ء میں بگراپور، دیناجپور، بنگال کے ایک مدرسہ میں مدرس ہوئے- کچھ عرصہ بعد جے پور چلے گئے اور وہاں مطب کا آغاز کیا- جے پور کے معروف اطباء میں آپ کا شمار ہوتا تھا- ساکتؔ امروہوی کے شاگرد تھے- 'نسیم چمن' شمارہ فروری ۱۸۹۶ء سے لیے گئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

سر کاٹنے میں گر تمہیں خوفِ خدا نہیں ہم بھی وہ ہیں کہ سر کا ہمیں غم ذرا نہیں
گو اس مریضِ ہجر کو ممکن شفا نہیں آ جائیں آپ اگر تو ابھی کچھ گیا نہیں

اٹھانہ اسکی بزم سے میں رشک غیر میں　　قابو میں اپنے یہ دل رشک آشنا نہیں

----

جلا فرقت میں دل ایسا مرا اندوہگیں ہو کر　　کہ دم نکلا مرے سینے سے آہ آتشیں ہو کر
فشار قبر سے بھولا ہوں اب میں جور گردوں کو　　زمیں نے پیس ڈالا ہے مجھے چرخ بریں ہو کر

----

نہ گئی بعد فنا بھی نہ گئی گردش بخت　　اڑتی پھرتی ہے مری خاک بگولا ہو کر

-☆☆-

سیفی: مرزا احمد حسین آپ کا نام اور تخلص سیفی ہے۔ آپ جناب مرزا عبدالرؤف بیگ رؤف کے فرزند ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں سیفی کی ولادت ہوئی۔ شعر و سخن کے ماحول میں پرورش پائی اور شاعری انہیں ورثہ میں ملی۔ آپ کے گھر تقریباً ۶۰ سال سے ہر جمعہ کو نعتیہ محفل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس محفل کا اہتمام پہلے آپ کے والد بزرگوار کیا کرتے تھے ان کے انتقال کے بعد اب یہ محفل سیفی کراتے ہیں۔ آپ بڑے خوش مزاج اور بڑی محبت سے ملنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ سیفی صاحب کے بڑے بھائی مرزا محمد حسین اور میرے بڑے بھائی محمد حسین صدیقی دونوں دوست تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں بھائیوں کا نام اور ہم دونوں بھائیوں کا نام ایک ہی ہے۔ احمد حسین صاحب سیفی ہومیوپیتھک کے مشہور ڈاکٹر ہیں اور حکیم کلب علی شاہد کے بہنوئی ہیں۔ آپ کی ایک غزل پیش خدمت ہے۔

مجھے دے کے زیست کی تلخیاں مرے غمگسار چلے گئے　　جو نباہتے مجھے عمر بھر وہ تمام یار چلے گئے
تری کم نگہی سے ساقیا ترا میکدہ ہی اجڑ گیا　　وہ جو میکدے کا وقار تھے وہی بادہ خوار چلے گئے
تھا نظر میں جن کی ترا بھرم نہ ہوا انہی پہ ترا کرم　　جو قرار مانگنے آئے تھے یونہی بیقرار چلے گئے
جو شعور عشق میں فرد تھے جو محاذ عشق کے مرد تھے　　سر دار ان کی طلب ہوئی جو بنام یار چلے گئے
یہ عجب مذاق ہے وقت کا ملی ایک جیسی ہمیں سزا　　مجھے اختیار ملے نہیں ترے اختیار چلے گئے
نہ خیال وصل کی راحتیں نہ سحر امید بشارتیں　　مجھے چھوڑ کر کبھی آسرے شب انتظار چلے گئے
ترے سرفروشوں کے واسطے یہاں صرف دو ہی مقام تھے　　جو بکوئے یار نہ آسکے وہ بسوئے دار چلے گئے

-☆☆-

**سیمابؔ:** خلیفہ معصوم علی نام تخلص سیمابؔ تھا۔ آپ حسین بخش کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۵۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا آپ کی سکونت محلہ گھیر مناف میں تھی بعد میں محلّہ پیرزادہ میں رہنے لگے تھے۔ رئیس تاجپور ضلع بجنور راجہ شیام سنگھ بہادر اور کنور شیوناتھ سنگھ کے یہاں ملازم تھے جو آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ صرف لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ "خم خانۂ جاوید" جلد چہارم میں سیمابؔ امروہوی کی خدمات اور شاعری کا مختصر ساذکر کیا ہے۔ کنور شیوناتھ سنگھ کی فرمائش پر انہوں نے ایک مثنوی "جادوئے رواں" بھی تصنیف کی تھی جواب نایاب ہے۔ لالہ سری رام نے "خم خانۂ جاوید" میں اس مثنوی کی تعریف کی ہے اور کچھ اشعار بھی لکھے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

یارب مجھے خامۂ رواں دے فکرِ سخن شرر فشاں دے

اعجاز کی سربسر ہو تقریر جادو سے کرے دلوں کو تسخیر

جو لفظ ہو صورت پری ہو جو نکتہ ہو سحر سامری ہو

مشاعروں میں حضرت سیمابؔ امروہوی کو اساتذہ کی صف میں بٹھایا جاتا تھا۔ غزل آپ تحت اللفظ میں پڑھتے تھے۔ فن تاریخ گوئی میں بھی آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ حضرت مولانا سید احمد حسن کی رحلت کی بھی تاریخ لکھی تھی۔ آپ نے فارسی میں بھی بہت کچھ لکھا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے۔

بہار آئی ہے' پھر وحشت کے کچھ ساماں نرالے ہیں جنوں نے سلسلے کچھ اور ہی بڑھ کر نکالے ہیں

پھر پرواز کھولے اور نہ کچھ بازو سنبھالے ہیں پکڑنے کو مرے' صیاد نے پھر جال ڈالے ہیں

تپِ الفت کی گرمی نے اثر اپنا یہ دکھلایا زباں پر سربسر چھالے ہیں' لب پر آہ و نالے ہیں

جوانی ہو چکی پر ولولے دل سے نہیں جاتے وہی نازک خیالی ہے' وہی مضموں نرالے ہیں

بہار آئی' جنوں سیمابؔ پھر بخیہ ادھیڑے گا عبث یہ جامہ زیبی ہے' عبث دامن سنبھالے ہیں

دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

کہا یہ خواب سے میں نے کہ اے رفیق و ندیم بتا تو کیوں نہیں آتی ہے مجھ غریب کے پاس

دیا جواب یہ اس نے مجھے کہ اے کم بخت میں تیرے پاس رہوں یا ترے نصیب کے پاس

-☆☆-

**سیدؔ امروہوی:** سید علی نام اور تخلص سیدؔ ہے۔ آپ محلہ شفاعت پوتہ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید حمزہ علی شہر کی ایک معروف شخصیت تھے۔امروہہ میں جو نوٹنکی ڈرامے ہوا کرتے تھے آپ میک اپ کے ماہر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔سید علی پاکستان آکر پی سی ایس آئی آر میں ملازم ہوگئے۔ سید امروہوی کراچی کے شعری و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ مشاعروں کے اہتمام کے سلسلے میں منتظمین ان کی خدمات سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سید علی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اچھا شعر کہتے ہیں اور پڑھتے بھی بہت اچھا ہیں۔ان کا مجموعہ کلام طباعت کی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ان کی نظمیں، سلام اور غزلیں اس مجموعہ میں شامل کی جارہی ہیں۔ نمونہ کلام ۔

ہمراہ قافلے کے چلو اہل قافلہ — بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتا نہیں کوئی
جب سے لہو لہان ہوا ہے ہمارا شہر — مہندی ہتھیلیوں پہ رچاتا نہیں کوئی
جو آئینوں کی طرح بکھر جائیں ٹوٹ کر — آنکھوں میں ایسے خواب سجاتا نہیں کوئی

چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مہر و مہ و انجم کو تنویر عطا کر کے — ہم نے ترے پیکر کا ہر نقش ابھارا ہے
میں اکیلا نہیں مرے ہمراہ — ایک سناٹا گھر میں رہتا ہے
سینے میں امڈ آیا ہے طوفان بلا کا — پلکوں سے چھلک جائیں نہ جذبات کے دھارے
دوست سیدؔ سے کس لیے ہیں خفا — وہ تو یاروں کا یار اب تک ہے

سید علی سیدؔ کو طباعت سے بھی بڑا شغف ہے۔وہ ایک مخلص انسان ہے اور امروہہ سے اس کی محبت' عقیدت کا روپ دھار چکی ہے۔ جناب شہباز صدیقی کے کلام کی طباعت اور اشاعت میں سید علی نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بڑی قابل قدر ہیں۔اس نے پاکستان میں شہباز صدیقی کے کلام پر تنقیدی مضامین شائع کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

-☆☆-

**سیوکؔ:** ماسٹر للتا پرشاد سیوکؔ امروہوی محلہ چوک میں پرچون کی دکان کرتے تھے۔غالباً اسی محلے میں آپ کی سکونت بھی تھی۔للتا پرشاد اور بانکے لعل بسملؔ کا کافی کلام عظیم امروہوی کے پاس ہے۔حمد کے دو

شعر جو ڈاکٹر عظیم امروہوی سے حاصل کیے۔ ملاحظہ ہوں

یارب گل گلزار میں، میں نے تجھے دیکھا　　اور وادیِ پرخار میں، میں نے تجھے دیکھا
جلوے تری قدرت کے مجھے کیا نظر آئے　　بحر و بر و کہسار میں، میں نے تجھے دیکھا
تو لطف سخن ہو کے، سخن میں ہوا پنہاں　　بحر و بر و کہسار میں، میں نے تجھے دیکھا

آپ کی ایک اور غزل کے چند اشعار جو کراچی میں میرے ایک دوست نے عنایت کیے۔ ملاحظہ ہوں:-

ابتدائے عالم ہستی میں، میں بے ہوش تھا　　ہوش جب آیا تو دل میں غفلتوں کا جوش تھا
کر دیا باغ جہاں سیراب اشکوں نے مرے　　ہجر کی شب گریۂ پیہم کا اتنا جوش تھا
لب پہ آیا ہے نہ سیوک کے کبھی نام خدا　　ہوش تھا یاد بتاں کا ورنہ وہ بے ہوش تھا

-☆☆-

**سردار نقوی:** سید سردار محمد نقوی نام اور قلمی نام (پروفیسر) سردار نقوی ہے۔ آپ کے والد سید انوار محمد نقوی محلہ مجپدرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ۲۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی (جیالوجی) پاس کر کے جیالوجیکل سروے آف پاکستان میں ملازم ہوئے۔ بعد کو محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے اور مختلف کالجوں میں تدریس سے متعلق رہے۔

شاعری کی ابتدا طالب علمی ہی کے زمانے میں ۱۹۵۸ء سے ہوئی۔ آغاز شاعری میں غزلیں اور نظمیں کہیں جو مشاعروں میں پڑھی گئیں اور مجلوں میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔ ۱۹۵۸ء سے سردار نقوی کا رجحان ترقی پسندی کی طرف رہا مگر وہ اس تحریک میں عملی طور پر شامل نہیں ہوئے۔ ترقی پسندی کا اثر ان کی شاعری پر بہر حال ضرور پڑا۔ اس دور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہر چند کہ وہ جان جہاں دشمن جاں ہے　　وہ دشمن جاں بھی تو نصیب دگراں ہے
دیکھو جسے وہ خود نگر و خود سر و خود بیں　　اک جسم نہ رکھتا ہو تو ہر شخص خدا ہے

------

کسی کی یاد سے کب زخم دل ہرا نہ ہوا　　شگفت گل کا یہ موسم تو اک بہانہ ہوا
کھلا ہے نکتۂ امکان آرزو جب سے　　ہمیں کبھی گلۂ بخت نارسا نہ ہوا

۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر یاور عباس کی تحریک پر پہلا مرثیہ کہا بس اسی وقت سے رجحان مرثیہ، نعت، رباعی اور سلام

کی طرف بڑھتا رہا یہاں تک کہ سنا ہے کہ تقریباً بیس سال سے غزل گوئی ترک کر دی ہے- سردار نقوی کے مرثیوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ وہ ایک ذہن رسالے کر پیدا ہوئے ہیں- ان کا مطالعہ اور ان کا مشاہدہ 'قدیم مرثیہ پر ان کی نظر' قرآن مجید 'احادیث وغیرہ کے جابجا حوالے انکی علمیت پر دلالت کرتے ہیں- ان کے مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں-

قبل نبی حیات کی وہ حالت تباہ　　　باطل کی ظلمتوں میں بھٹکتی ہوئی نگاہ
منزل سے راستوں کا تعلق نہ رسم وراہ　　　وہ روز و شب کا حال کہ اللہ کی پناہ
آتی تھی صبح فتنۂ تازہ لیے ہوئے
جاتی تھی شام دن کا جنازہ لیے ہوئے

ان کی نعت کے دو شعر پیش ہیں-

قل ھو اللہ کے حوالے سے　　　جس نے سمجھایا کبریا کیا ہے
اس کا معبود ہے مرا معبود　　　میں نہیں جانتا خدا کیا ہے

سردار نقوی نے تاریخی 'ادبی' تہذیبی موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے ہیں- چند کتابوں کے فارسی کے ترجمے بھی کیے ہیں- "مطالعہ قران" کے عنوان سے پروفیسر کرار حسین کی تقاریر کی تلخیص کیں-

-☆☆-

**شریفؔ:** سید شریف حسین رضوی نام اور تخلص شریفؔ ہے- آپ حضرت پیر شاہ ابن بدر چشتیؒ سے اخلاف تعلق رکھتے ہیں- شریفؔ امروہوی نہایت شریف النفس 'اعلیٰ کردار اور پاکیزہ شخصیت کے مالک اور خوش طبع نعت گو شاعر ہیں- ان کے دل میں شمع حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم روشن ہے- آپ کا نعتیہ دیوان "قندیلِ عرش" شائع ہوا- آپ کی ایک نعت بطور نمونہ کلام پیش ہے-

قرآں ہے نور 'نور ہے صورت حضورؐ کی　　　تصدیق کر رہی ہے ہر آیت حضورؐ کی
صلی علیٰ زباں پہ ہے مدحت حضورؐ کی　　　کم تو نہیں یہ ہم پہ عنایت حضورؐ کی
اللہ رے یہ شان یہ شوکت حضورؐ کی　　　سب رفعتوں سے بڑھ کے ہے رفعت حضورؐ کی
کس درجہ مطمئن ہیں غلامانِ مصطفیٰ　　　محشر میں کام آئے گی نسبت حضورؐ کی
صدیقؓ اک طرف ہیں تو اک سمت ہیں عمرؓ　　　روضہ میں بھی نصیب ہے قربت حضورؐ کی

دنیا میں آج ظلم و جہالت کا دور ہے　　محسوس ہو رہی ہے ضرورت حضورؐ کی
نسبت اگر کبھی ہے شریفؔ حزیں تو پھر　　دیکھے گا شکل روز قیامت حضورؐ کی

-☆☆-

شادؔ: سید شاد علی نام اور تخلص شادؔ تھا- آپ سید نبی بخش فلسفیؔ (محلّہ بنگلہ) کے فرزند تھے- گلدستہ "معراج الکلام" امروہہ اگست سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ کا کلام شائع ہوا تھا اس سے منتخب چند اشعار ملاحظہ ہوں؎

میکدے میں ہیں سنبھالے ہوئے میخوار مجھے　　ہوش آتا نہیں سب کرتے ہیں ہشیار مجھے
میں کہاں اور کہاں لالہ و گل کی خواہش　　اے نسیم سحری چھیڑ نہ بیکار مجھے
خوش بیاں پا کے نہیں چھوڑتا مجھ کو صیاد　　ہوئی اسباب اسیری مری گفتار مجھے
سر گراں بار تھا مدت سے مری گردن پر　　کر دیا آ کے خنجر نے سبک بار مجھے
بیوفائی کا ہے یارانِ وطن سے شکوہ　　ہائے کیوں بھول گئے شادؔ سب اکبار مجھے

-----

یوں تو مہمانیٔ غم میں مری اک عمر کٹی　　شادؔ کیا کوئی خوشی بھی مرے گھر آئے گی

-☆☆-

شاعرؔ: مولوی حافظ غلام نبیؔ خاں عباسی خلف مولوی محبّ علیؔ خاں عباسی، مولف "آئینہ عباسی" ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے- فن شاعری میں سید ابوالحسن ساکتؔ اور مولوی جمال شاہ رامپوری کے شاگرد تھے- بعد میں ان کے متعدد شاگرد ہوئے- سنہ ۱۹۱۴ء میں وفات پائی- آپ کی اولاد میں آپ کے ایک فرزند غلام صادق صادقؔ، جو حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے، ممتاز شاعروں میں تھے- رسول اللہ حضرت محمد مصطفیؐ کی ولادت باسعادت کے بیان میں ایک مثنوی "مطلع نور" مطبوعہ یادگار ہے- نمونہ کلام ملاحظہ ہو؎

نیام یار سے جس وقت تیغ خونچکاں نکلی　　فلک پر برق تڑپی رعد چلایا کہ جاں نکلی
زمین و آسماں کا فرق تھا دونوں کو جب جانچا　　سراسر سیدھی اس کی مانگ ٹیڑھی کہکشاں نکلی
نہ حاصل کر سکے ہر گز کرشمے اس کی ابرو کے　　بہت بن بن کے رنگیں اے فلک تیری کماں نکلی
نہ آئیں ہچکیاں انساں کو کیوں دم کے نکلتے دم　　صراحی سے جو مئے نکلی تو لیتی ہچکیاں نکلی

سخن گوئی میں انکا قافیہ کیا تنگ ہو شاعر　　اسوں ظم ت ہے نن ی قدر شایاں تھی

-☆☆-

**شبابؔ:** سید ذیشان حسینؔ نام اور شبابؔ تخلص تھا- آپ سید رضوان حسین (محلہ گذری) کے فرزند تھے- فن شاعری میں سید اظفر حسین خنظرؔ امروہوی کے شاگرد تھے- آپ کی غزل بطور نمونہ پیش خدمت ہے ؂

ایک کملایا ہوا پھول ہوں میں خار نہیں　　کیوں چمن اب مجھے رکھنے کا روادار نہیں
عندلیبوں نے بھی وہ زمزمہ خوانی چھیڑی　　دامِ الفت میں مرے کوئی گرفتار نہیں
باغباں نے بھی کیا مجھ سے کنارا افسوس　　میں تو اس کے لیے کچھ بوجھ نہیں بار نہیں
ہیں وہی غیر' تھا دعویٰ جنہیں اپناہت کا　　سچ ہے مفلسی کا زمانے میں کوئی یار نہیں
حُسن پر اپنے بڑا ناز تھا مجھ کو لیکن　　اب سمجھ آئی کہ مجبور ہوں مختار نہیں
گو شبابؔ اپنا ہوا نذرِ حوادث پھر بھی　　میں چمن چھوڑنے کے واسطے تیار نہیں

-☆☆-

**شبیرؔ:** محمد شبیر خاں ولد احمد خاں سنہ ۱۸۶۸ء کو کانپور میں پیدا ہوئے- ان کے والد بزرگوار کرنیل گنج، کانپور میں سب انسپکٹر پولیس تھے- فن شاعری میں پہلے صفیؔ امروہوی کے شاگرد ہوئے- کبھی کبھی ساکتؔ امروہوی سے بھی اصلاح لیتے تھے- دونوں استادوں کے انتقال کے بعد نسیمؔ امروہوی اور پھر خلیفہ محمودؔ علی کی شاگردی اختیار کی- فن شاعری میں جو وضع اختیار کی تھی اسی کو ہمیشہ قایم رکھا- عام بول چال اور محاوروں کو اشعار میں استعمال کرنے کے ماہر تھے- تقریباً ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی- مقامی و بیرونی مشاعروں میں ہمیشہ شرکت کرتے رہے- آپ کی تصانیف میں "بزمِ شبیر" "نظم شبیر" "مثنوی" "قتل معشوق" اور گلدستہ "روحِ سخن" وغیرہ آپ کی یادگار ہیں- آپ نے امروہہ کے ایک جلسے میں انگریزی حکومت سے خطاب کرتے ہوئے ایک نظم پڑھی اور ایک تمغہ بطور انعام حاصل کیا- اس نظم کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؂

پرچم عہد سلف پھر جلوہ گر ہو جائے گا　　جبکہ آزادی کا جھنڈا ہند میں لہرائے گا
کب تک اے چرخ کہن خون جگر پلوائے گا　　کب تک اب خوں ریزیاں دنیا کی دیکھے جائے گا
شرق سے تا غرب دیکھ اور پھر دکن سے تا شمال　　کتنی دنیا کٹ چکی کتنوں کا نمبر آئے گا

رحم کر حق نے دیا ہے تجکو دستِ مقدرت | ورنہ یہ سایہ ترا اس خلق سے اٹھ جائے گا

"نسیم چمن" سے لیے گئے آپ کی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

دل و جاں دین و ایماں کھو کے انکو پیار کر بیٹھے | جو کچھ پونجی تھی اپنی ہم وہ سب بیکار کر بیٹھے
خدا کے سامنے دیکھو بتو تم کو حلف دونگا | اگر تم واقعی جھوٹا کوئی اظہار کر بیٹھے
اجی شبیر قول و فعل کا کیا اعتبار ان کے | ابھی اقرار کرتے تھے ابھی انکار کر بیٹھے

-☆☆-

شمیم: مولوی سید جواد حسین نام اور تخلص شمیم تھا۔ سید حیدر حسین یکتا کے یہاں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ طبیعت کا قدرتی رجحان شاعری کی طرف ہوا تو شروع میں ساکت امروہوی سے اصلاح لی۔ شعر برجستہ کہتے تھے۔ بہ حیثیت شاعر نواب رامپور کے دربار سے وابستہ رہے اور فرزدق ہند کا خطاب عطا ہوا۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۱۳ء کو انتقال ہوا۔ امروہہ میں آپ کے بہت شاگرد ہوئے۔ آپ کا کلام ملاحظہ ہو۔

معراج سخن کس مہ کامل کی ثنا ہے | کس مہر منور کے لیے چرخ بنا ہے
کس شمع سے یہ روشنیٔ دار فنا ہے | خود فوجِ ملک قائلِ لا علم انا ہے
ہاں اس کے شرف سے کوئی آگاہ نہیں
حقا کہ وہ حق ہے مگر اللہ نہیں ہے

نہیں چھپتی ہے شوخی عہد طفلی میں حسینوں کی | جوانی آتے آتے حسن پیدا ہو ہی جاتا ہے
خبر مرنے کی سن کر ہر گھڑی حیران ہوتے ہیں | جو انا مرگ مرنے کا اچنبا ہو ہی جاتا ہے

-----

حال میرا کوئی کیا ان کو سناتا ہو گا | جا کے اس بزم میں اپنی ہی جماتا ہو گا
گر کسی نے کہا ان سے کہ وہ جاتا ہے شمیم | بولے پھر کیا کروں پاپوش سے جاتا ہو گا

شمیم امروہوی نہایت باخبر اور پابند اصول شاعر تھے اور بہت جلد کہتے تھے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ اپنے شوق سے مرثیئے اور سلام بھی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے فصیح الملک داغ دہلوی کی خدمت میں باشتیاق ملاقات ایک منظوم رقعہ ارسال کیا۔ ملاحظہ ہو۔

رقعہ منظوم بخدمت فصیح الملک داغؔ دہلوی

آسماں تک ہوئی ہے شہرتِ داغ  ماہِ کامل ہے داغ حسرتِ داغ
داغ ہے ناگزیر ..... اہلِ کمال  کیوں نہ ہو کاملوں کو الفتِ داغ
سرخروئی کبھی نصیب نہ ہو  گر نہ لالہ پہ ہو عنایتِ داغ
گرچہ محروم ہیں زیارت سے  اپنے دل میں ہے داغ فرقتِ داغ
ہم بھی خدمت سے بہرہ ور ہوں شمیمؔ  گر ہو معلوم وقتِ فرصتِ داغ

حضرت داغؔ نے اسی رقعہ کی پشت پر یہ جواب دیا۔

جواب رقعہ

مشتاق ہے دماغ ہمارا شمیمؔ کا  جویا ہے دل بھی صاحب طبع سلیم کا
''کوئی وقت فرصت نہیں اور ہر وقت فرصت ہے۔کل آٹھ بجے صبح تشریف لائیے''

-☆☆-

شبنمؔ: بھوکن سرن نام اور تخلص شبنم تھا۔آپ شمیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔امروہہ میں زردوزی کا کارخانہ تھا۔گلشن سخن 'امروہہ سے غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخ ترا دیکھا تو حیرت ہوگئی  آئینہ کی اور صورت ہوگئی
عشق میں کس کے یہ حالت ہوگئی  مجھکو انسانوں سے نفرت ہوگئی
اسم فرضی رہ گیا نام وفا  خلق میں عنقا مروت ہوگئی
آئے جب وہ عید آئی میرے گھر  جب چلے برپا قیامت ہوگئی

-☆☆-

شفقؔ: مولوی عبدالقیوم نام اور تخلص شفق تھا۔آپ مولوی حافظ عبدالرحمٰن صدیقی صدرمدرس دارالعلوم محلہ ملانہ امروہہ کے یہاں سنہ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔آپ علوم عربیہ کے ماہر تھے۔انیس سال کی عمر کو پہنچے تو شعر و شاعری کا ذوق ہوا اور مشق سخن اتنی کی کہ بہت جلد ممتاز شاعر بن گئے۔حضرت امیر مینائیؔ کو اپنا استاد کہتے تھے۔تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ہندوستان کے شعری گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

خلقت میں دھوم جلوۂ حسنِ بتاں کی ہے　　زینت اسی چراغ سے بزمِ جہاں کی ہے
کیوں کر نہ آفتابِ قیامت کی دھوم ہو　　تصویر ہو بہو مرے داغِ نہاں کی ہے
جو مر گئے فراق میں گویا وہ جی گئے　　لذت اجل میں زندگیِ جاوداں کی ہے
عالم سر نیاز جھکاتا ہے اس جگہ　　کعبہ ہے یا زمین ترے آستاں کی ہے

--

زبانِ حال سے رنگِ شفق کہتا ہے گردوں پر　　اُڑے ہیں خون کے چھینٹے زمینِ کوئے قاتل سے
دلِ بسمل سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن ہے　　ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی ہیں تیر قاتل سے

--

خاکِ مزار خاکِ شفا ہو کے بٹ گئی　　حسنِ عمل نے اور بھی مٹی خراب کی
اس بحر میں ثبات کہاں ہے غرور کو　　دم بھر میں بیٹھ جاتی ہے کشتی حباب کی

-☆☆-

**شوق:** مشکور حسن صدیقی آپ کا نام اور تخلص شوق ہے-سنہ ۱۹۳۸ء میں آپ کی پیدائش ہوئی-آپ مبارک حسن صدیقی محلہ قریشی کے فرزند ہیں-تعلیم ادیب جامعہ اردو علی گڑھ سے ہوئی-سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں-شوق انجمن ترقی اردو ہند یوپی کے کنویز رہے-آپ کمیونسٹ پارٹی کے ضلع سکریٹری اور ہندوستانی سماج سیوا کمیٹی امروہہ کے جنرل سکریٹری ہیں-اسکے علاوہ امروہہ کی متعدد انجمنوں کے سکریٹری' کنویز اور رکن ہیں-شعر و سخن کا ذوق اپنے شہر امروہہ سے ملا-شعر بہت اچھے کہتے ہیں-آپ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے-

داغ بدنامی کے اس طرح سے دھونا یارو　　اپنے دامن مرے اشکوں سے بھگونا یارو
میرے اشکوں سے یہ پوچھو کہ ہے کتنا مشکل　　چند قطروں میں سمندر کا سمونا یارو
خواب دیکھے ہیں کھلی آنکھوں سے میں نے ایسے　　راس اب جاگتے رہنا ہے نہ سونا یارو
تم نہ ہوتے تو کوئی اور سبب بن جاتا　　مجھ کو رسوا سر بازار تھا ہونا یارو
ان کی آنکھوں کے بھی ساغر نہ چھلک جائیں کہیں　　شوق کے حال پہ اتنا بھی نہ رونا یارو

-☆☆-

# شہبازؔ امروہوی

عیاں ہے سازِ ظرافت سے سوزِ دل میرا　　نہاں ہے دل کی لگی دل لگی کے پردے میں
یہ قہقہے نہیں شہبازؔ میرے نالے ہیں　　بہا رہا ہوں میں آنسو ہنسی کے پردے میں

------

مولانا سلطانؔ احمد ۲۳ر جنوری ۱۹۱۰ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے علاوہ مولانا عبدالعزیزؔ سے حاصل کی- بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور منشی کے امتحان پاس کیے- تعلیم سے فراغت ہوئی تو درس وتدریس کو اپنا مشغلہ اور وسیلہ بنایا- سولہ سال تک جگدیش سرن ہندو کالج امروہہ میں معلمی کے فرائض انجام دیے- مدرسہ اسلامیہ حنفیہ امروہہ، اور دارالعلوم چلّہ ،امروہہ میں تقریباً چالیس سال اردو، فارسی کے مدرس رہے- اپنے مدرسی کے زمانے میں طلباء کو تقریری مقابلوں کے لیے تقاریر لکھ دیا کرتے تھے اور ان طلباء کو مقابلوں کے لیے تیار کرتے تھے- جناب شعیب احمد عباسی ریجنل کمشنر انکم ٹیکس کراچی انہی کے تربیت یافتہ مقرر رہے تھے-

سنہ ۱۹۴۵ء میں شہبازؔ امروہوی بصارت سے محروم ہوگئے تھے- لیکن اس شدید احساسِ محرومی کے باوجود نہ صرف مثبت رویہ جاری رکھا بلکہ اپنی ظریفانہ شاعری کے ذریعہ برصغیر پاک وہند میں وہ شہرت حاصل کی کہ ان کو اکبر ثانی کہا جانے لگا- شہبازؔ کی شاعری مہذب طنزومزح کا ایک دلکش نمونہ ہے- وہ ہندوستان کے انتہائی معروف شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے- ان کی تصنیفات میں دو شعری مجموعے "ط ‘ظ" اور "حلوے سے کباب تک" آپ کی یادگار ہیں- ۳ر جون سنہ ۱۹۸۵ء کو طنزومزاح کی شاعری کا نادر اثاثہ اہل امروہہ کے سپرد کرتے ہوئے اس نامور شاعر نے ملک عدم کو کوچ کیا-

شہبازؔ امروہوی کے بارے میں افسر صدیقی امروہوی (مرحوم) فرماتے ہیں "شہبازؔ صاحب کے کلام مالا کلام کی کچھ خصوصیات نے انہیں دوسروں سے ممتاز بنادیا ہے- ضرب الامثال اور محاورات کا برجستہ استعمال ‘مختلف زبانوں کے اشتراک سے ایک ایسی زبان میں شعر کہنا جو خود اپنی مثال ہو‘ قارئین وسامعین دونوں کی تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے‘ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو شاعر کو عوام وخواص دونوں میں مقبول بنادیتی ہے-" ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں "شہباز صاحب کی شاعری میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی لیکن بنیادی طور پر وہ

مزاح نگار ہیں۔ان کے مزاح میں طنز اس طرح شامل ہے جیسے پھول میں خوشبو۔"

شہبازؔ امروہوی کے چند قطعات ملاحظہ ہوں:-

عیاں ہے سازِ ظرافت سے سوزِ دل میرا نہاں ہے دل کی لگی ٬دل لگی کے پردے میں
یہ قہقہے نہیں شہبازؔ میرے نالے ہیں بہار ہا ہوں میں آنسو ہنسی کے پردے میں

------

کمال حکمت سے کہہ رہے ہیں وہ اپنی گولیاں بنا کر
خدا نے چاہا تو اب نہ لاحق کسی کو آزارِ جنگ ہوگا
نہ زن ٬زمیں اور زر رہے گا ٬نہ سر میں سودا ٬نہ سر رہے گا
نہ لڑنے والے رہیں گے باقی ٬نہ گرم بازارِ جنگ ہوگا

-----

کپڑوں کے لیے استری اک دن جو منگائی نادان ملازم مرا لے آیا لگائی
واللہ ستم ڈھاتی ہے معنی کی یہ تفریق ہے رام دُہائی تری ٬ہے رام دُہائی

----

گم نام ہوں یارب مجھے شہرت دے دے اس جنسِ فرومایہ کو قیمت دے دے
جنت میں جو مسند نہیں کوئی نہ سہی دوزخ ہی میں کرسی صدارت دے دے

------

بجھتے ہی پنڈت جواہر لال کی شمع حیات ہو گئے مدھم سیاسی محفلوں کے سب چراغ
یوں تو بحرِ ہند کا ہر ذرہ ہے ذرِ شاہوار تھا جواہر لال لیکن ایک لعلِ شب چراغ

-----

تنخواہ کی قلت کا شکوہ کرتے ہوئے کل جو کہتا تھا
دلچسپ تھی اے شہبازؔ بہت یہ بات اک دفتر والے کی
اُوپر سے جو ہم کو ملتا ہے ٬سرکار کا اس میں احساں کیا
وہ حق ہے ہماری کرسی کا ٬یا دین ہے اُوپر والے کی

شہبازؔ امروہوی کے چند اور قطعات ملاحظہ ہوں۔

دیکھا جو مجھ کو کورٹ میں کہنے لگے کلرک ۔۔۔ یارو! شکار آیا ہے اس کو کھسوٹ لو
جمشیدؔ جی یہ بولے کہ موٹا ہے یہ کسان ۔۔۔ رشوت میں اس سے بڑھیا سی بیلوں کی جوٹ لو
فرمایا جیکسن نے کہ جھنجٹ میں مت پڑو ۔۔۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ سو سو کے نوٹ لو
بولے یہ شیر سنگھ کہ بزدل ہیں آپ لوگ ۔۔۔ میری تو رائے یہ ہے کفن بھی کھسوٹ لو
حسنؔ نے کانپ کر کہا یارو کرو نہ شور ۔۔۔ جو کچھ بھی تم کو لینا ہے پردے کی اوٹ لو
نتھو کڑک سے بولے کہ ڈر کی ہے بات کیا ۔۔۔ اپنا ہی اب تو راج ہے ڈنکے کی چوٹ لو

شہبازؔ امروہوی کے ساتھ ساتھ یہاں پر ان کے داماد جناب جمالؔ احمد نظامی کا ذکر نہ کیا جائے تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ جمال احمد نظامیؔ میرے بھی قریبی دوست اور ہم جماعت تھے۔ طنز و مزاح میں جمالؔ احمد نظامی کا کوئی ثانی نہ تھا۔ جمالؔ احمد نظامی اور شہبازؔ امروہوی امروہہ کی دو لازم و ملزوم شخصیتیں تھیں بلکہ سونے پر سہاگا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کسی محفل میں جب یہ دونوں حضرات ہوتے تو محفل کی رونق دوبالا کردیتے تھے۔

-☆☆-

**شوخؔ:** نام سید علی متقی خاں نقوی اور تخلص شوخؔ تھا۔ آپ سید علی مجتبیٰ رئیس امروہہ کے فرزند تھے۔ آپ عربی و فارسی کی معقول استعداد رکھتے تھے اور انگریزی بھی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ آپ امروہہ میونسپل بورڈ کے ممبر اور حکومت برطانیہ کے درباری بھی رہے ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی طبیعت اور سنجیدہ مزاج کے مالک تھے۔ محلہ گنج کی مسجد کے پیش امام بھی تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے جب پہلی مرتبہ ہمدرد جاری کیا تو آپ بھی عملہ ادارت میں شامل تھے۔ فن شاعری میں سید محسن حسین تحیؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی غزل کے تین شعر جو گلدستہ "اعجاز" میں شائع ہوئے۔ ملاحظہ ہوں۔

الم کیا انتہا ہو جس الم کی ۔۔۔ ستم کیا کوئی حد ہو جس ستم کی
زہے قسمت مرا قاتل بنا وہ ۔۔۔ جہاں میں دھوم تھی جس کے کرم کی
اسی نے دل دکھایا خوب اے شوخؔ ۔۔۔ توقع ہم نے کی جس سے کرم کی

-☆☆-

**شیدا:** آپ کا نام سید علی مہدی خاں اور تخلص شیدا تھا- آپ سید علی منتظم خاں کے فرزند تھے - آپ کے والد بھی ایک اچھے شاعر تھے - شیدا نے اپنے والد اور اپنے عزیزوں سے تعلیم حاصل کی - اس کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی - انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے اطراف شعر و سخن کا ماحول پایا جس کا آپ کی طبیعت پر بھی اثر ہوا- آپ آغاز جوانی میں شعر کہنے لگے تھے - فن شاعری میں منشی امیر احمد مینائی امیر لکھنوی کی شاگردی اختیار کی - ابتدا میں تخلص شیدا بعد میں ناظم اختیار کیا- آپ کی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

انجام برا ہے عاشقی کا مائل نہ ہو دل کہیں کسی کا
بولے وہ مری لحد پہ آکر انجام یہی ہے عاشقی کا
کیا جلد گذر گئی شبِ وصل نکلا ارمان کچھ نہ جی کا

-☆☆-

**شیدا:** نایاب احمد نام تخلص آپ کا شیدا ہے - آئی - ایم - انٹر کالج امروہہ سے آپ نے میٹرک کے بعد انٹر کیا- شعر و سخن کا ذوق طالب علمی سے ہوا- آپ مرحوم کوثر القادری امروہوی اور اب مشہور شاعر غمگین امروہوی کے شاگرد ہیں- نعت، منقبت، اور غزل کہتے ہیں لیکن گیتوں کی طرف آپ کی طبیعت زیادہ مائل ہے - ملاحظہ ہوں آپ کے چند اشعار ؎

میں تری چاہ میں شعلوں سے گزر جاؤں گا اور اک رنگ وفا پیار میں بھر جاؤں گا
جب ترے نقش قدم پر میں بکھر جاؤں گا تیری زلفوں کی قسم اور سنور جاؤں گا
حشر میں تم بھی جفاؤں کا نہ کرنا اقرار مجھ سے پوچھے گا خدا میں بھی مکر جاؤں گا

-☆☆-

**شوق:** حکیم محمد اسرار الحق نام اور تخلص شوق تھا- آپ حکیم مولوی عبدالقیوم کے فرزند تھے - سکونت آپ کی محلہ قریشی میں تھی - فن شاعری میں حضرت اصغر علی ثابت امروہوی کے شاگرد تھے - "گلشن سخن" امروہہ ۱۸۹۳ء سے غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہستی کے نام سے وہ ہونٹ خفا ہوتے ہیں سادگی پر تری سو رنگ فدا ہوتے ہیں
دل سے اس بت کی کریں دفع کدورت کیونکر نقش پتھر کے کسی سے بھی جدا ہوتے ہیں

زلف شب رنگ کے عاشق ہیں مگر سودائی　　بیٹھے بٹھلائے گرفتار بلا ہوتے ہیں
کب ملے روضۂ حضرت کی زیارت اے شوقؔ　　بندگی قید سے کس وقت رہا ہوتے ہیں

-☆☆-

**شکیبؔ:** منشی عبدالرب نام اور تخلص شکیبؔ تھا- آپ شبیر علی محلہ شیش محل کے فرزند تھے- آپ فارسی کے عالم تھے اور علمی استعداد کامل رکھتے تھے- فن شاعری میں آپ سید ابوالحسن ساکتؔ کے شاگرد تھے- بسلسلہ ملازمت کچھ عرصے آپ راج پوتانہ کی کسی ریاست میں بھی رہے اس کے بعد امروہہ آگئے- ہندوستان کے گلدستوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا- آپ کی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں نے کب شکوہ کیا گھر غیر کے جانے لگے　　کیوں نظر نیچی ہوئی کیوں آپ شرمانے لگے
آئے تھے جس بزم سے کل ہوکے رسوا و ذلیل　　آج اسی محفل میں پھر ہم خود بخود جانے لگے
ہے غنیمت کون کہتا تھا یہ دن ہوںگے نصیب　　ہم وہاں جانے لگے اور وہ یہاں آنے لگے

-☆☆-

**صوفیؔ:** جناب صوفی علیم اللہ نام اور تخلص صوفیؔ تھا- علیم اللہ صوفی ذوقؔ دہلوی کے شاگرد تھے- نومبر ۱۸۹۵ء کے شمارہ نسیم چمن میں شائع آپ کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے ؎

صدمے تو ہجر کے ہوں دل پائمال پر　　غیروں سے مشورے ہوں تمہارے وصال پر
زلفیں پڑی ہیں ایسی ترے گورے گال پر　　بیٹھا ہو جیسے زہر بھرا سانپ مال پر
پازیب پہنے قبر پہ میری نہ آئیو　　مردے اچھل پڑیں نہ کہیں تیری چال پر
حور و ملک کی دید کی خواہش نہیں رہی　　مرتا ہوں جب سے صوفیؔ میں اس خوش جمال پر

-☆☆-

**ضامنؔ امروہوی:** سید ضامن علی نقوی منشی سید عظمت علی محلہ کالی پگڑی کے فرزند ہیں- سنہ ۱۹۳۰ء میں آپ کی ولادت ہوئی- آپ اولاد شاہ شرف الدین شاہ ولایتؒ سے تعلق رکھتے ہیں- آپ کے والد منشی عظمت علی امام المدارس کے ان اساتذہ میں تھے جن سے ان کے شاگرد محبت کرتے تھے اور دلوں میں ان کا احترام تھا- اپنے پدر بزرگوار کی طرح سید ضامن علی بھی سنہ ۵۳ء سے ۱۹۹۱ء تک امام المدارس انٹر کالج میں استاد

رہے اور اپنے شاگردوں میں بہت مقبول ہوئے۔ آپ برسوں تک انجمن اساتذہ کے صدر رہے اور انجمن کے مفاد میں جیل بھی گئے۔

کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ دار العلوم سید المدارس امروہہ کے سکریٹری ہوئے اور اب جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن تحفظ عزاداری امروہہ کے نائب صدر، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری اور آڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ انجمن وظیفہ سادات و مومنین کے تین سال تک ممبر رہے اور اس انجمن کے سالانہ جلسہ میں ممبر انجمن کے بارے میں تعارفی نظمیں پڑھتے رہے ہیں۔ آپ کو شاعر انجمن کے خطاب سے بھی نوازا گیا اس کے ساتھ بہترین استاد کا اعزاز بھی کئی بار پاچکے ہیں۔ اب آپ بزم حیات امروہہ کے سکریٹری ہیں۔

سید ضمانت علی ایک اچھے زود گو شاعر ہیں اور ضامنؔ آپ کا تخلص ہے۔ یوں تو ان کو شاعری کی اصناف پر قدرت حاصل ہے مگر غیر مقدی نظمیں بہت اچھی لکھتے ہیں۔ حال ہی میں 'میں نے آپ کے کلام کے بارے میں رام ناتھ شرما کو لکھا تھا کہ وہ مجھے ان کی ایک غزل بھجوادیں تاکہ شاعروں کے باب میں ان کے ذکر کے ساتھ ان کی ایک غزل بھی نمونہ کلام کے طور پر لکھوں۔ حیرت ہے کہ انہوں نے نمونۂ کلام بھی ایسا بھیجا کہ مجھ ناچیز سے منسوب ہے۔ اس ذرہ نوازی اور محبت کا میں تہہ دل سے ان کا ممنون اور شکر گزار ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے میں ناچیز اس قابل تو نہیں تھا۔ یہاں آپ کا کلام لکھتے ہوئے بھی اپنی خود نمائی کا احساس ہو رہا ہے۔ بہر حال آپ نے اتنی محبت سے لکھا ہے تو میرا فرض ہے کہ آپ کو بھی دکھاؤں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آپ جو آئے تو گلزار و گلستاں مہکے — آرزو دل کی بر آئی تو دل و جاں مہکے
ذات والا کی مہک دور تھی اب پاس ہوئی — دیکھ کے آپ کو امروہہ کے انساں مہکے
جام نکہت کے چھلکتے ہیں بھری محفل میں — نکہتِ دید سے ہر قلب کے ایواں مہکے
آپ کے نام میں شامل ہیں جو احمد و حسین — کیوں نہ اس نام سے ہر ایک کا ایماں مہکے
آپ کے نور سے روشن ہوئے امروہہ کے دن — رخ کی خوشبو سے ہمارے تو شبستاں مہکے
ہاتھ میں جب قلم آیا ہے برائے تحریر — بخدا لکھنے سے پہلے ہی قلمداں مہکے
علم تاریخ پر حاصل ہے عبور کامل — ایک تصنیف سے تاریخ کے عنواں مہکے
آپ کی ذات گرامی سے جو منسوب ہوئے — ان کے اشعار ضمانتؔ کے سخنداں مہکے

-------

اسی طرح ایک نظم پہلے بھی میری کتاب "گوہر بحیرۂ عرب" کی رسم اجرا کے موقعے پر لکھ چکے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

خوب لکھی ہے سندھ کی تاریخ — اپنی صورت کی اک نئی تاریخ
وہ جو بحر عرب کا گوہر ہے — اس کراچی کا اس میں منظر ہے
ہے عبارت سلیس اور سادہ — کیوں نہ پڑھنے پہ دل ہو آمادہ
ذکر اس میں مصنفین کا ہے — اور اپنی بھی سر زمین کا ہے
اپنے امروہہ کے ہیں باشندہ — جن سے نام وطن ہے تابندہ

-☆☆-

**طپش:** سید نذر الحسن نام اور تخلص طپش تھا۔ آپ سید ناصر علی محلہ گذری کے فرزند اور حضرت ناسخ کے شاگرد تھے۔ ناسخ کی وفات کے بعد میر عشق کی شاگردی اختیار کی۔ طپش ایک نہایت پر گو شاعر تھے جن کو امروہہ اور ہندوستان کے شعراء میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ آپ کو تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ موصوف امروہہ میں استادانہ حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی غزلوں کے تین مختلف اشعار ملاحظہ ہوں۔

سیکڑوں ہوں گے وہاں چاک گریباں قاصد — اس کے کوچے کا یہ ہم تجھ کو پتہ دیتے ہیں
ہر قدم پر دست وحشت نے نئی بیداد کی — چپ ہوا تو پاؤں میں زنجیر نے فریاد کی
رقیب بیٹھا ہے محفل میں یار کے بدلے — خزاں چمن میں ہے گویا بہار کے بدلے

-☆☆-

**طاہر:** پروفیسر طاہر حسین نقوی کی ولادت ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو امروہہ میں ہوئی۔ محلہ سٹی کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم جے پور میں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ایم اے پاس کیا۔ منشی ادیب فاضل اور طبیب فاضل کے امتحانات اعلیٰ نمبروں سے پاس کیے۔ مہاراجاز کالج جے پور میں اردو فارسی کے پروفیسر رہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحان میں ٹاپ کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ایس ایم کالج، اسلامیہ کالج کراچی، ممتاز کالج خیرپور میں پروفیسر رہے اور گورنمنٹ کالج نواب شاہ سے ریٹائر ہوئے۔ نوجوانی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ آپ کو کسی سے تلمذ نہ تھا بلکہ تلمیذ رحمانی ہیں۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، قصیدے اور سلام

بہت خوب کہتے ہیں۔ابتدائی شاعری کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

اب نظر آتے ہیں زاہد راہ پر آتے ہوئے　　تا در میخانہ آ جاتے ہیں سمجھاتے ہوئے
ان کی چشم مست کی گردش سے دیکھا بزم میں　　رند کو گرتے ہوئے ساغر کو ٹکراتے ہوئے

آج کے عہد کی غزل کے چند شعر۔

اس بت نا آشنا سے دل ہمارا کیا لگا　　دوست سب دشمن لگے ہر اپنا بیگانا لگا
تند خو تو تھا مگر ظاہر نہ جانے آج کیوں　　حرف حرف اس کا شرر ہر لفظ انگارا لگا

-☆☆-

ظفر: نام منشی ظفر علی تلمیذ جناب تحی امروہوی۔آپ کی غزل کے تین شعر جو "بزم سخن" جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی تھی۔

سوز وگداز عشق سے جینا محال ہے　　یاں شوق اضطراب انہیں عذر وصال ہے
کیا شکوہ آسمان جو کرتا ہے ظلم و جور　　اوندھا بنا ہے اوندھی ہی ظالم کی چال ہے
ممکن نہیں کہ طائر دل بچ سکے ظفر　　پھیلا وہ رخ پہ زلف پریشاں کا جال ہے

-☆☆-

ظفر: سید ظفر الوحید رضوی نام اور تخلص ظفر ہے۔سنہ ۱۹۴۳ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ بدر الوحید رضوی کے فرزند ہیں جن کی سکونت محلّہ پیرزادہ میں تھی۔سنہ ۱۹۶۵ء میں ظفر نے کراچی یونیورسٹی سے (Marine Zoology) میں ایم ایس سی کیا۔اس کے بعد سنہ ۱۹۷۰ء میں جاپان سے Fisheries میں خصوصی مہارت حاصل کی۔شعر و سخن کا ذوق گھر کے ماحول سے ملا۔یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عمر میں آپ شعر کہنے لگے تھے۔آجکل آپ امریکہ کی ایک چھوٹی سی بستی سیاٹل میں مقیم ہیں جہاں بزم ادب کے سرگرم کارکن بھی ہیں۔آپ کا مجموعہ کلام "آگ کے پیوند" شائع ہو چکا ہے۔آپ کی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو۔

کل اہل رفتگاں کے مدفن سے تھا گزر
کچھ پھول چمن کے پھولوں پہ رکھتا رہا ظفر

لو حیں تھیں اور کچھ بھی نہ تھا آخری نشاں
کتبات تھے اور اس پہ لکھی سادہ داستاں
یوم وصال و یوم ولادت کے درمیاں
اک مختصر لکیر عبارت کے درمیاں
شاید یہ ہے لکیر جسے کہتیں زندگی

-☆☆-

علیؔ: سید علی نظر نام اور علیؔ تخلص تھا۔ ان کے والد سید بھیکا محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں منصبدار تھے۔ رہائش سنبھل میں تھی۔ علی نظر بھی امروہہ کے ان سیکڑوں شاعروں کی طرح نظروں سے نہاں رہے جن میں سے بہت سوں کا تو آج تک پتہ بھی نہیں۔ مولانا محمد عبادت کلیم نے پہلی مرتبہ ان کو دریافت کیا اور ایک تعارفی مضمون پاکستان کے "مہر نیم روز" میں شائع کرایا پھر اس کے بعد ڈاکٹر محمد سیادت نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے لیے علیؔ نظر کو منتخب کیا جو بریلی کالج نے منظور کر لیا۔ یہ مقالہ "علیؔ نظر۔ حیات و شاعری" شائع بھی ہو چکا ہے۔

علیؔ نظر کی پیدائش ۱۱۹۳ھ کے آس پاس بتائی گئی ہے۔ وہ میر تقی میرؔ کے معنوی استاد سعادت امروہوی محلہ حقانی کے شاگرد تھے۔ سعادت کے انتقال کے بعد ولی دہلوی سے اصلاح لی۔ ان کا مجموعہ کلام "دیوان علیؔ نظر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس طرح اسمٰعیل امروہوی شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار تھے اسی طرح علیؔ نظر وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے منظوم سفرنامہ لکھا ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں ؂

ہوا جو کچھ سو دیکھا اے علیؔ ہو گا سو دیکھیں گے — نظر میری خدا جانے سوئے تقدیر رہتی ہے
حال دل خواہ مخواہ مت پوچھو — دل کا دل ہے تباہ مت پوچھو
پانی کی طرح یار کو ہر رنگ میں دیکھا — مانند شرر سینۂ ہر سنگ میں دیکھا
اگر ڈھونڈتے دل کو سینہ میں یاراں — نہ پاتے نہ پاتے نہ پاتے نہ پاتے

واسوخت ملاحظہ ہو ؂

ٹک سنو حسن سے اے یار گرفتاری دل — قصۂ سوز و الم درد و دل افگاری دل
ہچکی پہ ہچکی اور شام و سحر زاری دل — نالہ و آہ و فغاں شورش و خوں باری دل

واں نہ کچھ چل سکی عیاری و طراری دل　　خاک میں مل گئی سب خویشی خودداری دل

دل کا کیا کہیئے اسے خوار ان آنکھوں نے کیا
کشتہ و زار و دل افگار ان آنکھوں نے کیا

-☆☆-

**عاصی:** سید صدیق حسن رضوی نام اور تخلص عاصی رضوی ہے۔ آپ شاہد حسن رضوی محلہ پیرزادہ امروہہ کے فرزند ہیں۔ آپ کی پیدائش حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے امروہہ میں حاصل کی اس کے بعد بی۔کام آگرہ یونیورسٹی سے کیا۔ بچپن ہی سے شعری ذوق ہے۔ آپ غزل، نظم، قطعات، رباعیات، دوہے، ہائیکو اور مزاحیہ کلام پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ کی پسندیدہ صنفِ غزل ہے۔ آپکا کلام ملاحظہ ہو ؎

جب بھی خود آگہی پیدا ہوئی دیوانوں میں　　زلزلہ آ گیا شاہوں کے شبستانوں میں
ہم نے تو صرف سر دار جلائے تھے چراغ!　　کھلبلی مچ گئی کیوں ظلم کے ایوانوں میں
وہ کریں کسکے لیے آتش نمرود کو سرد؟　　کوئی آذر کا پسر اب نہیں بتخانوں میں
تم نے ہستی ہی کو جب قید بنا رکھا ہے　　کس لیے لوگوں کو لے جاتے ہو زندانوں میں
دے گئی انکو بقا عشق کی شوریدہ سری　　اب نہ لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے بیابانوں میں
میکشی شیوۂ ارباب نظر تھی پہلے　　اہل دل اب کہیں ملتے نہیں میخانوں میں
رسم و تقلید ہے، بدعت ہے، ریاکاری ہے　　صرف اسلام نہیں آج مسلمانوں میں
اب بہاروں سے جنوں کا کوئی رشتہ نہ رہا　　دست عشاق سدا پائے گریبانوں میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے لب ساحل عاصی　　جنکو بچنا ہے وہ بچ جاتے ہیں طوفانوں میں

دوہا

ہاتھوں کا گجرا، نینوں کا کجرا، مانگ بھرا سیندور
سب کے رنگ ہیں پھیکے سجنی۔ جب تک ساجن دور!

-☆☆-

**عظیم امروہوی:** سید عظیم حیدر نام اور تخلص عظیم ہے۔ آپ حاجی سید معجز حسن کے پوتے اور نورالحسن مرحوم (محلہ مجاپوتہ) کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ ۲۹؍اپریل ۱۹۴۵ء مطابق ۱۶؍جمادی الاول ۱۳۶۴ھ

کو پیدا ہوئے۔ ابھی ڈھائی سال کے ہوئے تھے آغوش مادری سے محروم ہوگئے۔ آپ کی پرورش اپنے ننھیال محلہ دربار شاہ ولایت (لکڑہ) کے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ نام و تخلص کی مناسبت سے واقعی آپ عظیم ہیں۔ ڈاکٹر عظیم حیدر دور حاضر کے ہونہار اور خوبصورت مرثیہ نگار ہیں۔ آپ اولاد شاہ شرف الدین شاہ ولایتؒ سے تعلق رکھتے ہیں۔ عظیم حیدر کے جد امجد سید عبدالمجید عرف میر مجا امروہہ کی ممتاز و معروف شخصیت تھے۔ امروہہ کا محلّہ مجاپوتہ آپ کے جد امجد کا ہی بسایا ہوا ہے۔

آپ نے میٹرک امام المدارس امروہہ، انٹر ہندو کالج اور بی۔کام لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ دوران ملازمت ادیب کامل، دبیر فاضل اور ایم اے کیا۔ کم سنی ہی میں شعر و شاعری کا ایسا چسکا لگا کہ ۱۰ سال کی عمر میں ہی شعر موزوں کرنے شروع کر دیے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ نظم، قصیدہ، منقبت، سلام، نوحہ اور مرثیے میں بھی طبع آزمائی کی۔ فضل نقوی سے کلام پر اصلاح لی اور بعد میں حضرت مولانا سید محمد عبادت سے تلمذ کی سعادت حاصل کی۔ عظیم کی بہت سی تصنیفات طبع ہو چکی ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں مرثیہ نگارانِ امروہہ کراچی میں شائع ہوئی۔ وہ جدید اور قدیم مرثیہ نگاروں میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ مرثیہ پر انہوں نے تحقیق بھی کی ہے اور ان کی کتاب "مرثیہ نگاران امروہہ" بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی ادبی تاریخ ہے جس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی مگر ان سے پہلے اس اہم کام کو کوئی انجام نہ دے سکا۔

آپ کی تصانیف میں "حدیث غم" "حسین اور زندگی" "مرثیہ عظیم" شامل ہیں۔ ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین، ریڈیو کی تقاریر اور مذہبی مضامین طباعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ عظیم ایک اور اہم تحقیق کام انجام دے رہے ہیں اور وہ ہے صحافت میں امروہہ کے لوگوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنا۔ انشاءاللہ جب یہ کتاب مکمل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آئے گی تو ہمیں اپنے ممتاز صحافیوں کی کاوشوں کا صحیح شعور حاصل ہو سکے گا۔ عظیم مزاجی اعتبار سے ایک محقق، ایک تاریخ نویس، ایک منفرد نثر نگار اور ایک نادرہ کار شاعر ہے جس کو ہر صنف سخن پر کامل دسترس حاصل ہے۔ ایک مرثیہ ملاحظہ ہو ؎

اس شان سے واپس ہوئے یہ فاتح ایام　　ظالم کی اڑی نیند چھنا چین اور آرام
گل ہوگئے باطل کے دیے شام سے تاشام　　معلوم زمانے کو ہوا ظلم کا انجام
یوں خاک کیا سطوتِ شاہی کے بھرم کو
بستر پہ بھی اب چین نہیں ظلم و ستم کو

باقی نہیں اب ظلم کے ترکش میں کوئی تیر    اک لاغر و بیمار کو پہنائی ہے زنجیر
بے گور و کفن بھائی ہے بے پردہ ہے ہمشیر    مٹنے سے بچایا ہے مگر نعرہ تکبیر
پیاسوں کی وہ آواز وفا چھائی ہوئی ہے
اس حلق بریدہ کی صدا چھائی ہوئی ہے

اس غم سے تو فطرت کی کمر ٹوٹ گئی ہے    روتا ہے فلک اور زمیں چیخ رہی ہے
اور چلتی ہوئی نبض ہواؤں کی رکی ہے    اک آہ سمندر کے کلیجے سے اٹھی ہے
دل اپنا سنبھالے ہوئے صحرا بھی کھڑے ہیں
دریاؤں کے سینوں پہ بھی چھالے سے پڑے ہیں

ہر غم کو زمانے کے بھلائے گا یہی غم    ہر غم کیلیے غم یہی بن جائے گا مرہم
اس غم پہ تو خود دیدۂ قاتل بھی ہوا نم    فطرت نے بھی اس غم پہ کیا گریہ و ماتم
اس غم سے سدا ظلم بھی شرمندہ رہے گا
مر جائیں گے سب اور یہ غم زندہ رہے گا

-☆☆-

**غنچہ امروہوی:** امروہہ شعر و سخن کی ایسی بستی ہے جہاں اتنی تعداد میں شعرا پیدا ہوئے کہ ان کا شمار کرنا بڑا مشکل نظر آتا ہے- اس وقت بڑی حیرت ہوتی ہے جب کسی قدیم کتاب یا کسی رسالے میں امروہہ کے کسی شاعر کا تذکرہ یا اس کا کلام مل جاتا ہے- یہاں ملتان شہر کے ایک رسالہ "ملتان قدیم و جدید" سنہ ۱۹۶۸ء میں امروہہ کے ایک شاعر کا ذکر ملتا ہے جو ملتان میں نہ جانے کب سے مقیم تھے- ان کے بارے میں جو کچھ تحریر ہے جوں کا توں پیش ہے ملاحظہ ہو- "غنچہ امروہوی ملتان میں نہ جانے کب سے مقیم تھے- بہر حال ۱۹۴۲ء میں یا اس کے لگ بھگ وفات پائی- ملتان چھاؤنی میں ان ہی کی وجہ سے شاعری کو فروغ حاصل ہوا- ملتان سے ایک ادبی رسالہ "باغ و بہار" نکالا- ناطق جالندھری کے ہمعصر تھے- اس لیے ملتان شہر اور چھاؤنی میں ان کے علیحدہ علیحدہ مشاعرے ہوا کرتے تھے-"

غنچہ امروہوی آپ کا تخلص تھا اور آپ کا نام منشی وہاب احمد صدیقی تھا- آپ دلشاد علی کے فرزند اور اصغر علی ثابت رامپوری کے شاگرد تھے- آپ کے تین شعر ملاحظہ ہوں جو اس رسالے میں شائع ہوئے تھے-

صورت میں آدمی کی کچھ ایسی دلکشی ہے　　گویا بنانے والا بیٹھا ہے آدمی میں
اے شمع رود کھادے تو اپنا روئے روشن　　تقدیر کے لکھے کو میں پڑھ لوں روشنی میں

--

فرقت کی رات دردِ الم کربِ انتظار　　جھونکا غضب بھرا اس پہ نسیم بہار کا

-☆☆-

**غمگین:** نام سجاد حسین تخلص غمگین سنہ ۱۹۲۶ء کو امروہہ کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے- آپ کے والد طاہر حسین صاحب طاہر امروہوی ایک نامور شاعر تھے- یہی وجہ ہے کہ غمگین امروہوی کو ذوقِ شعر و سخن ورثہ میں ملا ہے- ابتدا میں والد محترم سے اپنی کاوشوں پر اصلاح کا شرف حاصل کیا- اس کے بعد بر صغیر کے مشہور و معروف استاد شاعر حضرت مولانا شہباز امروہوی سے تلمذ کی سعادت حاصل کی- کلاسیکی انداز میں روائتی غزل پر بھی بھرپور طبع آزمائی کرتے ہیں- نعت' غزل' منقبت' چار بیت' خمسہ' مسدس' نظم' نوحہ' گیت وغیرہ مختلف اصناف سخن میں بڑی مہارت ہے-

غمگین ملکی و شہری سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں- آپ کانگریس کمیٹی (آئی) امروہہ کے مدتوں صدر رہے- انجمن بستانِ ادب' بزم شہباز' بزم مصحفی' ادبی سنگم اور بزم حیات کے صدر' سرپرست اور اہم رکن رہے- آپ کی غزل ملاحظہ ہو-

کیوں نہوں اسکو دل و جاں سے وہ پیارے پتھر　　تیری بستی میں جو دیوانے کو مارے پتھر
دل کو راحت نہ ملی تیرے تصور سے تو پھر　　تیری تصویر کے سانچے میں اتارے پتھر
بزم انساں میں جو پہنچے تو خدا کہلائے　　ایک فنکار نے کچھ ایسے سنوارے پتھر
تاج کی شان کوئی تاج محل کی زینت　　کوئی ٹھوکر میں ہو کہلاتے ہیں سارے پتھر
دور حاضر کے رفیقوں سے ہیں بہتر غمگین　　کچھ نہ کچھ کام تو آتے ہیں ہمارے پتھر

-☆☆-

**فرحتی:** میر محمد عبید اللہ نام اور فرحتی تخلص تھا- آپ سنہ ۱۸۵۹ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے- پیدائش کے چند سال بعد فرحتی اپنی والدہ کے ساتھ پشاور چلے گئے جہاں آپ کے والد مولوی محمد عبد اللہ عباسی بعہدہ بخشی گری

محکمہ پولیس سرکار انگریزی پشاور میں تھے-سنہ۱۸۶۶ء میں آپ کی والدہ رحلت فرما گئیں-فرحتی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور چند کتب عقائد مذہبی اور قرآن مجید بقرأت صحیحہ مفتی صدرالدین سے پڑھا-اس کے بعد اپنے والد کے ساتھ امروہہ واپس آگئے-سنہ۱۹۴۸ء میں آپ کا فارسی دیوان "دیوانِ فرحتی) شائع ہوا-اسی دیوان کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

بغیر دید تو در دیدہ روشنائی نیست — سوائے مہر تو در دل وگر ہوائی نیست
بسا بگشتہ ام اندر جہان دلے بخدا — مثال تو بت بے مہر ور خدائی نیست
مقیدان جہان راست آرزوئے خلاص — اسیر دام ترا خواہش رہائی نیست
فروتنی و تحمل شعار کن صوفی — کہ سرکشی وخودی شیوۂ گدائی نیست
مدار فخر دو عالم بہ جامۂ فقر ست — کہ قدر کبر بدرگاہ کبریائی نیست
ستائش سخن خویش فرحتی کم گیر — کہ در طریقت ما رسم خودستائی نیست

-☆☆-

فرخ: اظہار الحق نام تخلص فرخ محلہ ملانہ جائے سکونت تھی-آپ کی غزل کے چند اشعار جو "بزم سخن" جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی تھی-ملاحظہ ہوں ؎

جو کل فلک پہ بدر تھا وہ اب ہلال ہے — سچ ہے کہ ہر کمال کو آخر زوال ہے
جس پر نگاہ کی اسے تسخیر کر لیا — یہ اک ذرا سی بات ہے ادنیٰ کمال ہے
وہ وقت نزع آئے ہیں فرخ کو دیکھنے — لو آج جن کے ہجر میں اپنا وصال ہے

-☆☆-

قائم: سید ظریف الحسن نام قائم تخلص تھا-آپ سید ظفر حسن محلہ لکڑہ کے فرزند تھے-کہا جاتا ہے کہ نہایت پُرگو اور اچھے شاعر تھے-سنا ہے کہ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں-حکومت پاکستان کے محکمہ خارجہ میں ملازم تھے-ملازمت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے زیادہ تر مشرق وسطیٰ میں قیام رہا اور غالباً وہیں انتقال بھی ہوا اور وہیں مدفون ہیں-کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی-آپ کی ایک غزل اور ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

آوارۂ بادہ نوشی ہوں چھلکا چھلکا کر پیتا ہوں — ساون کی فضاؤں کے اوپر مستی برسا کر پیتا ہوں

ہنگام سحر جب گلشن میں پھولوں کا میلہ لگتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ گلزار کی کمسن کلیوں کو پیمانہ بنا کر پیتا ہوں
پانی کے حسیں آئینے میں جب قوس قزح لہراتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ میں گنگا جمنی موجوں میں کشتی ٹھہرا کر پیتا ہوں
جب چاندرو پہلی رتھ لیکر چاندنی برسانے آتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ فطرت انگڑائی لیتی ہے میں موقع پا کر پیتا ہوں
جب گردوں پر مہ پاروں کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ اک پردہ نشیں کے جلوؤں سے دل کو بہلا کر پیتا ہوں

-☆☆-

**قوؔی:** سید لائق حسین نام اور تخلص قوؔی تھا- مشہور و معروف استاد مومن حسین صفؔی محلہ گذری کے فرزند تھے- کئی نسلوں سے خوشنویسی اور شاعری ان کے خاندان کا طرہ امتیاز رہی ہے- ان کے پردادا ''شجراتِ سادات امروہہ'' کے مولف مولوی سید بشیر حسن کے مطابق قوؔی کے پردادا خطِ نسخ و نستعلیق بہت اچھا لکھتے تھے- ''ان کی اولاد میں استاد ولی حسین وؔلی، مومن حسین صفؔی، محسن حسین تحؔی اور ان کے بیٹے پردتے سب کے سب سید لائق حسین قوؔی و عین الحسن جرؔی تک نہایت خوشنویس، اعلیٰ درجے کے شاعر اور کمالات کا مجموعہ تھے- خاص طور پر استاد مومن حسین صفؔی فن خوشنویسی و شعر گوئی میں دور دور اپنا جواب نہ رکھتے تھے-'' سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ کی وفات ہوئی- سید لائق حسین قوؔی اپنے عہد کے نہایت اچھے اور زود گو شاعر تھے- بلا کا حافظہ پایا تھا- دربار اکبری کے فیضی کی طرح طویل سے طویل نظم ایک بار سن کر یاد ہو جاتی تھی- موصوف نے امیر خسرؔو کی فارسی حمد کا ترجمہ اردو میں جو کیا ہے وہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں، قدرتِ زبان اور بیان کی روانی کی اعلیٰ مثال ہے- ان کے بھتیجے ترغیب بلند نے اس ترجمے کو اپنی مرتبہ کتاب ''سرمایۂ شعرا'' میں پیش کیا ہے- ان کا کلام یوں تو کہیں میسر نہیں جبکہ ان کے شاگردوں کا کلام امروہہ اور اطراف امروہہ سے شائع ہونے والے مختلف گلدستوں میں شائع ہوتا رہا ہے لیکن ان کے کچھ اشعار جو ہمیں مختلف ذریعوں سے خصوصاً ''سرمایۂ شعراء'' سے جو حاصل ہوئے ہیں پیش خدمت ہیں ؎

گرمیِ گفتار مشکل تھی، قوی! بے سوزِ عشق ‏ ‏ ‏ ‏ رات دن جلنا پڑا آتش بیانی کے لیے
چراغ لحد کیا سمجھ کر بجھایا ‏ ‏ ‏ ‏ نہ سمجھے کہ ہے نام روشن کسی کا
درد وہ درد ہے لب پر جسے لا بھی نہ سکوں ‏ ‏ ‏ ‏ زخم وہ زخم ہے دل کا کہ دکھا بھی نہ سکوں
پہلے تھیں کب سے دور بہت دل میں حسرتیں ‏ ‏ ‏ ‏ اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

-☆☆-

**قمر:** مثال احمد خاں آپ کا نام ہے- قمر تخلص کرتے ہیں اور جمالی ان کی کنیت ہے- ۲۵ر جنوری ۱۹۲۵ء کو محلہ کوٹ امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد جمال احمد خاں امروہہ کے ایک معزز شخص تھے- قمر جمالی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد و دادا سے حاصل کی -اس کے بعد چلہ کے مدرسہ سے حافظ ظہورالحسن چاندپوری کی شاگردی میں قرآن پاک حفظ کیا پھر آپ کھیتڑی چلے گئے جہاں جے سنگھ ہائی اسکول میں پڑھا- آگرہ سے میٹرک،ادیب اور ادیب عالم کے امتحانات پاس کیے- کھیتڑی میں مولانا شفیق احمد شفق مرحوم کی صحبت ملی تو طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل ہوگئی اور شعروسخن میں طبع آزمائی کرنے لگے-امروہہ میں یوسف بچھرایونی'لاہور میں غلام مصطفیٰ تبسم اور کراچی میں مولانا انجم فوقی سے قریبی وابستگی رہی- قمر جمالی کی شخصیت خلوص'محبت اور عجز وانکسار سے عبارت ہے-ان کا سماجی شعور پختہ اور روایات کی پاسداری ان کے کردار کا حصہ ہے-ان کی شاعری میں اپنے عہد کے کرب کا احساس نمایاں ہے-سوشل کاموں میں بھی آپ بہت دلچسپی لیتے ہیں-

اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور لاہور میں قیام کیا اور یہیں میکلیوڈ روڈ پر فائن آرٹ کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی-کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد آپ کراچی آگئے - یہاں آپ نے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی قایم کی جسے ماشاءاللہ اچھی طرح وہ اور ان کے بچے چلا رہے ہیں- آپ کا کلام ''صحرا میں شجر'' منظرعام پر آچکا ہے-نمونے کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

جان دیدیں گے اس چمن کے لیے — ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں
ہم نے جو معرکۂ شام و سحر دیکھا ہے — کیا کبھی تم نے بھی اے اہل نظر دیکھا ہے
ایک ہی شمع وفا کا یہ کرشمہ دیکھیے — ان کی محفل میں اجالا اور مری محفل میں آگ ہے
میں گفتگو کروں تو کروں کس زبان میں — اس شہر میں تو کوئی میرا ہم زباں نہیں
دوستوں کی اس قدر بھرمار ہے — دشمنوں کو ڈھونڈنا دشوار ہے
اس محبت میں مسلسل تو نے کھائے ہیں فریب — اے قمر پھر بھی نہ تیرے دل کی نادانی گئی
مجھ کو معلوم نہیں کونسا گھر ہے میرا — لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ترا گھر دیکھا ہے
دنیا سنوارنے تجھے بھیجا تھا اے قمر — تو نے تو عاقبت بھی نہ رکھی سنوار کے

-☆☆-

**قیوم:** محمد عبدالقیوم نام قیوم تخلص تلمیذ جناب علی امروہوی- آپ کی غزل کے چند اشعار جو "بزم سخن" جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی تھی- ملاحظہ ہوں-

آئے ہیں میرے قتل کا بیڑا اٹھا کے وہ　　چہرہ سے خوں برستا ہے منہ لال لال ہے
اللہ ہی جانتا ہے مرے دل کے حال کو　　پہلو میں دل ہے دل میں تمہارا خیال ہے
آئیں وہ دیکھنے مجھے کیا کہہ رہے ہو تم　　قیوم کا تو ایسا ہی اس کو خیال ہے

-☆☆-

**قیصر:** قیصر امروہوی ۷ر مئی سنہ ۱۹۳۳ء کو محلہ گھیر مناف امروہہ میں پیدا ہوئے- سید قیصر علی نقوی نام اور قیصر تخلص کرتے ہیں- آپ سید اصطفیٰ علی محلہ گھیر مناف کے فرزند ہیں- سات آٹھ سال کے ہوئے تو شعر و سخن کا ذوق ہوا- آزادی کے بعد آپ پاکستان آگئے اور ادارہ ترقیات کراچی سے منسلک ہو گئے- آپ ایک اچھے شاعر ہیں اور غزل خوب کہتے ہیں- آپ کا مجموعہ کلام "لہو میرے بدن کا" کراچی سے شائع ہو چکا ہے- آپ کی ایک غزل اور چند اشعار ملاحظہ ہوں-

آئیں نہ ہمیں راس یہ گلشن کی فضائیں　　جائیں بھی اگر ہم تو کہاں لوٹ کے جائیں
گھر چھوڑے ہوئے ایک زمانہ ہوا ہمکو　　ابتک در و دیوار سے آتی ہیں صدائیں
پہلے در و دیوار پہ ہوتا تھا چراغاں　　اب گھر میں چراغوں کو بجھاتی ہیں ہوائیں
کس کربِ مسلسل میں گزرتے ہیں شب و روز　　قیصر یہ بتائیں بھی تو ہم کیسے بتائیں

------

خود شناسی کا اثر لگتا ہے　　آئینہ دیکھ کے ڈر لگتا ہے
خود پہ تنقید بہت مشکل ہے　　عیب بھی اپنا ہنر لگتا ہے
گھر نہیں ہے در و دیوار کا نام　　آپ آئے ہیں تو گھر لگتا ہے

-☆☆-

**کاوش:** سید سبطِ رسول نام اور کاوش تخلص ہے- آپ سید راحت علی محلہ پیرزادگان کے فرزند ہیں- ۱۹۳۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی- ابتدائی شاعری میں حکیم طفیل حسن سے اصلاح لی اس کے بعد حیات اللہ انصاری مدیر "قومی آواز" لکھنو سے اصلاح لیتے رہے- ابتدائی تعلیم امام المدارس انٹر کالج سے حاصل کی- اس

کے بعد ریاست جے پور میں قیام رہا جہاں مہاراجہ کے دربار سے مشہور شخصیت سید نورالحسن نے موصوف کو متبنیٰ کر لیا اور وہیں علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کی اور منشی، منشی فاضل کے امتحانات وہیں سے پاس کیے۔ نوجوانی میں انتہائی جوشیلے قوم پرست تھے جمعیۃ العلمائے ہند اور مجلس احرار اسلام کے سرگرم کارکن تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آگئے یہاں آکر آل پاکستان ٹریڈ یونین کانگریس سے منسلک ہو گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے گہری وابستگی رہی۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں سید امام علی نازش کے ساتھ طلباء کی تحریک میں اتنی سرگرمی سے حصہ لیا کہ چار سال تک جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کامریڈ حیدر بخش کی ایماپر آپ ''سندھ ہاری کمیٹی'' کے آرگنائزر اور پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ امروہہ کے مشہور شاعر شعیب حزیں کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور ان دنوں پرسکون خاندانی زندگی بسر کر رہے ہیں البتہ کار کے ایک حادثہ میں ٹانگ سے معذور ہو گئے۔

روزنامہ "امروز" کراچی اور رئیس امروہوی کے "روزنامہ شیراز" سے بھی کاوش صاحب برسوں منسلک رہے۔ کوئی شعری مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا کوشش کی جارہی ہے کہ روزنامہ "امن" کراچی میں جو کلام متواتر برسوں تک شائع ہوتا رہا ہے اس کو جمع کرکے شائع کرادیں مجوزہ مجموعہ کا نام "کالی جھنّا لال ادب" ہے خدا کرے کہ جلد سے جلد اس کی اشاعت کا انتظام ہو سکے۔ نثر کی کتابیں "عورت کے زاویے" "سامراج اور انقلاب" شائع ہو چکی ہیں۔ نمونہ کلام :-

عمر اپنی جہاد میں گذری — راہ حق العباد میں گذری
کربلا بن کے زندگی کاوش — ردِ شمر و زیاد میں گذری

شب خون کے پرچم کو لہو سے بھرلو — ترکش میں کٹے سر کڑے بازو دھرلو
سیلاب بلا خیز کے آتے آتے — جو موج ہے پایاب اسے سر کرلو

غزل

------

مقتل شب میں قتل ہمارا جب نقش بر آب ہوا — دل کا سورج خون میں بجھ کر تیغ آب و تاب ہوا
فکر و نظر کا کوئی ورق ہو یا تن من کی لال کتاب — خون سے ہم نے جو کچھ لکھا سرسبز و شاداب ہوا
کون صلیب و دار کے یارو ناز اٹھانے آئے گا — ایک قلندر سید زادہ کاوش تھا نایاب ہوا

---

جو صحرا کی تمازت میں پلے ہیں — وہی موسم ہوا بن کر چلے ہیں
چلو ہم جشن زخم سر منائیں — کہ سارے ہاتھ اب پتھر تلے ہیں
بہت مشکل سے شام غم ڈھلی ہے — چراغوں کی طرح ہم بھی جلے ہیں

-☆☆-

**کوثر نقوی:** علی کوثر نام اور تخلص کوثر ہے- قاضی سید تقی حسن محلہ قاضی گلی کے فرزند ہیں-۱۰؍ اگست ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئے- آپ کے خاندان میں عہدۂ قضا ہر اسلامی عہد میں وابستہ رہا- علم و فضل کے لحاظ سے کوثر کا خاندان ایک مقتدر خاندان رہا ہے- ان کے دادا قاضی سید علی حسن بڑے اچھے خوشنویس تھے- حاجی سید نور الحسن محلہ دانشمندان کے بڑے امام باڑے کی تمام نستعلیق تحریریں ان ہی کے کمال کا نمونہ ہیں-

کوثر ایک نہایت پر گو شاعر ہے جس کو پاکستان کے شعراء میں ایک اہم مقام حاصل ہے- اسے تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے- وہ ایک اچھا غزل گو شاعر ہے اور اس کا غزلوں کا مجموعہ "دار عشق" شائع ہو چکا ہے- احمد ندیم قاسمی نے اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کوثر کا تغزل نہایت درجہ موثر ہے- دوسرے شعراء اور نقاد سب ہی امروہہ کے اس جوان شاعر کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں- کوثر کے لہجے میں مٹھاس، بیان کی صفائی اور زبان پر قدرت غرض کہ اس کی شاعری میں روایت کی گونج اور بڑے شاعروں کی آواز کی جھنکار سنائی دیتی ہے- کوثر کی شاعری میں زندگی کے مسائل سے بہادری کے ساتھ آنکھ ملانے کا حوصلہ صاف نظر آتا ہے- کوثر نظمیں، قطعات، رعبایات اور مصرعہ تاریخ خوب کہتا ہے- اس کی غزلوں میں مجموعی طور پر رومانویت غالب ہے- مثلاً

چاند سے اس لیے میں نے تجھے تشبیہ نہ دی — اس پہ ان خاک نشینوں نے قدم رکھے ہیں
سویا تو گلابوں کو جاگا تو تجھے دیکھا — ہر خواب کو یوں فوراً تعبیر نہیں ملتی
شاید یہی ہے رسم محبت کی ابتدا — آج ان سے گفتگو میں زباں لڑکھڑائی ہے

رباعی جو ایک مشکل صنف سخن ہے اس پر بھی کوثر کی گرفت مضبوط ہے-

آنکھوں کا تری عکس یہ سب جھیلیں ہیں — جلوے ترے دل کی مرے قندیلیں ہیں
ہیں پھول نگاہوں، میں لب پر ہے شراب — یہ دونوں ترے حسن کی تمثیلیں ہیں

رثائی ادب سے متعلق تمام شعری اصناف سخن پر کوثر کو مہارت حاصل ہے- ان اصناف سخن پر مشتمل ان کا ایک

شعری مجموعہ "لب کوثر" شائع ہو چکا ہے جو ان کی جدید مرثیہ نگاری کا مستند حوالہ ہے۔ان کے مرثیہ "آگ "اور "پانی" سے دو بند ملاحظہ ہوں۔

آگ وجہ کیف بھی ہے کیف آزاری بھی ہے　　وزن میں ہلکی بھی ہے اور غیظ میں بھاری بھی ہے
منبع آفات اس کی ایک چنگاری بھی ہے　　آگ مٹی کی طرح نوری بھی ہے ناری بھی ہے
شکل ابلیسی میں ڈھل جائے تو دوزخ ہے نصیب
شکل زعفر میں بدل جائے تو جنت ہے قریب

------

جلوہ نہیں ہے خالق جلوہ ہے اس کی ذات　　اک لفظ کہہ کے خلق کیے اس نے شش جہات
ہے ماورائے چشم مظاہر کی کائنات　　حد گماں سے بڑھ کے ہے یہ بزم ممکنات
ہاں یہ فزوں ہے فکر و قیاس و عقول سے
پر کم ہے حد جنبش پائیر سولؐ سے

-☆☆-

**گنگا سرن:** بیسویں صدی میں امروہہ کے جن ہندو شاعروں نے شہرت حاصل کی ہے ان میں پنڈت گنگا سرن "شیل جی" کا نام بھی شہرت رکھتا ہے۔ہری داس آچاریہ پنڈت گنگا سرن "شیل جی" ۲۳ر جون سنہ ۱۹۰۵ء کو محلہ کٹرہ بختاور سنگھ امروہہ میں آچاریہ برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام پنڈت شنکر لعل تھا جو امروہہ کے معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔گنگا سرن نے ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔سنہ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ کالج امروہہ سے میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ چندوسی چلے گئے جہاں کئی مضامین میں ایم اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ ایس ایم کالج چندوسی میں ہندی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو گئے۔

پنڈت جی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے بھجن کہنے والے اور بہترین ذاکر بھی تھے۔ کتھا کیرتن کے سلسلے میں انہوں نے لاہور، راولپنڈی، ساہیول (منٹگمری)، ملتان اور پشاور وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ انہوں نے بھجن اور گیتوں پر مشتمل کئی کتابیں لکھیں جن میں "پریم پکار" جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، بہت مقبول ہوئی۔ ۶ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کا ایک مشہور بھجن ملاحظہ ہو۔

گوبند میری یہ پرارتھنا ہے
بھولوں نہ میں نام کبھی تمہارا
نشکام ہو کر دن رات گاؤں
گوبند دامودر مادھو جی
ہے کرشن ہے یادوہے سکھتی

-☆☆-

لاغر: رضوان علی صدیقی نام اور تخلص لاغر ہے۔ مولوی فیاض علی محلہ کنکوئی کے فرزند ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں آپ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کا شوق خاندانی ہے۔ فاضل خاں بیدار امروہوی محلہ افغانان سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ "تر دامن" شائع ہوا۔ طنزیہ افسانوں اور خاکوں پر مشتمل مجموعہ "سر بہ گریباں" شائع ہوا اور ایک شعری مجموعہ "غبار صحرا" شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل اور چند متفرق اشعار پیش ہیں ؎

| | |
|---|---|
| ہم کہاں شکوۂ ارباب وفا کرتے ہیں | کس سے محرومیٔ قسمت کا گلہ کرتے ہیں |
| ہم کو آلامِ مسلسل نے کہیں کا نہ رکھا | اے خدا پھر بھی ترا شکر ادا کرتے ہیں |
| میں رہا یونہی ہمیشہ سے وفا کا پیکر | پھر بھی احباب مرے مجھ سے دغا کرتے ہیں |
| تم نے بیگانہ سمجھ رکھا ہے ہم کو لیکن | ہم کہاں تم کو مگر دل سے جدا کرتے ہیں |
| بس یہی شیوۂ ارباب وفا ہے لاغر | ظلم سہتے ہیں یونہی اور دعا کرتے ہیں |

چند متفرق اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

| | |
|---|---|
| بانگ جرس ہے اور نہ منزل کا کچھ نشاں | بچھڑے تھے کیا بتائیں کہاں کارواں سے ہم |
| آہٹ پہ کان، در پہ نظر، دل میں اضطراب | پوچھو ستم کشوں سے مزا انتظار کا |
| اللہ! کل ہے کہ جن کو ہماری تلاش تھی | محفل میں ان کی آج ہیں بار گراں سے ہم |
| ہر طرف تو لشکر اعدا پہ چھاتا جائے گا | موت جب تیری نظر میں زندگی ہو جائے گی |
| اک برق سی کوندی تھی اتنا تو رہا یاد | کیا گذری نشیمن پر یہ کس کو بھلا یاد |

-☆☆-

# مصحفی

ہر جائے گوش چشم بنا ناک کان کو
اپنی زبان سمجھیں ہیں اردو زبان کو
حیف اب اگر سخن نہ کہیں آسمان کو
تو کیونکہ جیتیں معرکۂ امتحان کو
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
بامنقر ان کنند قرینانِ من نیند

-----

شیخ غلام ہمدانی نام اور مصحفی تخلص تھا- آپ امروہہ میں پیدا ہوئے- آپ کے والد کا نام ولی محمد تھا-ان کی ولادت کی تاریخ کے بارے میں خاصی متضاد آراء ہیں-ایک تحقیق کے مطابق ان کا سال پیدائش 'ظہور' سے برآمد ہوتا ہے جس سے ۱۱۱۱ھ ان کا سال پیدائش قرار پاتا ہے- جبکہ مولانا حسرت موہانی نے اپنے تذکرہ میں ان کی سن ولادت ۱۱۶۴ھ لکھی ہے-اسی طرح ان کے سال وفات کے بارے میں بھی متضاد تحقیقی بیانات ہیں- آزاد کی تحقیق کے مطابق ۱۲۴۰ھ میں تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا'شیفتہ نے اپنی "گلشن بے خار" میں جو ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ ان کی وفات کو دس برس ہوگئے- مصحفی نے اپنی جائے پیدائش کو خود کافی مشکوک بنادیا ہے- پتہ نہیں کہ ان جیسا عالم وفاضل تذکرہ نویس نے اپنی جائے پیدائش کے بارے میں کیوں نہ واضح طور پر مقام کا تعین کیا- میر حسن نے اپنے تذکرے میں جو انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں موجود ہے لکھا ہے:

"از نجائے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبۂ وطن بزرگانش از قدیم
متصل دہلی الحال در شاہ جہاں آباد بہ پیشۂ تجارت بسر می برد-"

مولانا سید حبیب احمد افق کاظمی نے ان کے امروہہ وطن ہونے کے سلسلے میں "صحیفۂ مصحفی" میں یہ دلیل دی ہے:"......... حتیٰ کہ ان کے والد آخر عمر تک امروہہ کے ایک موضع اکبر پور کے جزوی حصے کے قابض ومالک تھے-" بہر حال سنہ ۱۱۹۰ھ کو مصحفی نے جب عہد جوانی میں قدم رکھا تو وطن چھوڑ کر دہلی چلے گئے جہاں تعلیم حاصل کی اور شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے- حصول علم کے اسقدر شوقین تھے کہ ان کا زیادہ وقت کتب بینی میں

گزرتا تھا-انہوں نے سنہ ۱۱۹۵ھ میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے-بارہ سال دہلی رہ کر مثل اور شعراء کے لکھنؤ چلے آئے تھے-اردو اور فارسی دونوں کے پر گو شاعر تھے- مصحفی نے آٹھ ضخیم اردو' فارسی دیوان اور تذکرے یادگار چھوڑے ہیں- آپ ایک اچھے مرثیہ نگار بھی تھے-حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے متاثر ہو کر کہتے ہیں ~

پہلے تو آب دیدہ ہوئی چشم آفتاب    چاہا یہ صبح نے میں اسے اپنا دوں نقاب
پھر آسماں سے مانگ کے لایا کہیں سحاب    چادر کو دلاشہ بے سر کے واسطے

مصحفی نہایت ہی زود گو شاعر تھے-مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں "دیوان ان کی استادی کو مسلم الثبوت کرتے ہیں-انواع و اقسام کی صدہا غزلیں ہیں-جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرتِ کامل پائی ہے-الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس دروبست کے ساتھ میں کھپایا ہے کہ جو حق استادی کا ہے' ادا ہو گیا ہے-ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے-ایسے موقع پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے جہاں سادگی ہے' وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں-اسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کی بھی جھلک دکھاتے ہیں"

اور سب ہیں کہ ورے بیٹھے ہیں    ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں
چاک ہے جب سے گریباں تب سے    ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشۂ مے کی طرح اے ساقی    پوچھو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے    ہم سے کتنے نکھرے بیٹھے ہیں

---------

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم    تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ایک واقعہ لکھا ہے-"ایک مشاعرے میں میر تقی مرحوم بھی موجود تھے' شیخ مصحفی نے غزل پڑھی:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو    مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا......

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا    دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا- ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا- شیخ موصوف نے کئی دفعہ اٹھ اٹھ سلام کیے اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا-"

مصحفی یقیناً ایک عہد ساز شخصیت تھے- نہایت عالم و فاضل، شاعرانہ کمال سے متصف تھے اور زباندانی پر ان کو بجا طور پر فخر تھا- تاریخی طور پر دیکھا جائے تو مصحفی وہ پہلے شاعر اور تذکرہ نویس ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ اس عالمگیر زبان کو "اردو" کہا ورنہ اسے تو "ہندی" کہا جاتا تھا- مصحفی دبستان لکھنؤ کے استاد تھے- میر حسن کو ان کی زباں دانی پر اتنا اعتقاد تھا کہ انہوں نے میر خلیق کو ان کے سپرد کیا- ناسخ اور آتش جو دبستان لکھنؤ کے بانی تھے وہ مصحفی کے ہی شاگرد تھے- یہاں اس ضمن میں جون ایلیا کا یہ قول نقل کرنا چاہتا ہوں:

"اگر سعادت امروہوی نہ ہوتے تو اردو غزل کو اپنا خدائے سخن نہ
ملتا اور اگر مصحفی نہ ہوتے تو اردو مرثیہ کو انیس نہ ملتا اور اردو "اردو"
نہ کہلاتی بلکہ اسے "ہندی" کہا جاتا-"

ان کا مسدس "حسب حال خدو ابنائے زمانہ" اگر پڑھا جائے تو اردو زبان اور لکھنؤ کی زبان کے بارے میں ان کے خیالات کا مولانا محمد حسین آزاد کو صحیح ادراک ہوتا اور وہ شاید مصحفی کی زبان پر "امروہہ پن" کی پھبتی نہ کستے- ان کے متذکرہ مسدس کا ایک بند ملاحظہ ہو-

ہر جائے گوش چشم بناناک کان کو
اپنی زبان سمجھیں ہیں اردو زبان کو
حیف اب اگر گگن نہ کہیں آسمان کو
تو کیونکہ جیتیں معرکۂ امتحان کو

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
بامنقر ان کنند قرینانِ من نیند

اسی دور کے سید انشاءؔ اور آپ کے معرکے بہت مشہور ہیں- اکثر غزلوں میں یہ دونوں باکمال شاعر طبع آزمائی کرتے تھے اور کچھ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی- ایک دن شیخ مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کے جلسے میں یہ غزل پڑھی:

زہرہ کی جو آئی کف ہاروت میں انگلی کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی

اس کا مقطع یہ تھا:

تھا مصحفیؔ وہ مائل گریہ کہ پس از مرگ تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اسی طرح میں سید انشاءؔ کی غزل کا مطلع تھا:

دیکھ اس کی بڑی خاتم یاقوت میں انگلی ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

جب مصحفیؔ چلے گئے تو یاروں میں ان کے بعض اشعار پر بہت چہ چے ہوئے اور غزل کو الٹ کر ان کے کلام کو خراب کیا گیا۔" یہیں سے فساد کی بنیاد قایم ہوئی اور طرفین سے ہجویں ہو کر وہ خاک اڑا کہ شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ غرض اس غزل کی خبر شیخ مصحفیؔ کو پہنچی۔ وہ پرانا مشاق، لکھنو بھر کا استاد کچھ چھوٹا آدمی نہ تھا۔ باوجود بڑھاپے کے بگڑ کھڑا ہوا اور یہ غزل فخریہ کہی۔ اب خواہ اسے بڑھاپے کی سستی کہو، خواہ طبیعت کا امر و بہ پن کہو، خواہ آئین متانت کی پابندی سمجھو، غرض اپنی وضع کو ہاتھ سے نہ دیا اور اپنے انداز میں خوب کہا۔ غزل فخریہ:

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

میں لکھنو میں زمزمہ سنجانِ شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

پھبتا نہیں ہے بزم امیرانِ دہر میں شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری

اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

ہے شاعروں کی اب کے زمانے کی یہ معاش پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری

لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے خفت اٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

ہر سفلہ را زبانِ دبیانِ تو کے رسد آرے تو ئی فغانی و بابائے شاعری

مجنوں منم چرا دگرے رنج مے برد در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

اے مصحفیؔ زگوشۂ خلوت بروں خرام خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری

جب سید انشا کی ستم ظریفیاں اور منہ زوریاں حد سے بڑھ گئیں تو انہوں نے کچھ رجزیہ اشعار کہہ کر انشا کو چڑایا جس کا جواب انشا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہ رجزیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدت وہ شخص ہے واللہ کہ مجنوں مرے آگے

قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر     طفلی میں جو کل کرتے تھے غوں غاں مرے آگے

اس کے علاوہ اور غزلیں بھی کہیں جن میں اس قسم کے اشارے کنایے ہیں-چونکہ سید انشاء صاحب عالم کے یہاں صدر نشین تھے' انہیں خیال ہوا کہ مصحفی میرا بھی یار ہے' مبادا اسے کچھ خیال ہو' خود پالکی میں سوار ہو کر پہنچے اور کہا کہ جلسے میں اس طرح گفتگو ہوئی ہے' بھئی تمہیں میری طرف سے کچھ ملال نہ ہو-شیخ مصحفی نے بے پروائی سے کہا کہ نہیں بھئی مجھے ایسی باتوں کا خیال بھی نہیں اور اگر تم کہتے تو کیا تھا-اخیر کا فقرہ سید انشاء کو کھٹکا-آتے ہی یاروں کو اور چمکا دیا-ادھر سے انہوں نے کچھ اور کہا' ادھر سید انشاؔء نے بحر طویل میں ایک ہجو کہہ ڈالی-"یہ سلسلہ ان دونوں شاعروں کے درمیان تادیر جاری رہا-ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ اور دوسرے امیروں نے بھی سید انشاؔ کا ساتھ دیا جس سے مصحفی کافی رنجیدہ خاطر ہوئے-ان کی اکثر غزلوں میں شکستہ خاطری کا رنج جھلکتا ہے-ان کی ایک ایسی ہی غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ فرمایئے:

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں     کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا     سچ یہ ہے کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

----

دن جوانی کے گئے، موسم پیری آیا     آبرو خاک ہے اب وقتِ حقیری آیا

مصحفی طبیعتاً بہت شریف النفس انسان تھے-مگر نچلا بیٹھنے کے قایل نہیں تھے-اگر کوئی ان کو چھیڑتا تو وہ ترکی بترکی جواب دینے کے عادی تھے-چنانچہ اپنی طبیعت کی اس روش کے بارے میں خود کہتے ہیں:

گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہی تو صلح سہی     وگر ہو پھیر شرارت' بشر ہوں میں بھی شریر

جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو     نگاہ کرنی تھی اول بہ ایں قلیل و کثیر

لیکن اس کے باوجود کہ سید انشاؔ اور ان کے درمیان مخالفت اور چشمک کا ایک طویل سلسلہ جاری وساری رہا مگر جب سید انشاؔ کا انتقال ہوا تو وہ نہایت غمگین اور ملول رہے اور چند شعر ان کی وفات پر کہے-ان میں سے ایک شعر:

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں     یاد ہے مرگِ قتیل و مردنِ انشاء مجھے

افسوس تو اسکا ہے کہ اتنا باکمال شاعر آخرِ عمر میں کہاں رہا اور کہاں دفن ہوا' اس کا نہ اہل لکھنؤ کو پتہ ہے اور نہ اہل امروہہ کو-امروہہ والے سمجھتے ہیں کہ کیونکہ موت لکھنؤ میں واقع ہوئی لہذا دفن بھی وہیں ہو گئے اور لکھنؤ

والے سمجھتے ہیں کہ امروہہ میں مدفن ہوگا۔

**معصوم:** مہیش سروپ ٹنڈن نام اور معصوم تخلص ہے۔ آپ کی رہائش کوچہ کھتریان بڑا بازار میں ہے۔ امروہہ کی علمی ادبی شخصیتوں میں مہیش سروپ ٹنڈن کی شخصیت بھی بڑی شہرت کی حامل ہے۔ہندی اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔چتراویکلی کے نام سے آپ کی ایک تصنیف سنہ ۱۹۹۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ مہیش سروپ ٹنڈن منکسر المزاج اور دکھی انسانیت کو سکھ دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ملاحظہ ہوں آپ کے کلام کے دو شعر ؎

تم اپنا دکھ مجھے دیدو میں اپنے سکھ تمہیں دیدوں — شروع پھر سے پرانا سلسلہ کردو تو اچھا ہے
یہ ممکن ہے کہ کل کچھ اور بھی لکھنا پڑے تم کو — صفحے پر زندگی کے حاشیہ کردو تو اچھا ہے

-☆☆-

**منتظر:** سید اظفر حسین نام اور منتظر تخلص تھا۔ آپ کے والد سید اختر حسین محلہ دربار کلاں ر کشکوئی ایک مسلمہ خوشنویس تھے۔منتظر قوی امروہوی کے جانشین تھے اور اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ان کے شاگردوں میں مولانا محمد عبادت کلیم، حکیم کلب علی شاہد، تاباں نقوی منتجب حسن بزمی اور حیات امروہوی کے نام نمایاں ہیں۔ بحیثیت استاد فن ان کی حیثیت امروہہ میں مسلم تھی اور مشاعرے کا اختتام ان پر ہی ہوا کرتا تھا۔بد قسمتی سے ان کا کوئی مجموعہ کلام میسر نہیں۔منتظر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کا خصوصی میدان تھا۔ چند شعر میسر آسکے ہیں جو پیش خدمت ہیں ؎

جتنا بھی چاہیں ناز کریں اپنی جیت پر — وہ ہاتھ جو گلے کا ترے ہار ہو گئے
بس اتنا فرق ہے انسان میں اور اس کی تربت میں — وہ ہے اک ڈھیر مٹی کا، یہ ہے تصویر مٹی کی
وہ اور شور عشق مرے دل میں بھر گئے — کیسے مسیح تھے کہ جو بیمار کر گئے
وہ لطف عام کر دیا مجھ پر جو خاص تھا — تم دل نواز ہو کے دل آزار ہو گئے
دن زندگی کے چشم زدن میں گزر گئے — جھونکے ہوا کے تھے ادھر آئے ادھر گئے

-☆☆-

**ماموں:** لئیق احمد صدیقی نام اور تخلص ماموں ہے۔ آپ کے والد حکیم عبدالقیوم امروہہ کے معروف حکیم

تھے - آپ کا خاندانی سلسلہ شیخ معین الدین ناگوری سے ملتا ہے -ماموں کی والدہ ماجدہ عائشہ خاتون بھی ایک نامور معلّمہ تھیں -ان کی اولاد میں لئیق احمد میٹرک کے امتحان میں برسوں تک فیل ہوتے رہے -اپنے فیل ہوتے رہنے پر ماموں کا ایک شعر زباں زد خاص و عام تھا؂

تمہاری شان کے شایاں نہیں ہے میٹرک ماموں　　وہ کوئی امتحاں ہے پاس جس کو لڑ کیا کر لیں

بہر حال ایک دن آپ کامیاب ہو ہی گئے-

ماموں طالب علمی کے زمانے سے مزاحیہ شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے-جب آپ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے ہیں تو ہر طرف سے داد و تحسین کا شور ہوتا ہے اور لوگ ہنس ہنس کر دوھرے ہو جاتے ہیں- آپ جب پاکستان تشریف لائے تو ایک محفل مشاعرہ ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی- آپ نے اپنی ایک مزاحیہ غزل سنا کر سامعین کو بڑا محظوظ کیا- یہ غزل آپ نے کراچی میں اسوقت کہی جب آپ اپنے دوست سے ملنے صبح ہی صبح اس کے بنگلے پر گئے -دوست، جو شیو کے بعد اپنے چہرے پر پاؤڈر لگا کر بیٹھے تھے، گھنٹی کی آواز سن کر باہر گئے- ماموں نے ان کے چہرے پر پاؤڈر لگا دیکھ کر یہ غزل کہہ ڈالی- ملاحظہ کریں؂

واہ کس شان سے وہ بنگلے سے باہر نکلے　　بیگ بیوی کا لیئے ہاتھ میں شوہر نکلے
اس طرح گھر سے وہ بال اپنے بنا کر نکلے　　سر پہ رکھے ہوئے جیسے کوئی چھپر نکلے
ساس نے تولا تو دونوں ہی برابر نکلے　　مرتبے میں مرے ہم زلف بھی ہمسر نکلے
داڑھی و مونچھ صفا دیکھی تو بیوی نے کہا　　اے میاں آپ تو اپنے ہی برادر نکلے
جیسے جم جائے ٹماٹر پہ پھپوندی ماموں　　رخ رنگین پہ وہ تھوپ کے پاؤڈر نکلے

-☆☆-

**مسیحا:**　　مسیحا تخلص ہے- 'نسیم چمن' فروری ۱۸۹۶ء کے شمارے میں آپ کی شائع ہونے والی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں؂

آنکھوں میں بیٹھ جاؤ تردد کی جا نہیں　　خوفِ نظر سے نور بھی ہم نے رکھا نہیں
آنکھوں کا تھا حجاب وہ قسمت سے اٹھ گیا　　اندھے سے اب انہیں کوئی پردہ رہا نہیں
تم اندھا' دیدوں پھوٹا' نہ ہم کو کہا کرو　　اندھے وہ ہیں کہ آنکھ میں جنکی حیا نہیں
اندھا کہو نہ مجھ کو مرے رخ پہ نور ہے　　اندھا وہ آئینہ ہے کہ جس میں جلا نہیں

کہتے ہیں اور کیا کوئی اندھا رہا نہیں　　　کیا فکر ہے جو آج مسیحا ملا نہیں

-☆☆-

**مضطر:** سید آل نبی نام اور تخلص مضطر تھا- آپ سید محمد تقی محلہ دربار کلاں کے فرزند تھے- خاندانی تعلق جعفری سادات سے تھا- فن شاعری میں حکیم امروہوی کے شاگرد تھے- آپ کی ایک غزل جو "نسیم چمن" میں شائع ہوئی پیش خدمت ہے-

بتوں کے عشق سے پتھر ہے رکھنا دل پہ پتھر کا　　　پرستش کے لیے پتلا بنالوں سنگ مرمر کا
بھلا پیر فلک کو اور کیا گردش سے مطلب ہے　　　خیال اس فتنہ گر کو ہے میری قسمت کے چکر کا
وہ بارش کے سبب جانے نہ پائے میرے مسکن سے　　　رہوں گا حشر تک ممنون اپنے دیدۂ تر کا
جو قسمت میں نہ ہو وہ شے عنایت کر خداوندا　　　میرے سر مفت میں احسان رہتا ہے مقدر کا
بنا شاہ شہیدان قلب مضطر ظلم سہہ سہہ کے　　　کلاہ دل پہ طرہ ہے کسی کے تیر کے پر کا

-☆☆-

**نظر:** نام مولوی محمد نظرالاحد صدیقی تخلص نظر تھا- آپ کی سکونت محلہ گنکوئی امروہہ میں تھی- ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار محترم مولوی عبدالغنی صاحب سے حاصل کی- شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا- امروہہ سے نکلنے والے گلدستہ "بزمِ سخن" کے نگراں تھے- شمارہ بزمِ سخن سنہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہونے والی نعت بطور نمونہ ملاحظہ ہو-

وصف نبی میں کھولوں زباں کیا مجال ہے　　　مداح جب حضور کا خود ذوالجلال ہے
آتی نہیں ہے شان نبی عقل و فکر میں　　　عاجز یہاں قیاس و گمان و خیال ہے
راہ خدا میں سر دیا امت کے واسطے　　　آلِ نبی بھی کیسی اولوالعزم آل ہے
موسیٰ کلیم ٹھیرے گئے خود جو طور پر　　　معراج مصطفیٰ کا عیاں سب پہ حال ہے
اب ہند سے حضور بلالو مدینہ میں　　　مد نظر نظر کو حضوری کمال ہے
دل اپنا تھام لو تو سناؤں یہ حال ہے　　　دل بیقرار جان حزیں جی نڈھال ہے

-☆☆-

## نسیم امروہوی

پسر کے داغ کی دنیا میں کچھ دوا ہی نہیں　　اس امتحاں میں کسی کا قدم جما ہی نہیں
مگر حسین سا صابر کوئی ہوا ہی نہیں　　سکون و صبر و تحمل کی انتہا ہی نہیں
خوشی سے دل پہ یہ جبر اختیار کرتے ہیں
جوان بیٹے کو حق پر نثار کرتے ہیں

جن فرزندگان امروہہ نے علم وادب، شعر و سخن کی شمع روشن کی وہاں نسیم امروہوی نے مرثیہ گوئی میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ 'ارمغان نسیم' انجمن سادات امروہہ رجسٹرڈ پاکستان میں آپ کی ولادت کے بارے میں تحریر ہے "۲۴ر اگست ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۸ھ بروز پیر امروہہ ضلع مراد آباد (یو-پی) میں اپنے دادا نسیم امروہوی کے دیوان خانے میں اذان صبح کے وقت ولادت ہوئی۔ یہ آنحضرت کے بعثت مبارک کی تاریخ تھی۔۔۔ لکھنؤ میں نسیم کی مرثیہ گوئی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں انہوں نے شمس العلما مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کے دیے ہوئے موضوع "فضائل علی، قرآن و حدیث کی روشنی میں" کے حوالے سے ایک معرکتہ الآرا مرثیہ کہا جس میں ۱۱۴ حدیثوں اور ۱۲۱ آیتوں سے استفادہ کیا"

آپ کی ذات سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری 'ارمغان نسیم' میں تحریر کرتے ہیں "مجھے اس جگہ نسیم امروہوی کی دوسری ادبی فتوحات کو نظر انداز کر کے صرف ان کی شاعری کا اجمالی تذکرہ کرنا ہے، نسیم امروہوی شاعر ہی نہیں شاعر گر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و فن کی ایسی پختگی اور اسلوب میں ایسی جامعیت نظر آتی ہے جو انہیں استاد سخن کے درجے پر فائز کرتی ہے۔" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تحریر فرماتے ہیں "ان کے وطن امروہہ میں اردو شاعری اور اردو ادب کی صالح روایات پروان چڑھیں اور ان ہی روایات میں نسیم صاحب نے مرثیہ گوئی شروع کی، سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی فضا نے ان کی مشق سخن کو جلا بخشی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں نسیم پاکستان تشریف لائے۔ آپ ترقی اردو بورڈ سے مدیر لغت کی حیثیت سے بھی منسلک رہے ہیں۔" مولانا نسیم نے تقریباً ایک سو چالیس کتابیں لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

ہفتہ ۲۸ر فروری سنہ ۱۹۸۷ء کو آپ نے وفات پائی۔ مغرب کے وقت مسجد آل عباس فیڈرل بی ایریا کے احاطے میں تدفین ہوئی۔ نسیم امروہوی نے اب تک جتنے مراثی کہے ہیں ان میں کچھ "مراثی نسیم" جلد اول اور جلد

دوم میں شامل ہیں۔اس کے علاوہ تقریباً ۸۔۱۰ مراثی ایک ایک، دو دو کرکے شائع ہوئے ہیں باقی سب غیر مطبوعہ ہیں۔اس طرح غیر مطبوعہ حصہ مطبوعہ سے بھی کچھ زیادہ ہے۔بہر حال مطبوعہ مراثی کا جب جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو قدیم مراثی کی خصوصیت رہا ہے۔مثلاً منظر نگاری کی شاندار مثالیں قدیم مرثیہ میں موجود ہیں۔ذرا صبح کا منظر نسیم امروہوی کی زبان سے ملاحظہ ہو ؎

نقاب رخ سے جو حور سحر اٹھانے لگی　　خزاں کی تیغ سے کشتوں میں جان آنے لگی
کرامت دم عیسیٰ صبا دکھانے لگی　　شگوفے کھلنے لگے، صبح رنگ لانے لگی
ہوا سنکنے لگی، ڈالیاں لچکنے لگیں
چمن مہکنے لگا، بلبلیں چہکنے لگیں

وہ پھول اوس کے بھیگے نجوم جن پہ نثار　　وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی جاں فزار فتار
بہار کی وہ جوانی وہ پتیوں کا سنگھار　　وہ بلبلیں رخ گل پر رکھے ہوئے منقار
یہ وصل کے جو مناظر نظر پہ چڑھنے لگے
چٹک چٹک کے شگوفے درود پڑھنے لگے

رخ سے آنچل جو ہٹانے لگی سلمائے سحر　　اختر سعد نے چوما رخ زیبائے سحر
شکل خورشید میں ابھری جو تمنائے سحر　　چشم کونین ہوئی محو تماشائے سحر
چھوڑ کر اہل زمیں بستر خواب اٹھنے لگے
آنکھیں ملتے ہوئے دریا میں حباب اٹھنے لگے

امام عالی مقام کا صبر بھی ملاحظہ ہو ؎

پسر کے داغ کی دنیا میں کچھ دوا ہی نہیں　　اس امتحاں میں کسی کا قدم جما ہی نہیں
مگر حسین سا صابر کوئی ہوا ہی نہیں　　سکون و صبر و تحمل کی انتہا ہی نہیں
خوشی سے دل پہ یہ جبر اختیار کرتے ہیں
جوان بیٹے کو حق پر نثار کرتے ہیں

یہیں سے دیکھ رہی ہے یہ فطرت غمگیں　　کہ جیسے طالب اذن وفا ہے وہ حسیں
زبان حال سے فرماتے ہیں یہ سرور دیں　　پھوپی کا اذن ہو بیٹا تو ہم کو عذر نہیں

نہ دھوپ چھاؤں میں گھر سے کبھی نکالا ہے
تمہیں تو جوگ کما کر انہوں نے پالا ہے

در حقیقت اردو مرثیے کے مدح کے حصے کو نسیم امروہوی نے قرآن اور احادیث کی مدد سے نہ صرف وسعت بخشی ہے بلکہ عظمت بھی عطا کی ہے اور یہ صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ان کے مرثیوں سے دو بند اور ملاحظہ ہوں:-

صبح ازل ہے خطِ گریبانِ مصطفیٰؐ　　شام الست، گوشۂ دامانِ مصطفیٰؐ
فرشِ علا، منارۂ ایوانِ مصطفیٰؐ　　علم خدا، چراغِ شبستانِ مصطفیٰؐ
معراج، منزلت کی حدِ ناتمام ہے
قوسین تو حضورؐ کا ادنیٰ مقام ہے

---

جامعِ آیاتِ قرآنِ شہادت ہیں حسینؑ　　سورۂ اخلاص و شکر و صبر و ہمت ہیں حسینؑ
شارحِ اجمالِ ایثار و صداقت ہیں حسینؑ　　کربلا پر جو ہوئی نازل وہ آیت ہیں حسینؑ
مصحف و شبیر ایک آغاز کا انجام ہیں
اس کا قول، ان کا عمل، جب مل گئے اسلام ہیں

انیس و دبیر کے بعد مرثیہ صرف شہدائے کربلا سے متعلق ہو کر رہ گیا تھا مگر نسیم امروہوی نے شخصی مراثی کو بھی ایک نئی جہت عطا کی اور جدید مرثیے کی بنیاد رکھنے میں بھی بنیادی کام انجام دیا۔ان کے ایک شخصی مرثیے کے دو بند جو حضرت جوش ملیح آبادی کی موت پر لکھا تھا ملاحظہ ہوں:-

اے قلزمِ حیات ترا جوش کیا ہوا　　"ھو" جس کی بت شکن تھی وہ مدہوش کیا ہوا
آہٹ سنے جو وقت کی، وہ گوش کیا ہوا　　کیوں منبرِ سخن ہے سیہ پوش؟ کیا ہوا
پھوٹے نصیب، جوش کا منکا جو ڈھل گیا
شعر و سخن کا آج جنازہ نکل گیا

---

ہے تیرے مرثیے میں وہ شوکت وہ دھوم دھام　　رہ جائے اڑ کے سطوتِ باطل کا تام جھام

تو نے دیا ہے ذوقِ شہادت کا جو پیام    وہ اک صلائے عام ہے انسانیت کے نام

آہٹ ہے جس کے ذکر میں بدر و حنین کی

دھڑکن ہے جس کی یاد میں قلبِ حسین کی

-☆☆-

**نظرؔ امروہوی:** سید علی منصرم خاں نقوی نام اور تخلص نظرؔ ہے۔ آپ ۲۷ر نومبر سنہ ۱۹۲۴ء کو سادات امروہہ کے گھڑیال والے خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید علی محتشم خاں کا شمار امروہے کے معززین میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا علی تقی خاں نقوی اور پردادا علی منتظم خاں نقوی حضرت امیر مینائی کے تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو شعری ذوق ورثہ میں ملا۔ نظرؔ امروہوی نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے غزل کو اپنا شعار بنایا۔ حضرت شعیب حزیںؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ جس وقت نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کی اردو مجلس شباب پر تھی آپ دہلی چلے گئے۔ آپ عرصۂ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے ہر جمعہ کو نعتِ سرورِ کائناتؐ پیش کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ ریلوے اکاؤنٹس میں ملازمت کے سلسلہ میں کراچی آگئے۔ نعتوں کا مجموعہ تیار ہے جو طباعت کے مراحل میں ہے۔ آپ ایک خوبصورت غزل گو شاعر بھی ہیں۔ یہاں ان کی ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے:

یقینِ وعدہ نہیں ہے دل کو مگر مجھے انتظار سا ہے
اسی فریبِ سکوں سے شاید دلِ حزیں کو قرار سا ہے

دیارِ حیرت کے ماسوا ہیں ہزار ایسے مقام جن میں
خرد بھی بے اختیار سی ہے جنوں بھی بے اختیار سا ہے

ابھی خرد بھی ہے کار فرما ابھی ہے کچھ احترامِ جلوہ
ابھی نہیں پردہ در نگاہیں ابھی جنوں ہوشیار سا ہے

نہ کارواں ہے نہ رہگذر ہے نہ کوئی منزل نہ کوئی رہبر
مقامِ ہوش و خبر سے آگے تمام عالم غبار سا ہے

نظرؔ محبت کے راستوں میں کچھ ایسے دلکش مقام آئے
کہ اب خیالِ سکونِ منزل بھی فطرتِ غم پہ بار سا ہے

**نقوشؔ :** مشوم حیدر آپ کا نام اور تخلص نقوشؔ ہے۔امروہہ محلہ مجاپوتہ میں ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کی ابتداء کے بارے میں انہوں نے خود بتایا ہے کہ ۱۹۶۲ء سے شعر کہنا شروع کیا۔کلام پر اصلاح احسان امروہوی اور رضاؔ امروہوی سے لی۔ آپ کی ایک کتاب "اکھڑے ہوئے پیڑ" شائع ہو چکی ہے جس میں غزلیں' نوحے' رخصتی' سلام' کہانیاں شامل ہیں۔"یہ مجموعہ غالباً اپنی نوعیت کا منفرد مجموعہ ہے۔جس میں ایک فنکار کی نثری نیز شعری کاوشوں کو اردو میں پہلی بار مجتمع کیا گیا ہے۔نقوشؔ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو تاثر یہی ملتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ابھی ان کی شاعری کا سفر جاری ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس میدان میں بتدریج ترقی کرتے رہیں گے۔ان کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

طبیعت بھلا کیوں پریشان ہے　　کسی حادثے کا پھر امکان ہے
بھلا اس کو دوں کس طرح بد دعائیں　　مری جان ہے وہ مری جان ہے
مری چند غزلیں' مری چند نظمیں　　بیاض غم جاں کا دیوان ہے
یہ نقش و نگار غم زندگانی　　نقوشؔ آپ کے گھر کا سامان ہے

غزلوں کے چند متفرق اشعار:

تم نے یہ دلنشین سرخی بھی　　میرے افسانے سے چرالی ہے
میں وقت کی صلیب پہ لٹکا دیا گیا　　پانی کو میں نے دیکھ لیا تھا سراب میں
ہم وہم کی حدود میں ہی قید رہ گئے　　تم سرحد گماں سے بھی آگے نکل گئے
وقت نے اپنی جبیں پہ ہمکو لکھا ہے نقوشؔ　　ظلمتوں میں ہم سحر ہیں' روشنی ہیں' نور ہیں

-☆☆-

**نوشہؔ :** نام مطاہر حسین تخلص نوشہ سنہ ۱۹۴۳ء کو امروہہ کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد طاہر حسین طاہرؔ امروہوی ایک نامور شاعر تھے۔لہذا شعر و سخن میں اصلاح اپنے والد محترم سے لی۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد آپ نے میٹرک اور پھر انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ آپ کی غزل بطور نمونہ پیش ہیں:

مدت ہوئی بری تھی کچھ آگ زبانوں سے　　اٹھتا ہے دھواں ابتک بستی کے مکانوں سے
ذہنوں کی سیاہی کو چہروں سے نہ پہچانو!　　آجاتے ہیں پتھر بھی شیشے کی دکانوں سے

کردار کے دھبوں کو لفظوں میں چھپاتے ہو　　تاریخ نہیں بنتی ان جھوٹے بیانوں سے
پرواز تخیل بھی کھو جائے جہاں نوشہ　　بچ بچ کے چلو تم بھی ان اونچی اڑانوں سے

-☆☆-

**نور امروہوی:** نور امروہوی قریشی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں شارجہ چلے گئے جہاں گزشتہ ۸-۱۰ سال سے ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے ہے۔ جدید لب و لہجے کی غزل کہتے ہیں۔ شارجہ اور مشرق وسطی کے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور شارجہ میں اردو کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی بڑی خدمات ہیں۔ آپ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے۔

کچے مکاں سے پکے گھر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
سمتِ سفر سے زادِ سفر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
بستر کی ہر اک سلوٹ میں ایک افسانہ خوابیدہ
اور تکیے سے دیدۂ تر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
گم سُم خوشبو کہتے سنتے مست ہواؤں کے جھونکے
گلیوں سے دیوار و در تک ایک کہانی بیچ میں ہے
انگنائی سے آنگن آنگن پھیلی ہیں دیواریں بہت
اس موسم سے اس منظر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
فن کی طلب روزی کی خاطر نور پھرے ہم دیس بدیس
لوح و قلم سے کیسۂ زر تک ایک کہانی بیچ میں ہے

-☆☆-

**وفا** متھن لعل سکینہ نام اور تخلص وفا ہے۔ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا قلمی دیوان عظیم امروہوی کے پاس موجود ہے۔ آپ کی ایک نعت کے دو شعر، جو ڈاکٹر عظیم حیدر امروہوی نے عنایت کیے، ملاحظہ ہوں۔

کیف پرور حسیں نظارے ہیں　　کس کے یہ دلنشیں اشارے ہیں

کیا وفا خوف دین و دنیا کا    شاہ دنیا و دیں ہمارے ہیں

-☆☆-

ہلالؔ: سید ہلالؔ رضا نقوی سید شرف الدین شاہ ولایتؒ کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں - ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد سید مزمل حسین ہجرت کے بعد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے - ہلالؔ کا تعلق امروہہ کے ایک معزز اور مقتدر خاندان سے ہے -

ہلال اردو میں ایم اے کرنے کے بعد کراچی کے سراج الدولہ کالج میں لیکچرار ہوئے - اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے "بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ" پر تحقیقی مقالہ لکھا - پاکستان کے مشاعروں، ادبی محافل اور ریڈیو پروگرامز میں اکثر شرکت کرتے رہتے ہیں -

ہلالؔ کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا تھا اور ۱۹۶۷ء میں پہلی غزل کہی - اس کے بعد نظم کی جانب توجہ زیادہ رہی - ترقی پسند ذہن ابتدا سے پایا تھا اس لیے اسی رنگ میں زیادہ تر نظمیں کہیں - جوشؔ ملیح آبادی کے مراثی کا مطالعہ کرنے سے طبیعت مرثیہ کی جانب راغب ہوئی اور ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جس پر جوشؔ ملیح آبادی سے اصلاح لی - اس طرح جوشؔ کے سب سے پہلے اور آخری شاگرد ہلالؔ ہوئے -

اس مرثیے پر اصلاح کے بعد جوشؔ ملیح آبادی نے مرثیہ پر اصلاح لینے کے لیے ہلال کو مشورہ دیا کہ وہ نسیم امروہوی سے رابطہ قایم کریں - اس مشورے کے بعد ہلال نسیم امروہوی سے اصلاح لیتے رہے - ہلال کا یہ پہلا مرثیہ "مشعل و مقتل" کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے -

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے تو مرثیہ گوئی کے بارے میں یا اس کی فنی خوبیوں کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کے لیے مکلف بھی نہیں ہوں مگر ان کی شاعری کی بارے میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے لکھا ہے "...... میاں ہلال نقوی نے عصر حاضر کے مطالبات کو اپنی انوکھی فکر اور ندرت بیان سے ربط دے کر ایک نئے رخ سے پیش کیا ہے - وہ ابتدائے شاعری ہی میں اس ارتقائی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ تاریخ ادب ان کو نظر انداز نہیں کر سکے گی -" جناب کیفی اعظمی نے لکھا ہے "...... جب نیا مرثیہ لکھا جانے لگا تو اس کو بھی ایک تجلی کی تلاش شروع ہوئی اور اس کو ہلالؔ نقوی مل گئے -" ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں "...... ہلالؔ نقوی کے روپ میں واقعہ یہ ہے کہ مستقبل کا ایک بہت بڑا شاعر چھپا بیٹھا ہے - انہوں نے بہت کم عمری میں ایسے مرثیے لکھے جو واقعی ہماری مرثیہ نگاری کی تاریخ کے رخ کو بدل دیں گے -" جناب جمیل الدین عالی کے خیال میں "انیس و دبیر کے عاشق اگر ان

کے نوجوان جانشینوں کی تلاش میں ہوں تو ڈاکٹر ہلال نقوی کو بھی سنیں اور پڑھیں "اتنے اہم ناقدین شعر و ادب کی آرا کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ ہلال نقوی نے پاکستان میں امروہے کا نام روشن کیا غلط نہ ہوگا۔

ہلالؔ نے اپنے مرثیوں کو ایک نئی ہیئت عطا کی ہے ان کے مسدس یا مرثیہ کا تیسرا مصرعہ غیر مقید ہوتا ہے۔بقول احمد ہمدانیؔ "تیسرے مصرعے کے آزاد ہونے کے باوجود نہ شوکت اسلوب مجروح ہوتی ہے اور نہ آہنگ میں کوئی فرق پڑتا ہے" ہلال نے مختلف عنوانوں پر مرثیے لکھے ہیں۔چند بند ملاحظہ ہوں؎

"ہاتھ"

جس ہاتھ میں قلم ہے حشم اس کے ہاتھ ہے جو ہاتھ خود قلم ہے علم اس کے ہاتھ ہے
ہر عہد تشنگی کا تمدن لکھے جو ہاتھ آثار و ارتقا کا بھرم اس کے ہاتھ ہے
برہم کرے صفوں کو جو ترتیب کے لیے
وہ ہاتھ اک سبیل ہے تہذیب کے لیے

-----

"طاقت"

ہے اقتدار منصب حق ! علم کا مزاج تیغوں کی کب ہے حرف صداقت کو احتیاج
لشکر ہزار پست ہیں خود حق کی گونج سے اس گونج کے جلال سے لرزاں ہیں تخت و تاج
اس شان سے سپاہ بھی کوئی لڑی نہیں
اقدام حق سے کوئی بھی طاقت بڑی نہیں

ہلال نے یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر حقیقت میں ان کا میدان ایک طرف تو صرف مرثیہ ہے مگر ان کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ ایک اسکالر بھی ہیں اور انہوں نے اہم موضوعات پر بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔وہ کراچی سے "رثائی ادب" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

ہلال کے مراثی میں عصر نو کی گونج ہے۔ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ اپنے معاشرہ کا جائزہ اچھی طرح لے چکے ہیں اور اس کی کمیوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اقرار بھی کرتے ہیں۔

اسی انداز میں وہ دور حاضر کے انسان کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں

جو چاہتا ہو کہ کھوئی ہوئی خوشی پالے تو کھول دے در قلب و نگار کے تالے
مگر یہ لازم و واجب ہے او خرد والے گمان و وہم سے ہو دور جب نظر ڈالے

دبے ہوئے جو ہیں منظر انہیں ابھار کے دیکھ
تعصبات کی عینک ذرا اتار کے دیکھ

-☆☆-

ہوش: سید احمد خاں نام اور تخلص ہوش ہے۔ آپ ۹/جولائی ۱۹۲۴ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ضمیر احمد خاں مرحوم امروہہ کے پٹھان خاندان کی معزز شخصیت تھے۔ ہوش صاحب نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک اور انٹر گورنمنٹ کالج مراد آباد سے پاس کیا۔اس کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا جہاں تاریخ میں ایم۔اے۔اور قانون کی ڈگری حاصل کی۔سنہ ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان آگئے۔

ہوش صاحب غزل کے شاعر ہیں اگر چہ سنہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک بہت سی نظمیں کہی ہیں۔سنہ ۱۹۷۸ء میں آپ پر دل کا دورہ پڑا توڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق شاعری کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔لیکن صحتیابی کے بعد شاعری کی اور خوب کی۔ان کا دیوان ''بکھر گئی خوشبو'' شائع ہو چکا ہے۔آپ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے۔

حضورِ یار بھی محوِ خیالِ یار تھے ہم | بھری بہار میں بھی تشنۂ بہار تھے ہم
یہ دن بھی ہیں کہ خزاں میں بھی مطمئن ہے دل | وہ دن بھی تھے کہ بہاروں میں بیقرار تھے ہم
ترے حضور تو دل کا عجیب عالم ہے | ترے بغیر کہاں اتنے بے قرار تھے ہم
یہ بات کم بھی نہیں ہے سکونِ دل کے لیے | ترے لیے بھی کبھی وجہِ انتظار تھے ہم
یہ کم نہیں کہ رہی ان سے کچھ تو نسبت ہوش | دیارِ دوست میں گو صورتِ غبار تھے ہم

-☆☆-

یکتاامروہوی: سید واحد علی نقوی نام اور تخلص یکتاامروہوی ہے۔یکتاکا تعلق نقوی سادات سے ہے۔آپ کے والد سید واجد علی محلہ حقانی تھے۔آپ سنہ ۱۹۱۳ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے مورث اعلیٰ سید لطف علی کو ''حقانی'' کے شاہی خطاب سے نوازا گیا تھا چنانچہ ان کی رہائش گاہ کے قرب وجوار کے علاقے کو محلہ حقانی کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔سید واحد علی یکتا نے ابتدائی تعلیم سید المدارس اور نور المدارس امروہہ میں حاصل کی۔اس کے بعد باب العلم نوگانواں سادات میں زیر تعلیم رہے۔یہاں سے فارغ ہوئے تو حصول علم کے لیے میرٹھ چلے گئے جہاں آپ نے منصبیہ عربی کالج میں داخلہ لیا اور منشی فاضل کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے

پاس کیا- تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں نیشنل پبلک لائبریری میں مہتمم اعلیٰ مقرر ہوئے- اسی زمانے میں آپ کا تعلق آل انڈیا ریڈیو سے ہوا جہاں آپ کی غزلیں گیت نظمیں اور نعتیں نشر ہوئیں- قیام پاکستان کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے-

سنہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک پاک ہیر الڈ کے رسالے "خاتونِ پاکستان" کے شعبۂ ادارت میں کام کیا- نسیم امروہوی کے ساتھ خیر پور (سندھ) سے ایک اخبار "مراد" نکالا جو آدھا اردو زبان میں ہوتا تھا اور آدھا سندھی زبان میں -ان دونوں کی یہ کوشش ملی یکجہتی کے لیے پاکستان میں سندھ کے حوالے سے اولیت کی حامل ہے-یکتا امروہوی نے نونہالوں اور بڑوں کے لیے تقریباً سوا سو کتابیں لکھیں- بچوں کے ادب میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے- یکتا نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں جس پر ان کو مکمل دسترس حاصل نہ ہو-ان کے مختلف مجموعے انجمن در انجمن' حیات و نجات' ابلیس کی خدائی' ذات و صفات' غزل سے غزل تک اور بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں- آپ کی کتاب "اقبال خواتین کی نظر میں" ۱۹۴۷ء میں چھپی تھی جس کے بارے میں اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر معزالدین نے تحریر فرمایا "یہ کتاب اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بھی اور مضامین کے حسنِ انتخاب کی بنا پر بھی ایک انفرادی خصوصیت رکھتی ہے-"

بچوں کے ادب میں مثنوی کی صنفِ سخن سے کام لے کر اپنے آپ کو لاثانی ثابت کیا- آپ کی ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

دستِ رنگیں میں اگر ان کے چھلکتا جام ہو — شعلہ در آغوشِ موجِ بادۂ گلفام ہو
انتظار نجیدہ نہ اے میرے دلِ ناکام ہو — یہ تو آغازِ جنوں ہے دیکھ کیا انجام ہو
سچ تو یہ ہے میں سمجھتا تھا کہ ناممکن ہے یہ — آپ کا پیغام ہو اور وہ بھی میرے نام ہو
وقتِ آخر ہے چلے آؤ رکا جاتا ہے دم — نام ہو جائے تمہارا' اور ہمارا کام ہو
موت کی وہ ایک ہچکی ہے امینِ زندگی — اے عزیزو جس پہ میری زیست کا اتمام ہو
وہ نہ آئیں گے، نہ آئیں گے، نہ آئیں گے کبھی — آج یکتا! کاش یہ میرا خیال خام ہو

-☆☆☆-

# امروہہ کی خواتین شعراء

**حجابؔ:** حجاب عباسی شعیب حزیںؔ کی صاحبزادی ہیں- حجاب سنہ ۱۹۴۶ء میں امروہہ میں پیدا ہوئیں- تقسیم ہند کے بعد اپنے والد کے ساتھ پاکستان آگئیں- آپ کے والد شعیب حزیںؔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے منسلک تھے لہذا حجاب کی تعلیم کوئٹہ میں ہوئی- آپ نے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے گریجویشن کیا پھر ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں اناؤنسر مقرر ہوگئیں- ریڈیو پاکستان کے بعد آپ پاکستان ٹیلیویژن سے خبریں نشر کرتی رہیں- آخر میں سوشل سروسیز کے محکمہ میں کام کرکے ریٹائرمنٹ لے لیا- چونکہ شعر و سخن کے ماحول میں پرورش پائی لہذا طبیعت پر اس کا اثر فطری ہے- آپ ایک اچھی شاعرہ ہیں- محسنؔ بھوپالی سے تلمذ ہے- آپ کی ایک غزل پیش ہے۔

نئی رتوں کی زمیں پر عذاب کیسے ہیں — قدم قدم نظر آئیں سراب کیسے ہیں
نہ آسکے جو لبوں تک سوال کیسے تھے — جبیں جبیں پہ رقم ہیں جواب کیسے ہیں
وہ چاہتیں، وہ پذیرائیاں تمام ہوئیں — ذرا سی دیر میں یہ انقلاب کیسے ہیں
مرے خدا مجھے اتنی تو آگہی دیدے — برنگِ رسم محبت عتاب کیسے ہیں
یہ آج چہرہ گلوں کا دھواں دھواں کیوں ہے — زمین کی پیاس بڑھائیں سحاب کیسے ہیں
فگار ہوگیا کانٹوں سے پیرہن کس کا — چمن میں آگ لگائیں گلاب کیسے ہیں
زباں تو حرف شکایت سے ناشناس رہی — حصار ذات میں یہ اضطراب کیسے ہیں
مجھے جو اذن تکلم ملے تو یہ پوچھوں — حجابؔ تو نے جو دیکھے وہ خواب کیسے ہیں

-☆☆-

**سیماؔ غزلؔ:** سیما غزل نام اور تخلص بھی غزلؔ ہے- آپ شعیب حزیں امروہوی کی صاحبزادی ہیں- سیما غزل ۱۹۵۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں- سرسید گرلز کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کی- آپ کے شوہر ڈاکٹر فواد مصطفی عراقی باشندے ہیں- شادی کے بعد سیما غزل نے ملازمت

چھوڑ کر صحافت کا پیشہ اختیار کیا- آپ ماہنامہ "دوشیزہ ڈائجسٹ" کی بارہ سال اڈیٹر رہیں- آجکل پاکستان ٹیلیویژن کے لیے ڈرامے لکھتی ہیں- آپ کے کئی لانگ پلے ڈرامے سائبان شیشے کا ذرا سی بات اور دشت تنہائی ٹیلیویژن پر دکھائے جا چکے ہیں- آجکل ایک اور سیریل ڈرامہ منزلیں ٹیلیویژن پر دکھایا جارہا ہے- شعر و سخن سے آپ کو بھی ذوق ہے اور اچھی غزلیں کہتی ہیں- آزاد شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں-

-☆☆-

**شاہین صدیقی:** شاہین صدیقی امروہہ کے ادبی خاندان میں پیدا ہوئیں- آپ کے والد حکیم سید آفتاب الدین کا امروہہ کے رضویہ خاندان سے تعلق تھا- بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف آپ کا رجحان تھا- ذوق سخن کو ابھارنے اور نکھارنے میں آپ کے والد نے آپ کی بڑی رہنمائی کی- شاہین اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں- سنہ ۱۹۵۷ء میں آپ کی شادی ہوئی- اس کے بعد سنہ ۱۹۵۸ء میں آپ لندن چلی گئیں جہاں پر ادبی محافل و مجالس کی شرکت نے آپ کی حوصلہ افزائی کی- گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود اردو زبان کی ترقی و ترویج میں کوشاں رہتی ہیں- لندن میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بہت مقبول ہیں- آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

سکوں کا ایک بھی لمحہ جو دل کو ملتا ہے — یہ دل خیال کی وادی میں جا نکلتا ہے
ہے روشنی مرے دل میں ترے خیالوں کی — کہ اک چراغ سا ویراں کدے میں جلتا ہے
مہک رہی ہے تری یاد کی کلی ایسے — کہ پھول جیسے بیاباں میں کوئی کھلتا ہے
خلاء میں میری نظر جب کہیں اٹکتی ہے — ترے وجود کا پیکر وہیں پہ ڈھلتا ہے
نظر میں تارے سے شاہین چمکنے لگتے ہیں — یہ دل جو شدتِ جذبات سے مچلتا ہے

**شکیل:** بی فردوسی جان آپ کا نام اور تخلص شکیل کرتی تھیں- حضرت شمیم امروہوی کی شاگرد تھیں- آپ کی ایک غزل کے چند اشعار جو گلدستہ "نسیم چمن" میں شائع ہوئی پیش ہیں ؎

تصویر میں وہ بات وہ ناز و ادا نہیں — ان کی کشش کا نقش کسی سے کھنچا نہیں
کچھ شوخیٔ کلام کا مضموں ملا نہیں — دل سے عروس نظم کا گھونگٹ کھلا نہیں
پتھر وہ دل ہے درد سے جو آشنا نہیں — وہ آنکھ بے سواد ہے جس میں حیا نہیں
بوسہ کے بدلے کیوں نہیں لیتے دل شکیل — نقصان اس میں میرا ہے کچھ آپ کا نہیں

**رضیہ انورؔ:** سرزمین امروہہ نے، جس کے خمیر میں شعر و سخن شامل ہے، جہاں ہزاروں شاعروں کو جنم دیا وہاں بہت سی شاعرات کو بھی پیدا کیا-ان ہی شاعرات میں ایک نام رضیہ انورؔ کا ہے جن کا کلام مدتوں تک ماہ نامہ ''عصمت''، ''خاتونِ پاکستان''، ''نسواں کتاب'' لاہور اور دیگر رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے-رضیہ خاتون کا اصل نام انوری خاتون تھا جو ان کے بزرگوں نے رکھا تھا لیکن شاعری کی دنیا میں آپ نے رضیہ انورؔ کے نام سے شہرت پائی اور انورؔ اپنا تخلص کرتی تھیں-

رضیہ انورؔ سنہ ۱۹۱۹ء کو امروہہ میں پیدا ہوئیں- آپ کے والد الحاج قطب الدین کا تعلق امروہہ کے معزز خاندان صدیقی سے تھا جن کی سکونت محلہ چاہ ملا امان میں تھی- آپ کے ایک بھائی منور علی خاں کراچی پولیس میں SP کے اہم عہدے پر رہ چکے ہیں-رضیہ انورؔ کی تعلیم و تربیت اپنے خاندان میں ہوئی- آپ کی طبیعت کا قدرتی رجحان ابتدا ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھا جو آپ کو امروہہ سے ورثہ میں ملا تھا- شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک اعلیٰ ظرف کشادہ ذہن اور روشن خیال خاتون تھیں-

رضیہ انورؔ ایک خوبصورت شاعرہ تھیں جنہوں نے نظمیں، گیت، نعتیں اور غزلیں کہیں لیکن آپ کی محبوب صنف سخن غزل تھی-ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ اہم مسائل و واقعات اور درس کی بھی عکاسی ہوتی ہے- آپ کا ایک دیوان ''دشتِ تنہائی'' شائع ہو چکا ہے-۱۹؍ دسمبر ۱۹۹۷ء کو آپ کی وفات ہوگئی- آپ کی ایک نظم، ایک غزل اور کچھ اشعار بطور نمونہ پیش ہیں؎

آئے نہ ساجن وعدہ کر کے بیت گئیں ساری رتیاں — کچھ اپنی کہتے کچھ میری سنتے ہو جاتیں سب من بتیاں
لوٹ بھی جائے بادِ بہاری آئی نہیں ان کی سواری — من مندر ہے ویراں ویراں سونی سونی شہر اور گلیاں
کوئل کوکو ہم کو بلائے پی پی پپیہا جی کو جلائے — گلشن گلشن ڈھونڈا اُن کو چھان لی اک اک ڈالی پتیاں
کیا وعدہ نبھانا بھول گئے یا لوٹ کے آنا بھول گئے — گھر اور آنگن سونا سونا راہ تکیں ہیں پھول اور کلیاں
تیری چندریا کون رنگائے جھولا تجھ کو کون جھلائے — ساون تو آیا ساجن نہ آئے چھیڑ کریں ہنس ہنس سکھیاں
اے پُروا ہوا اُو بھیگی فضا گھنگور گھٹا جا ان کو بتا — چپکے چپکے نیر بہائیں درشن پیاسی دو انکھیاں

ایک نظم کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں جو ملت اسلامیہ کی موجودہ زبوں حالی کی عکاسی کرتے ہیں؎

ہم نشیں! تو ہی بتا، عید مناؤں کیسے — دل غمگیں کو جو روتا ہے مناؤں کیسے
نغمۂ عیش و طرب تجھ کو سناؤں کیسے — درد جو دل میں نہاں ہے وہ دکھاؤں کیسے

ہم نشیں ! تو ہی بتا ، عید مناؤں کیسے

اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو میں پالوں پہلے　　دینِ اسلام کی شوکت کو بڑھالوں پہلے
جذبۂ شوقِ شہادت کو جگالوں پہلے　　دشمنِ دین کو دنیا سے مٹالوں پہلے

ہم نشیں ! تو ہی بتا ، عید مناؤں کیسے

-☆☆-

**بیناؔ:** بیناحسن نام اور تخلص بیناؔ ہے۔سید سعید حسن ابن سید حبیب حسن دربار کلاں کی صاحبزادی ہیں۔ سید عاشور کاظمی سے کلام پر اصلاح لیتی رہی ہیں اور ان کے ہی زیر اثر ترقی پسندی ان کی شاعری کا خاصا بن گئی۔ بڑی ہونہار نوجوان شاعرہ ہیں اور ان کا پہلا مجموعہ کلام "احساس کا سفر" ۱۹۹۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ان کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے "بیناؔ حسن اردو شاعری میں ایک نیا نام ہیں لیکن ان کے کلام میں جو تازگی اور دلکشی ہے وہ ان کے شاندار مستقبل کی ضامن ہے۔بینا کی نگاہ میں تیزی، فکر میں گہرائی اور اسلوب میں تازہ کاری ہے۔" ڈاکٹر فرمان فتحپوریؔ فرماتے ہیں "بیناشاعری کو کھیل نہیں سمجھتیں، واقعی دیدۂ بینا رکھتی ہے۔وہ شعر نہیں کہتی بلکہ شعر خود اس سے کہلواتا ہے۔بیناؔ زیادہ تر برطانیہ میں مقیم رہی ہے اور وہیں اس کی شاعری پروان چڑھی۔دادا اور پردادا بھی شاعر تھے۔"

بیناؔ نے مختلف بین الاقوامی مشاعروں میں داد و تحسین حاصل کی ہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین کے مشاعرے میں ان کی شاعری نے دھوم مچادی۔عاشور کاظمی نے اپنے تعارفی مضمون میں لکھا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی جب لندن تشریف لائے تو کل برطانیہ انجمن ترقی اردو نے ان کے اعزاز میں محفل شعر و سخن سجائی۔بیناؔ نے اپنی تازہ نظم جس کے دو شعر یہ تھے

شعلے تو اٹھے تھے مشرق سے　　مغرب سے دھواں کیوں اٹھتا ہے
اس راہ کے ذرہ ذرہ سے　　اک شور فغاں کیوں اٹھتا ہے

سنائی تو خلیق انجم ہمہ تن گوش بن گئے اور پوری نظم سن کر ڈاکٹر خلیق انجم بے ساختہ کھڑے ہوگئے اور بیناؔ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "جیتی رہو میری بچی۔اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے"

تین مختلف اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ایک امید اثاثہ ہے سو وہ تو نہ چھنے　　ظلم ایسا تو نہ انسان پہ ڈھایا جائے

متاعِ فکر لیں گے تب جہاں آرزو دیں گے　　زبانیں کاٹ کر یہ لوگ اذنِ گفتگو دیں گے
شعورِ زندگی بھی رفتہ رفتہ آ ہی جائے گا　　ابھی تو دَور ہے یہ آدمی کی بربریت کا

-☆☆-

**حیاتؔ:** مسعودہ نام اور حیاتؔ تخلص ہے- آپ شریف احمد صدیقی (بھارتی) محلّہ ملانہ کی اہلیہ ہیں- بدایوں سے تعلق تھا- علی گڑھ سے بی-ایڈ پاس کر کے دہلی میں معلّمہ رہیں- شعر گوئی سے قلبی لگاؤ تھا- غزل کی شاعرہ ہیں- سماجی اور عصری زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے- ان کا کلام ''بوئے سمن'' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا- شعر اچھا کہتی ہیں- نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؂

پاکستانی ادیب اور شاعروں کے لیے

مجھکو کہیں بھی تم اسی شاخِ کہن کے ہو　　اپنے چمن میں آئے ہو اپنے چمن کے ہو
کیوں کر نہ گیت گائے تمہارے ہر ایک موج　　تم تو ہماری وادیٔ گنگ و جمن کے ہو
نظروں سے دور ہو کے ہوا بھی ہے کوئی دور　　تم اب بھی ماہ و مہر ہمارے گگن کے ہو
صحنِ چمن میں کھنچ گئے دیوار و در تو کیا　　تم تو حدوں سے دور بہارِ چمن کے ہو
بوئے وفا ٹپکتی ہے اک ایک حرف سے　　کیا تم اسی خیال اسی فکر و فن کے ہو
خوشبو بسی ہوئی ہے وہی جان و جسم میں　　تم دشتِ ہجر میں بھی اسی گل بدن کے ہو
یہ کیا کہا کہ ہم تو مسافر ہیں اب حیاتؔ　　تم اب بھی جانِ جان ہمارے بدن کے ہو

-☆☆☆☆-

امروہہ کے شعراء کی تعداد ماشاءاللہ اتنی ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے مگر بدقسمتی سے امروہے کا کوئی بھی فرد اس سمت میں کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکا- میں اپنی کتاب میں تمام شعراء کو تو شامل نہیں کر سکا تاہم یہ کوشش ضرور کی ہے کہ جس کے بارے میں کوائف حاصل ہو گئے ہیں ان کو شامل کر لیا ہے- مگر ایک بڑی تعداد ایسے اہم شعراء کی رہ گئی جن کو باوجود اپنی خواہش کے اپنی اس کتاب میں شامل نہ کر سکا- لیکن اس کی خواہش ضرور ہے کہ اگر زندگی وفا کرے اور موقع میسر آ جائے تو اس اہم قومی ضرورت کو پوری کرنے کی کوشش کروں- کاش کہ ایسا ہو سکے!

-☆☆☆-

# محمد حسین صدیقی:

عمراس طرح امیدوں کے تعاقب میں کٹی داستاں ختم پہ تھی اور میں عنواں سمجھا
نامرادی میں توکوئی بھی تمنا نہ رہی جوخلش یاس نے دیدی اسے ارماں سمجھا

-------

میرے برادر بزرگ محمد حسین صدیقی ۱۷ر جولائی سنہ۱۹۲۹ء کو صوبہ سرحد کے ضلع بنوں میں پیدا ہوئے- بچپن ہی میں ہم دونوں بھائی آغوش مادری سے محروم ہوگئے تھے-والدہ محترمہ کی وفات کے بعد دادااور دادی صاحبہ ہمیں امروہہ لے آئے-انہوں نے ہماری تعلیم وتربیت کا ایسا خیال رکھا اور اس طرح پرورش کی کہ ہمیں اپنی ماں کی محرومی کا کبھی احساس تک نہ ہوا-جب ہم نے ہوش سنبھالا تو دادا صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو پہلے قرآن کریم کی تعلیم دی-اس کے بعد انہوں نے مجھے بگلہ اسکول میں اور بھائی جان کو امام المدارس ہائی اسکول میں داخل کرایا-

اپنے پستہ قد اور سانولی رنگت کے سبب بادی النظر میں تووہ اثر انگیز شخصیت کے مالک نظر نہیں آتے تھے-لیکن ان کی عقل و دانش،علم و فراست ،روشن ضمیری،مردم شناسی،حسن اخلاق اورکردار کی بلندی ان کی کوتاہ قامتی کو بھلادیتی تھی-ان کی اعلیٰ صفات کی جگمگاتی کرنیں ان کے سانولے رنگ پر چھاجاتیں- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے روشن پہلو نکھر کرسامنے آنے لگتے اوران کا

قرب پانے والا ہر شخص ان سے متاثر ہوتا چلا جاتا تھا۔افسوس علم ودانش کا یہ روشن آفتاب عروج پر پہنچنے سے پہلے ہی صرف ۴۰ برس کی عمر میں غروب ہو گیا۔

انہیں بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا اسقدر شوق تھا کہ درسی کتابوں کے علاوہ بھی وہ مختلف قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔علمی استعداد اس بلا کی تھی کہ خود طالب علم ہوتے ہوئے بہت سے طالب علموں کو،حتیٰ کہ اپنے ہم جماعتوں کو بھی گھر پر پڑھایا کرتے تھے۔ امام المدارس ہائی اسکول کے استادوں میں ان کے مشفق استاد ماسٹر تحی حسن صاحب مرحوم ان سے بہت محبت کرتے تھے۔وہ ان کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"حسینؔ آئی۔سی۔ایس۔کے لیے اہل ترین شخص ہے۔"

ان کے دوستوں میں سید علی نقوی محلہ بنگلہ،اقبال حسن رضوی(حکیم طفیل احمد کے فرزند)، صادقین،علی مرتضیٰ خاں (گھڑیال منزل)،تقی ہادی صاحب کے فرزند امام ہادی(لنڈن)،سید محمد باقر نقوی محلہ بنگلہ،شمس الحسن،صدر مرزا قیصر گرلز انٹر کالج محلہ سدو،رحمان عطار کے فرزند افتخار احمد اور شمیم الرب وغیرہ بہت قریب تھے۔ان دوستوں کے ساتھ آئے دن علمی بحث ومباحثے ہوتے رہتے تھے۔ان کے مباحثوں کے دوران کبھی ایسا بھی لگتا تھا کہ بس اب یہ آپس میں لڑ پڑیں گے۔ بھائی جان کا کھیلوں کی طرف رجحان بہت کم تھا البتہ ہاکی اور شطرنج کبھی کبھی کھیل لیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ موسیقی سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔مجھے یاد ہے کہ وہ موسیقی کو روح کی غذا کہا کرتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں کبھی کبھی رات کو موسیقی کی محفل بھی جمتی تھی جس میں شمیم الرب (محلہ سدو) گایا کرتے تھے اور مولوی ضیاو الدن کے فرزند شاہ نور بینجو بجایا کرتے تھے۔

بھائی جان نے سنہ ۱۹۴۴ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک کے امتحان میں انگلش،ڈرائنگ اور ریاضی میں Distinction کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔بھائی جان اور صادقین دونوں اپنی مادر علمی،امام المدارس ہائی اسکول میں ہم جماعت تھے۔رسالہ "علامت" کراچی ستمبر۔اکتوبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں صادقین مرحوم کی خودنوشت شائع ہوئی جس میں انہوں نے تحریر کیا: "میرے ہم جماعت لڑکوں میں سب سے زیادہ قابل لڑکا محمد حسین صدیقی تھا۔ جو انگریزی اور حساب میں غیر معمولی لائق ہونے کے ساتھ ساتھ خاکہ کشی اور نقشہ نویسی میں بھی ماہر تھا۔ اس لڑکے کے والد نے اسے خاکہ کشی

کے دیگر سازوسامان کے ساتھ ساتھ آبی رنگوں کے بڑے بڑے ڈبے بھی روانہ کیے تھے جن کو دیکھ کر محمد حسین سے میرے تعلقات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ اس کے دادا دادی بھی مجھ سے محبت کرنے لگے-اس ہونہار طالب علم کا گھر محلہ چاہ شور میں تھا-گرمیوں کی تعطیلات میں ہماری فنکارانہ سرگرمیاں اپنے عروج کو پہنچ جایا کرتی تھیں جس میں ظاہر ہے کہ نقشہ نویسی بھی شامل تھی اور میں محمد حسین کے گھر کی سہ دری میں بیٹھ کر کبھی کبھی تمام دن آبی رنگوں سے نقشے بناتا رہتا تھا" میٹرک پاس کرنے کے بعدانہیں وظیفہ کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایف-ایس-سی میں داخلہ مل گیا-لیکن افسوس یونیورسٹی کے استادوں کی باہمی چپقلش کے نتیجے میں وظیفہ ختم کردیا گیا- ذاتی نامساعد حالات کے تحت آپ تعلیم جاری رکھنے کے متحمل نہ تھے لہذاامروہہ واپس آگئے-

امروہہ میں آپ کی علمی قابلیت کا شہرہ عام تھا-امروہہ کی بہت سی معتبر شخصیات بھی بھائی جان کی ذہانت کی معترف تھیں اوران سے بہت محبت کرتی تھیں-محمد میاں رضوی(مرحوم)سابق چیئرمین میونسپل بورڈامروہہ کوان سے دلی انسیت تھی- تقسیم کے وقت BBC سے انگریزی خبریں سننے کے لیے اکثرآپکو محمد میاں رضوی(مرحوم) کے گھر بلایاجاتا تھااور آپ خبریں سن کر سامعین کواردو میں سناتے تھے-

محمد میاں کی ہی وساطت سے بھائی جان کی ملاقات مولاناحفظ الرحمن قبلہ سیوہاروی (مرحوم) سے ہوئی تو وہ آپ کو دہلی لے گئے جہاں وہ جمعیت علمائے ہند میں مولانا کے ذاتی مددگار کی حیثیت سے منسلک ہوگئے-اس خدمت میں جو فرائض تفویض ہوئے ان میں بین الاقوامی عمائدین سے مراسلت اور بالمشافہ ملاقاتوں میں ترجمان جیسے اہم فرائض شامل تھے جنہیں انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دینے کے علاوہ بعض مواقع پر جمعیت علماء ہند کے نمائندے کے فرائض بھی بخیر وخوبی انجام دیے-وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے کانگریس کی قومی اسمبلی کی ممبری کا مولاناحفظ الرحمن کوٹکٹ نہ دینے کے مسئلہ پرجمعیت کے موقف کی وضاحت کرنے کلکتہ گئے-نیزجمعیت علمائے ہند کے نمائندے کی حیثیت سے مہاتماگاندھی سے بھی ملاقات کی-جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ مولوی حفظ الرحمن مرحوم کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے اورجمعیت کے متذکرہ امور کو بخیروخوبی انجام دینے کی بنیادپر جمعیت کے صدر حضرت مولاناسید حسین احمدمدنی بھی ان کی اعلیٰ صلاحیت کے معترف اورمداح تھے-مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مرحوم نے بھائی جان کے علمی شغف اور صلاحیت کے پیشِ نظر جامعہ ملیہ دہلی میں داخلہ کے لیے جامعہ کے مہتمم سے

رابطہ کیااور خط بھی لکھالیکن انہوں نے داخلہ سے پہلے پاکستان ہجرت کرنے کا عزم کرلیا تھا-اس لیے جامعہ ملیہ میں داخلہ نہ لیا-یہ باتیں اس زمانے کی ہیں جب وہ teens میں تھے-

وہ بھی ایک عجیب دور تھا-ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا اور ایک نئی مملکت پاکستان وجود میں آچکی تھی- ہر طرف افراتفری کا دوردورہ تھا-صدیوں سے آباد لوگ پاکستان ہجرت کر چکے تھے اور بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کے لیے تیار بیٹھے تھے کیونکہ ایک طرف تو ایک نئی اسلامی حکومت کے دنیا کے نقشے پر ابھرنے کی ایک انتہائی مسرت تھی اور وہاں جا بسنے کی شدید خواہش دلوں میں موجزن تھی جبکہ دوسری طرف تقسیم کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں نفرت کی ایک آگ بھڑک اٹھی تھی-ظاہر ہے ایسے میں مسلمانان ہند کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا-بھائی جان کے دل میں بھی جذبہ اسلامی نے ایک ایسی کروٹ لی کہ انہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کے فیصلے کو بخوشی عملی جامہ پہنادیا اور وہ پھر پاکستان آگئے-

پاکستان کے شروع کے ایام میں زندگی بہت مشکل تھی-حصول علم کی طلب اور مالی پریشانیوں نے انہیں طویل عرصہ تک بے چین رکھالیکن بدترین حالات سے نہ تو وہ گھبرائے اور نہ کبھی ناامید ہوئے-وہ ایک آہنی عزم اور بلا کی قوت برداشت کے انسان تھے-مشکلوں سے نہ وہ پریشان ہوتے تھے اور نہ کسی قسم کا خوف ہی ان میں پیدا ہوتا تھا-ایک لگن تھی ایک جذبہ تھا اور ایک امنگ تھی زندگی میں کچھ بننے کی-انہیں نہ کوئی دنیوی طلب تھی نہ عیش و عشرت کی طمع -وہ زندگی کے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے-وہ قنوطیت پسند انسان نہ تھے بلکہ رجائیت ان کے کردار کا ایک روشن پہلو تھی- ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں-

بگڑ تا رہا ہوں سنور تا رہا ہوں　　میں ہر دور میں کچھ نکھر تا رہا ہوں
میں گر تا رہا ہوں سنبھلتا رہا ہوں　　زمانہ سے ہر دم نکھر تا رہا ہوں

پاکستان آکر بھائی جان مختلف اداروں میں ملازم رہے لیکن کسی ایک جگہ جم کر کام نہیں کیا-اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی امتحان کی تیاری کرتے تو ملازمت چھوڑدیا کرتے تھے-ملازمت کا زیادہ عرصہ آپ نے کراچی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعمیرات (Architect (Control میں گزارا جہاں انہوں نے مجھے بھی بلڈنگ سرویر کی آسامی پر ملازم کرادیا تھا-

اس زمانے میں کراچی میں اعلیٰ تعلیم کا پرائیویٹ نظام رائج نہ تھا اور ایسی صورت میں کالج میں

باقاعدہ داخلہ لے کر تعلیم جاری رکھنی ممکن نہ تھی- بس صرف پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے منشی فاضل وغیرہ کا امتحان پاس کرکے BA'FA اور MA کے امتحان میں شریک ہونا ممکن تھا- اس لیے دوران ملازمت بھائی جان نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا- منشی فاضل کرنے کے بعد F.A. اور B.A..English کے امتحانات دیئے اور دونوں امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے- سنہ ۱۹۵۵ء میں LLB فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا- اس کے بعد M.A.English میں داخلہ فارم داخل کیا- لیکن اس وقت کے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انگریزی میں داخلہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ انہوں نے کیونکہ منشی فاضل کی بنیاد پر گریجویشن کیا تھااس لیے انگریزی میں ان کو داخلہ نہیں دیاجاسکتا بلکہ ان کو فارسی میں MA کرنا ہوگا- ان کی اس گزارش کے باوجود کہ میٹرک،انٹر اور بی-اے- تینوں امتحانات میں انگریزی میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی ہے'وائس چانسلرصاحب نے داخلہ دینے سے انکار کردیا-لہذا بہ مجبوری مرحوم کو فارسی میں ایم-اے- کرنا پڑا- عجیب اتفاق ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا وظیفہ بھی ان ہی وائس چانسلر نے ختم کیا تھااور ایم-اے- انگلش میں داخلہ نہ دینے والے بھی وہی تھے-اس کے بعد وہ پاکستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں بھی شریک ہوئے اور نمایاں حیثیت میں کامیابی حاصل کی لیکن تعجب ہے کہ ان جیساذہین شخص بھی Viva میں منتخب نہ ہوسکا-

بھائی جان نے جن اداروں میں بھی کام کیابڑی محنت اور لگن سے کیا-وہ دفتری کام کواس خیال سے نہیں کرتے تھے کہ جوکام ان کودیاگیا ہے بس اسے پوراکردیں بلکہ اس ادارے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے دوسرے کاموں کو بھی فاضل وقت میں انجام دینے میں ان کو دلی سکون حاصل ہوتا تھا- اکثر اوقات تووہ دفتر کے دوسرے ساتھیوں کا کام بھی نمٹادیاکرتے تھے-دفتر کے کاموں میں دلچسپی لینے کی ایک مثال یہ ہے کہ جون سنہ ۱۹۵۶ء میں جب وہ میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعمیرات میں کام کررہے تھے تواس وقت تک اس ادارے کی کوئی آمدنی نہیں تھی اور یہ محض دوسرے اداروں پر بوجھ تھا- چنانچہ اس محکمہ کواپنے پیروں پر کھڑاکرنے کے لیے بھائی جان نے بلڈنگ پلان منظور کرانے کی ایک فیس وصول کرنے کی تجویز اپنے افسر کے سامنے پیش کی-وہ اس تجویز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کارپوریشن کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک ڈرافٹ تیار کرنے کو کہا- یہ ڈرافٹ جب کارپوریشن کے

سامنے پیش ہوا تو فوراً ہی اس کی منظوری دیدی گئی جس کے نتیجے میں آج یہ محکمہ خود اپنا ہی کفیل نہیں بلکہ دوسرے محکموں کا بھی کفیل ہے۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں ملازمت چھوڑ کر بھائی جان نے فخر الدین جی ابراہیم اینڈ کمپنی میں اپنی وکالت کا آغاز کیا۔ ابتدا میں تو وہ اس کمپنی میں بہت پریشان رہے اور تنخواہ بھی معقول نہ تھی لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کا عروج شروع ہو گیا۔ کمپنی کو جب ان کی قابلیت اور ذہانت کا علم ہوا تو وہاں کا ہر شخص ان کے ساتھ بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آنے لگا۔ اس کمپنی کے مالک سابق جسٹس فخر الدین جی ابراہیم ہیں جو بعد میں سندھ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے جسٹس بھی رہے اور آگے چل کر آپ صوبہ سندھ کے گورنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے والد محترم جناب غلام علی (مرحوم) بھی بمبئی کے نامور سالی سیٹر تھے۔ بھائی جان کے ساتھ ان کا برتاؤ بڑا مشفقانہ تھا۔ موصوف ہر موقع پر بھائی جان کو اپنا بیٹا کہہ کر متعارف کراتے تھے۔ بھائی جان نے بھی اس کمپنی میں بے لوث، بڑی محنت، مشقت اور لگن سے کام کیا اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

بھائی جان کی قابلیت اور ذہانت کے پیش نظر انہیں بڑی مراعات دی جانے لگیں اور ہر دو چار ماہ کے بعد ان کے مشاہرہ میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اس اضافہ کا علم بھائی جان سے پہلے مجھے ہوتا تھا۔ کیونکہ تنخواہ کا چیک، بینک میں جمع کرانے کے لیے وہ مجھے دیدیا کرتے تھے۔ وہ انتہائی سادہ اور قانع طبیعت کے انسان تھے مکان پر موجودہ دور کی تزئین و آرائش وزیبائش نہ تھی۔ حصولِ زر میں بھی انتہا درجہ کی قناعت تھی۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں حسب معمول بھائی جان نے مجھے لفافہ دیا۔ میں نے لفافہ کھول کر تنخواہ میں تین ہزار روپے کا اضافہ دیکھا تو پھر مٹھائی منگانے کے لیے کہا۔ لیکن اس مرتبہ وہ لفافہ انہوں نے مجھ سے لے لیا اور کچھ دیر تک چیک کو دیکھتے رہے۔ پھر کہا کہ مجھے کل بینک سے کچھ پیسے نکلوانے ہیں لہذا یہ چیک میں خود ہی جمع کرا دوں گا۔ یہ کہہ کر لفافہ اپنی ڈائری میں رکھ لیا۔ دوسرے دن یہ چیک انہوں نے فخر الدین صاحب کی میز پر لے جا کر رکھدیا۔ فخر الدین صاحب نے چیک اپنی میز پر دیکھا تو پھر بھائی جان کی ٹیبل پر رکھدیا۔ غرض دو چار بار ایسا ہوا تو ایک مرتبہ فخر الدین صاحب نے بھائی جان کو جتا کر کہا کہ حسین صاحب یہ چیک تمہارا ہے۔ بھائی جان نے ان سے کہا: فخر بھائی اب بہت اضافہ ہو چکا اور چیک لینے سے انکار کر دیا۔ فخر الدین صاحب نے مجبوراً پرانی ہی تنخواہ کا چیک دیا۔ یہ بات جسٹس فخر الدین

صاحب نے ہمیں اس موقعہ پر بتائی جب وہ ایک دن بھائی کے انتقال کے بعد انکے بچوں سے ملنے گھر آئے تھے- بہر حال قناعت پسندی بھائی جان کا شعار تھا جو زندگی کے آخری لمحات تک نہ چھٹ سکا-

بھائی جان سیر و تفریح کے عادی نہیں تھے -البتہ شام کو جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوتے توکتابوں کا مطالعہ' دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق'علمی گفتگو' مختلف کتابوں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ ان کا بہترین مشغلہ تھا جوانہیں تازہ دم کر دیتا تھا- برج کے بہترین کھلاڑی تھے-ہر اتوار کو برج کھیلنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اور سارا دن برج ہوتی تھی- برج کے دوران چائے کادور چلتا اور سگریٹ اس کثرت سے پیے جاتے کہ کمرہ دھویں سے بھر جاتا تھا- موسیقی سے بھی بڑالگاؤ تھا-جب ریڈیو پر کوئی خوبصورت غزل سنتے تو جھومنے لگ جاتے تھے-اقبال بانو' فریدہ خانم اور مہدی حسن کی گائی ہوئی غزلوں سے بڑا لطف اندوز ہوتے تھے-کبھی کبھی خود بھی بینجو بجاتے اور خوبصورت دھنیں بنایا کرتے تھے-

دیکھتے ہی دیکھتے بھائی جان کا شگفتہ چہرہ کملانے لگا-بیماری کے پے درپے حملے ہونے لگے-ایسی حالت دیکھ کر عزیز واقارب 'دوست واحباب سب ہی پریشان ہوگئے- ڈاکٹروں ،حکیموں کا علاج معالجہ ہوا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا- پھر اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا جس نے تشخیص کرکے پھیپڑوں کا کینسر بتایا-ایسی بیماری'جس کا کوئی علاج ہی نہ تھا' سن کر سب ہی کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں-ہر شخص کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے-جسٹس فخرالدین صاحب کو علم ہوا تو وہ بھی پریشان ہوگئے اور ملک سے باہر علاج کرانے کا بندوبست کرنے لگے-آفرین ہے بھائی جان پر کہ اپنی بیماری کا علم ہونے کے باوجود اپنے چہرہ پر مایوسی یا محرومی کے آثار نمایاں کرنا تو کجاانہوں نے دوستوں اور عزیزوں کو بھی مایوس نہیں ہونے دیا- خوداعتمادی **(Will power)**کا یہ عالم تھاکہ موت کے سائے منڈلا رہے تھے' دنوں کی گنتی ختم ہوتی جارہی تھی 'زندگی کی چند گھڑیاں باقی تھیں اور وہ حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف تھے-

۱۵رجولائی۱۹۶۹ء کو شام تک وہ دفتر میں کام کرتے رہے-۱۶رجولائی کو صبح اٹھے تو اس قابل نہ تھے کہ دفتر جاسکتے- ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ہسپتال لے گئے-اس دن وہ سانس لینے میں بہت دقت محسوس کررہے تھے-آخر میں ان کا سانس اکھڑنے لگا تو ان کے بیڈ پر آکسیجن ٹینٹ لگادیا-بیڈ کے اطراف میں عزیز واقارب اور دوست سب ہی پریشان کھڑے تھے- سانس کی تکلیف میں اسقدر شدت

تھی کہ کبھی بیٹھتے اور کبھی لیٹ جاتے تھے-ای تکلیف میں پہاڑ جیسا دن گزر گیا-شام ہو گئی تو انہوں نے بھائی صاحبہ سے کہا گھر جاؤ اور بچوں کو سنبھالو اور اپنا دل بڑا رکھنا-

رات کو دو بجے ان کی آنکھ لگ گئی-انہیں سوتے دیکھا تو دوست احباب بھی چلے گئے- اسوقت ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی-میں ان کے پاس بیٹھا ان کی زندگی کے لیے دعائیں کر رہا تھا-ہسپتال میں ہر طرف وحشت اور موت کا سماں طاری تھا- کبھی کبھی مریضوں کے کراہنے کی آوازیں آتیں تو دل گھبرانے لگتا تھا-ابھی نیند آئے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی- وہ اٹھ کر بیٹھ گئے-اس وقت وہ انتہائی تکلیف سے گزر رہے تھے-ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کہہ نہیں رہے-آج میں سوچتا ہوں کہ ان جیسا باہمت انسان اپنی زندگی کے ان آخری سانسوں میں کیا کہنا چاہتا ہوگا-شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں :

پسینہ موت کا ماتھے پہ آیا آئینہ لاؤ
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے تو ہاتھ پیروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دم ہی نکل گیا ہو مگر ان کی کمپنی کے ایک ساتھی وکیل چیل صاحب فوراً ڈاکٹر کو بلانے گئے لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی چند لمحوں میں وہ تکیہ پر بے جان ہو کر گر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی-

بھائی جان ایک عظیم انسان تھے -ان کی شخصیت شہاب ثاقب کے مانند نمودار ہوئی اور زندگی کی فضاؤں میں سطر نور کھینچتی ہوئی ابدیت میں گم ہوگئی-۷ا رجولائی ۱۹۶۹ء کو ۴۰ سال کی کم عمری میں انہوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا-عجیب اتفاق ہے کہ بھائی جان نے ۷ا رجولائی کو اس دنیائے ناپائدار میں آنکھ کھولی'۷ا رجولائی کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور ۷ا رجولائی ہی کو سفر آخرت اختیار کیا-اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے -آمین-

مرحوم کی شریک حیات مختار فاطمہ ان کی توقعات کے مطابق بڑی باہمت ثابت ہوئیں انہوں نے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی اور اس طرح قبول کی کہ ماشاء اللہ ان کی پانچوں لڑکیوں' بشریٰ' غزالہ' رعنا' رانی' سیماب نے ہی گریجویشن کیا اور اچھی ملازمتوں پر ہیں-دو کی شادی ہو چکی ہے تین باقی ہیں-ان کے اکلوتے بیٹے حسن عمر نے کمپیوٹر سائنس پڑھی اور برسر روزگار ہے-

بھائی جان زندگی کی اعلیٰ اقدار کے حامل تھے-وہ اپنی ذات سے بلند تر ہو کر سوچتے تھے-وہ صرف اپنی ہی ترقی کے بارے میں نہیں سوچتے تھے بلکہ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب بھی ان کے ساتھ ترقی کریں اور اس سلسلے میں ان سے جو کچھ بھی بن پڑتا تھا اس کے کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی-ان کے ایک دوست محمد یعقوب صاحب اپنا ایک ذاتی واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"محمد حسین صدیقی مرحوم سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۴۹ء میں اسوقت ہوئی جب میں کراچی پورٹ ٹرسٹ کے صدر دفتر میں ملازم ہوا-ملازمت مل جانے پر ایک افسر نے مجھے ساتھ لیجا کر اس شعبہ میں میرا تعارف کرایا-اسی دوران میری ایک غلطی پر وہاں موجود سارے افراد نے جواباً ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا مگر عجیب بات ہے کہ حسین صاحب قہقہہ لگانے والوں میں شامل نہ تھے- بہرحال شرمندگی کے ساتھ میں حسین صاحب کے برابر کرسی پر بیٹھ گیا-انہوں نے پیار بھرے انداز سے مجھے خوش آمدید کہا اور بڑی متانت و ہمدردی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ شاید آپ تو گریجویٹ ہیں؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے تو انہوں نے کالج اور میرے نصاب سے متعلق بہت سے سوالات کیے اور اس طرح انہوں نے محبت و یگانگیت کی ایک فضا قائم کر دی جس میں مجھے بڑا سکون ملا-

احمد میاں! مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے-ابھی میری ملازمت کا دوسرا یا تیسرا ہی دن تھا کہ انتظامی شعبے کے بڑے بابو نے مجھے ایک مراسلہ دیا جس میں بی-اے کی ڈگری پیش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی-دوسرے دن میں نے اپنی بی اے کی ڈگری ایک جوابی تحریر کے ساتھ بڑے بابو کو پیش کر دی- کچھ دیر کے بعد موصوف نے میرے کسی لفظ کے املے کی غلطی پر مندرجہ ذیل طنزیہ قطعہ لکھ کر بھیجا:

اک گریجویٹ نے شعر بھیجے ہیں    ایسے رنگیں ہیں جیسے نارنگی
شانِ املا ذرا ملاحظہ ہو    ت سے طبلہ ہے ٹ سے سارنگی

یہ مصرعے پڑھ کر میں پسینہ پسینہ ہو گیا-جب کاغذ جیب میں رکھنے لگا تو میری حالت دیکھ کر حسین صاحب نے پوچھا: کیا بات ہے-میں نے وہ مراسلہ حسین صاحب کو دیتے ہوئے کہا کہ شاید میں نے انگریزی میں ڈگری کی ہجے غلط لکھدی تھی-حسین صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میاں ایسی غلطیاں

بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگوں سے ہو جاتی ہیں-لاؤ' اسے مجھے دو'اور پھر انہوں نے اس قطعہ کے جواب میں فوراً ایک طبع زاد قطعہ لکھ کر بڑے بابو کو بھجوادیا- دو تین دن کے بعد بڑے بابو نے مجھے ایک قطعہ اور بھیجا تو اسی وقت حسین صاحب نے پھر ایک جوابی قطعہ لکھ کر بھیجدیا-ایک دو روز کے بعد مجھے پھر ایک قطعہ موصول ہوا تو اس مرتبہ اس کے جواب میں حسین صاحب نے ایک نظم لکھ کر بھیجدی اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوااور میری جان چھوٹی-

یاد رہے کہ اس وقت وہ صرف میٹرک تھے اور میں BAپاس تھااور وہ بھی الہ آبادیونیورسٹی سے-سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے سامنے واقعی میری حیثیت ایک مبتدی کی سی تھی-لیکن واہ واہ اس مرحوم کے حسن سلوک کا یہ حال تھا کہ اپنے سامنے والے کو کم مائیگی کااحساس بھی نہ ہونے دیتے تھے- میری سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ دفتر میں اتنی دیر تک کام کرنے والے شخص کو اسقدر مطالعہ کا وقت کب اور کیسے مل جاتا تھا-بات اردواورانگریزی زبان پر ختم نہیں ہو جاتی-مرحوم نے تو علم نجوم پر بھی نہ جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں-جب کبھی وہ اس علم کے بارے میں گفتگو کرتے تو میں بڑی حیرانی مگر نہایت دلچسپی اور توجہ سے ان کی باتیں سنتا تھا-میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا میدان رہا ہو جس کے بارے میں مرحوم نے مطالعہ نہ کیا ہو-

جب کبھی مرحوم اپنے بارے میں بات کرتے تھے تو اس خواہش کااظہار بڑی شدت سے کرتے تھے کہ وکالت کے ذریعے وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کاانتظام اگر کر سکے تو سکون و یکسوئی سے کچھ وقت مطالعہ کے لیے نکال سکیں گے -وہ پڑھنے لکھنے کا کام کرنا چاہتے تھے-انہیں اسلام اور نبیؐ پاک کے اسوۂ حسنہ سے نہ صرف قلبی لگاؤ تھا بلکہ فلسفیانہ نظر بھی رکھتے تھے-"

میرے مستقبل کے بارے میں بھائی جان کو بڑی فکر تھی-ان کی دلی خواہش تھی کہ میں بھی کچھ پڑھ لکھ جاؤں لیکن میں اس زمانے میں بڑالاابالی تھا-ان سے دور ہی بھاگتا تھاکہ کہیں وہ اس موضوع پر شروع نہ ہو جائیں- انہیں میری اس بے توجہی سے یقیناً بڑادکھ ہو تا تھا-پہلے تو وہ مجھے بہت پیار و محبت سے سمجھاتے رہے لیکن جب انہوں نے اپنی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہ دیکھا تو ذرا سختی سے پیش آئے- بہر حال بہت دیر میں جب ان کی نصیحتوں کا مجھ پر اثر ہوا تو میں نے ان سے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی جس پر انہیں کتنی خوشی ہوئی' شاید میں اسے لفظوں میں بیان نہ کر سکوں-اس زمانے میں میرے دل میں

بھی آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ پس انہوں نے فوراً ہی مجھے Architecture کی تعلیم دلانے کا فیصلہ کر لیا اور ان کے مشورے کے بعد میں نے Architec-ture میں داخلہ لے لیا۔

کالج میں داخلے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کھیر ٹیڑھی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی ہوگی۔ دل میں خواہش تو پیدا ہو ہی چکی تھی مضمون سے دلچسپی میں بھی اضافہ ہو تا گیا۔ بھائی جان کو میری دلچسپی اور محنت کا جب اندازہ ہوا تو انہوں نے فرسٹ ایئر میں میری کامیابی کے بعد والد صاحب کو ایک خط میں لکھا: "میاں جی! اب احمد بہت دل لگا کر پڑھ رہا ہے۔ آپ دیکھنا ایک دن یہ کچھ کر کے دکھائے گا۔" شاید ان کی دور بین نگاہوں نے میرے بڑھتے ہوئے ذوق و شوق سے یہ اندازہ لگایا ہو۔ میرے KDA کے ڈائریکٹر جنرل ہونے کے وقت اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنی خواہش کی تکمیل اور پیش بینی کی تعبیر کو عملی شکل میں دیکھ کر انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ افسوس صد افسوس! ان کے عزیز شاگرد پروفیسر مناظر صاحب جب میری اس ترقی پر مبارک باد دینے آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا: "احمد! نکھار جب آیا جب وہ دیکھنے والا نہ رہا جس کی شدید خواہش آج پوری ہوئی ہے!"

بھائی جان اپنے دوستوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے دوست بھی ان سے والہانہ پیار کرتے تھے۔ بھائی جان جب دوستوں میں مل بیٹھتے تو زندگی کے سارے غم بھول جاتے اور فرصت کے ان لمحوں میں دل کھول کر آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ زندگی کے نجی واقعات کا ان کے دوستوں کو مجھ سے زیادہ علم ہے کیونکہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے تو وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرتے بھی نہ تھے اور خوردی اور بزرگی کی ایک حد فاصل ہم دونوں کے درمیان تھی۔

جونؔ ایلیا نے میری تصنیف "سیاحت ماضی" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ان کے بھائی 'بھائی محمد حسین صدیقی ایک دقیق النظر عالم تھے۔ ہم لوگ انہیں مولانا کہا کرتے تھے۔ ان کی علمی اور ادبی شخصیت نے احمد حسین کی ذات میں بہت سے معنی آگیں گوشے پیدا کیے ہیں"

بھائی امان علی شجر (گھڑیال منزل) کی خدمت میں جب بھی میں حاضر ہوتا تو وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ حسین تمہارے خاندان کا ایک گوہر نایاب تھا۔ کوئی صورت ایسی نکالو کہ اس کی ذہانت، تبحر علمی اور پیشہ ورانہ زندگی کے مختلف پہلو کسی مضمون یا کتاب میں محفوظ ہو سکیں۔ دوران ملاقات بھائی جان

کی زندگی کے نجانے کتنے واقعات وہ مجھے سنایا کرتے -ایک دن انہوں نے مجھے ان کی وکالت کے حوالے سے ان کی قابلیت اور مہارت کا یہ واقعہ سنایا:

" پی-آئی-اے- کے ٹرائڈنٹ جہاز کے ایک قضیہ کے سلسلے میں محمود علی قصوری، سابق جج ظہیر الحسن لاری، اے - کے- بروہی اور فخر الدین جی ابراہیم کو ان کی Opinion اور Comments کے لیے بھیجا گیا- معاملہ جس پر ان کی آراء طلب کی گئی تھیں PIA کے لیے بڑا اہم تھا-فخر الدین جی ابراہیم اور ان کے والد محترم کو حسین کی ڈرافٹنگ پر بڑا اعتماد تھا-انہوں نے اس کو حسین کے حوالے کر دیا اور کہا کہ ایسی Opinion تیار کرو کہ یہ کام نہ صرف ہماری فرم کو ملے بلکہ یہ مقدمہ ہم جیتیں بھی- حسین نے اس کو اتنی محنت اور ماہرانہ طریقے سے تیار کیا کہ یہ کام فخر الدین جی ابراہیم کی فرم کو ملا اور PIA یہ مقدمہ جیت گیا- یہ کامیابی حسین کی اعلیٰ صلاحیتوں کی مرہون تھی اور اس کو بجا طور پر اس کا ہی شاہکار قرار دی گئی-"

بھائی شجر نے ان کے ایک اور شاہکار مقدمہ کا قصہ بھی سنایا:

" جوبلی انشورنس کمپنی کا ایک مشہور مقدمہ تھا-ایک ڈاکٹر نے ذیابیطس کے مریض کے ایک کلیم کے سلسلے میں غلط سرٹیفکیٹ دیدیا تھا-اگر یہ کلیم کمپنی کو ادا کرنا پڑتا تو اسے بھاری رقم ادا کرنی پڑتی-اس مقدمہ کی تیاری کا کام بھی حسین کی سپرد کیا گیا- حسین نے وہ وہ نکات نکالے کہ جن کی اساس پر مقدمہ کا فیصلہ جوبلی انشیورنس کے حق میں ہوا- انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے حسین کو مفت انشیورنس پالیسی دینے کی پیش کش کی مگر واہ رے حسین کی راست گوئی اور استغنا کہ اس نے MD کو کہا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور کمپنی کسی مریض کی ایسی شدید بیماری کو مدنظر رکھتے ہوئے انشیورنس پالیسی دے ہی نہیں سکتی مگر MD نے ضد کی کہ وہ اس خطرناک بیماری کے باوجود کمپنی یہ پالیسی ان کو ان کی محنت کے اعتراف کے طور پر دینا چاہتی ہے مگر حسین نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اخلاقی طور پر اس کو قبول نہیں کر سکتا- واہ رے اس عظیم انسان کی عظیم عظمت!"

حق گوئی اور حق پرستی حسین کے کردار کا ایک ایسا خاصہ تھی کہ جس میں تعلقات اور رشتے بھی اس کو متزلزل نہ کر سکتے تھے-انہوں نے مجھے بتایا کہ "شاید تمہیں نہ معلوم ہو کہ مولانا محمود احمد عباسی تمہارے بڑے قریبی عزیز تھے-تم اور حسین ان کی خالہ زاد بہن کے بیٹے ہو-ایک بار انہوں نے (مولانا محمود احمد

عباسی) نے اس (حسین) سے اپنی قریبی رشتہ داری اور اس کی اعلیٰ لیاقت اور علمی معلومات کے پیش نظر خواہش کی کہ وہ (حسین) تصنیف و تالیف کے کام میں ان کا مددگار بنے جسے حسین نے ان (مولانا محمود احمد عباسی) کے بعض رجحانات کے باعث جن سے حسین کو سخت اختلاف تھا نہ صرف یہ کہ اس پیش کش کو قبول نہیں کیا بلکہ ان کے تقرب سے بھی وہ (حسین) مجتنب رہے۔"

بھائی جان کی منکسر المزاجی سے متعلق یہ واقعہ سنایا:

"حسین میں کسر نفسی بھی حد کمال کی تھی۔ وہ کسی بھی تقریب میں نمایاں نشستوں پر بیٹھنے سے گریزاں رہتا تھا۔ سابق ایئر مارشل اصغر خان پی۔ آئی۔ اے کے ادارے سے جب ریٹائر ہونے لگے تو موصوف کے اعزاز میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں حسین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چنانچہ حسین وہاں شرکت کے لیے گیا اور حسب عادت عام نشست پر بیٹھ گیا۔ لیکن ایئر مارشل اصغر خان نے حسین کو عام نشست پر بیٹھا دیکھا تو سیدھے اس کے پاس آئے اور ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کرسی پر بٹھایا اور اپنے پیش رو چیئرمین سے حسین کا شاندار الفاظ میں تعارف کرایا۔"

ان کی ذہانت اور قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے بھائی امان مجھ سے کہنے لگے: "محمد حسین اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں کی نظم و نثر پر ایک سی قدرت رکھتا تھا۔ اردو تو خیر اس کی اپنی زبان تھی فارسی زبان اہل فارس کی طرح اور انگریزی خالص انگریزوں کی طرح لکھتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ نثر لکھنے پر قادر تھا بلکہ شاعری بھی بڑے جم کر کرتا تھا۔ اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نظم، غزل اور قصیدہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ انگریزی نظم میں بھی موضوع طبیعت تھی۔ تینوں زبانوں میں کلام منظوم کیا مگر بدقسمتی یہ کہ اس کو محفوظ نہ رکھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی پرانی کتابوں کے ذخیرے میں تلاش کیا جائے تو اس کا کلام ضرور موجود ہوگا۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ وہ افسانے بھی لکھتا تھا جو مختلف رسالوں میں چھپتے بھی تھے اور اگر کسی لائبریری میں تلاش کیا جائے تو اس کے بہت سے افسانے تمہیں مل جائیں گے۔ مجھے اس کا ایک معرکتہ الآرا افسانہ "پتھر کی لاش" یاد آرہا ہے۔ بڑا دلکش اور اثر انگیز افسانہ تھا۔ حسین نے ن۔م۔ راشد کے "ماورا" پر ایک جامع تنقیدی مضمون تحریر کیا تھا۔ ن۔م راشد اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ خود بھی ردیف، قافیہ سے معرا شاعری کا قائل تھا۔ لسانیات پر بھی ایک اعلیٰ درجہ کا مضمون تحریر کیا جو شائع بھی ہوا تھا۔"

بھائی جان کو درس وتدریس سے ہمیشہ شغف رہا ہے-جب وہ امروہہ میں تھے تو بہت سے طالب علموں کو پڑھایا اور پھر کراچی آکر بھی یہ سلسلہ جاری رکھا-ان کے شاگردوں میں ایک ہونہار شخصیت پروفیسر مناظر حسن صاحب کی ہے-بھائی جان کے بارے میں ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا:

''میں اکثر سوچتا ہوں کہ علم کے ساتھ انکساری'عاجزی اور خاکساری اتنی نایاب کیوں ہے؟ اہل علم وفضل میں تو اس کا ایک حسین امتزاج ہونا چاہیئے تھا مگر جب قریب سے دیکھا جائے تو یہ اعلیٰ صفت ان میں کمیاب ہے-کسی کے پاس خوبصورت دل دیکھا تو اسے رفعتِ علم سے محروم پایا'کسی کے علم نے متاثر کیا تو اس کے زعم خرد اور تفاخر علمی سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوا-مگر حسین صاحب مرحوم کی شخصیت بہت منفرد تھی'ان کے یہاں علم تھا تو انکساری بھی تھی'دل تھا تو اس میں دردمندی بھی تھی' محبت بھی تھی-دوسروں کے دکھوں کو بانٹنے کی خواہش بھی تھی اور بڑے خلوص کے ساتھ اس پر عمل بھی کرتے تھے-میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے اہل قلب کے تذکرے ہی پڑھے تھے مگر ملاقات صرف ایک ہی شخص سے ہوئی- بادی النظر میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بے ریش'پتلون پوش شخص میں ایک درویش' ایک صوفی بستا ہے-جب وہ حضورؐ کا ذکر کرتے یا سنتے تو ان کا پورا وجود وجد میں آجاتا تھا-حضورؐ کے بعد ان کی دوسری محبوب شخصیت حضرت عمرؓ کی تھی -وہ ان کے کردار سے بڑے متاثر تھے اور ان کی ایک ایک ادا کا ذکر ایسے کرتے تھے کہ جس سے ان کی بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا تھا-ان کے فضائل جب وہ بیان کرتے تو فضا میں رس گھلتا محسوس ہوتا تھا-صرف یہی نہیں حسین صاحب توبلا تفریق مذہب اور عقیدہ ہر عالم کا تذکرہ بڑے احترام کے ساتھ کرتے تھے-ہرچند کہ برٹرنڈرسل خدا کے وجود کا قائل نہ تھا مگر جب اس کی علمیت اور تخلیقی صلاحیتوں پر گفتگو ہوتی تو معلوم ہوتا کہ ان سے اچھا رسل کا کوئی **Exponent** نہیں ہوسکتا تھا-

مرحوم کی خواہش تھی کہ وہ سیرت پاک پر کوئی ایسی کتاب لکھیں جو آج کے مغربی ذہن کو اپیل کرے--- وہ ذہن جس کی پرورش مادیت پر ہوئی ہو اور جس نے بائبل کی گود میں آنکھ کھولی ہو-وہ کہا کرتے تھے کہ سیرت طیبہ پر یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی جانے اور اس انداز سے لکھی جائے کہ جو روحانیت اور روحانی تجربہ کے ضمن میں فرائڈ'یونگ اور مارکس کے جدید نظریات وافکار کی نفی ہو اور ایسا آپؐ کی سیرت اور آپؐ کے کردار کے خدوخال کو صحیح تناظر میں پیش کر کے ہی ممکن ہے- جدید حسیات

جو فرائڈ، یونگ، مارکس اور خلائی سائنس دانوں نے تشکیل دی ہے وہ گمراہ کن ہے اور اس کو مدنظر رکھتے ہوئے بزبان انگریزی ایسی کتاب کے لکھے جانے کی بڑی ضرورت ہے۔انگریزی زبان پر تو ان کو قدرت کاملہ حاصل تھی۔مسئلہ صرف عربی میں استعداد بڑھانے کا تھا کیونکہ تمام ماخذ عربی زبان میں ہیں مگر ان جیسے "جن" آدمی کے لیے درحقیقت یہ بھی کوئی مسئلہ نہ تھا، بہت مفصل پلاننگ تھی۔ ان کی طرف سے یہ ایک قسم کا اتمام حجت ہوتا۔ کاش زندگی مہلت دیتی! اس کام کے لیے وہ موزوں ترین شخص تھے۔ان کی معاشیات، نفسیات اور عمرانیات پر بھی گہری نظر تھی اور مشرق و مغرب کے ادب کے بھی وہ بہت اچھے طالب علم تھے۔

اردو ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان سے زیادہ مطمئن نہ تھے لہٰذا طے ہوا کہ اگر میں ان کی مدد کروں (واہ رے میں!) تو ایک تاریخ لکھی جائے۔ ہر شاعر کے تذکرے سے پہلے ایک مفصل باب اس زمانے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی پس منظر پر ہو، تاکہ دیکھا جائے کہ شاعر ان سے متاثر ہوا یا نہیں اور اگر ہوا تو کس حد تک یا وہ ایک IvoryTower میں بیٹھا فرضی شاعری کرتا رہا۔ لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا اور تقریباً ۷۰، ۸۰ صفحے تحریر بھی ہو گئے تھے کہ اچانک ان کو وکالت شروع کرنے کا موقع میسر آ گیا مگر وہ ہمیشہ یاد دلاتے رہے کہ یہ کام کرنا ضرور ہے۔

میرے ہاتھ میں کوئی فضول سی کتاب دیکھ کر ناراض ہوتے تھے۔کہتے تھے کہ اگر صرف عالمی ادب اور تاریخ کے Classics ہی پڑھے جائیں تو بھی ہماری عمر ناکافی ہے۔ہر چند کہ ان کا ریمارک صرف ان کی اپنی ذات کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ ہر اس شخص سے متعلق ہے جو ادب کا طالب علم ہے۔جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے تو میں نے ان کو ہمیشہ کوئی علمی یا ادبی کتاب خواہ وہ اردو کی ہو، فارسی کی ہو یا انگریزی کی پڑھتے ہوئے ہی دیکھا۔جب میں ان کے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کہیں ایسا تو نہ تھا کہ ان کو یہ علم ہو کہ ان کی عمر صرف ۴۰ سال ہو گی۔ میں نے انہیں انتقال سے ایک دن پہلے تک کام کرتے دیکھا یا پڑھتے دیکھا۔ویسے وہ اپنی صحت کے بارے میں پوری طرح جانتے تھے کہ کسی بھی صبح، کسی بھی رات کی تاریکی میں اچانک پیغام اجل آ سکتا ہے۔ وہ ایک آہنی عزم کے انسان تھے ۔ٹوٹ کر بکھرنے والے آدمی ہی نہ تھے جبکہ ان کے قریبی لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔وہ اکثر دوران گفتگو برٹرنڈ رسل کی ایک بات دھرایا کرتے تھے جو مجھے پوری طرح یاد تو نہیں

مگر مفہوم کچھ ایسا ہے کہ بالآخر قدرت کی اندھی قوتیں آخری انسان کو بھی مار دیں گی مگر انسان مر کے بھی نہیں ہارے گا۔

اسلام ان کا عقیدہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس سے عشق کرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ افسوس اسلام کی کوئی تاریخ ایسی نہ لکھی گئی جو عصبیت اور تنگ نظری سے بالا ہو۔ان کا قول تھا کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ World Perspective میں رکھ کر کیا جائے تو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکو گے۔

عمر عزیز ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی مگر آج تک مجھے کسی نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا حسین مرحوم نے۔میری زندگی میں ان کے بغیر جو ویرانی آئی ہے اس کو بھگتتے ہوئے ۲۹ سال ہو گئے۔غالب کے مرثیے کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ غالب عارف کے غم کو دل سے زیادہ دماغ میں محسوس کر رہے تھے۔اس کے برخلاف شیکسپیئر کے اس شکوے میں زیادہ Pathos ہے۔

Why should a dog, a horse, a rat have life.
And thou no breath at all?. Thou' it come no
more. Never,never,never................

تم کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے تم کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

اور اب تو زندگی کا پیٹرن یہ بن گیا ہے ؎

وہ شہر بھر سے مراسم کا سلسلہ بھی گیا گیا وہ شخص تو لوگوں میں بیٹھنا بھی گیا

--------

اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور تم (احمد حسین) ان کے لیے جو کچھ کر رہے ہو اس کو بطریق احسن پورا کرو"

اس مختصر سی ۴۰ سالہ زندگی میں بھائی جان نے ہر اس شخص کو متاثر کیا جو ان کے قریب آیا اور ان کی موت کے بعد تو ان کے اکثر دوستوں نے ان سے جس طرح اپنے قلبی لگاؤ، فکری یگانگت اور ان کی متاثر کن شخصیت کا ذکر کیا اور ان کے بلند عزائم اور حوصلہ مندی کے بارے میں بتایا تو میرے اوپر یہ تاثر گہرا

ہوتا چلا گیا کہ واقعی میرا بھائی ایک بڑا انسان تھا۔وہ ایک "شعلۂ مستعجل" تھا جو زندگی کے افق پر ذرا سی دیر کے لیے چمکا اور اپنے پیچھے اندھیروں کے نشان چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔یہی مشیت ایزدی تھی۔انسان یہیں آکر مجبور ہو جاتا ہے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے دوست احباب خاص طور سے امان علی نقوی عرف شجر (گھڑیال والے)' جو بھائی جان کے بہت ہی قریب تھے' کی بڑی خواہش تھی کہ بھائی جان جیسی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھا جانا چاہیئے۔لیکن یہ کام تعویق میں پڑتا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خواہش بھی ماند پڑتی چلی گئی۔لیکن امان علی صاحب' جنہوں نے "گلدستۂ امروہہ" کے نام سے ایک جامع کتاب تالیف کی ہے' سے جب بھی میری ملاقات ہوتی تو وہ ہر بار میری توجہ اس طرف مبذول کراتے رہے۔

بھائی جان کے حالات تفصیل سے لکھے جائیں تو ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن یہ کام مجھ جیسے شخص کے لیے' جو ان کے حالات سے پوری طرح واقف بھی نہیں' بڑا مشکل تھا۔اب "کشور اولیاء" لکھنے کا موقعہ میسر آیا تو یہ خیال ہوا کہ بھائی جان پر کوئی کتاب تو شاید نہ لکھ پاؤں لیکن کم از کم اس وقت اتنا تو کر سکتا ہوں کہ ان کے بارے میں ایک مختصر اور جامع مضمون "کشور اولیاء" میں شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب میں نے ان کے دوستوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی میرے خیال سے اتفاق کیا اور کہا کہ فی الوقت یہ بہترین موقعہ ہے کہ ان کی زندگی کے بارے میں چند صفحات اس کتاب میں شامل کر دیے جائیں اور میرے ایسا کرنے سے نہ صرف میرا ذاتی اطمینان ہوگا بلکہ ان کی متنوع شخصیت کے اگر کچھ پہلو' خصوصاً ان کی شاعری خواہ وہ کتنی ہی مختصر' نامکمل اور بے ترتیب ہی کیوں نہ ہو' اس کتاب کا حصہ بن جائے تو کم از کم امروہے کے ایک ایسے شاعر کا تذکرہ ہو جائے گا جو بہت بڑا شاعر ہو سکتا تھا اگر اس نے شاعری کو سنجیدگی سے لیا ہوتا۔

## محمد حسین صدیقی......ایک شاعر

اب تک میں نے بھائی جان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ ایک بھائی کے بارے میں لکھا ہے اور وہ بھی یوں کہ میرا یہ بھائی عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔میں ان کے بارے میں' جیسا کہ میں نے بار بار اوپر کہا بھی ہے' بہت کم جانتا تھا اور جو جانتا تھا وہ نہ جاننے کی برابر ہے۔وہ ایک شاعر تھے یا انہوں نے

شاعری کی تھی' میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا-ہاں ان کے چند قریبی دوستوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ ضرور کیا تھا مگر مجھے نہ ان کا کلام حاصل تھا اور نہ میں نے' سچی بات تو یہ ہے' کبھی اس کے حصول کی کوئی جستجو ہی کی تھی-میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ان جیسا انسان جس نے اپنی تمام زندگی........ مختصرترین ہی کہوں' جہد للبقا میں گزاردی تھی جس کے شب وروز کسب معاش میں گزرے ہوں وہ شاعری بھلا کیا کر سکتا تھا مگر جب میں اپنی زیر نظر کتاب کے آخری حصے پر پہنچا تو میرے ایک دوست نے بڑی شدت سے اس پر اصرار کیا کہ یار ڈھونڈ تو شاید ان کی کوئی بیاض ہاتھ لگ ہی جائے-پس ایک دن میں ان کی کتابوں کے ڈھیر میں گھس گیا اور میں اسے خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ مجھے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو تین ڈائریاں مل گئیں جن میں ان کی چند غزلیں' دو ایک نظمیں' کچھ قطعات' ایک ایک دو شعر اور ان کے دو مضمون لکھے ملے-میں نے سوچا کہ یہ کلام جو اب تک مل سکا ہے کسی علیحدہ کتاب کی طباعت کے لیے قطعاً ناکافی ہے اور اگر اس کو اسی طرح پڑا رہنے دیا جائے تو اس کا قوی امکان ہے کہ یہ غت ربود ہو جائے اور پھر ہاتھ ہی نہ لگ سکے-میں نے اور میرے دوست نے آپس میں مشورے کے بعد آخر یہ فیصلہ کیا کہ اس تمام دریافت کو خواہ یہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اپنی اس کتاب ''کشور اولیاء'' میں محفوظ کر دیا جائے-ہر چند کہ کتاب کا یہ حصہ اس کے پورے موضوع کے احاطے سے باہر ہے اور شاید قارئین کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو مگر اس کا بھی غالب امکان ہے کہ مستقبل میں کوئی تذکرہ نگار' شعرائے امروہہ کا تذکرہ لکھنے کی اگر ہمت کر ہی بیٹھے تو اس کو ایک ایسے شاعر کا کلام مل جائے جس نے شاعری کو سنجیدگی سے نہ لیتے ہوئے بھی کچھ تخلیق کیا-میں نہ تو ادیب ہوں' نہ تنقید نگار اور نہ شاعر-اس لیے بھائی جان کی یہ شاعری کتنی مضبوط' کتنی کمزور یا کتنی اہم یا غیر اہم ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے میں ہرگز خود کو مکلّف نہیں پاتا-یہ تو صاحبان نقد و نظر اور عالمان فکر و فن کا کام ہے کہ وہ اس کے بارے میں کچھ کہیں یا لکھیں اگر ان کی شاعری ان کو متوجہ کر سکے -میں تو اس کو اس کتاب میں اس لیے شامل کر رہا ہوں کہ یہ زمانے کی دست برد سے بچ جائے اور اس سے زیادہ میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے-

اب آپ ان کے کلام کو خود ہی پڑھیں اور اس کا فیصلہ کریں کہ وہ شاعر تھے بھی کہ نہیں' ان کے کلام میں روش عام سے ہٹ کر کوئی نیا رخ نظر بھی آتا ہے کہ نہیں یا وہ اپنی فکر کو اپنے اشعار میں واضح کر بھی سکے ہیں یا انہوں نے اپنے وقت کا صرف زیاں ہی کیا ہے حالانکہ اپنی شاعری کے بارے میں ان

کا اپنا نظریہ ان کے اپنے اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے ذریعے کچھ پانا چاہتے تھے بس ان کو اس میں زندگی سے شاید فرار حاصل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

کیا ملا شاعری سے پھر بھی حسینؔ ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ تو جینے کا آسرا پایا

## غزلیات

کرب تھا جو کہ مری جاں کا اسے جاں سمجھا ‏ ‏ ‏ ‏ وہ جو دشوار تھا میں نے اسے آساں سمجھا
عمر اس طرح امیدوں کے تعاقب میں کٹی ‏ ‏ ‏ ‏ داستاں ختم پہ تھی اور میں عنواں سمجھا
نامرادی میں تو کوئی بھی تمنا نہ رہی ‏ ‏ ‏ ‏ جو خلش یاس نے دیدی اسے ارماں سمجھا
عقل ہر ذرہ کی وسعت سے تھی حیران مگر ‏ ‏ ‏ ‏ وحشت عشق نے ہر دشت کو زنداں سمجھا
زیست ہنگامہ طلب روزِ ازل سے ٹھہری ‏ ‏ ‏ ‏ میں تھا آسودہ مگر خود کو پریشاں سمجھا
اُف یہ آزار جنوں اور یہ احساس خودی ‏ ‏ ‏ ‏ دل وہ فتنہ ہے کہ میں درد کو درماں سمجھا
پھول دیوانگیٔ نالۂ بلبل پہ ہنسے ‏ ‏ ‏ ‏ اور وہ نادان انھیں چاک گریباں سمجھا
شکوہ جب میں نے کیا تلخیٔ دنیا کا حسینؔ ‏ ‏ ‏ ‏ ہم نشینوں نے مرے مجھکو غزلخواں سمجھا

------

بگڑ تا رہا ہوں سنور تا رہا ہوں ‏ ‏ ‏ ‏ میں ہر دور میں کچھ نکھر تا رہا ہوں
میں گر تا رہا ہوں سنبھلتا رہا ہوں ‏ ‏ ‏ ‏ زمانہ سے ہر دم نکھر تا رہا ہوں
مجھے راس آئی بلندی نہ پستی ‏ ‏ ‏ ‏ میں چڑھتا رہا ہوں اتر تا رہا ہوں
اٹھے موت کے کتنے خونخوار لشکر ‏ ‏ ‏ ‏ میں اک اک کے آگے ہی بڑھتا رہا ہوں
اٹھائی نہ منت سفر میں کسی کی ‏ ‏ ‏ ‏ کہ رہبر سے اپنے جھگڑ تا رہا ہوں
اٹھے کتنے طوفان لیکن بھنور میں ‏ ‏ ‏ ‏ ہر اک موج سے میں اکڑ تا رہا ہوں

--------

کچھ خلاؤں میں بھٹک کر رہ گئے ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ زمانہ سے ٹھٹک کر رہ گئے
کارواں جب مضمحل آیا نظر ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ قدم ہم بھی لپک کر رہ گئے

میں نے پوچھا کفر کو ہے کیوں فروغ — مفتی دیں بس بھڑک کر رہ گئے
تلملا اٹھے تھے دیوانے مگر — اک تبسم سے جھجک کر رہ گئے
زندگی بلبل کی دو بھر ہو گئی — پھول تو دو دن مہک کر رہ گئے

-------

حسن نے تجھ کو کیا دیا عشق نے مجھ کو کیا دیا — ہم کو بنا کے داستاں صرف گماں بنا دیا
جینے کا غم نہیں تھا کم عرصہ روزگار میں — تیرے لب و نگاہ نے اور اسے بڑھا دیا
عالم زندگی میں کچھ بھولنے آ گیا تھا میں — فطرت جنگ جو نے پھر یاد وہی دلا دیا
بدلے ثبات و عزم نے کتنے مقدرات کو — پر مرے عزم نے مجھے خاک میں کیوں ملا دیا
کشمکش حیات نے دل کو اگر رلا دیا — ساز حیات کا خیال آیا تو مسکرا دیا
بدلا ثبات و عزم نے کتنے مقدرات کو — پر مرے عزم نے مجھے خاک میں کیوں ملا دیا
تشنہ ذوق دید سے ایسا حجاب تھا اگر — اتنا مری نگاہ کا حوصلہ کیوں بڑھا دیا
منت چشم یار کیا شکوہ روزگار کیا — دل نے کبھی ہنسا دیا دل نے کبھی رلا دیا
کیوں یہ عناصر حزیں چین کہیں نہ پا سکے — کون سی تھی خلش حسینؔ ان میں جسے چھپا دیا

-------

دل نے بھی اک ہنر نمائی کی — آرزو کر کے جگ ہنسائی کی
جھیل کر تلخیاں زمانے کی — دل نے بھی ہم سے کج ادائی کی
زندگی سے بھی اور تم سے بھی — میں نے دونوں سے بیوفائی کی
راہ گم کی جو زندگی میں کبھی — آرزو ہی نے رہنمائی کی
تم ہو کس حال میں خدا جانے — بات تو کچھ نہ تھی جدائی کی
میرے احوال پر جو روتے ہو — کس لیے پھر یہ جگ ہنسائی کی
مصلحت تھی ہمیں نہ راس آئی — کیا شکایت تری خدائی کی
ہیں گرفتار غم حسینؔ سبھی — آپ کیا سوچتے رہائی کی

-------

کچھ صنم یا خدا کا ڈر ہوتا — کوئی معیار خیر و شر ہوتا
مٹ گئے ہم یہ غم نہیں لیکن — کچھ زمانہ ہی کارگر ہوتا
بھول جاتا جو اپنی منزل کو!! — چین سے طے مرا سفر ہوتا

------

اے آزر خیال وہ بتخانے کیا ہوئے — اے چشم مست شوق وہ پیمانے کیا ہوئے
ہر خار تشنہ کام ' ہر اک راہ سوگوار — اے دشت آرزو ترے دیوانے کیا ہوئے
کس راہ میں لٹائی متاع نگاہ و دل — اے ذوق نقش گر' وہ پری خانے کیا ہوئے
سجدوں کو آستاں ہے نہ سر پھوڑنے کو سنگ — وہ شہر و در کہاں گئے ویرانے کیا ہوئے
تھی جن کے دم سے بزم حقیقت میں روشنی — وہ بزم وہ چراغ وہ پروانے کیا ہوئے
ہے ذوق زندگی پہ گراں ہوش زندگی — ساقی وہ رقص و رنگ وہ پیمانے کیا ہوئے
برگشتہ کائنات ہے روٹھی ہوئی حیات — ہم رسم و راہ عشق سے بیگانے کیا ہوئے

---------

ہر نظر پر حجاب ہے ہستی — کس کے رخ پر نقاب ہے ہستی
زیست اضطراب ہے ہستی — درد کا انتخاب ہے ہستی
ایک نقطہ پہ کب ٹھہرتی ہے — پیکر انقلاب ہے ہستی
پا سکو گے کہاں حقیقت کو — ہم نے مانا سراب ہے ہستی
سیم تن ظلمتوں کے سائے ہیں — نور کا پیچ و تاب ہے ہستی
بن رہی ہے بگڑ بگڑ کے مدام — کیسا چنچل حباب ہے ہستی
زندگی کو نمود کا میدان — موت پر اک عذاب ہے ہستی
اس کی خاطر تو خلد کو چھوڑا — کیسے کہیے خراب ہے ہستی
کون کہتا ہے جرم کی پاداش — آرزو کا ثواب ہے ہستی
نیستی کا جواب ہے ہستی — یوں کہو لاجواب ہے ہستی
مار ڈالا حسینؔ ہستی نے — تم کہے جاؤ خواب ہے ہستی

اگر سمجھتا میں تیرا انشاء تو حاجت اختیار کیا تھی  قدم قدم پر جہاں بناتا، میں کیا نہ بے اختیار کرتا
نہیں عناصر کی آرزو میں وہ چرخ گردی جو چاہتا ہوں  میں پہلے آیا بہت جہاں میں ابھی کچھ اور انتظار کرتا

--------

خشک آنکھوں کے لیے خون کا ساماں کر لیں  اور اک بار چلو زیست سے پیماں کر لیں
فکر انجام کہاں تشنہ آغاز کریں  تم یہ کہتے ہو تمہارا ابھی تو ارماں کر لیں
ٹھوکریں کھا کے جنوں طالب زنجیر ہوا  جی میں آتا ہے کہ ہر دشت کو زنداں کر لیں
زندگی درد ہی ٹھہری تو اگر مر نہ سکیں  کیوں نہ جو درد اٹھے ہم اسے درماں کر لیں
حسرت دید کبھی ہو گی نگاہوں کو حسینؔ  اب تو کہتے ہیں نگاہوں کو بھی پنہاں کر لیں

-------

ایک بے سمت جستجو تو ہے  حسرت و آرزو کی خو تو ہے
عشق کا دور جستجو تو ہے  مضطرب ان کے روبرو تو ہے
کہہ نہ پائے ہم اپنے دل کی بات  بہکی بہکی سی گفتگو تو ہے!!
جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ میں  تیرا اظہار آرزو تو ہے
حشر تھی وہ نوازش پیہم  رہ گئی دل کی آبرو تو ہے

------

دیار یار میں کس کس پہ اعتبار کریں  سو خود کو کوچۂ جاناں کا بس غبار کریں
جو داغ تجھ کو دیے تحفۂ محبت میں  وہ داغ سینہ میں اپنے کہاں شمار کریں
بدل ہی جائیگا نظم جہان بھی اک دن  ابھی خود اپنے بدلنے کا انتظار کریں
ابھی تو مقتل ہستی ہے تشنۂ رونق  لہو کو اپنے ذرا اور تابدار کریں
سمجھ میں آ نہ سکی جب حقیقت ہستی  فریب قلب و نظر کا ہی اعتبار کریں
سکوں کے بھیس میں بے چین رہ چکی صدیوں  ذرا حیات کو اب وقف انتشار کریں
فریب عشق کو دیں حال کو بھلا کر کیوں  شب فراق ہے کیا یاد لطف یار کریں
گذر نہ جائے تقدس میں عمر ہی ساری  کبھی تو اپنی جوانی کو داغدار کریں

نہ چین لینے دیا زیست نے عدم میں بھی　　گریز کس لیے دنیا سے اختیار کریں
حسین راز بنایا نظر نے ہر شے کو　　عمل سے راز جہاں کو ہم آشکار کریں

---------

کیا مجھ سے غم زیست سنایا نہیں جاتا　　پر اس دل نازک کو بجھایا نہیں جاتا
تعمیر جہاں دی ہے تو کچھ اور بھی غم دے　　یہ بوجھ اکیلا تو اٹھایا نہیں جاتا
جو قصر کہ صدیوں سے کھنڈر ہوا سے پھر سے　　فرسودہ بناؤں پہ بنایا نہیں جاتا
روتے ہیں جو مظلوم تو ہنس دیتے ہیں واعظ　　اشکوں کو مگر ایسے سکھایا نہیں جاتا
اے شیخ اب انسان سے اندوہ جہاں کو　　جنت کی امیدوں پہ بھلایا نہیں جاتا
ڈھونڈو نہ فقط تیل کہ یہ شمع حرم ہے　　بے سوز دروں اس کو جلایا نہیں جاتا
حیلے ہوں سیاست کے وہ یا دین کے پھندے　　اٹھتے ہیں ستم کش تو دبایا نہیں جاتا
الجھن ہے عجب حال سے بیزار ہوں لیکن　　گذری ہوئی صدیوں کو بلایا نہیں جاتا
وہ گاؤں کی شامیں، وہ جھنکتے ہوئے پازیب　　ان سادہ مناظر کو بھلایا نہیں جاتا
راہوں کے کناروں پہ وہ شیشم کی قطاریں　　وہ حسن تو ان شہروں میں پایا نہیں جاتا
سنتا ہوں مشینوں کی صدائیں اسے لکھوں　　کیا تجھ سے بھی اک گیت سنایا نہیں جاتا
جو خواب بدل دیتے ہیں تاریخ کو اکثر　　خود ان کو عمل میں کبھی لایا نہیں جاتا

-------

عشق کا دیوانہ پن ہے، جو کیے جاتا ہوں میں　　آپ سے جاتا ہوں میں اور آپ میں آتا ہوں میں
دل کی بے پایاں خموشی کی تہوں میں روز و شب　　ایک مبہم آرزو کو مضطرب پاتا ہوں میں
اک غم جاوید پیوستہ ہے میری روح میں　　ہر نفس دل میں کوئی پنہاں خلش پاتا ہوں میں
مجھ کو اک درد نہاں آوارہ رکھتا ہے مدام　　دشت و در، شہر و بیاباں، چھانتا پھرتا ہوں میں
گھومتا رہتا ہوں مایوس و پریشاں ہر طرف　　جیسے کوئی گمشدہ شے ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
دن گذرتے ہیں مرے فکر و تجسس میں مدام　　خواب سے بیزار اکثر رات بھر رہتا ہوں میں
رات کے تاریک سناٹے میں باہر شہر سے　　اضطراب دل سے گھبرا کر نکل جاتا ہوں میں

بس چاہیئے اک جذب یقیں دل میں سلامت　　آتی ہیں شب و روز ہی آفات کا کیا ہے
ہو عزم اگر زیست کا سینے میں درخشاں　　رک جاتے ہیں طوفان بھی حالات کا کیا ہے
ہم نے تو سوچ لیے زیست کے عنوان بہت　　پر تری یاد میں رویا دل نادان بہت
خود شناسی کا ہر اک لمحہ گزرتا ہے کٹھن　　عالم خواب میں جینا تو ہے آسان بہت
کوئی امکان رہائی کا قفس سے نہ رہا　　دل کو تعمیر نشیمن کا تھا ارمان بہت
حسرت جنت موعود میں ہم کو یارو　　عصر حاضر میں اٹھانا پڑا نقصان بہت
رہنما چھوڑ کے پہونچے نہ ہوں منزل پہ کہیں　　قافلہ راہ میں لگتا ہے پریشان بہت
کفر الزام نہیں مجھ پہ کہ جب آنکھ کھلی　　روح یزداں نظر آئی مجھے بے جان بہت
راز افشا غم دنیا نے کیے ورنہ حسینؔ　　نیک بندہ تھا ترا اور تھا انجان بہت

---------

جڑیں نظام کہن کی جو آج کھو دیں گے　　وہ انقلاب زمانہ کا بیج بو دیں گے
نظر میں کوئی نہ منزل، نہ آرزو دل میں　　یہ راہرو کسی منزل پہ بھی نہ پہونچیں گے
کوئی بھی ہوش نہیں جن کو اپنی منزل کا　　وہ ہر دوراہے پہ رک کر کھڑے ہی سوچیں گے
جو رہ میں بھول گئے حاصل سفر اپنا　　وہ کارواں ابھی منزل پہ جا کے لوٹیں گے
جنہیں حیات کی رفتار ساز گار نہیں　　وہ ہر قدم پہ ابھی زندگی کو روکیں گے
حریم حسن میں پاس ادب بجا لیکن　　نگاہ عشق کو اہل ہوس بھی ٹوکیں گے
مسافروں کو نشاں دے رہا ہوں راہوں کا　　حسینؔ مجھ کو یہ رہبر مدام کوسیں گے

---------

کچھ فسانہ مختصر ہوتا گیا　　کچھ غم دل کارگر ہوتا گیا
جتنی وحشت قیدیوں کی کم ہوئی　　اور زنداں تنگ تر ہوتا گیا
جسقدر نزدیک منزل سے ہوے　　دور ہم سے راہبر ہوتا گیا
تھا کٹھن پر سخت کوشی سے مری　　وقت بھی زیر و زبر ہوتا گیا
قیس کے صحرا میں جب کانٹے چبھے　　اور بھی شوریدہ سر ہوتا گیا

کب اثر تھا شکوہ مجبور میں — خون بہا تو پر اثر ہوتا گیا
ہر قرینہ بزم ہستی کا حسینؔ — بندگی سے دردِ سر ہوتا گیا

---------

چلو کہ بزم طرب آج پھر سجائیں گے — دل خراب کی بستی کو ہم بسائیں گے
جلی نہ شمع حرم شاہ و شیخ کے ہاتھوں — چلو کہ سوزدروں سے ہمیں جلائیں گے
حیات روٹھ گئی ہے برس ہوئے ہم سے — اسے بھی نذر عمل دیکے پھر منائیں گے
غم حیات کے مارے جوان ارماں کو — ترے تبسم گریز سے جلائیں گے
ہیں اپنے زور سے غافل یہ مزدخوار ابھی — ادائے قیصر و خسروانہیں سکھائیں گے
وہ کھیت ڈوب گیا شام کے دھندلکوں میں — اسی کی اوٹ میں دھیمے سے گنگنائیں گے
کریں گے پیار کی باتیں بگڑ بھی جائیں گے — نظر ملا کے بہت دیر مسکرائیں گے
رہے زمانے سے تقدیر کے مقید ہم — اب ہم زمانے کی تقدیر آزمائیں گے
حسینؔ تنگ ہیں انسان کی خدائی سے — خدا کو عرش پہ اکبار پھر بٹھائیں گے

-------

میں خود کو کھو رہا ہوں پا رہا ہوں — بہر صورت گزرتا جارہا ہوں
ہر اک ذرہ ہے رازوں کا خزینہ — سمجھتا کچھ نہیں سمجھا رہا ہوں
عجب صورت سے شرح ذات کی ہے — خدا سے دور ہوتا جارہا ہوں
مری کاوش کا ہوا انجام کچھ بھی — مگر دل کی خلش بہلا رہا ہوں
مجھے ہر گام پر فطرت نے روکا — مگر میں ہوں کہ بڑھتا جارہا ہوں
نہیں تخریب سے اب میں ہراساں — بگڑ کر میں سنورتا جارہا ہوں
سلاسل کو جو پگھلا دے وہ آتش — دل انسان میں بھڑکا رہا ہوں
نہ دے کچھ بھی مگر سوز عمل دے — میں اپنے عزم سے شرما رہا ہوں

--------

درد پایا تھا ایک قسمت میں　　وہ بھی منت کش دوا پایا
عصر حاضر میں کیا خدا ڈھونڈیں　　ہر قدم پر نیا خدا پایا
کیا ملا شاعری سے پھر بھی حسینؔ　　کچھ تو جینے کا آسرا پایا

--------

تیرے خیال کے رہے دربان ایک ایک　　جان حیات میرے دل و جان ایک ایک
برباد ہو کے بھی ہمیں آتے رہے ہیں یاد　　رہ رہ کے مردہ حسرت و ارمان ایک ایک
فرط طرب، ہجوم تمنا، وفور یاس　　کس کس طرح سے اٹھا ہے طوفان ایک ایک
سوز نگاہ، زخم جگر، داغ آرزو　　لکھا ہے اپنے خون سے عنوان ایک ایک
تیاریاں ابھی سے ہیں فصل بہار کی　　سیتا ہوں دامن اور گریبان ایک ایک

--------

پابندی آئیں فرض نہیں، آئین بنانے والوں پر
بس اپنی خدائی کی خاطر آئین بنائے جاتے ہیں
امروز کی عشرت کے عاشق کیا جنت فردا مانیں گے
مرتے ہوئے انسانوں کو فقط یہ خواب دکھائے جاتے ہیں

---------

گر وہ جان بہار آ جائے　　زندگی پر نکھار آ جائے
یہ تصور بھی کاش مٹ جائے　　یاس ہی کو قرار آ جائے
دیکھ تو لوں کبھی کبھی شاید　　ہمتوں پر ہی پیار آ جائے

------

راہ نیاز فکر حکیمانہ چاہیئے　　اس میکدہ میں ہمت رندانہ چاہیئے
پہلے حریم ناز میں تھی جستجوئے دید　　ہر دشت و در میں اب رخ جانانہ چاہیئے
بہر تماشہ دیدۂ فرزانہ چاہیئے　　کردار داستان کو دیوانہ چاہیئے

---------

غم حیات ' غم کائنات نے مارا | ازل سے دل کو تری بات بات نے مارا
ملے تھے مجھکو بھی کچھ زرنگار لمحے مگر | مرے شباب کو اک احتیاط نے مارا
کشاکش غم دوراں کو زندگی سمجھے | حسینؔ اپنے ہی عزم و ثبات نے مارا

-----

## عزائم

کہاں ہیں جفاکش عزائم
کہاں ہے مرا جذبہ دردمندی
مری زندگی میرے احساس پر ایک کوہ گراں ہے
مری مسکراہٹ کی گہرائیوں میں پشیمانی مجرمانہ نہاں ہے
امیدوں پہ میری غم ویاس کی تلخی و تیرگی حکمراں ہے
جفاکش عزائم!
مرے جذبہ دردمندی کو آواز دیکر بلاؤ
فرائض کا احساس مجھکو دلاؤ
مجھے اس گراں خوابیٔ زندگی سے جگاؤ
ہوس اور نمائش کے بے آب صحرا میں 'میں ایک بھٹکا ہوا راہرو ہوں
کہاں ہیں جفاکش عزائم
کہاں ہے مرا جذبہ دردمندی

------

### قطعہ

آخر حسینؔ اس کا بھلا تم کرو گے کیا | دل جو بچا کے کوچہ قاتل سے لائے تھے
آنکھوں میں پھر بجی نہ کوئی محفل جمیل | دل کو اٹھا کے کون سی محفل سے لائے تھے

-------

قطعہ

الجھنیں بڑھتی گئیں جتنا میں سلجھاتا گیا　　زیست مجھ سے دور بھاگی میں قریب آتا گیا
عمر بھر رونا تھا ہمکو ورنہ دیکھا ہے حسینؔ　　ویسے تو یاں غم بھی کچھ لوگوں کو راس آتا گیا

----------

## خزاں

پیاسی بنجر بھوڑ کے بیچ
چمپا کا اک پیڑ کھڑا
لو کی لپٹیں آگ کی برکھا
سب سے پانی مانگ چکا
نا کوئی ساگر نہ کوئی دریا
پیاسی بنجر بھوڑ کے بیچ
ڈھیرے ڈھیرے ٹہنی پتے
جل کو ترستے سوکھ گئے
نا کوئی ساگر نا کوئی دریا
بانجھ اور بنجر بھوڑ کے بیچ
چمپا کا اک پیڑ کھڑا
آگ سے جھلسے پیاس کے مارے
ہرے بھرے جنگل میں اگتا
پھول کھلاتا بن مہکاتا
بھینی باس سے جی لہکاتا
یہ چمپا کا پیڑ جو سوکھا
نا کوئی ساگر نا کوئی دریا
پیاسی بنجر بھوڑ کے بیچ

چمپا کا اک پیڑ کھڑا
کیکر، جھاڑ، بالو اڑتا
نا کوئی ندی نا کوئی نالا
نا کوئی جل تھل نا کوئی دریا
نا کوئی بدلی نا کوئی سایا
نا کوئی ساگر نا کوئی دریا
پیاسی بنجر بھوڑ کے بیچ
چمپا کا اک پیڑ کھڑا

---------

## مایوسی

کون کہتا ہے کہ مایوس ہوں میں؟
تو بھی نادان ہے سمجھی نہیں اب تک بھی مجھے
عالم موت مری روح پہ طاری ہی سہی
سوچ کر کچھ تو کہا کر مری محبوب مگر
زہر آلود یہ چبھتے ہوئے جملے تیرے
چیر دیتے ہیں دماغ و دل کو
گوشے گوشے میں مری روح کے در آتے ہیں
فہم و ادراک کو آزار بنا جاتے ہیں

○

سوچ کر کچھ تو کہا کر کہ نہ مر جائے کہیں
زیست کا ہچکیاں لیتا ہوا احساس لطیف

جو خودی کا مری سرمایہ ہے
میرا یہ وہم کہ پستی ہے مقدر میرا
اور حیرت کدۂ وقت میں مجبور ہوں میں
وقت کے بہتے ہوئے دھارے کی تخلیق ہوں میں
عہد نو کار کی توثیق ہوں میں
اک مسافر جو کسی منزل موہوم کی سمت
ہے رواں برق کے ذروں کی طرح
دیکھتا ہی نہیں مڑ کر کبھی پیچھے کی طرف
اسی بے سمت مسافر کا نشان پا ہوں
تیری باتوں سے یہ اوہام دہر اٹھتے ہیں
سوچ کر کچھ تو کہا کر مرے محبوب کبھی

○

کون کہتا ہے کہ مایوس ہوں میں
میرے کردار پہ بہتان ہے، بہتان ہے یہ
مسکرا سکتا ہوں میں بھی مری محبوب مگر
ان عزائم کی بلندی کو میں لے جاؤں کہاں
عہد طفلی سے جو ہیں سر میں سمائے میرے
دیکھتا ہوں جو چمکتے ہوئے تاروں کی طرف
کتنے تاریک شبستاں مجھے یاد آتے ہیں
تجھ کو شکوہ ہے کہ قربت میں بھی دوری ہی رہی
لالہ زاروں میں بھی آثار الم جانہ سکے
کیا بتاؤں کہ مچلتا ہوا فطرت کا شباب

یاد مجبور جوانوں کی دلا دیتا ہے
لالہ و گل کے دہکتے ہوئے رنگ
آتش رشک و حسد دل میں لگا دیتے ہیں
خون دل میں نے جلا کر یہ تمنا کی ہے
کاش تابش میں زمیں کے لیے لا سکتا کبھی!
بحر افلاک پہ بہتے ہوئے تاروں کے چراغ
اور کمھلائے ہوئے چہروں کی زینت کے لیے
چھین لیتا میں حسیں پھولوں سے نکھرا ہوا رنگ
خطہ ارض پہ لے آتا وہ فردوس بریں
جس کی امید میں جیتی ہیں یہ زندہ لاشیں

○

کون کہتا ہے کہ مایوس ہوں میں
تو نے الحاد کا الزام لگایا مجھ پر
میری محبوب مگر تجھ کو یہ معلوم نہیں
دین تو روح ہے اور اسکی الوہیت کو
میں نے رگ رگ میں ہمیشہ سے سما رکھا ہے
دین اسلام مرا مذہب ہے
میرا ایمان مری جان ہے یہ
ہاں وہی دین کہ بدلا تھا مقدر جس نے
جس نے مظلوموں کو احساس انا بخشا تھا
جسم بے روح کو اس مذہب مرحوم کی آج
چند بے دین خداؤں نے سیادت کے لیے

ایک بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے

○

کون کہتا ہے کہ مایوس ہوں میں؟
تو مری جان! سمجھ سکتی یہ رمز اور یہ راز
اپنے لب پر وہ تبسم میں کہاں سے لاؤں
جگمگاہٹ کے لیے جس کی جلا ہوں اب تک
ہے مرا ناز ترے ہونٹوں کی عصمت کا لہو
ہاں مری روح یخ بستہ ہے لیکن مری جان
میں کہاں پیتا ہوں وہ آتش سیال کے جام
جن میں کھنچ آتی ہے دہقان کے خوں کی گرمی
میرے آلام ہیں خود میرے عزائم کا ثبوت
میں تو مایوس نہیں
کون کہتا ہے کہ مایوس ہوں میں

قطعہ

اس بیکسی میں شکر ہے تم یاد آگئے ۔۔۔ بت خانہ خیال میں شمعیں جلا گئے
اٹھی بھی گر نگاہ محبت چھپا گئے ۔۔۔ ٹھہری جو ضد کہ لائق الفت نہیں ہیں ہم
بدلی تری نگاہ تو سب یاد آگئے ۔۔۔ بھولے ہوئے تھے جور و جفائے زمانہ ہم

قطعہ

مژدہ حشر زمانہ کو ہے فریاد نہیں ۔۔۔ نالہ و اشک میں پنہاں طلب داد نہیں
میں تو خود اپنی تباہی پہ بھی ناشاد نہیں ۔۔۔ منحصر مجھ پہ نہ ہو کاش کسی کی امید
عہد رفتہ کی مسرت بھی مجھے یاد نہیں ۔۔۔ عمر اس طرح کٹی کاہش فردا میں حسینؔ

------

## سرودِ امید

تیرے نغموں سے زندگی مخمور — وسعت کائنات ہے معمور
اے مرے چاند سو گئی دنیا — تیرے گیتوں میں کھو گئی دنیا
مور و ماہی خموش ہیں سارے — چھپ گئے تیرے نور میں تارے
سو گئے طائران خوش الحان — نیند میں غرق ہیں تھکے حیوان
کھیت بھی نور کی رداؤں میں — بے خبر سو گئے فضاؤں میں
نقرئی پھول ، پتیاں ساکت — دھیمی دھیمی ہوا بھی ہے صامت
میں ہوں اس خواب سے مگر بیزار — مجھکو رکھتی ہے اک خلش بیدار
رہتی ہے روح میری آشفتہ — ایک جاں سوز غم سے آغشتہ
میرے سینے میں ایک طوفاں ہے — دل کی گہرائیوں میں ہیجاں ہے
آرزو ایک دل میں مضطر ہے — روح جس کی ازل سے خوگر ہے
رکھتی ہے یہ ازل سے وارفتہ — رہتا ہوں جستجو میں آوارہ
جستجو خود ہی میری منزل ہے — سیل امواج میرا ساحل ہے
تو ہے تمثیل میری جنت کی — تو ہے تکمیل میری جنت کی
اس لیے تیرے پاس آتا ہوں — داستان الم سناتا ہوں
کاش دنیا میں تیری آ جاتا — اور ترا رمز ذات پا جاتا
سر بسر ہے تو ایک سیل نور — ہے زمان اور مکان سے تو دور
روز و شب محو یاس رہتا ہوں — میں تو دائم اداس رہتا ہوں
تیری دلکش فضاؤں میں شاید — کیف آور ہواؤں میں شاید
فکر ہستی کو بھول جاؤں گا — اپنی جنت میں تجھ میں پاؤں گا

------

## یہ کوئی شہر ہے کہ ویرانہ

یہ کوئی شہر ہے کہ ویرانہ
نہ کہیں روشنی، نہ ہنگامہ

تیرگی کے اتھاہ سوتوں سے
کالے دھارے امنڈ کے پھیل گئے
روشنی ہے کہیں، نہ ہے آواز
ظلمتیں خامشی کی ہیں دمساز
یم بہ یم تہ بہ تہ اندھیرے سے
گھٹ گیا دم نگاہ کا جیسے
چار سو ہے عدم کا سناٹا
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
نہ کہیں روشنی، نہ ہنگامہ

اس طرف دور سے ابھی لیکن
ایسی آواز آئی کانوں میں
جیسے آوارہ بے نوا کتے
شہر کے شب گزیدہ کوچوں میں
یک بیک سوتے سوتے بھونک اٹھے
رات سے تنگ آگئے ہونگے
یا کہیں تیرہ کار چوروں کو
جاتے دیکھا نمود بے پاؤں
یا پر اسرار درد کی تصویر

آ گیا کوئی اجنبی رہگیر
یا ھیولوں سے محوِ سرگوشی
آگیا ہو گا کوئی دیوانہ
اس کی وحشت سے ڈر گئے ہونگے
پھر وہ آواز بھی نہیں آئی
پھر کہیں روشنی نہ ہنگامہ

نہ کہیں روشنی ' نہ ہنگامہ

ہاں مگر اس طرف نظر آئے
تیرگی سے نڈھال چند دیے
جیسے حسرت سے مرتے دم آنکھیں
جینے والوں کی صورتیں دیکھیں
جیسے جذبات کے تلاطم سے
دل کا نغمہ گلے میں گھٹ جائے

نہ کہیں روشنی ' نہ ہنگامہ

شاید اس سمت کوئی بستی ہے
یہ دیے شام سے جلے ہونگے
شہر کے لوگ سو گئے ہونگے
ہاں مگر یکبر اس اندھیرے میں
سب دیے جھلملا کے ڈوب گئے
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
روشنی کو نظر ترستی ہے

نہ کہیں روشنی ' نہ ہنگامہ

کیسی آواز کان میں آئی

کانپ اٹھا سکوت صحرا کا
جیسے خانہ بدوش لوگوں کا
کوئی وحشی قبیلہ صحرا میں
تھک کے دن بھر کی رہ نوردی سے
زندگی کے غموں کو بہلانے
دکھ بھرے گیت مل کے گانے لگا
یہ بھی شاید فریب تھا کوئی
کوئی آواز پھر نہیں آئی
نہ کہیں روشنی ' نہ ہنگامہ
شل ہوئے شوق جستجو کے قدم
مٹ گئی آس بھی نگاہوں کی
رنگ سب بجھ گئے مثالوں کے
پھول پژمردہ ہیں خیالوں کے
کس کو معلوم ہے بتائے کون
یہ کوئی شہر ہے کہ ویرانہ
نہ کہیں روشنی ' نہ ہنگامہ

---

قطعہ

موت کے آگے سر جھکا کے بھی آرزوئے بقا سنبھلتی ہے
عالم یاس میں بھی چین کہاں زندگی مر کے بھی مچلتی ہے
پرسش غم ترا کرم ہے مگر حسرت دل کہاں نکلتی ہے

---

## رزم نامۂ ذات

جہاں سے اہرمن کا شر مٹادوں  خدا کو ارض کا خالق بنادوں
غبار آلود محراب حرم میں  شرار آہ سے شمعیں جلادوں
فرشتے کانپ جائیں عرش لرزے  وہ فتنے آرزوؤں سے جگادوں
صحیفے اپنی تفسیریں بدل دیں  عزائم کے اگر تیور دکھادوں
نمو کی قوتیں بیدار کر کے  زبان خار سے غنچے کھلادوں
ارم کے شوق میں بے چین ہو کر  محیط وقت میں محشر اٹھادوں
کروں گر جام و مینا کی پرستش  حرم کو ایک میخانہ بنادوں
جو پائے ناز کو دوں نذر الفت  افق تک پھول اور کلیاں بچھادوں
حوادث پر اگر چاہوں تصرف  عناصر کا سر طاغی جھکادوں
نگاہِ فقر کو احساس دے کر  ادائے قیصر و کسریٰ سکھادوں
اگر شوقِ نشاط جاوداں ہو  ضمیر غم میں خوشیوں کو سمادوں
میں یکسانی سے اکتا کر جہاں کی  بنائے نظم پارینہ ہلادوں
مژہ پر گر حیائیں جھلملائیں  ضیائے ماہ و انجم کو لٹادوں
عمل کو واسطہ دے کر بقا کا  جنون و عقل کے ڈانڈے ملادوں
اگر تاریخ کی محفل بپا ہو  فسانے روم و بابل کے سنادوں
کروں گر جذبہ تسخیر پیدا  سرود و رقص کی محفل بڑھادوں
اگر طوفان کی موجوں سے الجھوں  نفس سے آگ پانی میں لگادوں
غم انسان کے نعرے لگا کر  سر فغفور سجدے میں گرادوں
فلاحت کے لیے دہقاں کی خاطر  فرات و نیل صحرا میں بہادوں

○

پڑے جب یاس کے تاریک سائے  ہم اپنی تابش دل ہار آئے

ابھی عقل و خرد تھے زیر تشکیل — کہ رستے زیست کے مسدود پائے
ابھی ابھری نہ تھیں جب آرزوئیں — سبق تسلیم کے مجھکو پڑھائے
زمانے نے خلش دی جستجو کی — عقائد ورثہ آبا میں پائے
کوئی معیار خیر و شر نہ پایا — تصوف نے بھی راز اپنے چھپائے
نہ سیر لامکاں کی خو ہی چھوٹی — نہ سمجھا شیخ و صوفی کے کنائے
مجھے تاریخ نے کھنڈروں میں لاکر — شکوہ رفتہ کے قصے سنائے
دفاتر میں بھی پہنچا دفن کرنے — میں ارمانوں کی لاشوں کو اٹھائے
تھے امیدوں کے نازک آبگینے — چلا آہستہ سینے سے لگائے
جوانی کے مقدس خواب اپنے — طرب انگیز غرفوں میں جگائے
دبانے کے لیے احساس بے باک — فسانے جبر و سطوت کے سنائے
رسے جب زخم احساس خودی کے — پہنچ کر قہوہ خانوں میں چھپائے
شکستہ حوصلوں کو نیند آئی — تو پایل کے چھناکوں سے جگائے
بڑھی جب تلخی احساس میری — دہکتی مے سے لب اپنے جلائے
نہ جب پرواز کو پائیں فضائیں — تو زیر دام ہی ہم پھڑپھڑائے

------

جس خواب نے افسون سکوں قوم کا توڑا — اس خواب کی شاید کوئی تعبیر نہیں ہے
یہ کونسی منزل ہے تمنا کی نہ جانے' — دل میں ترا غم ہے تری تصویر نہیں ہے
ماضی کی یاد سے غم دوراں بھلا سکو — شاید حقیقتوں کو فسانہ بنا سکو
جاکر حرم میں ڈھونڈ لو یزداں گمان کا — شاید اسے فریب کہن میں نہ لا سکو

-------

جتلائے الم بھی رہتا ہے — دل پہ تیرا کرم بھی رہتا ہے
اس کی آنکھوں سے پی بھی لیتے ہیں — بندگی کا بھرم بھی رہتا ہے
اپنا مٹنا بھی کچھ ضروری ہے — اپنے مٹنے کا غم بھی رہتا ہے

کرتے رہتے ہیں منبر و محراب          ذکر شمع حرم بھی رہتا ہے

قطعہ

گلوں سے رنگ ستاروں سے نور لائیں گے          نئی زمین پہ جنت نئی بنائیں گے
کریں گے سوئی ہوئی کہکشاں سے ہم شوخی          نظر سے چاند کی کرنوں کو گدگدائیں گے

قطعہ

ہر دور میں کیوں بھیس بدلتا رہا اپنے          یہ راز تمنا ہے بتایا نہیں جاتا
جو زخم دیا تھا تری معصوم ادا نے          بے شرم حسینوں کو دکھایا نہیں جاتا

## نظم

وفور کیف سے آنکھیں ہیں نیم باز تری
سرور وصل سے تیرے بدن میں لرزش ہے
لذت عیش تن و روح میں ساری ہے ترے
گرمیٔ شوق سے بیتاب ہے آغوش تری
اور جذبات کے ہیجان و تلاطم کے سبب
گوشۂ لب میں نمایاں ہے نمی

متفرق اشعار

منہ سے جو بات دل کی بتائی نہ جائے گی          جھینپی ہوئی نظر سے چھپائی نہ جائے گی
ہم نے ہر زخم محبت میں تری کھایا ہے          ہم سے پوچھے کوئی اے زیست تری رعنائی
اتنا تو ہوش مجھ کو جنوں میں بھی ہے حسینؔ          دامن کا تار تار سیے جا رہا ہوں میں
نہ پوچھ تشنۂ تکمیل زندگی ہے وہ دل          نگاہ لطف کی اک یاد بھی جو پا نہ سکے
کیوں آج دل سنبھالے سنبھلتا نہیں حسینؔ          طوفان کوئی اور ہے کیا انتظار میں

چارہ درد کا شاید ہمیں ارماں ہوتا    اپنے غم کا بھی جو یارب کوئی عنواں ہوتا

-☆☆-

حسین صاحب کے دو مکمل یا نامکمل مضمون ان کی اپنی تحریر میں پیش خدمت ہیں۔



اردو میں دوسرے اصناف کی طرح غزل بھی فارسی سے ہی ماخوذ ہے۔ جس وقت ہندوستان میں دونوں قوموں کے ملاپ سے ایک نئی زبان دھیرے دھیرے نمودار ہو رہی تھی، اس وقت فارسی میں یہ صنف پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اپنی مخصوص فنی خوبیوں کی وجہ سے غزل نے جو فوقیت اور اہمیت حاصل کی، وہ فارسی میں بھی میسر نہ آسکی تھی کیونکہ فارسی میں مثنوی قطعہ، رباعی اور قصیدہ بھی کافی ترقی یافتہ ہو چکے تھے۔

لیکن فارسی زبان کی ادبی زندگی کے پہلے دور میں غزل موجود نہ تھی۔ فارسی شاعری کی بنیاد عربی شعر و ادب پر رکھی گئی تھی۔ بحور، قافیہ اور دوسرے عروضی اصول سب عربی ہی سے لئے گئے۔ فارسیوں نے صرف پانچ بحروں اور التزام ردیف کا اضافہ کیا۔ عربی میں قصیدہ کے سوا اور کوئی صنف رائج نہ تھا، اس لئے فارسی شاعری کا سنگ بنیاد بھی عباس مروزی کا قصیدہ ہی تھا۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ رودکی نے غزلیں بھی کہیں، لیکن دراصل غزل کی اس وقت کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ رودکی کی کوئی غزل نہیں ملتی۔ اس عہد میں غزل کا کام قصیدہ کی تشبیب سے لیا جاتا تھا۔ اسی لئے مدت تک غزل، تشبیب، اور نسیب ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ عشقیہ موضوعات کے علاوہ دوسرے اخلاقی اور حکیمانہ خیالات کو بیان کرنے کے لئے قطعہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔

مگر قصیدہ کی صورت عرب کے عباسی دور ہی میں مسخ ہو چکی تھی۔ شخصی نظام حکومت کے اثر سے شعراء نے اس صنف کو چاپلوسی کر کر انعام و اکرام حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اس لئے متنبی اور ابوالعلاء کے قصیدوں میں ایک خود غرض انسان کی مصنوعی مدح سرائی اور خوشامد مل سکتی ہے یا مطلق العنان فرمانرواؤں کی طاقت و عظمت

اندازہ ہو سکتا ہے مگر ان میں سچے جذبات کی تلاش بے سود ہے۔

فارسی میں اسی رنگ کی تقلید ہوئی۔ چنانچہ ایک عرصہ تک شاعری کا مصرف صاحبانِ استبداد اور اولی الامر کی جھوٹی سچی ستائش کر کر دولت و عزت حاصل کرنا سمجھا جاتا رہا۔ قصیدہ اس مقصد کیلئے موزوں تھا۔ اسلئے جس طرح شخصی دورِ سیاست میں معاشرے کے نظام کا ہر پہلو ایک فرد واحد کے گرد چکر لگاتا ہے، شاعری بھی جو اس وقت صرف قصیدہ سے مراد تھی، سلاطین کے درباروں اور محلوں کا طواف کرتی رہی۔ نتیجہ میں قصیدہ بدترین اخلاقی پستی اور ذہنی غلامی کا آئینہ بن گیا۔ قصیدہ کی تشبیب بھی جو 'مدح' سے بہر حال متعلق تھی، بے لاگ احساسات کی ترجمانی نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس میں بھی وہی تصنع اونگھتا رہتا ہے جو یک لخت مدح پر پہنچ کر جھنک پڑتا ہے۔ قصیدہ کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ تشبیب اور مدح کو اتنا مسلسل اور مربوط رکھا جائے کہ تشبیب سے مدح پر پہنچنے کا احساس بھی نہ ہو۔

مثنوی ایک لمبی داستان کی منظوم صورت ہوتی تھی۔ اسلئے نہ صرف شاعر کیلئے کوئی کامیاب مثنوی لکھنے میں بڑی محنت اور جانفشانی درکار ہوتی تھی بلکہ خود سامع کی لطف اندوزی میں اس کا طول و تسلسل شعر ہونے کی حیثیت سے مزاحم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مثنوی میں بھی امراء و سلاطین ہی کی جنگ آزمائیوں، شجاعت و سخاوت کے کارناموں اور حسن و عشق کے قصوں کا بیان ہوتا تھا۔ عوام کو وہاں بھی ثانوی درجہ حاصل تھا۔

قطعہ میں تسلسل کے علاوہ مضامین کا تنوع معدوم تھا۔ قطعات عموماً اخلاقی اور فکری موضوعات پر لکھے جاتے تھے۔ اسلئے عام طور پر ان میں خشک موعظت اور فکر ہوتی۔ مگر قطعہ بادشاہی اثرات سے کم متاثر ہوا۔ اس میں جو کچھ بھی کہا جاتا تھا،

وہ شاعری کی آواز ہوئی تھی

غزل اگرچہ اس دور میں مستقل صنف نہ تھی مگر تشبیب اور قطعہ میں اس کی پرورش ہو رہی تھی۔ جب صفاریہ کے عہد میں رباعی ایجاد ہوئی اور اس کی مقبولیت بڑھتی ہی گئی، تو گویا شاعری نے غزل کی پیدائش کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔ کیونکہ رباعی میں مختلف النوع خیالات، ایمائی اور اجمالی اسلوب میں جدا جدا بیان کئے جاتے ہیں اور غزل کو بھی خیالات و موضوعات کا تنوع اور استقلال اور بیان کا اختصار و ایجاز ہی دوسرے اصناف سے ممیز کرتے ہیں۔

دوسری طرف قطعات کی اخلاقی شاعری نے حکیم سنائی پر پہنچ کر ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر لی۔ نظامی نے اپنی مثنویوں میں حسن و عشق کے مضامین کو مکمل کر دیا۔ رباعیات میں بھی اخلاق، بے ثباتی دنیا، اور رندی کے علاوہ عمر خیام نے حکماء، فقہا اور واعظین پر حملے شروع کر دیئے۔

تاتاریوں کی یلغار کے بعد دنیائے اسلام میں طوائف الملوکی اور غلامی کا زمانہ آیا۔ شعراء کا درباری تعلق اور سرپرستی ختم ہو گیا۔ چنانچہ تصیدے کا انحطاط بھی شروع ہو گیا۔ مثنوی بھی شعراء سلاطین سے بخشش یا انعام کے حصول ہی کی خاطر تصنیف کیا کرتے تھے۔ اس لئے مثنوی میں اس قدر محنت کرنے کے لئے کوئی خارجی کشش نہ رہی تھی۔ علاوہ بریں انقلاب کی تباہ کاریاں جلد بھولنے والی نہ تھیں۔ اس قومی شکست نے مسلمانوں کو غمگین اور محزون بنا دیا تھا۔

ایسے حالات میں سعدیؒ نے غزل، رباعی، تشبیب، قطعہ اور مثنوی کے مختلف اجزاء اور خصوصیات کی ترتیب سے ایک نئے صنف کی تشکیل کی۔ یہی غزل کی موجودہ

Memorandum.

ہے۔

سعدی نے غزل میں درد و الم، معاملاتِ عشق اور ریاکار زاہدوں کی پردہ دری کو شامل کیا۔ عشقیہ واردات اور معاملات کو وسعت دی، درد و غم کو غزل کی روح میں جاگزیں کر کے اس کی تاثیر کو تمام اصناف سے بڑھا دیا، اور اخلاقیات کو ریاکار مذہبی طبقہ پر نکتہ چینی کر کے منطقی اور طنزیہ طریق اظہار سے دلنشیں بنا دیا۔ جو اختصار اور ایمائیت، مضامین کا تنوع اور استقلال سنائی میں پرورش پا چکا تھا اس کو غزل کا بنیادی اسلوب بنایا۔ قطعات کے مضامین اور مثنوی کے حسن و عشق کو غزل میں داخل کیا۔ زبان صاف اور سادہ ہو ہی چکی تھی، شیخ نے جدتِ ادا کا اضافہ کر کے غزل کو مکمل صنف کی حیثیت سے پیش کیا۔

میر عطار نے عمر خیام کے ساغر و مینا اور ماہ چہاردہ ساقی کی بجائے عرفانِ حقیقت کے نشہ اور لامکانی محبوب کے عشق کو منصوبانہ سرمستی اور وجدانیت کی تیزی دیکر بیان کرنا شروع کر دیا۔ مولانا روم نے تصوف، حقیقت اور وجدان کو اور ابھارا۔ حافظ نے جوش، وجد اور کیف گھول دیا جو لوگ جنس کی رات میں شاعری کے حقیقی اثرات ہیں۔ اور ایپکورس کے فلسفہ کو غزل میں شد و مد کے ساتھ شامل کیا۔ غرض رفتہ رفتہ فارسی میں غزل ایسا صنف بن گئی جس میں انسان کے ہر قسم کے جذبات بے پناہ تاثیر اور رمز کے ساتھ پیش کئے جانے لگے۔ صوفی کا عرفان و ایقان، اخلاقیین کا اخلاق، رندوں کی لاابالی، مجذوبوں کی حیرت، سالکوں کا جذبہ سلوک، پری چہروں کے غمزہ و ادا، چشم و ابرو، لب و گیسو، عاشقوں کا سوز و گداز اور افراد کے آلام سب غزل میں سما گئے۔

غزل نے اسی ہمہ گیری کے ساتھ اردو میں رواج پایا۔ ایران اور ہندوستان

کے سیاسی اور سماجی حالات اور نظامات اصلاً ایک ہی تھے۔ اس لئے غزل کا بنیادی فلسفہ اور اسلوب اردو میں بھی وہی رہا جو فارسی غزلوں میں تھا۔ لیکن ہندوستان کے کی مخصوص سماجی زندگی اور سیاسی تبدیلیوں سے غزل بھی متاثر ہوئی۔ اردو شاعری کے مختلف ادوار کا پس منظر یہی اجتماعی انقلابات ہیں۔

غزل کی عام مقبولیت کی وجہ اس کی سچی شاعری اور فنی خوبیاں تھیں اور مسلّم تھیں۔ غزل کے ماضی پر ان تینوں خصوصیات کے اعتبار سے مجملاً روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ تاکہ قرون وسطیٰ میں اس صنف نے ادب اور حیات کی جو عظیم الشان اور قابل اعتراف خدمات انجام دی ہیں، ان کی اہمیت اور بزرگی کا اندازہ ہو جائے۔ علاوہ بریں اس کی فنی خوبیوں اور صلاحیتوں کے بیان سے، جنھوں نے عہد گذشتہ میں قبول عام کا شرف بخشا، اس مسئلہ پر بھی غور و خوض کرنے میں آسانی ہوگی کہ آیا غزل کو دور حاضر میں کارآمد، زندہ اور متحرک صنف بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

غزل کی اولین خصوصیت جس نے اسے سچی شاعری بنایا، یہ تھی کہ قصائد کے برخلاف تصنع، چاپلوسی اور دریوزہ گری کی بجائے اس نے خالص انسانی جذبات کو آزادی کے ساتھ اپنا موضوع بنایا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مثنوی بھی ان عیوب سے پاک نہ تھی۔ لیکن غزل ہی ایک صنف تھا، جسمیں صدیوں ہمارے شعرا و درباری غلامی سے آزاد ہو کر اپنے احساسات کو صداقت کے ساتھ ظاہر کرتے رہے۔ چنانچہ عوام جو قصیدہ کو محض جھوٹ سمجھتے تھے اور مثنوی کے کرداروں سے بھی طبقاتی اختلاف سے انھیں اجنبیت کا احساس ہو سکتا تھا، غزل میں اپنی زندگی کی تصویر پا کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ قصیدے اور مثنوی کا ایک شعر بھی لوگ یاد نہ کرتے تھے مگر غزل کا ہر اچھا شعر زبان زد عام و خاص ہو جاتا تھا۔

ابتدا سے ہی غزل نے عشقیہ جذبات کو اپنا موضوع بنایا ، عشقیہ جذبات
غزل میں تفصیل سے بیان ہونے لگے ۔ عشق ابتدائے آفرینش سے آج تک انسان کا بے حد وسیع اور فطری جذبہ رہا ہے ۔ ہر قوم اور ہر ملک کی شاعری کا موضوع محض محبت ہی رہی ۔ اسی فطری خلش کو غزل نے وجدانی کیفیات کی شرابوں میں سرشار کر کے ، بے لوث آزادی کے ساتھ اظہار کیا ۔

آغاز میں یہ عشق مجازی تھا ۔ شاعر کا محبوب ایک حسین و جمیل انسانی پیکر ہوتا تھا ۔ جس کے حسن سے متاثر ہو کر وہ اپنے جمالیاتی احساس سے لطف اندوز ہوتا اور اسی تاثر کو شعر کا لباس پہناتا ۔ مگر بہت جلد محبت کا ایک مختلف تصور جو اسلامی دنیا میں پھیل کر عروج پا چکا تھا ، غزل میں داخل ہو گیا ۔ یہ عشق کا یہ تصور دراصل اس دور کے طریق حیات کا مرکزی نقطہ تھا اور اس کے پس منظر پوری قوم کا سماجی نظام تھا اور وہ خیالات اور خواہشات تھیں جو کسی نظام کو تشکیل کرتی ہیں ۔ عشق کا یہ تخیل تصوف تھا جو زندگی کی ایک مخصوص تعبیر کا داعی تھا ۔ چونکہ زندگی کا یہ تصور قوم کی رگ و پے میں رچ گیا تھا ، اس لئے اگر غزل میں اس کا عکس نہ ملتا ، تو غزل پر سماج کی نقاشی نہ کرنے کا الزام آتا ۔ چنانچہ غزل میں ماورائی حسن کی تمنا ، تلاش اور عزم وصل کے مضامین غزل کی جان بن گئے ۔ اور تصوف اور غزل میں روح اور جسد کا تعلق پیدا ہو گیا ۔

غزل پر تصوف کے چھا جانے کی وجہ صرف عمرانی نہ تھی ۔ اس کا ایک اہم سبب انسانی ذہن کا وہ آفاق گیر احساس بھی تھا جو تمام موجودات میں ایک لطیف وحدت کا تعقل کر لیتا ہے ۔ یہ وحدت کوئی حقیقت ہے یا نہیں ، اس کا فیصلہ کرنا مابعد الطبیعیات کے مسائل میں سے ہے ، لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نازک اور باریک احساس تمام اقوام کے شعراء ، فلاسفہ ، ارباب دین اور متکلمین میں مشترک رہا ہے

خواہ اس کی توضیح شیخ کبیر کے نظریہ وحدت الوجود کی شکل میں کی گئی ہو۔ یا ہیگل کے 'روحِ کائنات' کے تصور کی صورت میں۔ صوفی کی وحدت، فلسفی کی حقیقت اور شاعر کا محبوب حسن اسی بسیط احساس کی تعبیریں ہیں۔ خصوصاً اعلیٰ پایہ کے شعراء کے مختلف جذبات کا سرچشمہ یہی احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے تخیل میں جو زندگی کی ایک مربوط تصویر ہوتی ہے، اس کا راز بھی یہی ہوتا ہے۔ انسان میں نظمِ کائنات کا احساس کرنے کی ایک فطری صلاحیت یا حس موجود ہے، جسے وجدان کہتے ہیں اور جو شاعری کی روح ہے۔

اسلام نے وحدت کی اس شد و مد سے تبلیغ کی کہ تمام نظامِ حیات و کائنات کا بنیادی اصول اسی کو قرار دیا۔ یہ وحدت فلسفہ اور کلام کی عقلیت اور اہلِ مجاہدہ و ریاضت کی روحانیت سے مترشح ہو گئی۔ سریت فن کی جان ہے۔ اور اس کے بہترین اظہار کے بہترین اسالیب، ایمائیت اور اشاریت ہیں جو سریت کے علاوہ دوسرے جذبات و خیالات کے لئے بھی اعلیٰ طریقِ بیان ہیں۔ اس لئے غزل کو تصوف اور تصوف کو غزل بہت راس آئی۔

عشق، جمالیات اور تصوف کے علاوہ غزل نے ایک اور جذبہ کے اظہار کو اپنایا جو انسان کی جبلت میں داخل ہے۔ آدمی زندہ رہنا چاہتا ہے مگر کائنات اور فطرت اس کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس لئے آدمی کو زندہ رہنے کے لئے فطرت کی قوتوں سے ٹکر لینی پڑتی ہے۔ اس مسلسل جنگ میں ناامیدی اور تاخیر ہوتی ہی رہتی ہے جو انسان کے نفس میں غم کو پیدا کر سکتے ہیں۔ آدمی کی آرزوئیں لامحدود ہیں۔ ان کی تکمیل نہیں ہو سکتی اس لئے انسان کی زندگی کے ساتھ

غم بھی زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا، انسان، ہر دور کے ادب میں عشق کا جذبہ اور غم ہی دو جذبات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ارسطو جب شاعری سے بحث کرتا ہے تو محض المیہ پر تبصرہ کرتا ہے گویا المیہ کے علاوہ یونانی شعر میں کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ غزل نے تصوف اور حسن و عشق کے پہلو بہ پہلو غم کو بھی جگہ دی۔ غم انسان کے ہر نازک پہلو کو چھیڑا اور اس میں وہ تاثیر اور درد پیدا کیا کہ غم کو زندگی بنا دیا۔ غم جاناں کے علاوہ غم روزگار کو بھی اپنے حیطۂ اظہار سے باہر نہ جانے دیا۔ دراصل اگر غزل میں از منۂ وسطیٰ کے سماجی اور عمرانی مسائل، مشکلات اور مصائب کا مطالعہ کرنا ہو، تو حزن و ملال کے اشعار کی تہوں میں ہو کر دیکھنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ غزل نے انسان کے تمام جذبات اور قلبی واردات کا احاطہ کر لیا۔ خصوصاً تصوف کے اثر سے حیرت، جذب، سرمستی، وجد، محویت، جاوید، بے تابی، خودی، اور سیکڑوں کیفیات کو غزل بیان کرتی رہی۔

جذبات کی آزاد ترجمانی کے علاوہ اگر ہمارے ادب میں کسی صنف نے زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور سماج کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کوئی قابل اثر بھی چھوڑا ہے تو وہ صرف غزل ہے۔

غزل میں تصوف کے جگہ پاتے ہی ہزاروں اخلاقی اور حکیمانہ مسائل اور جذبات ظاہر کیے جانے لگے۔ حقیقت مطلق کا مافوق الادراک ہونا، موجودات کی ابتدا اور انتہا، انسان کی غرض و غایت، تمنا کی ازلیت اور ابدیت، بے ثباتی عالم، جنت و دوزخ، خیر و شر، جبر و اختیار، جنون و حکمت، عقل و وجدان، سود و زیاں، انسان کی حقیقت، کائنات اور انسان کا تعلق وغیرہ ہم سیکڑوں اعلیٰ فکری مسائل کو جذبات میں

سموکر پیش کیا گیا۔

مابعد الطبیعیاتی افکار کے علاوہ ایک اعلیٰ، پاکیزہ اور وسیع النظر نظام حیات بھی غزل میں ابھرنے لگا۔

قرون وسطیٰ میں مذہبی اداروں کی مطلق العنانی، تسلط اور ریاکاری انسان کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ تھا۔ اس دور میں حکومت بھی اپنے لامحدود اختیارات کے باوجود مذہبی جماعت کی قوت کو براہ راست للکارنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ مگر غزل نے عالم وجود میں آتے ہی اپنے حملہ کا نشانہ سب سے پہلے اسی گروہ کو بنایا۔ شیخ کی پگڑی اچھالنا صدیوں غزل کا دلچسپ مشغلہ رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی طبقہ نے اس تضحیک کو اپنے لئے خطرناک سمجھکر اس کو دبانے کی بھی کوشش کی۔ مگر یہ وقت کی آواز تھی، سچائی تھی اور مثبت بھی تھی۔ چنانچہ غزل مذہبی طبقے کی پردہ دری کرنے میں نہایت کامیاب رہی۔ آج بھی عوام میں "ملا" کا لفظ زبان پر آتے ہی تحقیر کے جو آثار چہرہ پر نمودار ہوتے ہیں وہ غزل کی ہی نقاب کشائی کا بہت حد تک نتیجہ ہے۔

اس زمانہ میں شخصی حکومت اور متمول امراء کے خلاف آواز بلند کرنا حق پرست علماء اور بااثر اہل حق کیلئے بھی سہل نہ تھا۔ مخلص رہنمایان ملت بھی اپنی مساعی کو محض اصلاح تک محدود رکھتے تھے۔ دنیا کی تاریخ کے اس عہد میں عوامی انقلابات بہت کم آتے تھے۔ جسکی وجہ انفرادی مسائل کو اجتماعی طریقہ سے حل کرنیکی تدبیر سے لاعلمی تھی۔ عوام کو اجتماعی آواز کی قوتوں کا احساس نہ تھا۔ دوسرے ذرائع آمدورفت کی تنگی تھی۔

اس کے علاوہ حکومت کا دائرہ عمل بھی اتنا وسیع نہ تھا۔ معیشت کا مسئلہ انفرادی ذمہ داری خیال کیا جاتا تھا۔ حکومت عوام کی عزت و آبرو، جان و مال اور مذہبی روایات

کی حفاظت اپنے ذمہ لیتی تھی ۔ قومی آزادی کی تعلیم اور انصاف کا اجرا بھی اس کے سپرد تھا ۔ اچھی حکومتیں عوام کے دوسرے مسائل سے بھی دلچسپی لیتی تھیں اور ان کی تھوڑی بہت مدد کرتی رہتی تھیں مثلاً نہریں ، سڑکیں اور سرائیں بنانا ، مدارس کا قیام ، مساجد کی تعمیر وغیرہ ۔ حصول معیشت کے مسائل اجتماعی طریقے سے حل ہو سکتے جاتے تھے ۔

اس لئے عوام میں حکومت کے خلاف بے چینی یا تو مذہبی اسباب سے پیدا ہوتی تھی یا عمال کے جور و تعدی کی بنا پر یا بعض اس بادشاہ کی وجہ سے ۔ اگر اس قسم کی کوئی چیز پیدا نہ ہوتی تھی تو باوجود افلاس اور تنگدستی کے عوام حکومت کو اپنی مصیبتوں کا باعث تصور نہ کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے کامیاب فرمانروا اپنی مملکت میں ان عیوب کو رونما نہ ہونے دیتے تھے اور تھوڑی بہت تعمیری کام بھی کرتے رہتے تھے ۔ اس لئے سلاطین کی طاقتیں اور اختیارات لامحدود ہو جاتے تھے ۔ چنانچہ جب کبھی ایک مستبد حکومت کی لاپرواہیاں حد سے بڑھیں تو انقلاب کے آثار رونما ہوئے لیکن بادشاہ وقت نے رویہ میں ذرا سی تبدیلی کی اور عوام اور حکومت میں مصالحت ہو گئی ۔ مثلاً جہانگیر نے اسلام کو صرف حکومت کا مذہب قرار دے دیا اور مجدد الف ثانی نے اس اصلاح کو کافی سمجھ لیا ۔

ایسے دور میں غزل بھی زندگی کی یہی خدمت کر سکتی تھی کہ بادشاہوں کو عہد عتیق کی طرح عدالت سے باندھ رکھے ۔ انسان میں خود شناسی پیدا کرے ، اس کی عظمت کا احساس دلا کر اس میں فاعلیت پیدا کرے ۔ اور اس طرح بادشاہوں کے بیچ میں شریعت و قانون کی برتری ڈالے رکھے ۔ خود بادشاہوں کی ذہنیت اور اخلاق کی اصلاح کرے ۔ عوام میں سماجی امتیاز مٹا دے اور مساوات پیدا کرے ۔

چنانچہ غزل نے ان تمام اعلیٰ اور عمرانی ذمہ داریوں سے بطریق احسن سبکدوشی حاصل کی ۔

نفس پرستی، دولت پرستی، جاہ پرستی اور توہم پرستی کے ساتھ بادشاہ پرستی کی جگہ غزل نے انسان پروری اور حق پرستی کی نہایت پرجوش اور وجد آور تلقین کی۔ تصوف کے وحدت الوجود اور اسلام کی وحدت نے غزل کو جاندار روحانیت بخشی جس نے پاکیزہ اخلاق پیدا کرنے والوں کا درجہ سب سے زیادہ بلند کر دیا۔ اسی طرح غزل مزاج کے ذہن اور عملی زندگی پر بادشاہوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے منافی عنصر سے ٹکر مسلسل حکومت کی قوت و اختیار، جاہ و جلال اور حقوق کو تجاوز سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

یہ تو غزل کا منفی عمل اور اثر تھا مگر غزل کا مثبت کارنامہ اتنا عظیم الشان ہے کہ جب تک ہمارا ادب زندہ ہے، غزل کا یہ احسان اس کے سر سے نہیں جا سکتا۔ غزل نے مشرق کی روح کو بے نقاب کر دیا۔ ہمارے نظریہ حیات کو مجموعی شکل میں کیف و تاثیر کے ساتھ پیش کیا۔ غزل کو غنائی شاعری کہا جاتا ہے مگر دنیا میں کسی قوم کی غنائی شاعری زندگی کے حقائق اور معاشرے کی نفسی کو غزل کی طرح حسن و شکوہ کے ساتھ عریاں نہیں کر سکی۔

قرون وسطیٰ مذہبی تعصب اور جور و ظلم کا زمانہ ہے جس میں مذہب کے اذعانی تصور نے تنگ نظری کو انسان کے دل و دماغ پر طاری کر دیا تھا۔ تنگ نظری کے علاوہ فقدان علم، اور جہالت کی فراوانی نے بنی نوع انسان کا کوئی آفاقی تصور بلکہ ذہنوں میں تعمیر نہ ہونے دیا۔ مذہبی اختلاف کی شدت نے انسانیت کی وحدت کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

---

لیکن اس دور میں غزل چیخ چیخ کر تنگ نظری، جہالت اور تعصب کے خلاف جدوجہد کی آواز بلند کرتی رہی۔ متغزلین نے ہمیشہ بنی آدم کے اتحاد و اخوت کو سراہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے صاف صاف اپنے آپ کو تمام مذاہب سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کی

بجائے انسان کے احترام، اس کی دل آزاری سے باز رہے، اس کی ہر بدی اور لطعن کو ہی اپنا دین بنا لیا۔ آدمی کے حقوق کے احترام اور آدمی کی خدمت کو حج، نماز، روزہ ہر مذہبی رسم سے اعلیٰ و برتر عبادت قرار دیا اور دل آزاری کو بدترین گناہ۔

یہی نہیں بلکہ غزل میں شعراء نے تمام مذاہب کی تفہیم وحدت اور یکجہتی مماثلت کو پیش کیا اور مذہب دوستی کے ساتھ ادا کر لینے پر زور دیا۔ ظاہری اعتقادات کو ہمیشہ تحقیر اور تمسخر کی نگاہ سے دیکھا۔ ظاہر پرستی کو حقیقی علم اور ادراک حیات کا دشمن سمجھا۔ انہوں نے کافر جیسے لفظ کو جس سے زیادہ ذلت و حقارت کا موثر اظہار نہ ہو سکتا تھا، اتنا دلکش، بلند اور پاک بنا دیا کہ متقی مومن بھی اپنے آپ کو "کافر" کہتے ہوئے وجد میں آ جاتا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز ہے۔

مذہبی تعصب کی شدت کو اس طرح اعتدال پر لانے اور انسانی ہمدردی کی تلقین کرنے کے علاوہ انسان کی عظمت کو جس طرح سے غزل نے آشکار کیا دنیا کے ادب میں اس کی مثال کم ملے گی۔ غزل نے انسان کو عالم کائنات کا مرکز، تمام مخلوقات کا مقصود، خلاق اکبر کی تمام صفات و قویٰ کا مظہر کی حیثیت سے پیش کیا۔ غزل گو کا انسان خدا سے برابری کرتا ہے، اس سے بے تکلف الجھتا ہے، اس سے ناز و نیاز ہوتے ہیں، مشورے کئے جاتے ہیں گویا خدا کے اعمال میں انسان کو کم سے کم مشیر ضرور بنا دیا۔ خدا کے رازوں کا امین، جاودان حیات کا مالک، خدا کے کارخانے کو چلانے والا بھی غزل میں انسان ہی ہے۔ اس کی زندگی ایک رفیع المرتبت مقصد سے آراستہ اور مزین ہے۔ اس کا نصب العین جتنا عالمگیر اور لامحدود ہے اتنا ہی بلند اور اعلیٰ و ارفع ہے۔

غزل نے انسان کی عظمت اور اس کے نصب العین کی رفعت کے ساتھ اسے خود شناسی اور روح کائنات کے تحقق کی دعوت دی۔ علم و ایقان کو ابھارا اور مسلسل عمل کی

فلسفیانہ بے عملی اور قنوطیت سے روکا۔

ایسے تیار کیا اور "بشریت" کو انسان کی تمام مشکلات کا حل بتایا۔

یہ تھی غزل کی سچی شاعری اور غزل کا فلسفہ جو ایک حقیقی شاعری کی طرح سماج پر اثر انداز بھی ہوتا رہا اور اس سے متاثر بھی ہوتا رہا۔ یہی اس کی مقبولیت کے اہم اسباب میں سے ایک ہے۔ لیکن غزل میں چند فنی خصوصیات ~~ایسی~~ بھی ہیں ~~جو~~ اور صنفوں میں نہیں ہیں جنھوں نے صدیوں غزل کو سب سے زیادہ جاندار صنف شعر بنائے رکھا۔ اور جن سے آج بھی نا امید ہونا، ہمارے ادب کے مستقبل کیلئے ایک غلط مصلحت ثابت ہوگا۔

غزل کی پہلی فنی خوبی یہ ہے کہ اس کے طریق بیان میں پائندگی اور قید زمان و مکان سے آزادی پائی جاتی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ ہنگامی ادب ضروری ہے یا غیر ضروری ایکارہ۔ لیکن اس سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ ادب کے کسی کارنامہ میں اگر پائندگی بھی پائی جائے تو ہر زمانہ میں اس کی سچائی اور لطف قائم رہیں گے۔ اور وہ کبھی نہ مر سکیگا۔ غزل نے تمام اصناف سے الگ ایسے ہی فطری احساسات اور خیالات کو لیا جو انسان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اور اپنے اسلوب بیان سے ان کی پائندگی کو کسی طرح کم نہ ہونے دیا۔

ان ہی جذبات کو مثنوی اور تمثیل میں بھی پیش کیا گیا۔ لیکن غزل کے انداز بیان میں جو تعمیم اور پائندگی ہے، مثنوی اور تمثیل کو نصیب نہیں۔ مثنوی یا تمثیل میں کسی خیال یا جذبہ کے اظہار کیلئے کرداروں کے مکالمہ یا ان کی نفسیاتی کیفیات کے بیان کا طریقہ کام میں لایا جاتا ہے۔ شاعر کی بجائے کردار کا تصور اس میں افسانویت پیدا کر دیتا ہے اور وہ خیال شاعر کے ایمان اور یقین سے محروم ہو جاتا ہے۔ غزل میں اس کے برخلاف ہر شعر کھلا کھلا شاعر کے جذبہ کی ہی تصویر ہوتا ہے اور شاعری حقیقت معرفت

Accounts Notes

پرستی کی ہوتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایسے جذبہ کا آئینہ اور جاوید اظہار ہوتا ہے جو کسی فرد یا کسی عہد سے مخصوص نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے نے ہزاروں کروٹیں بدلیں، زندگی کے اقدار میں لاکھوں انقلابات آئے لیکن غزل کا ایک اچھا شعر اب بھی وہی تاثیر رکھتا ہے جو صدیوں پہلے رکھتا تھا۔

غزل نے وقتی حالات اور ہنگامی مسائل پر بھی روشنی ڈالی مثلاً ملا کی جنس جہاں زاہد کی ریاکاری، فقیہا کی تنگ نظری، عوام کے مصائب وغیرہ مگر اپنے اسلوب سے ان میں بھی وہی تعمیم پیدا کر دی جو اس کی تکنیک کا خاصہ ہے۔

غزل کا انداز بیان خالص وجدانی ہے۔ شاعر کی نظر زندگی کے ہر پہلو پر پڑتی ہے۔ وہ حیات و موجودات کے ہر شعبہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ کہیں وہ کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر جستجوئے راز کرتا ہوا نظر آتا ہے کہیں سطحی اور جزوی چیزیں اس کی توجہ اور ادراک کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ وہ ان سب چیزوں سے پہلے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ذہن اور احساس میں تحریک ہوتی ہے۔ اس کا وجدان بیدار ہو جاتا ہے۔ زندگی کا ایک مجموعی خاکہ اس کے دماغ پر منقش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جب اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، تو تحلیل کے مطالعہ اور تجربات کی بجائے یقین اس کے ہر لفظ اور ہر لب و لہجہ سے ٹپکتا ہے۔ جوش، مستی اور کیف میں ڈوب کر وہ اس کیفیت کو بیان کرتا ہے، جسے جزویات اور کلیات کا مطالعہ اس کے دل و دماغ میں پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اسے اپنی دریافت کی حقیقت پر جزم و یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ ان جزوی محرکات کی طرف وہ محض لطیف اشارہ کرتا ہے مگر دراصل وہ صرف اس مجموعی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے۔

جوش اور وجدان ہی کی آغوش میں موسیقیت اور غنائیت بھی پرورش پاتی ہے۔

لیکن غزل میں جو غنائیت فطری طور پر موجود ہے اس کا سبب اس کا وجدانی تکنیک ہی نہیں بلکہ اس کی عضوی ساخت بھی ہے۔ چند اس کی مکمل ترنم اور نغمگیت کی زبردست معاون ہوتی ہے۔ غزل نے خود موسیقی پر اپنا اثر ڈالا ہے جس کا واضح ثبوت ہندوستان، ایران اور پشتو زبانوں کے نغمہ میں اصولی اشتراک ہے۔ ن۔ م۔ راشد کہتے ہیں: "غزل نے ہماری روایات نغمہ پر عالمگیر اثر ڈالا۔"

درحقیقت وزن اور قافیہ کے بے جا استعمال کی شدید مخالفت بھی کی جاتی ہے، مگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وزن اور قافیہ، شعر کے صوتی حسن اور موسیقیت میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ شاعری کے لئے لازمی نہ سہی مگر ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر زبان کے شعرا نے شعر میں نغمگی پیدا کرنے کے لئے ان کو بہترین آلہ سمجھا ہے۔ لوک گیتوں تک میں یہ رجحان صاف جھلکتا ہے کہ شاعر کو اگر قافیہ اور وزن آسانی سے کام آسکے، تو ان کو کام سے نہیں جانے دیا۔ نارمن شاعری پر عبرانی ادب کے اثرات قافیہ اور وزن ہی کی صورت میں نمایاں طور پر نمودار ہوئے۔ یوں تو عرب جیسی وزن و قافیہ کی خوگر قوم کے خیال میں بھی ہر آواز میں لحن موجود ہے لیکن درحقیقت متوازی حرکات اور متوازن اصوات ہی موسیقی اور معمولی انداز کلام میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ خود ن۔ م۔ راشد جیسا [illegible] کہتا ہے: "قافیہ موسیقی کی کلید ہے"۔

~~غزل~~ ان اصولی محاسن اور بنیادی خوبیوں کے علاوہ غزل ہی ایسا صنف ہے جس میں شاعروں نے لخت جانی کا کم سے کم ملا ہو گیا۔ اور اگر کیا بھی تو اسے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ غزل کی مسلمہ خصوصیات میں سادگی، روانی اور سلاست کو بنیادی شمار کیا گیا۔

## قافیہ اور مضمون بندی:

بحر اور قافیہ شاعر کو اپنے تجربات کی ترجمانی میں ترنم پیدا کرنے میں جتنا مدد دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری نے قدیم سے قدیم دور میں جب شعر کو باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل نہ تھی، عوامی گیتوں میں بھی کوشش کی ہے کہ اس حربہ کو استعمال کر سکے۔ خیالات کو اشعار میں پُر اثر اور ترنم صورت میں ادا کرنے کے لئے ہزاروں طریقے استعمال کئے گئے ہیں اور تجربات وارد ہیں کہ شعری علامتانہ نکتہ سے اسالیب کی دریافت کا سلسلہ نہ آج تک ختم ہوا اور نہ ہو۔ لیکن چونکہ انسانی کورد و شعوری [illegible] کے لیے اصوات و حرکات میں توازن اور تناسب پیدا ہو جانے سے [illegible] ان میں غنائی کیفیت [illegible] لازمی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے عموماً شعر کہنے والوں کا رجحان اس آسان تدبیر کی جانب مائل رہا کہ نثر سے کم سے کم [illegible] ترجمان اور طریقوں سے غنائیت پیدا کرنے میں دشواری ہوتی، اس سہل طریقہ کو زیادہ استعمال کرنا پسند کیا گیا۔

لیکن جن شعراء نے آزاد نظم میں غور کیا ہے انہوں نے [illegible] قافیہ کی زنجیر اور سخت گوئی سمجھ کر پابندی سے آزاد کر لیا اور اس لئے فن میں [illegible] رکھا ہے۔ قافیہ خود شاعر کو نئے خیالات بھی سمجھا دیتا ہے۔ [illegible] یہ خیالات مستقل اضافے ہیں اگرچہ [illegible] ثانوی مستقل حیثیت نہیں رکھتے مگر مرکزی جذبہ کو اکثر زیادہ حسین اور وسیع بنا دیتے ہیں۔ اور اکثر ان خیالات کی مدد سے نظم کی روح زیادہ واضح اور متناسب ہو جاتی ہے۔ اکثر قافیہ کے پیدا کردہ یہ فروعی خیالات

اتنے طویل ہوتے ہیں کہ نظموں کے تسلسل کی یک آہنگی ایک موڈ پیدا کر دیتی ہیں اور سامع کا ذہن ایک ہی نقطہ پر مرکوز رہ کر اکتا جانے سے نجات پا لیتا ہے۔ وہ نظمیں اکثر بحث کا مناسب ہوتی ہیں جن میں قافیہ نے شاعر کو [illegible] ایک سپاٹ لکیر سے ہٹا کر اطراف و جوانب کی طرف دھکا دیا اور پھر کچھ چند لمحے اپنی مرکوز بحث کی وادیوں میں سیر کرا کر اپنی راہ پکڑ لی۔ [illegible] قافیہ جب ذہن کو معمولی سا دھکا دیتا ہے۔ جس سے وہ سرراہ کے مناظر میں شعور کو خوابیدہ کر سکتا ہے اس کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے تو حیرت کا ایک لطف احساس پیدا ہوتا ہے جو موضوع میں زندگی کی نئی رمق دوڑا دیتا ہے۔ ذہن [illegible] اس طرح ہی جلد [illegible] ہلکی ہلکی اور متوسط تماثیل [illegible] اس میں موضوع کے ضربانی ادراک اور لطف اندوزی کی تازہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

شاعر کسی خیال کو منطقی پیرایہ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ خیالات جب اس کے شعور میں ابھرتے ہیں تو خود ایک مبہم حسن ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ منطقی پیرایہ خیالات کے جسم کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے مگر وہ حسن جو وہ اپنے ہمراہ لاتے [illegible] انتشار سے پیدا کردہ ہوتا ہے۔ چنانچہ منطقی طور پر خیالات کے چہرہ پہ وہ تازگی اور رونق نہیں ہوتی کیونکہ وہ ایک خاص جسم کو تابع ہوتے ہیں۔ [illegible] شعرا نے اس معروف اظہار [illegible] شعریت پیدا کرنے کے طریقے نکالے ہیں جن سے قاری کا ذہن اس کے جسم کو دیکھ کر [illegible] اس کی روح کا نقش خود اپنے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ مگر اس

میں ہماری نگاہ فن کی نری مہارت کی طرف جاتی ہے۔ لیکن یہ امر تو در حقیقت سے خالی نہیں ہوتا — کہ اگر اس تصویر کشی میں ماہر کے ذہن کی مہارت سے تمام رنگوں کے استعمال میں لغزش ہو جاتی ہے تو تصویر میں وہ دلکشی نہیں رہتی جو ندرت اور جدت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس دلکشی کے معیار کی تگ و دو میں مشکل فن کو مقصد سمجھا تو پھر ماہر نقاش کے رنگوں کی آمیزش اتنی مبہم ہو جاتی ہے کہ وہ تصویر میں کوئی ربط نہ پا کر لطف آپ کو لطف اندوز ہونے نہیں دیتا / ناکام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جدید دور میں اکثر شعرا ان دو خطروں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

لیکن کامیاب شعراء بیشتر اپنے خیالات کے حقیقی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے معاون خیالات دیکر اپنے قاری کو کی مدد کرتے ہیں جس سے وہ خود اپنے ذہن میں شاعر کے خیالات کو اسی حسن سے آراستہ کر لیتے ہیں جو وہ شاعر کے ذہن سے نکل کر خارجی وجود میں لکھ رہے ہیں۔

یہ معاون خیالات شاعر کو مختلف طریقوں سے سوجھتے ہیں۔ کبھی وہ ان خیالات کو موضوع سے براہ راست متعلق بالمشابہت، کبھی فطرت کے کسی حسین منظر کے تاثرات کو اجاگر کر کے اپنے موضوع سے مربوط کر دیتا ہے، کبھی وہ اپنی زندگی کے مشاہدات کی تصویروں کو مناسب تمثیل کر کے ارد گرد لگا دیتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنے موضوع کے ایک جزو کو لے لیتا ہے اور اس کو مستقل اور مکمل شکل کر کے موضوع سے الگ کر دکھا دیتا ہے

Mr. Lytton Strachey
1. Eminent Victorians
2. Charles George Gordon, soldier & mystic (1838)

حسب اس کے موضوع کے افراد کا انفرادی شخص جو کہ ان کا ہے۔ اور اگرچہ
اس مضمون کی مکمل صورت کا موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر
موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے اس کی ساخت کی پیچیدگی نمایاں ہو کر تاریخ کو
میں داخل ہو جاتی ہے اس کی ذہن اور موضوع کی ثابت اور اس تصور ہو جاتا ہے۔
گزشتہ اس کے مشاہدات اور مطالعے جس کے ذہن پر منقش ہوتے ہوتے
کہ الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ [illegible] الفاظ ابھی کہ ذہن پر جگہ لگا لیتے ہیں
ان الفاظ کو دہ لینے ذہن میں ایک مخصوص معنی پیدا ہوتا ہے اور یہ الفاظ
اس کو نہیں خطوط کی علامات ہوتی ہیں۔ جس کی مدد سے وہ اپنے تجربات
مشاہدات کو ملکانتا ہے۔

چنانچہ جب اس کا نگار رہ جاتا ہے پہلے [illegible] کوئی شاعر یا پیدا کر دیتا ہے
تو وہ اس کے حسین ترین اظہار اور مواد کو اس کے ساتھ معاون خیالات
کی [illegible] تلاش کرتا ہے۔ معانی یا خیالات کی جگہ کے وہ انہی [illegible] الفاظ
کی طرف رجوع ہوتا ہے جنہیں اس نے اپنی تمام مشاہدات کی [illegible]
کی امانت سمجھ کر محفوظ رکھا ہے۔ یہ علامت [illegible]

[illegible] G. W. Steevens (Correspondent

اس مطالعہ کی جمع کی ہوئی تمام تصویروں کو اصلی آنکھ کے سامنے سے
گذارنے لگتی ہیں ۔ وہ حسن کو اپنے موضوع کی آرائش کرتے موزوں الفاظ
رنگوں اور خطوط میں مناسب ترتیب کے ساتھ پھیلاتا جاتا ہے ۔
بعض اوقات اکثر ان الفاظ کو بھی یاد دلا دیتا ہے
اور جو الفاظ قافیہ یاد دلاتے ہیں ان میں ایک صفت نمایاں ہوتی ہے ۔ قافیہ کے
یاد دلائے ہوئے اشعار موضوع سے اکثر بعید ہوتے ہیں ۔ لیکن جو الفاظ
خود بخود خیال میں آتے ہیں وہ ہر حال میں موضوع سے بہت قریب ہوتے ہیں ۔ قافیہ کے
یاد دلائے ہوئے الفاظ کو ایسے صفات یاد دلاتے ہیں
جو شاعر [illegible] موضوع سے وابستہ کر دیتا ہے
تو ان کا مستقل حسن موضوع کے اندر مکمل طور پر ادا ہو جاتا ہے ۔ لیکن
شاعر کے خود یاد کردہ الفاظ جو [illegible] اکثر موضوع سے [illegible] عبارت
کا علاوہ [illegible] ہیں ان میں مستقل مدد دینے کی صلاحیت کم ہوتی ہے

## امروہے کا محرّم

امروہہ اپنے محرم کے لیے بڑی شہرت رکھتا ہے- عظیم امروہوی کے کہنے کے مطابق آج بھی ۲۷ امام باڑے موجود ہیں-اس روح پرور ماحول میں یہاں کی فضائیں کربلاوالوں کے ذکر سے گونجتی رہتی ہیں-شاید اس کا سبب یہ ہو کہ امروہہ (۲۵۳)اور کربلا(۲۵۳) کے عدد برابر ہیں-

سانحہ کربلا کے ایک سال بعد ہی راہب دت کے خاندان نے اس یاد کو غم ناک انداز میں منایا تھا-(ممتاز فلمی شخصیت سنیل دت کا تعلق اسی خاندان سے ہے)سرزمین ہند پر عزاداری کی بنیاد جن برہمنوں نے رکھی وہ حسینی برہمن کہلائے اس عقیدت مندانہ ابتدا کا یہ نتیجہ ہوا کہ عزاداری دن بدن ترقی کرتی چلی گئی-"

اس شہر میں ۲۷ اماباڑے ہیں جن میں کربلا کے بہتر شہیدوں کی عزاداری ۲۷ دن یعنی ۲۵ ذی الحجہ تا ۸ ربیع الاول ہوتی ہے-ان عزاخانوں کے لیے سالانہ چندہ مقامی لوگ لاکھوں کی تعداد میں کرتے ہیں- مجموعی طور پر عزاداری پر صرف امروہہ میں ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے جس سے مزدور طبقہ کو روزگار بھی فراہم ہوتا ہے-امروہہ کے مخصوص عزاخانے مندرجہ ذیل ہیں:

عزاخانہ کٹرہ غلام علی: شاہی منصبدار سید مظہر علی خان نے عہد فرخ سیر بادشاہ میں تعمیر کرایا تھا-

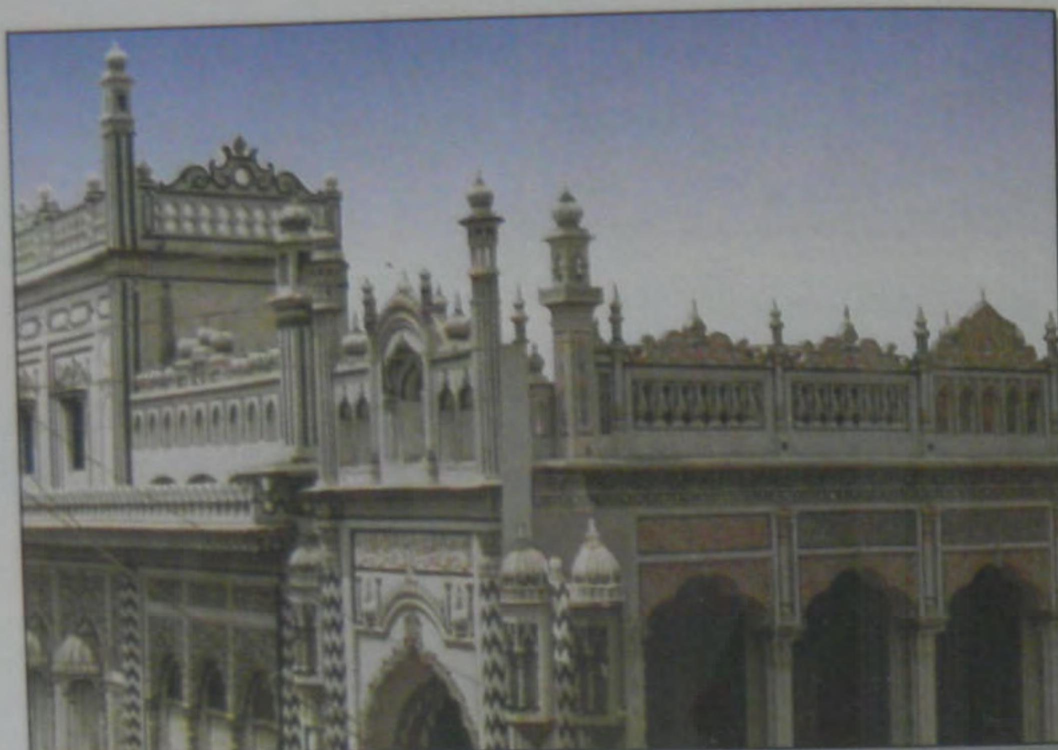
عزاخانہ مساۃ نورن: تقریباً دو سو سال قبل دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمہ مساۃ نورن نے اس کی تعمیر کرائی-

عزاخانہ محلّہ حقانی: یہ بھی قدیم عزاخانہ ہے-سعادت امروہوی کے خاندان سے اس کا تعلق ہے-

عزاخانہ سید دوست علی: سید دوست علی نے ۱۱۸۰ھ میں تعمیر کرایا- تاریخ "تربت حسینی" ہے-

عزاخانہ جعفری: محمد شاہ کے عہد میں سید محمد بخش اور سید حسین علی نے تعمیر کرایا-

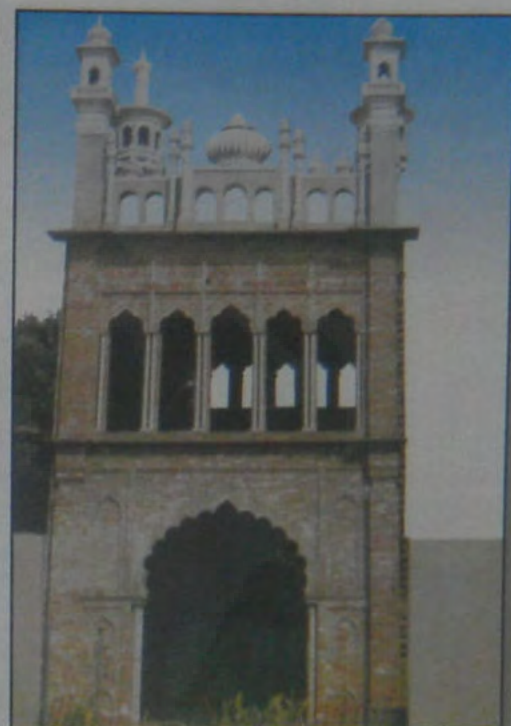
حسینیہ دربار شاہ ولایت: اس کا تعلق سید ابدال محمد کی اولاد سے ہے-سو سال قبل از سر نو تعمیر ہوا- مشہور رئیس امروہوی،جون ایلیا اور کمال امروہوی کا خاندان اس وسیع



دانشمندان کے امام باڑے کا خوبصورت منظر



محرم کے جلوس سے پہلے اونٹوں کا قافلہ



دانشمندان کے امام باڑے کا صدر دروازہ



محرم کا جلوس



محرم کے جلوس میں روشن چوکی کا منظر

اماماڑے کاانتظام کرتا ہے۔

عزاخانہ شفاعت پوتہ: دو سو سال قدیم عزاخانہ ہے لیکن موجودہ عمارت کی تعمیر ڈیڑھ سو سال قبل مولانا محمد عسکری نے کرائی تھی۔

عزاخانہ بخشی الملک

سید میراں خان: عہد جہانگیر شاہ میں اس کی بنیاد سید میراں خان نے ڈالی۔

عزاخانہ دربار شاہ ابوالحسن: یہ بھی امروہہ کاایک قدیم عزاخانہ ہے۔

عزاخانہ مسماۃ صغرن: اس کی تعمیر ۱۲۲۸ھ میں ہوئی۔ عمارت کی منفرد شان ہے۔

عزاخانہ محلّہ بگلہ: عالمی شہرت یافتہ مصور و خطاط صادقین کے آباؤاجداد نے اس کی تعمیر تقریباً ۱۵۰ سال قبل کرائی تھی۔یہ عزاخانہ شیشے کی آرائش کے سبب خاص شہرت رکھتا ہے۔

عزاخانہ مسماۃ وزیرالنساء: دانشمندان، یہ تقوی سادات کا عزاخانہ فن تعمیر کے اعتبار سے دور دور شہرت رکھتا ہے۔نسیم امروہوی کے خاندان سے اس کا تعلق ہے۔

عزاخانہ مسماۃ میمونہ خاتون: حاجی سید معجز حسن نے ۱۹۰۲ء میں اپنی اہلیہ کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔

عزاخانہ نسابان: سادات امروہہ کے نساب سے تعلق رکھنے والی برادری کا یہ عزاخانہ ۱۲۶۱ھ میں تعمیر ہوا۔نقالوں کا عزاخانہ، محلّہ احمد نگر امروہہ کی نقال برادری بھی عزاداری کرتی ہے یہ انہوں نے ہی تعمیر کرایا ہے۔

ان چند عزاخانوں کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امروہہ کی عزاداری میں عورت مرد سادات اور دیگر اقوام سب ہی حصہ لیتے ہیں۔ محرم کا چاند نمودار ہونے کے بعد یہاں ہر طرف مرثیہ و سوز اور نوحہ وماتم کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔پورا ماحول سوگوار ہو جاتا ہے اور دس دن تک ہر عزاخانہ میں ایک مجلس مردانی یا زنانی ضرور منعقد ہوتی ہے جس کا سلسلہ نماز صبح کے بعد سے ایک بجے شب تک رہتا ہے۔ عشرہ محرم کے دوران عزاخانوں میں نوبت (نقارے اور نفیری) بھی بجتی ہے اور مجالس میں مختلف قسم کا تبرک بھی تقسیم ہوتا ہے۔

عزاداری کا دوسرا اہم رخ جلوس عزا ہے لیکن یہاں کے جلوس کی تاریخ سے مجالس کی تاریخ زیادہ قدیم

ہے- محرم کے جلوس ۳ محرم تا ۱۰ محرم بر آمد ہوتے ہیں- ۳ محرم سے ۸ محرم تک جلوس صبح ۹ بجے بر آمد ہو کر پورے شہر کا گشت کرتا ہوا ہر عزاخانے میں جاتا ہے اور وہاں مرثیہ اور ماتم ہوتا ہے- شام ۷ بجے اسی عزاخانے واپس آجاتا ہے جہاں سے صبح کو بر آمد ہوتا ہے-

ان جلوسوں میں سب سے آگے اونٹوں کی ایک طویل قطار ہوتی ہے- پہلے اونٹ پر سیاہ علم اور ۲ بڑے نقارے ہوتے ہیں باقی اونٹوں پر خمیری روٹی اور بسکٹ وغیرہ تقسیم کرتے ہوئے لوگ چلتے ہیں- اس تبرک کو یہاں کی اصطلاح میں توشہ کہتے ہیں- یہ کربلا کے بھوکے اور پیاسے شہیدوں کی یاد میں تقسیم کیا جاتا ہے- اونٹوں کی قطار کے پیچھے کربلا کے شہدا کے تابوتوں کی شبیہیں مختلف انداز کی ہوتی ہیں- شیر خوار علی اصغر کی یاد میں جھولا اور پالکی ہوتی ہے- اس کے علاوہ روشن چوکیاں گنبد نما لکڑی کی بنی ہوتی ہیں جو مغل آرٹ کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں- ان پر رسول اور آل رسول کے نام اور اشعار تحریر ہوتے ہیں- جلوس کے اس حصے کو آرائش کہتے ہیں- اس میں حسینی فقیر باجا بھی بجاتے ہیں اور یہ آرائش یہاں کی قاسمی برادری کے لوگ بڑی عقیدت سے اٹھاتے ہیں- روشن چوکی میں یا تو نوبت بجتی ہے یا تبرک تقسیم ہوتا ہے-

آرائش کے پیچھے حسینی باجہ بجانے والے نوجوان ہوتے ہیں جو نوحہ یا کلمہ لاالٰہ الا اللہ کا ساز بجاتے ہیں- حسینی بینڈ اس بات کی علامت ہے کہ کسی فرماں روا کی سواری آرہی ہے- حسینی باجے کے بعد مختلف قسم کے علم ہوتے ہیں ان میں چند علم بالکل منفرد انداز کے ہوتے ہیں جنہیں تلواروں کا علم کہتے ہیں- یہ علم چند ہتھیاروں کو ملا کر بنایا جاتا ہے یعنی ایک بڑے نیزے میں ایک کمان اور دو تیر باندھے جاتے ہیں اور پھر دونوں جانب سے دو تلواریں آویزاں ہوتی ہیں- ان مختلف علموں کے پیچھے ایک تابوت ہوتا ہے- تابوت کے پیچھے ذوالجناح (دلدل) امام حسین کے وفادار گھوڑے کی یاد میں گھوڑا ہوتا ہے جس پر سرخ دھبے کی سفید چادر پڑی ہوتی ہے- گھوڑے کو کئی کلو کے چاندی کے زیورات سے سجایا جاتا ہے- سب سے پیچھے عزاداران امام حسین سر و پا برہنہ قطار در قطار چلتے ہیں- ابتدائی دو تین قطاریں نوحہ پڑھتی ہیں باقی پیچھے قطاریں جن میں ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے جواب میں تین مرتبہ حسین حسین حسین کہتا ہے- یہ نوحہ امام حسین کے تعارف پر مشتمل ہے چند اجزا مندرجہ ذیل ہیں- شہید کربلا حسین، غریب نینوا حسین، امیر کربلا حسین، مظلوم کربلا حسین، وارث انبیاء حسین، سرور اولیاء حسین، عاشق کبریا حسین، بے یار و اقربا حسین، راحت جان فاطمہ حسین، گوہر تاج ہل اتیٰ حسین، بے مونس و آشنا حسین، قرۃ العین مصطفیٰ حسین، راکب دوش مصطفیٰ حسین-"

صرف ۵ محرم کا جلوس خاموش چلتا ہے ورنہ ۳ سے ۸ محرم تک یہی نوحہ پڑھتا ہوا جلوس آگے بڑھتا ہے۔ ۷ محرم کے جلوس میں علموں کی تعداد بہت ہوتی ہے۔

۳/ محرم کا جلوس: یہ جلوس "اولیاء کے علم" کہلاتا ہے۔ اس کا بانی ولی محمد خان عرف ولیا تھا۔ یہ جلوس عزاخانہ منچدرہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برآمد ہو رہا ہے۔

۴/ محرم کا جلوس: یہ عزاخانہ حرمت شاہ (فقیرنی) محلہ مچھر ہٹہ سے ۱۲۱۷ھ سے برآمد ہو رہا ہے۔ حرمت شاہ اس کی بانی تھی۔

۵/ محرم کا جلوس: یہ سقوں کا جلوس کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کی ابتدو وفاتی نام کے ایک سقے نے کی تھی۔ یہ عزاخانہ سددو سے برآمد ہوتا ہے۔ آج بھی اس جلوس میں سقہ برادری بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔

۶/ محرم کا جلوس: اس جلوس کی بانی دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمہ مسماۃ نورن تھیں دو سو سال قبل انہوں نے اس جلوس کی ابتدا کی تھی اور اس تاریخ پر حسینی لنگر بھی کرتی تھیں۔

۷/ محرم کا جلوس: اس جلوس کی ابتدا عزاخانہ کٹرہ غلام علی سے اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوئی تھی اسی دور میں یعنی عہد فرخ سیر بادشاہ میں اس عزاخانے کی تعمیر ہوئی تھی۔ اسی شب میں یہاں ایک جلوس مہندی بھی برآمد ہوتا ہے۔

۸/ محرم کا جلوس: یہ جلوس عزاخانہ چاند سورج سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بانی ایران سے آئے ہوئے شاہ مسکین نامی شخص تھے جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں امروہہ آئے تھے۔

امروہہ کی عزاداری کو ایک باضابطہ شکل اور انفرادی شان دینے کے بانی شاہ مسکین کے خلاف مخالفین نے قتل کا فتویٰ حاصل کر کے انہیں قتل بھی کر دیا تھا۔ ۸ محرم کو تمام بڑے عزاخانوں میں ماتم اور زنجیروں، چھریوں اور قمع سے ماتم کرتے ہیں جس کو تنظیمی شکل یہاں کی انجمن عباسیہ دیتی ہے۔ سیکڑوں نوجوان اس ماتم میں شرکت کرتے ہیں۔

۹/ محرم: امروہہ میں شہدائے کربلا کی یاد میں نذر و نیاز کا بہت زیادہ سلسلہ رہتا ہے۔ صبح سے ایک بجے دن تک مجالس اور پھر چار بجے عزاخانہ شمس علی خاں دربار کلاں میں مجلس کے بعد جلوس میں مناقب پڑھے جاتے

ہیں-نشانوں میں ایک تاریخی نشان جو حضرت زید شہید بن امام زین العابدین کے تبرکات میں سے ہے، وہ بھی بر آمد ہوتا ہے-۹ محرم گزرنے کے بعد شب عاشور یہاں کے تمام عزاخانوں میں مخصوص روشنی کا انتظام رہتا ہے اور تمام عقیدت مندان امام حسین بلا تفریق مذہب و ملت عزاخانوں میں جاکر تعزیے، علم، تابوت، ضریح اور تربتوں کی زیارت کرتے ہیں-بزرگ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے ہیں اور مرثیہ و سوز پڑھتے ہیں-

۱۰ر محرم: اس روز عاشورہ امروہہ میں تعزیوں، تابوت، تربت، ضریح، دلدل اور علم کے تقریباً ۲۵ جلوس صبح ۴ بجے سے شام ۷ بجے تک نکلتے ہیں اور ان کے یہاں بھی نذر و نیاز ہوتی ہے- آج کی تاریخ کے ہر جلوس کا یہاں الگ انداز الگ نوحہ اور الگ مرثیہ ہوتا ہے-ان جلوسوں کے بعد شام غریباں کی بڑی مجلس بے چراغ و بے فرش امامباڑہ میمونہ خاتون محلّہ مجاپوتہ اور امامباڑہ نورن محلّہ گذری میں ہوتی ہے-اس کے علاوہ امام باڑہ دوست علی و دربار شاہ ولایت اور دیگر امامباڑوں میں بھی شام غریباں کی مجالس ہوتی ہیں جن میں بے حد گریہ و زاری ہوتی ہے-۱۱ محرم کو دھرم شالہ میں حسین اور انسانیت پر سیمینار ہوتا ہے-

امروہہ کے تمام جلوسوں کی تواضع تبرکات سے دیگر اقوام بھی جلوس کے راستے میں جگہ جگہ کرتی ہیں اور اتحاد و امن، یگانگت و اخوت اور بھائی چارے کا ایک مثالی ماحول رہتا ہے-روایتی تہذیب کی آئینہ دار اس عزاداری کا شاعری، خطابت، ادب، ثقافت، تہذیب، تمدن اور آرٹ کے مختلف شعبوں کے ارتقا میں بڑا ہاتھ ہے-

جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تھا، جاگیر دارانہ نظام پر زوال آیا، جمہوری نظام قایم ہوا تو اس کا اثر امروہہ کے محرم پر بھی پڑا-عزاداری نے بھی جمہوری مزاج اختیار کیا-ایک انجمن تحفظ عزاداری نام سے قایم ہوئی جس نے محرم کے تمام انتظامات کو ایک دستور اور آئین کے تحت سنبھالا اور جو آج بھی مراسم عزا کے انتظامات کرتی ہے-اس کے پہلے بانی صدر سید مسعود حسن (وکیل) اور بانی سکریٹری علامہ شفیق حسن ایلیا (رئیس امروہوی اور جون ایلیا) کے والد ہوئے اور اب کئی سال سے اس کے صدر سید عسکری رضا ایڈوکیٹ ہیں- حقیقت یہ ہے کہ محرم کی اس انفرادی شان میں دیگر اقوام کے بھرپور تعاون کا بھی ہاتھ ہے اسی لیے یہاں میل ملاپ کا سب سے بڑا مظاہرہ بھی محرم کے موقع پر ہی ہوتا ہے کیونکہ امروہہ کی تمام اقوام امام حسین سے گہری عقیدت رکھتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ امروہہ کے ......... "ہر ذرے پر لکھی ہے تری داستاں حسین"

-☆☆☆-

# تعلیمی ادارے

مغربی یوپی کی قدیم بستی امروہہ کو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں اپنی گرانقدر علمی وادبی خدمات کے سبب ایک منفرد درجہ اور شناخت حاصل ہے۔ دراصل ہندوستان کی تہذیبی، علمی وادبی روایتوں کی پاسبان اس بستی میں ہمیشہ علم کا چرچہ رہا ہے۔ آج بھی اس چھوٹے شہر میں بے شمار تعلیمی ادارے ہیں۔ سنہ ۹۰-۱۹۸۹ء کی رپورٹ کے مطابق اس شہر میں اس وقت پچاس پرائمری اسکول، چھبیس پرائیویٹ اور سرکاری جونیئر اسکول، تین ہائیر سیکنڈری اسکول، سات انٹر کالج، تین گرلز انٹر کالج اور ایک ڈگری کالج ہے۔ اس کے علاوہ دینی تعلیم کے لیے کئی مدارس ہیں۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے بھی کئی ادارے ہیں۔ پہلے اس بستی کے چند قدیم مدرسوں کا ذکر کریں گے جو تاحال قائم ہیں یا جو زمانۂ قدیم میں قائم ہوئے تھے لیکن بعد میں بند ہو گئے۔

**مدرسہ معزّیہ کیقبادی مسجد (سدو):** "تاریخ امروہہ" کے مطابق امروہہ کا پہلا مدرسہ امروہہ کی مسجد کیقبادی (سدو) میں قائم کیا گیا تھا۔ مدرسہ کی تعمیر مسجد کے جنوب ومشرقی حصے میں کی گئی تھی۔ یہاں طلباء کے رہنے کے لیے کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ زمانۂ قدیم میں امروہہ جیسے چھوٹے شہر میں ایسے مدرسے سے ابتدا کی گئی تھی کہ جس میں باقاعدہ موجودہ دور کی طرح طلباء کے لیے ہوسٹل کا بھی انتظام تھا۔ افسوس کہ اب اس مدرسہ کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔

**مدرسہ مولوی دوست محمد:** غالباً ابتدائے عہد عالمگیری میں مولوی دوست محمد بن شیخ محمد شاکر نے محلہ قریشی میں قائم کیا تھا- مولوی دوست محمد کے بعد ان کے شاگرد رشید مولوی شیخ سلطان الدین محمد درس و تدریس میں مشغول رہے- مدرسے کے ہونہار اور غریب طلباء کو حکومت کی طرف سے وظائف بھی دیے جاتے تھے- اس مدرسے کا بھی اب کوئی نام و نشان باقی نہیں- صرف کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا بھی کوئی مدرسہ تھا جہاں کے طلباء کی حکومت وقت بھی امداد کیا کرتی تھی-

**مدرسہ میر کلو:** یہ مدرسہ اور ایک مسجد محلہ گذری میں میر اسد اللہ خان عرف میر کلو منصبدار پنج ہزاری نے سنہ ۱۱۷۲ھ میں اپنے مکانات کے متصل تعمیر کرایا تھا- اس مدرسے کے مصارف کے لیے موضع جھرتن میں قطعات وقف کیے گئے تھے-

**مدرسہ خورشید جاہی:** سید دوست علی (محلہ کٹکوئی) کے پوتے سید سعید حسن بن سید ظہور حسن کی تحریک سے سنہ ۱۲۹۹ھ میں مدرسہ خورشید جاہی قائم ہوا تھا- نواب خورشید جاہ بہادر اس زمانے میں حیدر آباد دکن سے شمالی ہند کی سیر و سیاحت کے لیے تشریف لائے تھے- اسی دوران کسی تقریب میں مراد آباد آئے تو امروہہ بھی تشریف لائے- ان ہی کے نام سے یہ مدرسہ موسوم ہوا تھا- سید سعید حسن مرحوم نے اجراء مدرسہ کے متعلق ایک پمفلٹ کے ذریعہ اہل شہر سے مشورہ بھی کیا تھا- یہ مدرسہ سید مرتضیٰ علی کے مکان واقع محلہ گذری میں قائم کیا گیا تھا- لیکن یہ بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا-

**تاج المدارس:** اکابر شہر کی تحریک پر محلہ چاہ شور میں ایک مدرسہ تاج المدارس قائم کیا گیا تھا- یہ مدرسہ مولوی سبحان علی (پیرزادہ) کے مکان میں قائم ہوا تھا- حکیم زین العابدین اس مدرسے کے منتظم اور شیخ عبداللہ و شیخ عظیم اللہ محلہ کالی پگڑی سکریٹری تھے- چند سال جاری رہنے کے بعد جامع مسجد محلہ ملانہ کے مدرسے میں ضم کر دیا گیا تھا-

**تاج المدارس ثانی:** شیخ عبداللہ مرحوم نے پہلے مدرسے تاج المدارس سے لاتعلق ہو کر تاج المدارس ثانی قائم کیا- یہ مدرسہ منشی امام الدین کے مکان واقع محلہ بادشاہی چبوترہ میں کھولا گیا- اس مدرسے کو نواب وقار الملک مرحوم کی سرپرستی بھی حاصل تھی- ابتدا میں اس مدرسہ نے اچھی ترقی کی، انگریزی تعلیم کا بھی اجراء ہوا- امروہہ گورنمنٹ اسکول کی حالت جب ایسی خراب ہوگئی کہ محکمۂ تعلیم نے اس کی اعلیٰ جماعتوں کے بند

کرنے کا قصد کیا تو نواب وقار الملک نے اس مدرسہ کا الحاق بھی سرکاری اسکول سے کردیا-نواب صاحب کی کوششوں سے اس سرکاری اسکول میں مسلمان طلباء کی مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا جس کے اخراجات نواب صاحب مرحوم ہی ادا کرتے تھے-

## مدرسہ عربیہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ

یہ دینی درسگاہ امروہہ کے ایک خوبصورت تالاب پانواڑی کے کنارے پر واقع ہے- تالاب کے دوسری جانب بجنور روڈ انتہائی پر فضا مقام سے گزرتی ہے- آج سے تقریباً سوا سو سال قبل عالم اسلام کی مشہور و معرف اس درسگاہ کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا-دار لعلوم دیوبند کے بعد ہندوستان کے چند منفرد اور گنے چنے عربی و دینی تعلیمی اداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے-ملک کے دور دراز علاقوں سے کسب علم کی خاطر طلباء یہاں آتے ہیں-اس ادارے میں طلبا کے لیے ہاسٹل کی سہولت بھی موجود ہے-روزانہ ڈھائی سو طلباء کے کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے-یہاں عربی، فارسی، فقہ، حدیث وغیرہ کی اعلی تعلیم دی جاتی ہے-یہاں تقریباً ۸۰۰ طالب علم دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں-

جامعہ تبلیغی سرگرمیوں کا بھی مرکز ہے-یہاں کے مدرسین حضرات تبلیغ کا کام مستقل طور پر انجام دیتے ہیں-یہاں ملک کے دوسرے شہروں سے بھی تبلیغی جماعتیں آتی ہیں-عارف باللہ حضرت الحاج مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعتِ تبلیغی رحمتہ اللہ علیہ بذات خود اس مدرسہ میں کئی بار تشریف لائے-رئیس المبلغین حضرت الحاج مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور مولانا الحاج محمد عمران خاں صاحب بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں-

جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ و عیدگاہ کی سالانہ روئیداد (۱۴۰۱ھ) میں ایک مضمون "تاسیس جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ" میں تحریر ہے کہ:

"امروہہ قدیم سے ایک تاریخی و علمی بستی رہا ہے یہاں عظیم تر مشائخ کرام و علمائے عظام، اعلیٰ ترین باکمال اطباء، شعراء اور علوم و فنون کے ماہر پیدا ہوئے...... معزالدین کیقباد کے عہد میں یہاں مدرسہ معزیہ قائم ہوا تھا جو مدتوں رہا-اس کے بعد سید محمد میر عدل بعہد اکبر بادشاہ اور دیگر علماء نے مختلف اوقات میں اس کی علمی ساکھ کو قائم رکھا-

ملا عبدالقادر نے اپنی تاریخ میں امروہہ میں اپنی تعلیم پانے کا ذکر کیا ہے پھر صوفیا و شیوخ نے جو علم ظاہر و باطن کے جامع تھے اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے آشنا تھے-اس سرزمین پر معارف و حقائق کے دریا

بہائے، یہاں کی خانقاہوں میں تصوف و معرفت کے سبق پڑھائے جاتے تھے اور ملک کے گوشہ گوشہ سے مریدین وزائرین کشاں کشاں یہاں آتے تھے۔ اس کے بعد یہاں تعلیمی حلقوں میں جمود طاری ہو گیا اور وہ پچھلی روایات افسانۂ کہن بن کر رہ گئیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس روحانی رشتہ کی بنا پر کہ ان کے سلسلۂ سلوک کے چند بزرگ یہاں محو استراحت ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے عزیز ترین شاگرد رشید جو کہ آسمان علم کے درخشندہ ستارے اور ان کے علوم و کمالات کے آئینہ تھے اسی مردم خیز سر زمین کے باشندے تھے امروہہ تشریف لاتے رہتے تھے۔ اس روحانی رشتہ کی وجہ سے حضرت مولانا نانوتویؒ نے یہاں کے بعض اہل علم و اہل خیر حضرات کو مشورہ دیا کہ اس سر زمیں سے حضرت شاہ عضد الدین صاحبؒ حضرت شاہ عبد الہادی صاحب اور حضرت شاہ عبد الباری صاحب نے اپنے فیوض و برکات کو تمام دنیا میں پھیلایا ہے کیوں نہ ایک دینی عربی درسگاہ قائم کی جائے چنانچہ حضرت مولانا کے ایما پر یہاں کے حساس مسلمانوں نے اس مدرسہ کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۰ھ میں اس مدرسہ میں عربی کی تعلیم شروع کی گئی اور ۱۳۰۳ھ میں ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہوی رحمتہ اللہ علیہ نے مراد آباد کے مدرسۂ شاہی سے تشریف لا کر اس مدرسہ کو چار چاند لگائے اور اس کے نظام کو باضابطہ و باقاعدہ بنایا، علم حدیث و تفسیر علم فقہ اصول فقہ غرضکہ معقولات و منقولات میں سے ہر ایک فن کی تعلیم دی جانے لگی۔

حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہوی نے تقریباً ۲۷ برس بعہدۂ صدر المدرسین و شیخ الحدیث اس درس گاہ میں درس دیا، ہزاروں تشنگان علوم اور مہمانان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امروہہ آئے اور اس چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوئے...... ان کے بعد ہندوستان کے ایک زبردست مفسر، محدث عارف باللہ حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی ہوئے...... ان دونوں اکابر کے علاوہ اس جامعہ میں دنیائے اسلام کے بزرگ ترین پیشوا قطب العصر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ نے بھی بایما حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ ایک عرصہ تک شیخ الحدیث و صدر المدرسین کی حیثیت سے تشنگان علوم نبویہ کو سیراب کیا۔

اس ادارے سے حصول علم کرنے والوں نے پورے ملک میں نہ صرف ادارے کا بلکہ امروہہ کا نام روشن کیا ہے۔ ان میں مفتی نسیم احمد فریدی صاحب جنہیں ۱۹۹۰ء میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے "عربی عالم کا ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ مولانا نسیم احمدؒ صاحب نے اس جامعہ میں بے انتہا خدمات انجام دیں۔ شہر اور دور دراز

شہروں اور ملکوں سے جو فتوے آتے ہیں ان کے جواب کے لیے جامعہ میں خاص شعبہ قائم ہے- یہ خدمت مفتی، مولانا نسیم احمدؒ صاحب فریدی (مرحوم) اعزازی طور پر انجام دیتے رہے-"

درسگاہ میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف بھی قائم ہے- مولانا سید طاہر حسن صاحب امروہوی شیخ الحدیث جامعہ و موصوف معارف مدینہ کو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے مقرر کیا گیا ہے-

**مدرسہ محمدیہ:** یہ مدرسہ حکیم عبدالسلام صدیقی نے محلہ قریشی میں سنہ ۱۳۰۰ھ میں قائم کیا تھا- لیکن زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا' چند سال کے بعد بند ہو گیا تھا-

**دارالعلوم عربیہ چلہ:** دارالعلوم چلہ امروہہ ایک قدیم دینی ادارہ ہے جسے ہر دور میں مشاہیر علمائے ہند کی سرپرستی حاصل رہی ہے- اس ادارے کو حضرت مولانا عبدالشکورؒ لکھنوی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ سیوہاروی، مولانا احمد حسنؒ امروہوی، مولانا سراج احمد خاں، مولانا انوار الحق، مولانا فضل احمدؒ وغیرہ جیسے جید علما کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا ہے جن کی سرپرستی میں اس ادارے نے ہزاروں تشنگان علوم کو فیضیاب کیا- مسجد چلہ' جس میں حضرت شاہ گدڑؒ نے چلہ کشی کی تھی، یہ ادارہ بھی دارالعلوم چلہ کہلانے لگا-

**دارالعلوم سید المدارس:** حکیم امجد علی مرحوم کی تحریک پر سنہ ۱۸۹۲ء کو قائم ہوا- ابتدا میں یہ ایک معمولی اردو مکتب کے طور پر قائم کیا گیا تھا لیکن دو سال میں اس مدرسے کو اتنی ترقی ہوئی کہ سنہ ۱۸۹۴ء میں علاوہ اردو کے فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی جاری ہوئی اور پھر عربی تعلیم کا بھی اضافہ ہوا اور اس طرح مستقل عربی مدرسہ میں تبدیل ہو گیا- اردو نصاب اسقدر رکھا گیا کہ اگر کوئی طالب علم یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گورنمنٹ اسکول میں داخل ہونا چاہے تو اس کو سہولت اور آسانی ہو-

مولوی سید نذر حسین مرحوم ساکن محلہ مچھرہٹہ نے اپنی کل معقول جائداد مدرسہ کے حق میں وقف کر دی' پھر ایک وقف مساۃ ہاجرہ خاتون زوجہ علی ابن الحسین ساکنہ محلہ شفاعت پوتہ کی طرف سے ایک وقف قائم ہوا اور اس طرح مدرسہ کی دائمی بقا کے اسباب فراہم ہو گئے- یہ مدرسہ اشرف المساجد شفاعت پوتہ سے ملحق اپنی ایک خوبصورت عمارت میں ایک عرصہ دراز سے قائم ہے- سنہ ۱۹۰۵ء میں سید المدارس کی عمارت کے افتتاح کے موقع سر جیمس لیٹوش بہادر سابق لیفٹی ننٹ گورنر صوبجات متحدہ نے فرمایا اور اسی موقع پر یہ حکم نافذ ہوا کہ سادات امروہہ کی تعلیم گاہ سے آٹھ لڑکے ہر سال گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ میں بلا فیس تعلیم پا سکیں گے-

دینوی تعلیم میں اس ادارے کو بلند مقام حاصل ہے-

عرصہ دراز تک اس مدرسے میں عربی کا قدیم نصاب پڑھایا جاتا رہا- پھر چند سال بعد الہ آباد بورڈ کے منظور شدہ امتحانات مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل اور سید الافاضل کی تیاری باقاعدگی سے کرائی جانے لگی-

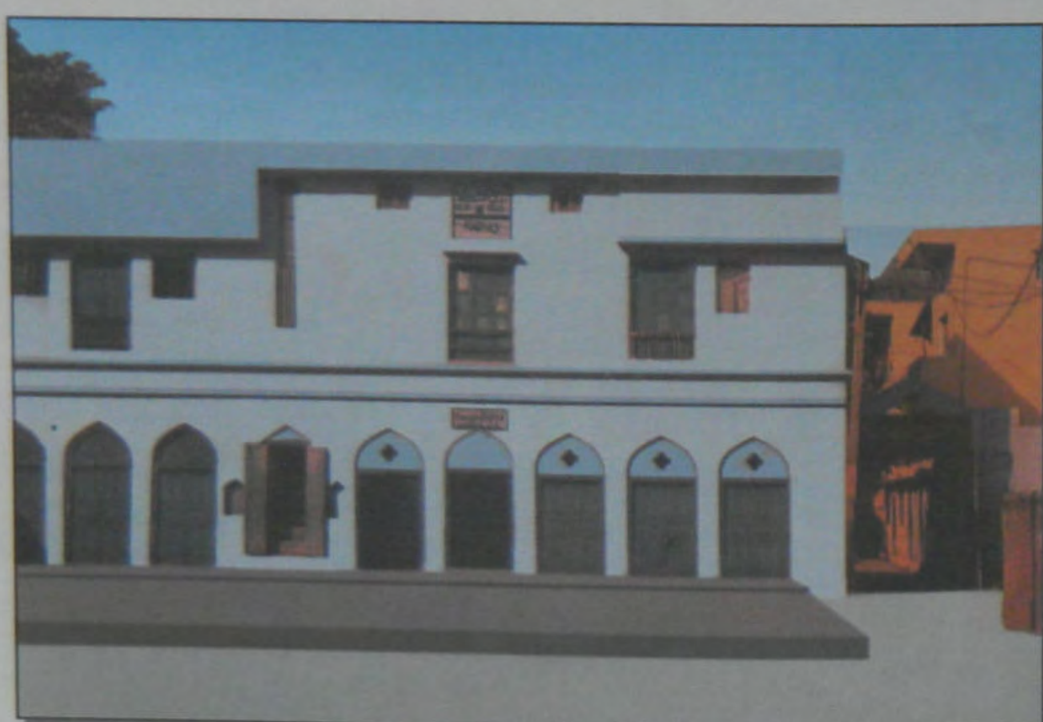
**نور المدارس:** تقوی سادات کی طرف سے محلہ دانشمندان میں اشرف المدارس کے نام سے اس مدرسہ کی ابتدا ہوئی- جناب نجم الملت اور مولانا سید نقی حسین کے توجہ مبذول کرانے پر حاجی نور الحسن نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ ادارے کو وقف کر دیا تھا اور اسی لیے اس ادارے کا نام اشرف المدارس کی بجائے نور المدارس کر دیا تھا- ابتدائی دور میں ادارے نے اپنے شعبے میں شاندار خدمات انجام دیں لیکن بعد میں شورشوں اور تنازعات کے سبب اس کا پہلے جیسا معیار باقی نہ رہا اور اب ایک عرصہ دراز سے یہ ادارہ تعلیمی میدان میں تقریباً خاموش ہے- اس کی عمارت بھی کھنڈر بن چکی ہے-

**ٹی-جی-سی-ہندو ہائی اسکول اینڈ جے-ایس-ہندو انٹر کالج:** سنہ ۱۹۱۲ء میں لالہ جھبالال نے اپنے چچا تیج رام کی یاد میں اسے تیج رام جگدیش کارونیشن پرائمری اسکول کے طور پر قائم کیا تھا- ۱۹۳۶ء میں اسے ہائی اسکول کی حیثیت حاصل ہوئی اور ۱۹۴۹ء میں اسے انٹر کالج کا درجہ حاصل ہوا- اس انٹر کالج کو بنانے میں ساہو جگدیش سرن کی کاوشوں کا بڑا دخل رہا اسی لیے اس کالج کا نام ان کے نام پر جگدیش سرن ہندو انٹر کالج رکھا گیا- اس کالج کا تعلیمی معیار ہمیشہ سے بلند رہا ہے- اس ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کرتے والوں کی بڑی تعداد پاکستان میں بڑے بڑے منصب پر فائز ہے-

**جگدیش سرن ہندو ڈگری کالج:** امروہہ کے مشہور و معروف رئیس اور سماجی کارکن آنجہانی ساہو جگدیش سرن کا نام اس شہر کی تعلیمی روایتوں کو فروغ دینے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے- علمی اور سماجی کاموں میں آپ کی جو خدمات ہیں انہیں اہل امروہہ کبھی نہیں بھول سکتے- ۱۹۶۰ء میں ان ہی کی کاوشوں سے ہندو ڈگری کالج کی بنیاد پڑی- فی الحال یہ شہر کا واحد ڈگری کالج ہے جو ہندو ڈانٹر کالج سے ملحق ایک بڑے قطعہ اراضی پر واقع ہے- کالج کی عمارت بہت خوبصورت ہے- اس کے اطراف میں خوبصورت لان، چمن اور کھیلنے کا میدان ہے- یہاں مخلوط تعلیم کا انتظام ہے اور آرٹ، سائنس و کامرس کے مختلف مضامین پوسٹ گریجویشن کی سطح تک پڑھائے جاتے ہیں-



مدرسہ عربیہ جامع مسجد امروہہ..........پانواڑی تالاب کے کنارے



دارالعلوم چلۃ......امروہہ



ہندو ڈگری کالج.............امروہہ



گورنمنٹ انٹر کالج............امروہہ

**امام المدارس انٹر کالج:** امروہہ میں تعلیم کے فروغ میں سادات امروہہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔امام المدارس انٹر کالج کی بنیاد بھی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر سادات امروہہ کے چند معزز حضرات کے ذریعہ ۱۹۰۲ء میں ابتدائی درجات کے مکتب کے طور پر ڈالی گئی تھی۔اس کے قیام میں جناب سید مقبول احمد، جناب سید محمد باقر اور مولوی سید محمد مصطفیٰ کی کاوشوں کا نمایاں دخل رہا۔اس ادارے کے سب سے پہلے ہیڈ ماسٹر محلہ گذری کے جناب سید نجم الحسن صاحب مقرر ہوئے۔۱۹۱۴ء میں مولوی سید مجتبیٰ اور خان بہادر سید نبی ہادی کی کوششوں سے یہاں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا اور یہ مڈل اسکول بنا۔سنہ ۱۹۱۹ء میں امام المدارس کو حکومت کی طرف سے منظوری ملی اور اس طرح امام المدارس کو اس شہر کا پہلا حکومت سے تسلیم شدہ نجی تعلیمی ادارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔۱۹۳۱ء میں سید تقی ہادی اس ادارے کے اعزازی منیجر مقرر ہوئے اور تقریباً نصف صدی تک اس عہدے پر فائز رہے۔ان کی انتھک کوششوں سے سنہ ۱۹۳۴ء میں یہ ادارہ ہائی اسکول ہو گیا اور سید محمد تقی مرحوم، جو سنہ ۱۹۲۵ء سے اس ادارے سے منسلک تھے، پرنسپل مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۶۰ء تک اس ادارے کی خدمات انجام دیتے رہے۔آپ انتہائی ذہین اور منکسر المزاج اور اپنے طالب علموں سے بے انتہا محبت کرنے والے استاد تھے۔

سید محمد تقی ہادی، جو اس ادارے کے منیجر تھے، سنہ ۱۹۵۲ء میں ایم ایل اے (ممبر اسمبلی) منتخب ہوئے تو آپ کی کاشوں اور اس ادارے کا تعلیمی معیار بلند ہونے کے سبب اس کو ترقی دے کر انٹر کالج کا درجہ دیا گیا۔امام المدارس انٹر کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس ادارے سے صادقین جیسی شہرۂ آفاق شخصیت، محمد حسین صدیقی جیسے قابل اور ذہین وکیل اور بہت سے طلباء شمع علم لے کر نکلے کہ چہار دانگ عالم میں اس ادارے اور اپنے وطن عزیز کا نام روشن کر دیا۔مجھ خاکسار کو فخر ہے کہ اپنی تعلیم کا آغاز میں نے یہیں سے کیا تھا۔یہ میری بدقسمتی تھی کہ جب نویں کلاس تک پہنچا تو وقت کے بے رحم حالات نے مجھے اس مادر علمی سے جدا کر دیا۔

**گورنمنٹ بوائز انٹر کالج:** گورنمنٹ بوائز اینڈ انٹر کالج جو ریلوے اسٹیشن کے قریب پر فضا مقام پر واقع ہے۔کالج کے عقب میں حضرت پیر شاہ ابن بدر چشت کا مزار ہے اور سامنے کھیلنے کا بڑا میدان ہے۔سنہ ۱۸۶۳ء میں اینگلو ورنا کیولر اسکول (Anglo vernacular School) کے طور پر اس عمارت میں قائم کیا گیا تھا جس میں آج کل کچہری کا دفتر واقع ہے۔سنہ ۱۹۱۸ء میں اسے ہائی اسکول کا درجہ دیا گیا۔اس کے بعد

ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑا قطعہ اراضی لیا گیا جس پر نئی عمارت تعمیر کی گئی اور اسے وہاں منتقل کر دیا گیا - حکومت کی طرف سے قائم کردہ یہ پہلا ہائی اسکول ہے - اس ادارے کا تعلیمی معیار ہمیشہ بہت بلند رہا ہے - ۱۹۵۵ء میں یہ انٹر کالج بنا اور سائنس کے درجات کی ابتدا ہوئی - لقا علی اور جمیل احمد صدیقی نے اس کالج کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا - کپور صاحب، ماسٹر مختار حسین اور قمر علی جعفری کے عہد پرنسپل شپ میں اس ادارے نے کامیابی کی نئی منازل طے کیں اور اسے معیار تعلیم میں ایک بلند مقام تک پہنچایا - یہ امروہہ کا واحد انٹر کالج ہے کہ جہاں ہاسٹل کا بھی انتظام ہے -

**عبدالکریم خاں انٹر کالج:** کریم خاں کالج بجنور روڈ پر ایک انتہائی پرفضا مقام پر واقع ہے - اس کے تین طرف بزرگان دین کے مزارات ہیں اور سامنے پانواڑی تالاب ہے - بیسویں صدی میں امروہہ میں بیڑی کی صنعت کو فروغ دینے والوں میں عبدالکریم خاں صاحب پیش پیش تھے - جنہیں تعلیم کے فروغ میں خاص دلچسپی تھی - اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے بھی امروہہ کے دیگر تعلیمی اداروں کی خدمت کرتے رہے - عبدالکریم خاں نے چھٹی دہائی میں اس ادارے کی بنیاد ڈالی - اس ادارے کی ابتدا سنہ ۱۹۵۸ء میں بہ حیثیت جونیئر اسکول اور پھر سنہ ۱۹۶۵ء میں ہائی اسکول سے ہوئی - ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں اسے انٹر کالج کا درجہ حاصل ہوا - اس کالج میں آرٹس، کامرس اور سائنس کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے - اس وقت اس کالج میں تقریباً ۱۳۰۰ طلباء زیر تعلیم ہیں - اس کالج کے منیجر جناب محمد ایوب صدیقی ہیں جن کی دلچسپیوں سے اس کالج کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے - یہ کالج بجنور روڈ پر ایک پرفضا مقام پر واقع ہے - اس کے اطراف میں اولیاء کرام کے مزارات، آموں کے خوبصورت باغات اور پانواڑی تالاب ہے - کالج کی خوبصورت عمارت ۲۵ کمروں اور ایک بڑے ہال پر مشتمل ہے -

**آل احمد گرلز انٹر کالج:** محلہ کٹکوئی کے سید آل احمد نقوی کی تعلیم نسواں کی تحریک کے نتیجے میں سنہ ۱۹۲۸ء میں انجمن اصلاح معاشرت نے اپنے سالانہ جلسے میں جو ماسٹر مختار حسین نقوی کی زیر صدارت ہوا اور جس میں محمد جعفر جعفری، معزز حسین، منتجب حسین، سجا لحسنین، تقی ہادی اور مولوی بشیر حسین جیسے افراد شامل تھے تعلیم نسواں کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے سارے ممبران نے منظور کیا - چنانچہ ۱۹۳۲ء میں تعلیم نسواں کے لیے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جسے آل احمد صاحب کے نام سے ہی منسوب کیا گیا - اس ادارے



امام المدارس انٹر کالج..............امروہہ



ہندو انٹر کالج..............امروہہ




کریم خاں انٹر کالج............امروہہ



کندن ماڈل انٹر کالج............امروہہ

کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے آلِ احمد صاحب نے اپنی کچھ جائداد بھی اس ادارے کو وقف کر دی۔ شہر میں تعلیم نسواں کے فروغ میں اس ادارے کا بہت اہم رول رہا ہے۔ آج بھی تقریباً ڈیڑھ ہزار طالبات یہاں مختلف مضامین کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

**گورنمنٹ گرلز کالج:** حکومت اتر پردیش کی طرف سے سید محمد تقی ہادی صاحب مرحوم سابق (ایم-ایل-اے) کی جدو جہد اور کاوشوں کے سبب یہاں گورنمنٹ گرلز کالج کھولنے کی منظوری دی گئی۔ کالج کے لیے زمین کا مسئلہ درپیش ہوا تو جناب ساہو جگدیش سرن صاحب نے، جو تعلیم کے فروغ میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اس ادارے کو ایک بڑا قطعہ اراضی وقف کر دیا۔ ان ہی کی وقف کی ہوئی زمین پر یہ کالج قائم ہے۔ اس کالج میں سائنس اور حساب جیسے مضامین کی اعلیٰ تعلیم کا عمدہ انتظام ہے۔

**کندن ماڈل انٹر کالج:** اس شہر میں تعلیمی ادارے قائم کرنے والی شخصیات میں ایک ممتاز شخصیت سیٹھ پورن چند کی ہے۔ پورن چند کا، جو شگر مل کے مالک سیٹھ کندن لال کے فرزند ہیں، شہر کے نامور رئیسوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ نے اپنے والد صاحب کی یاد میں چودھری بسنت سنگھ (سیانے والے) کے مالی تعاون سے اس کالج کو قائم کیا۔ کالج کی عمارت نہایت خوبصورت ہے۔ آج اس کالج میں تقریباً ایک ہزار سے زیادہ طلباء مختلف مضامین کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

**شرمادیوی گرلز کالج:** تعلیم نسواں کا یہ ایک اور اہم انٹر کالج ہے۔ شرمادیوی گرلز کالج کو قائم ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن اپنے تعلیمی معیار میں اسے بلند مقام حاصل ہو چکا ہے۔

**فیض عام انٹر کالج:** چند سال قبل شہر کی چند سرکردہ مسلم شخصیات نے شہر کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس ادارے کی بنیاد ڈالی۔ انتہائی قلیل مدت میں اس ادارے نے بڑی ترقی اور کئی منازل طے کیں۔ ابتدائی درجات سے شروع ہو کر آج یہ انٹر کالج بن چکا ہے۔

**مرزا قیصر مسلم انٹر کالج:** یہ کالج فی الحال محلہ سدو میں ایک رہائشی مکان میں قائم ہے۔ کالج کی عمارت کے لیے قطعہ آراضی لے لیا گیا ہے اور تعمیر کے بعد نئی عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔ جناب شمس الحسن اس ادارے کے صدر ہیں جو اس کی ترقی اور تعلیمی معیار بلند کرنے میں رات دن کوشاں ہیں۔

**شری سناتن دھرم سنسکرت ودیالیہ:** سنسکرت تعلیم کے لیے بھی ایک تعلیمی ادارہ شری واسودیو تیر تھ میں واقع ہے۔ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے بھی پرانا ہے جہاں سنسکرت میں انٹر میڈیٹ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں جیوتش (علمِ نجوم) کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ علم نجوم کی تعلیم میں مسلمان بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ادارہ یو۔پی۔ کے سمپورنانند وشوودیالیہ بنارس سے منظور شدہ ہے۔ اس ادارے میں قرب و جوار کے اہل ہنود بڑی تعداد میں مذہبی تعلیم اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

-☆☆☆-

# مندر

**واسودیو مندر:** امروہہ کا جنوب و مغربی گوشہ ایک انتہائی پر فضا، سرسبز اور انتہائی دلکش مقام ہے۔ اسی گوشے میں گھنے اور تناور درختوں کے بیچ ایک خوبصورت پارک ہے جو بانسدیو پارک کے نام سے مشہور ہے۔ اسی پارک میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کے کناروں پر ہزاروں سال پرانے درخت ہیں۔ تالاب میں نیچے اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ تالاب کے مغربی کنارے پر ایک عالی شان واسودیو مندر ہے۔ بیچ تالاب میں ایک بہت اونچے پلیٹ فارم پر بھگوان شیو کی مورتی ہے۔ اس مورتی تک پہنچنے کے لیے تالاب پر دو طرف سے پُل بنے ہوئے ہیں۔ تالاب کے شمال میں ایک قدیم قدآور درخت کے سایہ میں میرا کا دربار (مندر) ہے۔ یہاں ہزاروں لوگ اپنی مرادیں مانگنے آتے ہیں۔ میرا کے نام سے امروہہ صدیوں سے ہندوستان کا شہرت یافتہ شہر ہے۔ میرا کے دربار کے برابر میں کالی دیوی مندر ہے۔ ان عمارتوں کے علاوہ واسودیو تیرتھ پر تلسی اذیان بھی بنا ہوا ہے۔ اس میں مہاکوی گوسوامی تلسی داس جی کی ایک بہت بڑی مورتی ہے جو ایک اونچے گول پلیٹ فارم پر بنی ہوئی ہے۔ اس ادیان کے چاروں طرف کھلا صحن ہے جس کے چاروں طرف تین فٹ اونچی پختہ فصیل ہے۔ صحن میں لال پتھر کا فرش ہے۔ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے سنگ مرمر کے بینچ رکھے ہوئے ہیں۔ تیرتھ پر ہواخوری کے لیے دو پارک ہیں جو مختلف پھول پودوں سے آراستہ ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے کھیل کے میدان بھی ہیں۔ یہاں پر ایک سنسکرت پاٹھ شالہ اور واسودیو تیرتھ کے نام سے ایک ہائی اسکول بھی ہے۔ شام ہوتی ہے تو پورا علاقہ مندر کی گھنٹیوں اور ناقوس کی آوازوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ یہ ایسا خوبصورت اور دلفریب مقام ہے جہاں صبح سے شام تک بیٹھنے کے بعد بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، بس دل چاہتا ہے کہ یہیں بیٹھے رہیں۔

حال ہی میں جب میں امروہہ گیا تو میری ملاقات پروفیسر پنڈت رام ناتھ صاحب سے ہوئی جو مجھے بانسدیو پارک اور واسودیو مندر دکھانے لے گئے۔ واسودیو مندر کے بارے میں انہوں نے بتایا:

"یہ وہ مقام ہے جہاں اب سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل جناب کرشن پانڈو کے بن واس کے دوران ان سے ملنے آئے تھے۔ اس وقت یہاں ایک سرودر (جھیل) جس کے چاروں طرف کافی دور تک پھیل

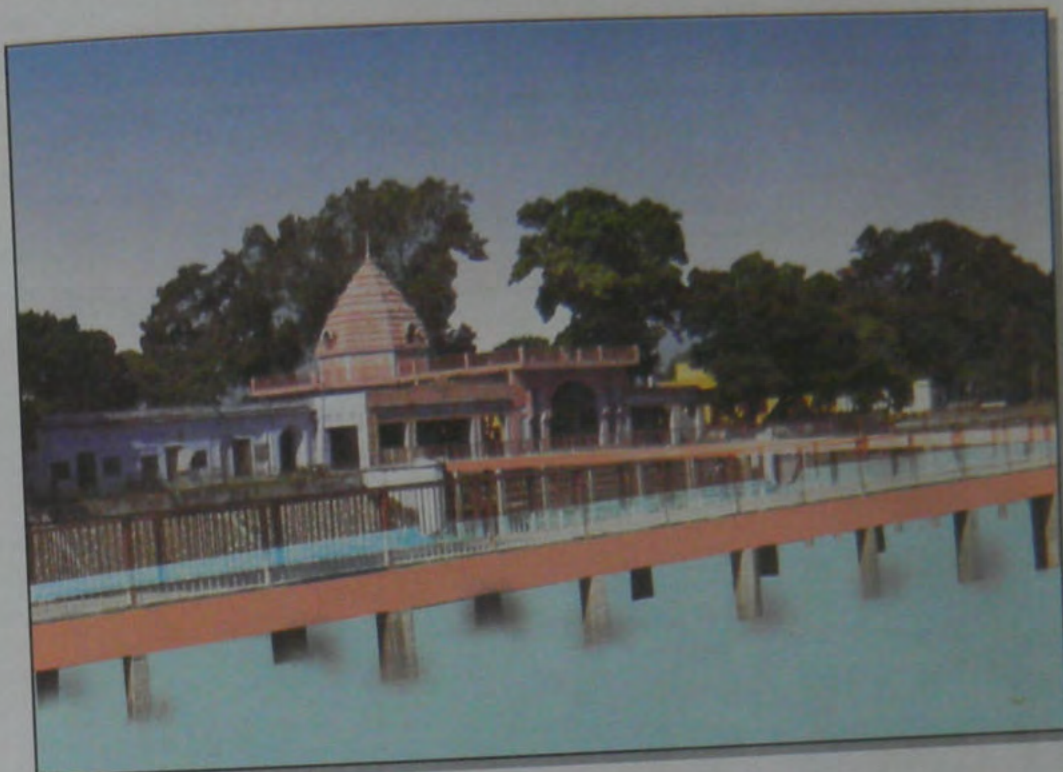
، پلکھن اور برگد وغیرہ کے جنگلی درخت کثیر تعداد میں کھڑے ہوئے تھے-شری کرشن کی آمد کے بعد یہ سرو ور شری واسودیو سرو ور کے نام سے مشہور ہوتا چلا گیا کیوں کہ شری کرشن کا ایک نام واسدیو بھی ہے- تقریباً نو صدی قبل مسیح اندرپرستھ (دہلی) کے راجہ امر چوڑھ (راجہ امر جودھ) نے امروہہ شہر آباد کر کے اسی مقام پر شری واسدیو سرو ور کے غربی کنارے پر پیپل اور برگد کے آپس میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دو درختوں کے نیچے ایک شیوالہ بنوایا تھا-زمانہ گزرتا گیا اور یہاں دیگر اشخاص بھی جملہ مندر، شیوالے، کمرے اور دالان وغیرہ تعمیر کرتے رہے-ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے زمینیں خرید کر مندر کو دان کیں- آج یہ کئی ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا امروہہ شہر میں ایک ایسا تیرتھ ہے جس کی شہرت دور دور تک ہے- تالاب کے مغرب میں شوالہ وٹیشور ناتھ ہے-اس شوالے میں رادھا، کرشن، رام سیتا شیو پاروتی، درگا اور ھنومان وغیرہ مختلف دیوی، دیوتاؤں کی سنگ مرمر کی مورتیا ں ہیں-فرش کے بیچ میں راجہ امر چوڑھ کا ستھاپت کرایا ہوا شیولنگ ہے جسے آٹھ دھاتوں سے بنی ہوئی چادر سے ڈھک دیا گیا ہے-''

میرا کبھی کسی مندر میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا-میرا خیال تھا کہ شاید مندر میں کسی مسلمان کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی-لیکن اکتوبر ۹۷ء کو امروہہ گیا تو بھونیش شرما اور پنڈت رام ناتھ مجھے اس مندر کے اندر بھی لے گئے- مندر کے اندر لے جانے پر میں بڑا حیران ہوا- مجھے وہاں بڑا لطف آیا-وہاں مندر کی گھنٹیاں لٹکی ہوئی دیکھیں تو ان کی آوازیں 'جو بچپن میں سنا کرتا تھا کانوں میں گونجنے لگیں-ان آوازوں کو سننے کے لیے دل بیتاب ہو گیا تو فوراً ایک گھنٹی کو خوب بجاتا رہا-مندر میں داخل ہوتے ہی سامنے بڑی بڑی مورتیاں بڑے خوبصورت انداز میں رکھی ہوئی تھیں-اس وقت مندر میں آرتی (عبادت) ہو رہی تھی- مندر دیکھ کر جب ہم جانے لگے تو پرشاد (تبرک) کے لیے روک لیا گیا- آرتی ختم ہونے پر پرشاد سے ہماری تواضع کی گئی-

**مندر شری راماتج کوٹ:** یہ مندر امروہہ کے پر رونق علاقے محلّہ کٹرہ غلام علی میں واقع ہے-اس مندر کی تعمیر عہد مغلیہ میں ہوئی تھی-مندر کا اندرونی حصہ انتہائی خوبصورت ہے-مندر کے صحن میں ایک چھوٹا سا خوبصورت مندر ہے جسے ہنومان جی کا مندر کہا جاتا ہے-کہتے ہیں کہ اس مندر کی تعمیر شریمتی شبو دیوی زوجہ لالہ نند کشور نے کرائی تھی جو متقی اور عبادت گزار خاتون تھیں اور ہر وقت بھگوان کی پوجا میں مشغول رہتی تھیں-انہوں نے مذہبی تعلیم ایک پنڈت بلدیو داس سے حاصل کی تھی- پنڈت گل شنکر نارائن اس مندر کے



تلسی داس کا مجسمہ ........ بانسدیو پارک



واسودیو مندر.................بانسدیوپار



آریہ سماج.................مندر

متولی ہیں- پنڈت گل شنکر نارائن سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بہت ہی خوش مزاج پایا- انہوں نے اپنی عبادت گاہ میں مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور میری بڑی خاطر تواضع کی- یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مندر میں پوجاپاٹ سنسکرت زبان میں ہوتی ہے-

**مندر بابا گنگا ناتھ:** امروہہ کے گنجان علاقے میں 'جو جاٹ بازار کے نام سے موسوم ہے' سنت بابا گنگا رام جی کا قدیم مندر ہے- شہر اور دور دراز میں آپ گنگا ناتھ نام سے مشہور ہیں- کئی صدی پہلے پنڈت گنگادھیان نے یہاں ایک شیوالہ تعمیر کرایا تھا- یہ عمارت بہت بڑے رقبہ پر بنی ہوئی ہے- روایت ہے کہ کچھ زمین سید دوست علی ساکن محلہ کنکوئی نے بھی دان کی تھی- مندر میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب پیپل کا ایک پرانا درخت ہے اس کے مقابل دوسری طرف ایک خوبصورت باغیچہ ہے- اس کے بعد پنڈت گنگادھیان جی کا تعمیر کردہ پرانا شوالہ ہے جس کے برابر میں بابا گنگا ناتھ جی کی سادھی ہے جو زندہ سادھی بتائی جاتی ہے- اس سادھی کے پیچھے باہر کی طرف ایک مورتی دیوار میں بہت ہی خوبصورت انداز میں نصب کی گئی ہے-

مندر کے ایک حصے میں ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں الگ الگ سنگھاسنوں پر رکھی ہوئی ہیں- اس ہال سے متصل ایک اور چھوٹا ہال ہے جس میں باباجی کا دھونا ۲۴ گھنٹے جلتا رہتا ہے اور اس کے برابر میں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر پھول اور چادریں چڑھائی جاتی ہیں- دُرگا دیوی، گایتری، لچھمی وغیرہ کی مورتیاں ایک الگ ہال میں رکھی ہوئی ہیں- اس مندر میں ست سنگ بھون بھی بنا ہوا ہے- صبح و شام دونوں وقت مندر میں آرتی ہوتی ہے جس میں اہل محلہ اور شہر کے دوسرے محلوں کے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں- آرتی کے بعد چرن آمرت اور پرشاد تقسیم کیا جاتا ہے-

**مندر ساہو کی نندن:** یہ خوبصورت مندر محلہ کوٹ میں واقع ہے- امروہہ کے ایک مخیر زمیندار ساہو دیوکی نندن جی نے تعمیر کرایا تھا- اس مندر میں ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سنگِ مرمر کی چار فٹ اونچی چوکیوں پر رکھی ہوئی ہیں- امروہہ میں تین گنبد والا یہ واحد مندر ہے- صبح و شام پوجا ہوتی ہے- یہیں سے ایک روایتی جلوس رتھوں کو سجا کر نکلتا ہے-

**آریہ سماج:** یہ ہندوؤں کا ایک مندر ہے اور اس کے اندر بہت سے کمرے بھی بنے ہوئے ہیں- ایک اچھا بڑا صحن ہے جہاں بڑے بڑے ہندو عالم آیا کرتے تھے اور ہندو دھرم پر لیکچر ہوا کرتے تھے- (مولوی) رام چندر

ان ہندو عالموں میں سے تھے جنہوں نے قرآن اور اسلامی تاریخ کا خصوصیت سے مطالعہ کیا تھا- موصوف اکثر سنی اور شیعہ علماء سے علمی مباحث پر بحث و مناظرے بھی کیا کرتے تھے- ان کا ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے- ان کے بحث و مباحثہ سے کبھی مذہبی رواداری متاثر نہیں ہوئی-

**گردوارے:** امروہہ میں سکھ مذہب کے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے- یہی وجہ ہے کہ امروہہ میں ان کے صرف تین گردوارے ہیں- ان گردواروں میں ایک بانسدیو پارک' دوسرا اسٹیشن روڈ اور تیسرا گردوارہ سنت ہلاس داس جی کی سادھی کے قریب ایک کمرہ میں واقع ہے-

**بائیں کا کنواں:** امروہہ کے شمال و مغرب میں نوگانواں سادات جاتے ہوئے دوڈھائی میل کے فاصلے پر دائیں جانب ایک فرلانگ پر واقع ہے- امروہہ کا یہ تاریخی اور قدیم ترین کنواں عجیب وغریب طرز کا بنا ہوا ہے جو خاصے بڑے رقبہ پر واقع ہے- اس کنویں کے اندر مشرق میں تقریباً بارہ فٹ چوڑی سیڑھیاں ہیں جو کنویں کی سطح آب تک جاتی ہیں- کنویں کے چاروں طرف اوپر نیچے بارہ دری نما کمرے اور راہ داریاں بنی ہوئی ہیں جن میں اندھیرے سے خوف آتا ہے- لیکن یہ امروہہ کی قدیم طرز تعمیر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے- اس کنویں کی ساری تعمیر ڈریسنگ اسٹون سے کی گئی ہے- اب یہ کنواں خشک ہو چکا ہے- یہاں پر ہر سال چھڑیوں کا میلہ لگتا ہے- مولانا محمود احمد عباسی کی تالیف "تاریخ امروہہ" کے مطابق یہ کنواں راجہ کرپاناتھ کے باغ کا ہے جو کائستوں کے سورج دھج خاندان سے تھا-

**گنگا نہانا:** امروہہ شہر کے اطراف کئی ندیاں اور سب سے بڑا دریا گنگا ہے- گنگا امروہہ سے دہلی جاتے ہوئے تقریباً بیس پچیس میل کے فاصلے پر گڑھ مکتیسر کے پاس بہتی ہے- یہ ہندوؤں کا انتہائی متبرک مقام ہے- نومبر کے مہینہ میں ہر سال ملک کے دور دراز علاقوں کے ہندو گنگا کے دونوں کناروں پر جمع ہوتے ہیں اور صبح ہی صبح گنگا میں نہاتے ہیں جس کو گنگا اشنان کہتے ہیں- ہندو مذہب کے مطابق گنگا میں نہانے سے انسان پوتر (پاک) ہو جاتا ہے اور اس کے سارے پاپ (گناہ) دھل جاتے ہیں- اس موقع پر ہر سال یہاں ایک بہت بڑا میلہ بھی لگتا ہے- اس میلے میں امروہہ کے لوگ بھی اپنی مصنوعات، جن میں مٹی سے بنے ہوئے کھلونے، برتن، لکڑی کے ڈھول، ڈھولک، اور دیگر سامان، لیجا کر فروخت کرتے ہیں-

-☆☆☆-



ہنومان جی کا مندر رامانج کورٹ کٹرہ غلام علی



مندر ساہو کی نندن محلہ کوٹ



سکھوں کا گردوارہ........ بانسدیو پارک



مندر بابا گنگا ناتھ    جاٹ بازار



ہندوانی شادی

# ثقافتی پس منظر

امروہہ ایک ایسی بستی ہے جہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ہی مذاہب کے لوگ صدیوں سے آباد ہیں- یہاں تمام مذاہب کے ماننے والے اسقدر پیار و محبت سے رہتے ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی- سب ایک دوسرے کے مذہب کا بڑا احترام کرتے ہیں اور کسی قسم کا کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا- امروہہ میں رمضان المبارک کا بھی بڑا احترام کیا جاتا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ رمضان المبارک میں ہندو بھی اپنے گھروں پر روزہ افطار کراتے ہیں- یہاں ایسے ہندو شاعر بھی ہیں جو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیں بھی پڑھتے ہیں- اتنے مختلف مذاہب کے لوگوں کا اتنی محبت و پیار سے رہنا اس شہر کے علاوہ کہیں نہیں ملتا- بعض اوقات تو یہاں کے لوگوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں- واقعی اگر یہ کہا جائے کہ تہذیب و تمدن، اور ثقافت میں امروہہ اپنا اعلیٰ اور ایک منفرد مقام رکھتا ہے تو بے جانہ ہو گا- ایسی تہذیب، محبت و پیار دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہاں کے ہندو، مسلمان بزرگوں کی دی ہوئی تعلیم اور بزرگان دین و اولیائے کرام جو یہاں آسودہ خاک ہیں ان کا فیض ہے- یہاں پر ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے تہوار بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں-

## مسلمانوں کے تہوار

**عید الفطر:** مسلمانوں کا یہ تہوار قمری کلینڈر کے لحاظ سے یکم شوال کو منایا جاتا ہے- اس جشن روحانی کی ابتدا

سنہ ۲ھ سے ہوئی- عید کا جشن 'فطرہ اور زکوۃ سب ایک مخصوص نظام زندگی پالینے کی راہیں ہیں- عید سے قبل رمضان المبارک کے مہینے میں اپنی کمائی ہوئی دولت پر ڈھائی فیصد زکوۃ نکالکر غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے- عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے خاندان کے ہر بالغ نابالغ فرد کی طرف سے ایک مقررہ فطرہ کی رقم خیرات کی جاتی ہے- اسی لیے اس تہوار کو عید الفطر کہتے ہیں- اس دن صبح کو پورے شہر کے سنّی مسلمان بیرون شہر عید گاہ میں جمع ہو کر عید کی نماز ادا کرتے ہیں اور اسی طرح اہل تشیع اشرف المساجد شفاعت پوتہ میں نماز عید ادا کرتے ہیں- شہر کے مختلف علاقوں میں میلے لگتے ہیں- دوست احباب، عزیز واقارب ایک دوسرے کے گھر جاکر بغلگیر ہوتے ہیں اور شیر یلی سے تواضع کی جاتی ہے- دوستوں اور عزیزوں کو عید کی مبارکباد کے کارڈ بھیجے جاتے ہیں- بچوں میں عیدی تقسیم کی جاتی ہے- ہندو دوست مسلمان دوستوں کو عید مبارک کہنے ان کے گھر آتے ہیں-

**عید الاضحیٰ:** یہ تہوار ہر سال ذالحج کی ۱۰ تاریخ کو منایا جاتا ہے- اس کی ابتدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے وقت سے ہوئی جب انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی قربانی بحکم اللہ تعالیٰ پیش کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرئیل نے دنبہ رکھدیا- عید الفطر کی طرح اس دن نماز عید الاضحیٰ کے بڑے بڑے اجتماع ہوتے ہیں اور نماز کے بعد سنت ابراہیمی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حلال جانور (چوپایۓ) قربان کیے جاتے ہیں- قربانی کے جانور کا گوشت غربا مساکین اور عزیزوں میں تقسیم کیا جاتا ہے-

**شب برات:** یہ تہوار تمام مسلمان ۱۴ر شعبان کو بڑے اہتمام سے مناتے ہیں- سارے مسلمان پوری رات اللہ کی عبادت میں گزارتے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں کل عالم کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں- اس روز شام کو کئی قسم کے حلوے پکائے جاتے ہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر اور غریبوں میں تقسیم کیئے جاتے ہیں- چھوٹے بچے رات کو آتشبازی سے لطف اندوز ہوتے ہیں-

## جلسے:

**جلسہ عید میلاد النبیؐ:** عید میلاد النبیؐ کا جلسہ سرور کائنات حضرت محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وصلم کی ولادت کے موقع پر منعقد ہوتا ہے- رات کو جلوس نکلتا ہے اور گھروں میں روشنی کی جاتی ہے-

**جلسہ حضرت ابو بکر صدیقؓ:** یہ سالانہ جلسہ محلّہ قریشی میں باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے-

**جلسہ حضرت عمر فاروقؓ:** یہ جلسہ ہر سال یوم فاروق اعظمؓ کے موقع پر محلہ ترپولیہ میں بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوتا ہے۔

**مجالس:** امروہہ کی عزاداری دور دور تک مشہور ہے۔ محرم کے مہینہ میں تمام امام باڑے بڑے اہتمام سے آراستہ کیے جاتے ہیں اور مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ جن میں سنی شیعہ سب ہی شرکت کرتے ہیں۔ مجلس کے اختتام پر تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ صفر کی بیسویں تاریخ کو تعزیہ اٹھایا جاتا ہے۔

**محفلیں:** امروہہ میں آئے دن جشنِ میلاد شریف، مشاعرے، نعت اور قوالیوں کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ ہر سال سولہ سترہ منقبتی مشاعرے ہوتے ہیں۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد ماسٹر عبدالرؤف کے گھر نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے جو تقریباً ۶۰ برس سے متواتر ہوتا چلا آرہا ہے۔ ماسٹر صاحب کے انتقال کے بعد اب انکے نیک فرزند جناب احمد حسین سیفی اس کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں۔

**چار بیت:** امروہہ کے ادبی ذوق کی تسکین کا قدیم ذریعہ چار بیت کی محفلیں بھی ہیں۔ یہ محفلیں امروہہ کے دیوان خانوں کے علاوہ آموں کے باغات میں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ اس محفل میں کوئی ساز وغیرہ نہیں ہوتا بلکہ ساز کی جگہ صرف دف بجایا جاتا ہے۔ چار بیت سنانے والی پارٹیوں کے درمیان بڑے دلچسپ مقابلے ہوتے ہیں۔ جب ایک پارٹی کسی قافیہ ردیف میں شعر سناتی ہے تو فوراً ہی دوسری پارٹی اسی قافیہ ردیف میں اپنا شعر سنا کر پہلی پارٹی کے شعر کا جواب دیتی ہے۔ عوام کی عدم دلچسپی کے باعث ان محفلوں کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے۔

**عرس حضرت شاہ ولایتؒ:** انیسویں سے اکیسویں رجب تک تین دن بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے اور میلہ بھی لگتا ہے۔ اس عرس کی خصوصیت یہ تھی کہ اہل ہنود بھی ایک مقررہ دن لنگر کا اہتمام کرتے چلے آئے ہیں۔

**عرس حضرت شاہ ابنؒ:** ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ سے پندرہ تاریخ تک بڑا شاندار عرس ہوتا ہے۔ دن میں آپ کی خانقاہ اور رات کو مزار پر قوالی ہوتی ہے۔ خانقاہ اور مزار پر میلہ بھی لگتا ہے۔ اب یہ عرس پاکستان میں بھی بڑی شان سے منعقد ہوتا ہے۔

**عرس شاہ عبدالہادیؒ:** ماہ شوال میں ایک تاریخ سے آٹھ تاریخ تک عرس ہوتا ہے۔ یہ عرس کراچی

میں بھی منعقد کیا جاتا ہے۔

**گیارہویں شریف:** گیارہ ربیع الثانی کو محلہ چاپلہ میں حضرت غوث الاعظم محی الدینؒ جیلانی کا عرس بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتا ہے۔

## ہندوؤں کے تہوار

**سلونو یا راکھی بندھن:** اس تہوار میں بہن اپنے بھائی کی کلائی پر راکھی باندھتی ہے۔ راکھی بندھن کا یہ خوبصورت تہوار ساون کی آخری تاریخوں میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر امروہہ میں واسو دیو پارک میں ایک میلہ بھی لگتا ہے جہاں بہن بھائی راکھی باندھنے اور بندھوانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ بڑا ہی رومانٹک تہوار ہے جس میں بھائی اور بہن کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ رسم صرف حقیقی بہن بھائی تک ہی محدود نہیں ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی غیر مرد کی کلائی پر راکھی باندھ دیتی ہے تو دونوں میں بہن بھائی کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے اور اس مرد پر اس ہندو عورت کی حفاظت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

اس تہوار کے سلسلے میں ایک واقعہ ہے جو بہت ہی دلچسپ ہے اور جس سے اس تہوار کا تقدس، شائستگی و تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ غالباً راجستھان کے کسی راجپوت راجہ کے بیٹے راجکمار کا ہے جو کسی غریب خاندان کی ایک حسین و جمیل لڑکی کو دیکھ کر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ لڑکی کسی اور لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ جس لڑکے سے وہ محبت کرتی تھی وہ نہ تو کوئی راجہ کا بیٹا تھا اور نہ ہی گھر کا کوئی رئیس تھا لیکن خاندانی تعلق اس کا بھی راجاؤں کے خاندان سے تھا۔ اس غریب لڑکی سے شادی کرنے کے لیے راجکمار نے اپنے باپ سے کہا۔ چنانچہ راجہ نے اپنے ولی عہد کا پیغام لڑکی کے ماں باپ کو بھیجا اور ساتھ میں کچھ تحائف بھی بھیجے۔ لڑکی کے ماں باپ اس پیغام سے بہت خوش ہوئے اور فوراً منظور کر لیا۔ جب یہ بات لڑکی کے علم میں آئی تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ ایک دن اس کے خیال میں یہ بات آئی کہ عورت کا حال عورت ہی زیادہ سمجھ سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر وہ راجہ کے محل پہنچ گئی اور راجکمار کی بہن راجکماری سے سارا حال بیان کر دیا۔ راجکماری جب اس کا حال سن چکی تو اس نے لڑکی سے تین دن کے بعد محل پہنچنے کے لیے کہا۔ تین دن کے بعد راکھی بندھن کے تہوار کا دن تھا۔ چنانچہ تین دن کے بعد لڑکی محل پہنچی تو شہزادی نے اسے ایک کمرے میں چھپا دیا۔ اس کے بعد شہزادی شہزادے کو دیکھنے اس کے کمرے میں گئی تو اس نے اپنے بھائی کو آئینہ کے سامنے

کنگھے سے بال سنوارتے ہوئے دیکھا-وہ فوراً دوڑی ہوئی لڑکی کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے بھائی کے پاس پہنچ گئی -بھائی کے پاس پہنچ کر راجکماری نے بھائی سے کہا مجھے کچھ اور کام کرنا ہے لہٰذا راکھی جلد بندھوالو-راجکمار کو آئینہ میں اپنی بہن نظر آرہی تھی لیکن وہ لڑکی' چونکہ شہزادی کے پیچھے کھڑی تھی' نظر نہ آئی-راجکمار نے آئینہ کے سامنے کھڑے کھڑے اپنی کلائی پیچھے بہن کی طرف کردی-راجکماری نے فوراً لڑکی کے ہاتھ میں راکھی دے کر اپنے بھائی کے ہاتھ پر باندھنے کا اشارہ کیا-لڑکی نے فوراً راکھی راجکمار کی کلائی پر باندھ دی-راکھی بندھ جانے کے بعد کچھ راکھی بندھائی کا انعام دینے کے لیے جیسے ہی راجکمار پلٹا تو اسے اپنی بہن کی جگہ وہ لڑکی نظر آئی-اس وقت وہ اپنی بہن کی اس حرکت پر بہت ناراض ہوا اور گرج کر کہا' یہ تو نے کیا کیا-اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے-وہ بہت دیر تک بڑبڑاتا رہا-

دوسری طرف اس لڑکے کو جب یہ علم ہوا کہ راجہ کا بیٹا اس کی محبوبہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کا خون کھول گیا-اس کی رگوں میں بھی راجپوت کا خون تھا-اتفاق سے وہ بھی راکھی بندھن والے دن راجکمار سے دو دو ہاتھ کرنے محل پہنچ گیا اور درباریوں سے راجکمار کو بلانے کے لیے کہا-جب راجکمار اس کے سامنے آیا تو اس نے کہا کہ میری محبوبہ سے شادی کرنے سے پہلے تجھے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا-وہ میان سے تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا اور راجہ کے بیٹے کو مقابلے کی دعوت دی-درباریوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے بھی میان سے تلواریں نکال لیں اور اس لڑکے کا کام تمام کرنا چاہتے تھے-لیکن راجہ کے بیٹے نے ان سب کو روک دیا اور کہا کہ میں اس لڑکے کو ایسا گھائل کروں گا کہ ساری عمر مجھے یاد رکھے گا-یہ کہہ کر وہ محل میں گیا اور اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اس لڑکے کے سامنے لے آیا-راجکمار نے اس لڑکے کو مقابلے کے لیے اپنے پاس بلایا-وہ لڑکا ننگی تلوار لیکر جیسے ہی راجکمار کے پاس پہنچا تو راجکمار نے اس لڑکی کا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دیدیا-لیکن راجکمار نے فوراً ہی اس لڑکی کا ہاتھ چھڑا کر لڑکے سے کہا کہ اب یہ میری بہن ہے اور اس طرح میرے گھر سے نہیں جائے گی-اب اس کی شادی تیرے ساتھ راجکماری کی طرح ہوگی' جا اور اپنی شادی کا انتظام کر-

دیوالی: یہ تہوار ہندی کیلنڈر کے مطابق کارتک کے مہینہ میں ہوتا ہے-اہل ہنود کے مطابق رام چندر جی جب لنکا کے راجہ راون کو مار کر ایودھیا واپس آئے تو ایودھیا کے رہنے والوں نے شہر کو روشن کرکے ان کا استقبال کیا تھا-دیوالی کے آنے سے پہلے شہر اور گھروں کی صفائی اور سارے گھر میں نئے رنگ و روغن شروع ہو جاتے ہیں-اس تہوار پر بازار سے نئے برتن لانے کا بھی رواج ہے-رات میں گنیش جی اور لکشمی جی کی پوجا کی جاتی

ہے-پوجا کے وقت گنیش اور لکشمی جی کے سامنے کھیلیں، بتاشے، مٹھائی، کھانڈ کے کھلونے، پھول اور پان وغیرہ رکھے جاتے ہیں-عزیزوں اور دوستوں کے گھر مٹھائی بھیجتے ہیں-رات میں گھروں اور بازاروں میں روشنی کی جاتی ہے-اب تو روشنی بجلی کے قمقموں سے کی جاتی ہے ورنہ پہلے مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیے جلا کر کی جاتی تھی-دیوالی کے دن جگہ جگہ میلے لگتے ہیں-پرانے زمانے میں دیوالی کی رات کو قندیل ہوا میں چھوڑے جاتے تھے-ہوا ان قندیلوں کو اڑا کر آسمان کی طرف لے جاتی تھی-جس سمت کو ہوا کا رخ ہوتا اسی سمت کو یہ رنگ برنگے قندیل اڑتے چلے جاتے تھے-لیکن اب قندیلوں کا رواج نہیں رہا-

دیوالی کا تہوار سردیوں کے موسم میں منایا جاتا ہے-سردی کی وجہ سے رات ہوتے ہی لوگ اپنے گھروں میں چلے جاتے تھے اور سڑکیں سنسان ہو جاتیں اور ماحول پر سناٹا طاری ہو جاتا تھا-ایسے موسم میں جب یہ تہوار آتا تو رات میں یار دوستوں سے اور کبھی کبھی بڑے لوگوں سے اس تہوار کے بارے میں قصے کہانیاں سنا کرتا تھا-وہ کہتے تھے اس رات میں جادو ٹونے بہت کیئے جاتے ہیں-ایک جادو کی ہنڈیا بھی آسمان کی طرف چھوڑی جاتی ہے-دیوالی کے یہ قصے کہانیاں سن کر مجھے رات کو بہت ڈر لگتا تھا اور کبھی کبھی جادو کی ہانڈی دیکھنے کے لیے آسمان کی طرف بھی تکنے لگتا تھا-لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس تہوار میں خوف کے ساتھ ساتھ عجیب سا لطف بھی تھا-

ہولی: ہندوؤں کا یہ تہوار بڑا دلکش اور رنگین ہوتا ہے-ابھی تہوار کی تاریخ بہت دور ہوتی ہے کہ گھر گھر میں لوگ خوشیاں منانے لگتے ہیں-لوگ گھروں کی صفائی ستھرائی اور نیا رنگ کراتے ہیں-امروہہ اور اس کے اطراف میں کسان چوپائیاں گاتے ہیں اور پھر ایک عجب انداز سے ڈھول بجاتے ہیں-سردیوں کی سنسان راتوں میں امروہہ کے چاروں طرف وقفہ وقفہ سے ڈھول بجانے کی آوازیں آتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پوری بستی پر جادو جگا دیا ہو- کہتے ہیں دور کے ڈھول بڑے سہانے لگتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ڈھولوں کی آواز بڑی سہانی لگتی ہے-

یہ تہوار پھاگن کے مہینے کی پورنماشی کو منایا جاتا ہے-اس دن ہندوؤں کے محلوں میں شام کے وقت کسی میدان یا کھلی جگہ پر' جہاں ہولی جلائی جاتی ہے' محلے کے لوگ ایندھن جمع کرتے ہیں-پھر پنڈت کے بتائے ہوئے وقت پر اس ایندھن میں آگ لگادی جاتی ہے-ہولی کے تہوار کے اگلے دن ہولی کا بنجارہ (جلوس) نکلتا ہے-اس تہوار میں عزیز، دوست ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں-

اس تہوار کی بابت کہا جاتا ہے کہ ایک راجہ ہرناکشیپ بھگوان کو نہیں مانتا تھا اور ان لوگوں سے سخت نفرت کرتا تھا جو بھگوان کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن اس کا بیٹا پرہلاد کو بھگوان پر اعتقاد تھا۔ ایک دن راجہ نے اپنی بہن کو، جسے یہ قوت حاصل تھی کہ وہ آگ میں نہیں جل سکتی تھی، راضی کیا کہ وہ پرہلاد کو لیکر آگ میں بیٹھ جائے۔ چنانچہ ایک دن ایسا ہی کیا گیا لیکن راجہ کی بہن تو جل کر راکھ ہوگئی اور پرہلاد کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اس دن مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں اور ہندو اپنے مسلمان دوستوں کی بھی بڑی خاطر تواضع کرتے ہیں۔

**دسہرہ:** اہل ہنود کے مطابق اس دن رام چندر جی نے لنکا کے راجہ راون پر فتح حاصل کی تھی۔ اسی فتح کی خوشی میں یہ تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ کنوار کے مہینے میں شکل پکھ کی دس تاریخ اس تہوار کی مقررہ تاریخ ہے۔ امروہہ میں دسہرہ کا دن آنے سے دس روز پہلے روزانہ رات کو رام لیلا ہوتی ہے۔ جس میں رام چندر جی کا اوتار ہونے سے لیکر ایودھیا کے راجہ بننے تک پوری زندگی کا سفر دکھایا جاتا ہے۔

دسہرہ کے دن شام کو ہندو انٹر کالج کے میدان میں لنکا کے راجہ راون کا پتلا جلایا جاتا ہے۔ اس وقت پٹاخوں سے پورا شہر گونج جاتا ہے اور آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ اسی میدان میں ایک میلہ بھی لگتا ہے۔ اس دن ہندو اپنے عزیزوں اور دوستوں کی مٹھائی اور پھل وغیرہ سے تواضع کرتے ہیں اور بچوں میں پیسے تقسیم کرتے ہیں۔ رات کو پوجا ہوتی ہے۔ بہنیں اپنے بھائیوں کے کانوں پر نورتے (جو کے کلے) رکھتی ہیں۔

**رام ڈول:** کنہیا جی کی پیدائش کا تہوار ہے۔ اسے جنم اشٹمی بھی کہتے ہیں۔ یہ تہوار بھادو بدی اشٹمی کو منایا جاتا ہے۔ دوسرے دن تمام مندروں سے جلوس نکلتا ہے۔

## میلے:

**چھڑیوں کا میلہ:** امروہہ میں چھڑیوں کے میلے کئی مقامات پر کئی دن تک لگتے ہیں۔ چھڑیوں کا پہلا میلہ احمد نگر میں پھر ایک ایک دن کٹکوئی، پھول باغ، بساون گنج اور پھر آخری دن بائیں کے کنویں پر بڑی دھوم دھام سے لگتا ہے۔

**نیزے کا میلہ:** نیزے کا میلہ محلّہ چھیوڑہ پر لگتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت مسعود سالار غازی نے سنبھل کے قریب ایک نمایاں فتح حاصل کی تھی جس کی یاد میں اب تک سنبھل و امروہہ وغیرہ میں نیزے کا میلہ

منعقد ہوتا ہے-

**شاہ مدار کی بیرق:** یہ میلہ پیر شاہ ابن بدر چشتیؒ کے مزار کے قریب لگتا ہے-

**شادی بیاہ:** امروہہ میں شادی بیاہ کی رسمیں سنی مسلمانوں میں عموماً دن میں اور شیعہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے یہاں رات میں ہوتی ہیں-مسلمانوں میں دولھا دلہن کا نکاح چند لمحوں میں پڑھادیا جاتا ہے لیکن ہندووں کے یہاں شادی کی یہ رسم آدھی رات سے شروع ہوتی ہے اور کئی گھنٹے جاری رہتی ہے- آخر میں دولہا دلہن آگ کے چاروں طرف پھیرے لگاتے ہیں- پھیروں سے پہلے لڑکی کے ماں باپ اس تقریب سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں-ہندو اپنے بچوں کی شادی اپنے عزیزوں میں نہیں کرتے بلکہ اس شہر کے کسی لڑکے یا لڑکی سے بھی نہیں کرتے جہاں وہ خود رہتے ہیں-ہندوؤں کے یہاں شادی کے موقع پر ایک بڑی دلچسپ رسم ادا کی جاتی ہے- یہ رسم کچھ اسطرح ہے کہ جب بیٹے کی بارات جانے لگتی ہے تو اس کی ماں گھر کے اطراف میں کسی کنویں میں پیر لٹکادیتی ہے-اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں اپنے بیٹے سے کہہ رہی ہے کہ اب تیری بیوی آرہی ہے'اب میرا اس گھر میں کوئی کام نہیں رہا لہذا میں کنویں میں ڈوب رہی ہوں- لیکن بیٹا ماں کو راضی کر کے گھر لے آتا ہے-

**تفریح گاہیں:** امروہہ کی تفریح گاہوں میں واسودیو (بانسدیو) پارک بہت ہی خوبصورت اور پر فضا مقام ہے-اس پارک میں جانب غرب ایک خوبصورت مندر ہے جس کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب ہے-اس تالاب کے بیچوں بیچ ایک گول پلیٹ فارم جس پر چار بھجی مورتی بنی ہوئی ہے-اس مورتی کے اوپر چھتری نما پکی چھت ہے-اس کے پاس جانے کے لیے تالاب میں بنے ہوئے دو لمبے پلوں پر سے گزرنا پڑتا ہے- تالاب کے چاروں طرف روڈ ہے جس کے ایک طرف قد آور درخت لگے ہیں اور دوسری جانب چاروں طرف خوبصورت Grill لگی ہوئی ہے-مندر کی مخالف سمت تالاب کے دوسرے کنارے پر سکھوں کا گردوارہ ہے- تالاب کے ایک کنارے پر میرا کا مندر ہے-اسی پارک میں ایک مقام پر تلسی داس کی بہت بڑی مورتی ہے-گرمیوں کی شام ہوتی ہے تو امروہہ کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں تفریح کرنے آجاتے ہیں- یہاں واسودیو کے علاوہ کوئی مخصوص تفریح گاہ نہیں ہے لیکن امروہہ کا اطراف سارا ہی تفریح گاہ ہے-بائیں کا کنواں، عید گاہ، پانواڑی تالاب اور گاگن، بان، کرولہ اور سوت 'ان سب ندیوں میں اب پانی برائے نام ہے، بڑے پر فضا اور سرسبز مقام ہیں-شام ہوتی ہے تو مزاروں پر بھی بڑی رونق ہوتی ہے-جمعرات کو شاہ سید شرف الدین شاہ ولایتؒ کے مزار

پر قوالی ہوتی ہے جس میں ہندو عقیدت مند بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

**کھیل اور مشغلے**: کرکٹ اور ہاکی کے ساتھ یہاں بہت سے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ان کھیلوں میں گلی ڈنڈا، تیر اندازی، پورے، کائی ڈنڈا، گیڑیاں، کبڈی، لنگڑی، کوڑا جمال شاہی، نیلی نیلی گھوڑی، چھیں بکلہ 'اتی چی تللیو، کنچے، شطرنج، تاش، چوسر وغیرہ عام تھے۔پرانے کھیلوں میں کچھ کھیل اب متروک ہو چکے ہیں لیکن بہت سے کھیل اب بھی کھیلے جاتے ہیں۔مشغلوں میں کبوتر بازی، پتنگ بازی وغیرہ اب بھی عام ہیں۔پتنگ بازی کے پیچوں کے تو باقاعدہ مقابلے ہوا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے لیے اطراف کے شہروں کے لوگ بھی امروہہ آیا کرتے ہیں۔یہاں پر پہلوانی کا بھی بڑا شوق رہا ہے۔یہاں کے پہلوانوں نے بھی کشتی میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ننھا پہلوان بہت مشہور و معروف تھا۔

-☆☆☆-

# صحافت

اتنی مختصر بستی میں ایک صدی پیشتر متعدد اخبار، رسائل اور گلدستے شائع ہوتے تھے جو امروہہ ہی میں قائم چھاپہ خانوں میں چھپا کرتے تھے۔ اس وقت "نسیم چمن"، "اعجاز" اور "بزم سخن" نامی ایسے ماہناموں کا تعارف مقصود ہے جو اب سے سو سال پہلے امروہہ سے شائع ہوا کرتے تھے۔ آج کے دور میں بھی ہم "نسیم چمن"، "اعجاز" اور "بزم سخن" (شعری گلدستوں) میں درج شاعروں کی غزلوں کی روشنی میں کم از کم اس دور کی اردو غزل اور اس سے متعلق بہت سے ایسے سوالوں کے جواب حاصل کر سکتے ہیں جن کی اردو اسکالروں، محققین اور ناقدین کو تلاش رہا کرتی ہے۔ مثلاً ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ سو سال پہلے جب مولانا حالی کی اصلاحی شاعری سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز ہو چکا تھا تو کیا شمالی ہند کے اردو شاعروں نے بھی اس روش کو اپنانے میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی یا وہ بدستور حسن و عشق سے وابستہ کیفیات کے اظہار میں مگن چلے آ رہے تھے۔ یا اس سوال کا جواب ہمیں مل سکتا ہے کہ سو سال پہلے بھی اردو شاعری میں ثقیل اور ادق الفاظ، نیز دور از کار استعاروں اور تشبیہات کے استعمال کو ہی حسن کلام سمجھا جاتا رہا تھا یا سہل اور عام فہم الفاظ میں اظہار بیان نے اپنے پاؤں جمانا شروع کر دیے تھے۔ ان شاعروں میں سے علیم اللہ صوفی ذوقی کے شاگرد ہیں۔ غرض ایسے بہت سے سوال اٹھا کر "نسیم چمن"، "اعجاز" اور "بزم سخن" سے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

امروہہ کی آبادی ایک لاکھ اڑتیس ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔ لیکن سو سال پہلے جب یہ ایک چھوٹا سا قصبہ رہا ہوگا اور اس کی آبادی بھی دس پندرہ ہزار کے آس پاس رہی ہوگی، اور خاص طور سے ایسے زمانے میں جب وسائل کا فقدان تھا، امروہہ سے باقاعدگی سے کسی شعری گلدستہ کا جاری ہونا یقیناً اپنے آپ میں تاریخی اہمیت والی

قابل ذکر بات کہی جائے گی- مزید بر آں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان رسالوں کی چھپائی خود امروہہ میں ہی قائم "انتظامی پریس"، "جوہر پریس" اور کئی پریسوں میں ہوا کرتی تھی- ظاہر ہے کہ یہ پریس محض دو چار گلدستوں پر تو چل نہیں سکتے ،اس لیے ان پریسوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ سو سال پہلے بھی امروہہ علم وادب کا مرکز رہا ہوگا جہاں بڑی تعداد میں کتب خانے بھی ہوں گے اور علم وادب سے شغف رکھنے والے باذوق افراد کی اپنی ذاتی لائبریری بھی ہوگی- مگر آج کی صورت حال یہ نظر آتی ہے کہ کتابوں کو ڈھونڈنے تو نہیں ملتیں-

امروہہ کے تعلق سے ضمناً ایک چھوٹی سی معلومات اور ہو جائے- چند سال پیشتر اقبال عباس عباسی صاحب نے امروہہ میں مقیم شاعروں کی فہرست ترتیب دی تھی، تو ایسے شاعر جو باقاعدگی سے مشاعروں میں مدعو ہوتے ہیں، ان کی تعداد اس وقت ساٹھ سے اوپر شمار ہوئی تھی- اگر امروہہ کے ان سیکڑوں معروف شاعروں کو بھی شامل کر لیا جائے جو ہندوپاک کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں تو امروہہ کے شاعروں کی تعداد کافی بڑھ جائے گی- اور اگر اس وقت امروہہ سے باہر رہائش پذیر شاعروں کو نہ بھی شامل کریں اور اپنے سامنے صرف امروہہ میں ہی شب و روز گزارنے والے شاعروں کی بات کریں تو ایسے افراد کی بات تو کر ہی سکتے ہیں جو خواہ مشاعروں میں جا کر اپنا کلام نہ سناتے ہوں مگر ان نام و نمود سے بے نیاز شاعروں کے نام اقبال صاحب کی مرتبہ فہرست میں شامل ہونے سے یقیناً رہ گئے ہوں گے تو اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ فہرست خاصی طویل ہو جائے گی، جبکہ اس فہرست میں امروہہ کے ایسے ان گنت افراد کو تو شامل ہی نہیں کیا جا سکتا جو شعر فہمی کے ساتھ ساتھ شعر موزوں کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں- ایسے شاعروں کے باقاعدہ دیوان تو موجود نہ ہونگے مگر ان کا منتشر کلام تو بہر حال ان کے لواحقین کے پاس ضرور موجود ہوگا- اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سو سال پہلے کی اس مختصر سی آبادی میں اتنی بڑی تعداد میں مستند اور زود گو شاعروں کا ہونا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ امروہہ کا ماحول شعر و شاعری کے لیے ہمیشہ سازگار رہا ہے-

میرے پاس "نسیم چمن" کے جن شماروں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں وہ ستمبر ۱۸۹۵ء سے فروری ۱۸۹۶ء تک کے ہیں- اس کے اصل نسخے دیکھنے اور فوٹو اسٹیٹ کرانے کا اتفاق مجھے ۱۹۹۳ء میں کراچی میں ہوا تھا- موجود آخری شمارے یعنی ۱۸۹۶ء کے شمارے میں کوئی ایسی اطلاع یا اشارہ نہیں ملا جس سے معلوم ہو کہ یہ آخری پرچہ ہے، بلکہ ٹائٹل کے چوتھے صفحے پر "ضروری باتیں" کے عنوان کے تحت جو اشتہار نما اداریہ ہے، اس کی عبارت سے نہ صرف اس ماہنامے کی اشاعت کے اغراض و مقاصد، اس کی پالیسی، نیز اس کی قیمت وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ

اس سے واضح طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس گلدستہ کی اشاعت متذکرہ شمارہ تک جاری تھی اور اس سلسلے کو بند کر دینے کا مالکان یا منتظمین کا کوئی ارادہ نہ تھا-اس لیے گمان غالب یہی ہے کہ "نسیم چمن" فروری ۱۸۹۶ء کے بعد بھی جاری رہا ہوگا-

اس ضمن میں یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی مجلے یا رسالے کو جاری رکھنے کے لیے مالی ضرورت کے پیش نظر اشتہارات کا شائع کرنا جب آج ضروری ہے تو اس زمانے میں بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی-چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان مختصر رسالوں میں اشتہار بھی شائع ہوتے تھے-جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کا امروہہ کا معاشرہ پبلیسٹی کے اصولوں اور ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھا-ظاہر ہے کہ "کاپی رائٹنگ" کا فنی معیار جو آج ہمارے سامنے ہے وہ بتدریج ترقی کرکے اس منزل تک پہنچا ہے- قارئین کی دلچسپی کے لیے اشتہار کی عبارت جو ان گلدستوں میں ملتی ہے وہ ہم جوں کی توں پیش کر رہے ہیں:

ضروری باتیں

"نسیم چمن" ماہوار شائع ہوتا ہے- ہر انگریزی مہینے کی اخیر تاریخوں میں خریداروں کی خدمت میں پہونچا کرے گا-(۱) قیمت اسکی روسا، عظام کی قدردانی پر موقوف ہے (۲) قیمت عام خریدارون سے ایک روپیہ چار آنے معہ محصول ڈاک ہے-(۳) بغیر قیمت پیشگی آئے ہوئے ہرگز کسیکو روانہ نہین ہوتا-(۴) ایک نمبر بطور نمونہ ڈھائی آنے قیمت پر بھیجا جاتا ہے-(۵) ہر تحریر جواب طلب کے لیے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے ورنہ بیرنگ کی شکایت معاف کیونکہ بصورت دیگر تلف ہونے پر ہم ذمہ دار نہین-خریدار اور غیر خریدار سب کا کلام طرح اور غیر طرح منتخب ہو کر شایع ہوگا-اگر غزل عمدہ ہوگی کل درج کی جائے گی اگر ایک شعر عمدہ ہوگا ایک درج کیا جائے گا نہ اچھا ہوگا غزل داخل دفتر کی جائے گی ہان اپنی طرف سے بغیر اجازت ایک لفظ کا بھی تصرف نہوگا-انتخاب کمیٹی کرتی ہے پوری غزل بلا انتخاب یا غیر طرح غزلیات فی شعر دو آنے دینے پر درج ہو سکتی ہے لیکن صحت کا لحاظ ضرور رہیگا-ہر غزل علیحدہ علیحدہ خوش خط بھیجنا چاہیے ایک ورق یا ایک کاغذ پر اگر دو غزلیں ہوں گی ایک درج ہوگی-درخواست خریداری و زر قیمت اور غزلیات وغیرہ بنام مولوی احمد حسین خان نسیم مالک گلدستہ و مطبع انتظامی امروہہ محلہ چاہ معماران آنی چاہیے- جن حضرات کی خدمت مین یہ گلدستہ بلا طلب روانہ کیا جاتا ہے وہ خریداری اور غیر خریداری سے بذریعہ کارڈ مہتمم کو اطلاع دین ورنہ

خریداروں میں متصور ہو کر گلدستہ ان کے نام جاری رہے گا اور قیمت کا مطالبہ کیا جائے گا۔"

"ضروری باتیں" کے نیچے ایک اور اشتہار بھی ہے۔

اختر صحت المعروف بہ آئینہ صحت

"یہ رسالہ مولفۂ حکیم ڈاکٹری ویونانی جناب حکیم رشید احمد صاحب امروہوی مقیم سنبھل کا کہ جس میں قواعد حفظان صحت کے پورے طور سے درج ہیں ۲۰-۲۶ کی تقطیع سفید کاغذ پر انتظامی پریس سے مطبع ہو کر سنبھل سے شایع ہوا کرتا ہے فی الحقیقت دیکھنے کے قابل ہے۔"

ایک اشتہار روشنائی کی بابت کچھ اس طرح ہے:

"اسکی تعریف کرنیسے خود اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے البتہ مصطفائی اور الف خانی روشنائی سے خوبی مین کہین بہتر مقدار مین زیادہ قیمت مین کم وزن فی پوڑیہ عہ ۲؍۱ (ایک روپیہ ڈھائی آنے) قسم اول تی ار ڈیڑھ پیسہ قسم دوم ۹؍ (پون پیسہ)۔"

اسی طرح ایک اشتہار ٹوپیوں سے متعلق ہے:

امروہہ کی ساختہ ٹوپیان

"اگرچہ یہ ٹوپیان سارے ہندوستان بلکہ تمام جہان میں مشہور و معروف ہین کہ جنکی اس شہر مین جابجا کارخانے جاری ہین اور ہر قسم کے کام عمدہ اور نایاب ریشمی اور نیم زری اور کلابتونی وغیرہ ہر قسم گول و کشتی نما ہفت رنگہ ہر ایک رنگ کی گرمائی و سرمائی بڑی خوبی و اسلوبی سے تیار ہوتی ہین مگر تاوقتیکہ بیرونی حضرات کو اطلاع نہ دیجاوے کہ اسکا صدر کارخانہ کونسا ہے تو وہ بیچارے اپنی خواہش کا مال ضرورت کیوقت اطمینانی طریقہ سے کس طرح منگا سکتے ہین لہذا اطلاع دیجاتی ہے کہ ایک کارخانہ نہایت سچا بڑی امانت و دیانت سے کام انجام دینے والا کہ جسکے متعلق ایک بڑی دوکان کہ جسمین سوائے ٹوپیون کے دوسرے مال تجارتی بہی ہزارہا روپیہ کے موجود ہین اور بیرونی صاحب تجار و دیگر شایقین اس سے طرح طرح کے نفعے اٹھاتے ہین اس دوکان کا پتہ یہ ہے کہ دوکان شیخ نور محمد و ظہور محمد سوداگران بازار محلہ گذری شہر امروہہ ضلع مراد آباد۔ مگر قیمت پیشگی نہ آنے سے بطور ویلیو پی ایبل کے مال روانہ ہوتا ہے اور درصورت مال ناپسند ہونے کے تاجران صاحبان کو اطلاع دیجاوے تو واپسی بہی ممکن ہے۔ شرح قیمت کلاہ ریشمین ۱۰؍ (دس آنے) سے لیکر عہ ۸؍ (ایک روپیہ آٹھ آنے)

تک -کلاہ نیم زری ۱۲/ (بارہ آنے) سے لیکر دو روپیہ تک - کلاہ کلاہ بتونی ۴ روپے چار آنے سے لیکر صہ / (پانچ روپیہ) تک قیمت ہے"

ان اشتہارات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس شہر میں سو سال پہلے اس قسم کی متعدد صنعتیں بڑے پیمانے پر جاری تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اب وہاں ختم ہو گئی ہیں -اس کے علاوہ ان گلدستوں میں اشتہار دیگر کسی خاص مقصد کے لیے پیغام بھی پہنچایا جاتا تھا -ایک اشتہار ملاحظہ ہو:

شعرائے نامدار کیخدمتمیں التماس

"حضرت قدوۃ السالکین شمس العارفین مولانا و مرشد نا عالیجناب السید محمد عبداللہ ابوالفتح، المعروف بندگی حضرت شاہ ابّن صاحب بدر چشتیؒ حسینی الرضوی الامروہوی کی شان مبارک میں تصنیف کیے ہوئے قصائد کا ایک مجموعہ ہر سال طبع کرا کر تقسیم کیا جاتا ہے - میں امید کرتا ہوں کہ حضرات شعراء اس کار خیر میں حصہ لیکر داخل حسنات ہوں گے -"

سید محمد عبدالوحید رضوی منصرم ریاست سروہی -

"نسیم چمن" کے ستمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے پر جلد اور نمبر درج ہے - گویا یہی اس کا پہلا شمارہ ہے - ٹائٹل پر دو لکیروں والی دروازہ نما محراب کی ایک لائن میں جلد نمبر، مہینہ اور سن اور شمارہ نمبر لکھنے کے بعد پھول پتیوں والی چوڑی بیل ہے جس میں شعر درج ہے:

یہ دیتی ہے مژدہ نسیم چمن　　نیا رنگ لایا ہے باغ سخن

اس کے بعد چھ لائنوں میں تقسیم کر کے "مرتبہ خاکسار سید زائر حسین السعدہ اللہ فی الکونین امروہوی انتظامی پریس امروہہ میں چھپکر باہتمام مولوی احمد حسین خان نسیم مطبع و گلدستہ شایع ہوا" درج ہے، اور سب سے نیچے پھولوں والی بیل کے نیچے لکھا ہے قیمت للعہ / (چار روپے) سالانہ پیشگی -

ان گلدستوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد کی طرح اداریہ یا ابتدائیہ لکھنے کا رواج نہ تھا - بس پہلے صفحہ پر دائیں بائیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اور درمیان میں "حمد و نعت" از جناب مولوی احمد حسین خانصاحب نسیم لکھنے کے بعد ان دو شعروں سے کی گئی ہے:

نسیم ثنا ہے روان مثل نور　　کہ حاصل ہو جس سے دلوں کو سرور
خدا کی صلوۃ ان پہ میرا سلام　　ملین گے ہمین قبر مین جو ضرور

اس کے بعد مصرع طرح نسیم چمن "ہوا ہوں جیسے آشفتہ قد رعنائے دلبر کا" درج ہے- ۲۳ سطر والے ۱۸ صفحات پر مشتمل ۱۸۹۵ء کے پہلے شمارے میں ۲۸ شاعروں کا کلام شامل ہوا ہے- بیشتر شاعروں کے ناموں کے ساتھ ان کے استادوں کے نام بھی لکھے ہیں اور ہر شاعر کے نام کے آگے پیچھے جناب، حضرت، صاحب اور اکثر کے ساتھ امروہوی بھی لگا ہے- ایک نام کے آخر میں سلمہ لکھا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں کم عمر رہے ہوں گے- صرف ایک شاعر سلام اللہ خاں سلامی تلمیذ فضل حسین سعید امروہوی کی اس شمارے میں مجموعی طور پر ۳۶ شعروں پر مشتمل ایک ساتھ تین غزلیں شامل ہیں باقی سب کی صرف ایک ایک غزل ہی شائع ہوئی ہے-

انیسویں صدی میں "نسیم چمن" کے علاوہ ماہنامہ "عمدۃ المطابع" سنہ ۱۸۸۰ء میں، ہفتہ وار "احسن الاخبار" ۱۸۸۰ء، ہفتہ وار "عندلیب" ۱۸۸۸ء، اور ہفتہ وار "اختر ہند" ۱۸۹۴ء میں شائع ہوتے تھے- "نسیم چمن" کی فوٹو کاپیوں کے علاوہ میرے پاس شعری گلدستوں کا ایک ایک اصل نسخہ "بزم سخن" اور "اعجاز" بھی ہے- "بزم سخن" جو سنہ ۱۹۱۶ء، "اعجاز" سنہ ۱۹۲۱ء اور "ہجولی" سنہ ۱۹۱۶ء میں امروہہ سے شائع ہوتے تھے- بزم سخن جس کے سرپرست جناب خلیفہ سید محمود احمد صاحب یاؔور، ابوالمنصور سید حبیبؔ احمد صاحب اتقی منیجر اور نگراں جناب مولوی محمد نظر الاحد صدیقی نظر امروہوی تھے- جبکہ "اعجاز" کے مرتب ابوالتوقیر افسرؔ امروہوی تھے جو ایک محقق کے طور پر انجمن ترقی اردو کراچی سے ایک زمانے تک متعلق رہے اور اپنی تحقیق و تجسس اور محققین کی معاونت کے سلسلے میں اچھے نام سے یاد کیے جاتے ہیں- اس رسالے کے پبلشر اور منیجر محمد وقار علی تاجؔ صدیقی تھے- یہ رسالہ سید مجاہد حسین جوہرؔ کے "جوہر پریس" امروہہ میں شائع ہوتا تھا- ایک اور رسالہ جس کا نام "حیات" تھا وہ سید جعفر حسین حیاتؔ امروہوی بھی نکالتے تھے جس میں مضامین اور مقالے بھی شائع ہوتے تھے- اس کے علاوہ ایک رسالہ سید عزادار حسین دانشمند ان سے نکالتے تھے جس میں برصغیر کے معروف دانشور، شاعر، قطعہ نویس اور صحافی حضرت رئیس امروہوی کے مضامین اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں-

رسالہ "نسیم چمن" کے برعکس رسالہ "اعجاز" امروہہ میں ابتدائیہ کے طور پر "امروہہ پر ایک تاریخی نظر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا ہے جو غالباً سلسلہ وار چھپتا رہا ہوگا- نیز موجودہ عہد کی طرح ایک صاحب کا تنقیدی خط بھی ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے-

اس رسالے میں کتابوں کی فہرست کے اشتہار میں قیمت اور پتہ بھی باقاعدہ موجودہ عہد کے خطوط پر درج

ہے۔ نیز صفحہ ۲۴ پر "اعجاز" کے سرپرستوں کی فہرست دی گئی ہے جو یہاں جوں کی توں پیش کی جا رہی ہے:

اعجاز کے معزز سرپرست

(۱) افتخار الشعراء، اعتبار الملک، اقتدار جنگ خان بہادر، حضرت مضطؔر، استاد خاص ہز ہائنس والی ٹونک

(۲) جناب منشی مولوی محمد احمد صاحب صرؔیر مینائی لکھنوی استاد خاص ہز ہائنس والی رامپور

(۳) عمدۃ الشعراء تاثر الملک افضل الشعراء بابو نارائن پرشاد صاحب ورماؔ مہر جانشین داغؔ

(۴) تاج الشعراء ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین حضرت داغؔ

(۵) شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب جعفری رنجوؔر عظیم آبادی

(۶) جناب محمود علی خان صاحب محمؔود عرف آغا علی صاحب آنریری مجسٹریٹ ورئیس الہ آباد

(۷) عالیجناب تواری ہری رام صاحب رئیس امروہہ

پھر آخری صفحہ ۲۵ پر ادارے نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے "اعجاز" کے خریدار مرحمت فرمائے تھے۔ یہ عبارت بھی اسی طرح پیش کی جاتی ہے۔

شکریہ

جن حضرات نے "اعجاز" کے خریدار مرحمت فرمائے ہیں ان کے نام نامی شکریہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

۱ جناب شیخ مبارک علی صاحب از شملہ

۲ جناب برکت شاہجہانپوری از راولپنڈی

۳ جناب بسم اللہ خان صاحب بسمؔل از ناگ پور

۴ حسرت اطہر ہاپوڑی از جے پور

۵ عمدۃ الشعراء حضرت مہرؔ از گوالیار

۶ امیر الکلام حضرت غریب از سہارنپور

۷ جناب اطہر گرواری از کلکتہ

۸ جناب خلیق بٹاوَدی از بٹادو

امروہے کے بزرگوں سے سنا ہے کہ متذکرہ رسالوں کے علاوہ اور بھی اخبارات اور رسائل امروہہ سے شائع ہوتے تھے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ امروہہ میں اب ان کی ایک کاپی میسر نہیں آتی جبکہ اس عہد کے بارے میں یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امروہے میں صحافت دوسرے قصبوں اور شہروں سے زیادہ عروج پر تھی۔ مگر امروہے کی تاریخ کی طرح امروہے کی صحافت بھی عروج و زوال کی ایک فراموش کہانی ہے۔

-☆☆☆-

# معاشی حالات اور صنعتیں

## معاشی حالات

تقسیم سے قبل یہاں خاص طور پر مسلمانوں کا ذریعہ معاش زمینداری یا ملازمت تھا اور اہل ہنود کی بڑی تعداد تجارت کرتی تھی۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد زمینداری ختم ہوئی تو یہاں کے لوگوں کے خاص طور پر مسلمانوں کے معاشی حالات بری طرح متاثر ہوئے۔ لیکن انہوں نے مختلف کاروبار اور گھریلو صنعتیں لگا کر ان حالات کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا اور اب اللہ کے فضل وکرم سے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ امروہہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتیں بہت محدود ہیں اس لیے یہاں کا ملازمت پیشہ طبقہ یا پڑھے لکھے لوگ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ملازمت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ امروہہ کے بہت سے لوگوں نے اب زراعت کا پیشہ بھی اختیار کر لیا ہے۔ یہاں سیکڑوں قسم کے آم بکثرت پیدا ہوتے ہیں جنہیں دوسرے شہروں اور ملکوں کو ایکسپورٹ کیا جاتا ہے اور اس طرح بڑی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ آم کے باغات بیشتر لوگوں کے اپنے ہوتے ہیں اور آموں کی فصل کے دوران انکی دیکھ بھال بھی خود ہی کرتے ہیں جبکہ بہت سے تجارت پیشہ اور شوقین لوگ آموں کی بہار خرید لیتے ہیں۔ یہاں آموں کا موسم بہت دلکش ہوتا ہے۔ جب آم کی کونپل (پکا ہوا پہلا آم) گرتی ہے تو راتوں کو باغوں میں بہار آجاتی ہے۔ لوگ اپنے باغوں میں جھونپڑیاں ڈال کر رات کو رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ دعوتوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مشاعروں کی نشستیں اور چار بیتوں کی محفلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

## صنعتیں:

امروہہ نے اگر ایک طرف ادب، طب، سائنس، آرٹ، اسٹیج ڈرامے اور فلمی دنیا میں اپنا نام روشن کیا ہے تو دوسری طرف یہاں کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں نے بھی کم وسائل کے باوجود پورے ملک میں بڑی شہرت پائی۔ یہاں کے مٹی اور لکڑی کے کھلونے، لکڑی کے ٹیبل لیمپ، کارچوب، گاڑھے اور کھدر کا کپڑا، قالین، ہولی کی ٹوپیاں' بیڑی وغیرہ کی صنعتوں نے پورے ملک میں شہرت حاصل کی ہے اور ہندوستان کی برامدات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو وہ تحفظ حاصل نہ ہو سکا جو ان کی ترقی اور بقا کے لیے ضروری تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کئی صنعتیں اب مفقود ہو گئی ہیں۔

**بیڑی کی صنعت:** امروہہ میں بیڑی کی صنعت کب آئی اور کون لایا اس کی کوئی مصدقہ تاریخ تو دستیاب نہیں ہے البتہ سینہ بہ سینہ جو معلومات فراہم ہوئی ہیں ان کے مطابق سنہ ۱۹۰۷ء میں امروہہ سے سید طاہر حسین اور سید عاشق حسین کام کی تلاش میں میں کلکتہ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے پہلی بار بیڑی بنتے ہوئے دیکھی اور سیکھی اور سیکھ کر یہ فن امروہہ لانے کی ٹھان لی۔ ان دونوں حضرات نے وہاں بہت محنت اور لگن سے یہ کام سیکھا لیکن دوسری روایت کے مطابق چاہ ملا امان کے ساکن مسیح اللہ خاں نے سب سے پہلے امروہہ میں بیڑی کا کاروبار کیا اور ۴۲۷ نمبر کی بیڑی شروع کی۔ اسی سلسلہ میں معلومات کے مطابق ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں یہ گھریلو صنعت قریبی قصبہ نوگانواں سادات میں پہنچی۔ نوگانواں سے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہاں کے سید مصطفیٰ حسین کلکتہ سے بیڑی بنانے کا فن سیکھ کر آئے۔ ان کے ساتھ اولاد حسین، انتظار حسین، امیر حسین اسماعیل عرف چھنگا اور مہرو بھی بیڑی کا کام سیکھ کر نوگانواں سادات آئے اور اس فن کو عام کر کے لوگوں تک یہ صنعت پہنچائی جب کہ گاؤں بان کھیڑی کے محمد ذکی، محمد تقی اور محمد مصطفیٰ بھی کلکتہ سے بیڑی بنانے کا فن سیکھ کر آئے تھے۔

امروہہ کی بیڑی صنعت سے متعلق ایک اور بات یہ بھی عام ہے کہ مشہور سرمایہ دار عبدالکریم خاں نے تین افراد کو امروہہ سے بیڑی کا کام سیکھنے کلکتہ بھیجا تھا اور ان تینوں افراد کے اہل خانہ کی اس مدت تک مالی امداد کی جب تک وہ بیڑی کا کام سیکھ کر نہیں آ گئے۔ افسر حسن اور سید شبیہہ الحسن نے بھی اس صنعت کو کافی فروغ دیا۔ بہر حال یہ بات بالکل یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ گھریلو صنعت بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کلکتہ سے امروہہ اور نوگانواں سادات پہنچی۔ آج امروہہ اور نوگانواں سادات کے علاقے میں بیڑی کے چھوٹے بڑے دو سو سے زائد

کارخانے اور بیڑی کے مارکہ چل رہے ہیں جبکہ کچھ بہت بڑے ہیں جن میں کافی لوگ روزگار حاصل کر رہے ہیں لیکن بیڑی کے کاریگروں کی حالت بہتر نہیں ہے کیونکہ جہاں ان کو طبی امداد نہیں ملتی اور معمولی مزدوری ملتی ہے تو دوسری طرف سرکار کی عدم توجہی سے ان لوگوں کے مختلف مسائل حل ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ امروہہ کے تقریباً بیس ہزار سے بھی زائد لوگوں کا روزگار بیڑی کے کاروبار سے ہی وابستہ ہے۔

**لکڑی کی صنعت**: لکڑی کی صنعت میں سہارنپور کے بعد امروہہ کا بھی ایک قابل ذکر مقام رہا ہے۔ آم اور شیشم کے باغات کے لیے امروہہ مشہور ہے۔ ان دونوں درختوں کی لکڑی سے کھلونے بنانے کا کام گزشتہ تین سو برس سے ہو رہا ہے۔ خاص طور پر ڈھولک اور چھوٹے موٹے کھلونے ہاتھ سے بنائے جاتے تھے۔ لکڑی کے کام میں اس حد تک ترقی ہوئی ہے کہ لکڑی کا ڈنر سیٹ، چائے کے کپ ساسر وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن کاریگروں کو اتنا معاوضہ بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھی پال سکیں۔ ۱۹۵۵ء میں امروہہ کے ہی ایک کاریگر دھاندو نے بجلی سے چلنے والی لکڑی کی مشین بنائی جس کے ذریعہ بہت سے کھلونے بالکل ایک سائز کے بنانا آسان ہو گیا۔ بعد میں اس مشین کے دیگر کاریگروں نے اس پر مزید تجربے کیے اور اس مشین کو بہتر طور پر بنالیا۔ جس کی وجہ سے اس صنعت کو فروغ حاصل ہوا اور آج بیس ہزار سے بھی زائد لکڑی کے کاریگر اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ امروہہ کے کاریگروں کا بنایا ہوا لکڑی کا ڈنر سیٹ تقریباً دس ہزار روپے تک فروخت ہوتا ہے لیکن کاریگروں کو اس قیمت کا ایک چوتھائی حصہ بھی نہیں ملتا۔

لکڑی کے کھلونوں کی برآمدات سے ہر سال ملک کو آٹھ کروڑ روپیہ زرمبادلہ ملتا ہے لیکن آجکل اس پیشہ سے منسلک تقریباً پانچ ہزار خاندان تنگ حالی سے دوچار ہیں کیونکہ سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق گزشتہ دنوں میں لکڑی کے کٹان پر پابندی لگادی تھی، جس کی وجہ سے کھلونے بنانے کے لیے لکڑی دستیاب نہیں ہے، نتیجہ کے طور پر یہاں لکڑی کے کاریگر بے روزگار ہو کر رہ گئے ہیں۔

**رتھ بہلی**: امروہہ کی ایک مشہور صنعت رتھ بہلی بھی تھی۔ یہ ایک تانگہ نما یا بگھی نما ایک گاڑی ہوتی تھی جو خاص طور سے ہندو رؤسا سواری کے لیے رکھتے تھے۔ رتھ گاڑی چلانے کے لیے اس میں دو بیل جوتے جاتے تھے۔ اس گاڑی پر ایک چھوٹا سا گنبد بنایا جاتا تھا جس کے نیچے بیٹھنے کے لیے مخمل کے گدّے بچھے ہوتے تھے۔ رتھ کی خوبصورتی کے لیے اندر کی طرف چھت وغیرہ کو مخمل کے کپڑوں سے سجاتے تھے۔ باہر کی طرف

سنہری کام کیا جاتا تھا- لیکن اب یہ صنعت بالکل ختم ہو چکی ہے-ایک تصویر لینے کے لیے رتھ کی تلاش میں امروہہ کے اطراف کے کئی گاؤوں تک گیا لیکن کسی جگہ رتھ نظر نہیں آیا-

**قالین کی صنعت:** امروہہ کی ایک خصوصی صنعت یہاں کی قالین کی صنعت ہے جس کے لیے وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ صنعت حکومت کی عدم دلچسپی کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے- حالانکہ اس صنعت میں لگے ہوئے تقریباً پچیس ہزار لوگ اپنے تشخص اور تحفظ کے لیے مختلف محاذ پر نبرد آزما ہیں-امروہہ میں قالین بافی کی صنعت بہت قدیم ہے، معلومات کے مطابق ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ہند ہوئی تو ہزاروں لوگ ادھر سے ادھر چلے گئے جس کی وجہ سے یہاں قالین بنائی کاریگروں کی بہت کم تعداد رہ گئی-ایک قالین ہتھ کرگھے سے بہ مشکل تمام تین یا چار دن میں بن جاتی ہے-اس وقت کے مطابق مزدوریاں بہت کم تھیں-۱۹۶۰ء کے بعد قالین کی بنائی میں تبدیلی آئی- ہتھ کرگھوں کی جگہ ہینڈلوم کی کھڈیاں لگائی گئیں تو کام کی رفتار بھی بڑھی-دھیرے دھیرے یہ صنعت پھلنے پھولنے لگی- آج امروہہ میں ہینڈلوم اور پاورلوم کے تقریباً تین درجن کارخانے ہیں جہاں ایک دن میں تقریباً سو سے دو سو قالینیں تیار ہوتی ہیں-ہر قالین دہلی، ممبئی، مدراس، کلکتہ، رانچی، جے پور سمیت ملک کے تقریباً تمام شہروں کو سپلائی کی جاتی ہے-بجلی کی مشینوں کے ذریعہ اب سوتی اور خالص ریشمی قالین بھی امروہہ میں تیار ہو رہے ہیں-اس کے ساتھ ساتھ نوگانواں سادات بھی اس صنعت سے مالا مال ہے- اس چھوٹے لیکن تاریخی قصبہ میں ہینڈلوم اور پاورلوم کے تقریباً ایک درجن کارخانے ہیں- سیکڑوں لوگوں کو اس صنعت سے دو وقت کی روٹی ملتی ہے-

امروہہ میں گاڑھے اور کھدڑ کے کپڑے کی صنعت بھی بہت قدیم ہے-اس صنعت میں امروہہ کے انصاری صاحبان برسوں سے مشغول ہیں-انہوں نے کھدڑ اور گاڑھے کا کپڑا بننے کی ہینڈلوم فیکٹریاں لگائی ہوئی ہیں یہاں تک کہ ان کے اپنے گھروں میں بھی کپڑا بننے کی کھڈیاں لگی ہوئی ہیں-اس صنعت میں امروہہ کے انصاری صاحبان نے قابل قدر ترقی کی ہے-کھدڑ اور گاڑھے کا کپڑا بڑی مقدار میں دوسرے شہروں اور ملکوں کو بھیجا جاتا ہے-امروہہ میں ایک سوت کا مل بھی ہے جو صوبہ اتر پردیش میں سب سے بڑا مل ہے-

**کارچوب کی صنعت:** امروہہ میں کارچوب کا کام بھی گھریلو صنعت کی شکل میں کافی مدت سے کیا جا رہا ہے- حالانکہ یہ فن رام پور اور لکھنو کی میراث تھا- یہاں کے بے پناہ صلاحیت والے لوگوں نے اس فن کو

دوسرے شہروں سے سیکھا اور امروہہ میں لاکر گھر گھر پہنچا دیا۔ آج شہر میں تقریباً ڈیڑھ ہزار مرد عورتیں اس فن سے اپنے خاندان کو پال رہے ہیں۔ یہاں دہلی، مراد آباد، رام پور کے لوگ ٹھیکہ پر کارچوبی کا کام دے جاتے ہیں اور طے شدہ دن تاریخ پر آکر تیار شدہ مال لے جاتے ہیں۔

**ہولی کی ٹوپیوں کی صنعت:** ملک کے کونے کونے تک جانے والی "ہولی کی ٹوپیاں" بھی امروہہ میں ہی بنتی ہیں۔ ہولی کے مستی بھرے ماحول میں جہاں ایک طرف رنگ اور گلال دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف خصوصی طور پر تیار کی گئی شبہ ہولی کی ٹوپیاں بھی اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ تقریباً سوا سو سال قبل محلہ بٹوال کے چاند بیگ اور ہوشیار بیگ نے سب سے پہلے ہولی کی ٹوپیاں بنا کر نئی روایت کی داغ بیل ڈالی تھی اس سے پہلے ان ٹوپیوں کی اہمیت کلھو اور گنگا کے میلے تک محدود تھی جہاں لاکھوں معتقدین کے سروں پر یہ ٹوپیاں بجی رہتی تھیں۔

مغل خاندان سے متعلق چاند بیگ ہوشیار بیگ کے خاندان کے منتظم بیگ، مستقیم بیگ، محمد یٰسین بیگ اور نسیم بیگ وغیرہ اس خاندانی روایت کو آج بھی نبھا رہے ہیں۔ ہولی آنے سے چھ ماہ قبل ٹوپیاں بنانے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ٹوپیاں بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ چھ ماہ کی محنت اور آدھا درجن ہاتھوں سے گزرنے کے بعد ٹوپی سر تک پہنچتی ہے۔ باریک ململ، کلف، ابری چمکدار اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے تیار یہ ٹوپیاں ملک کے کونے کونے میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس خاندان کے لوگوں نے بتایا کہ اب اس کام میں اتنی آمدنی نہیں ہے کہ خاندان کا پورے سال کا خرچ چل سکے وہ تو اپنے آباءواجداد کی دیرینہ روایات کو پورا کرنے کی غرض سے اس پیشے سے منسلک ہیں۔ ان ٹوپیوں کی فروخت سے اصل فائدہ ان درمیانی لوگوں کو ہوتا ہے جو بڑے بڑے شہروں میں بیٹھ کر ان کا مال تھوک میں خریدتے ہیں۔ یہ واحد خاندان ہے جو پورے ملک میں اپنی نوعیت کی ٹوپیاں بنا کر امروہہ کی شناخت بنائے ہوئے ہے۔

یہاں کے کوجگر (کوزہ گر) جو غالباً اب بالکل نہیں ہیں، مٹی کی چھالیاں، چھوٹی الائچی، لونگ، پستہ، بادام وغیرہ اس طرح بناتے تھے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ نقلی ہیں۔ اکثر لوگ از راہ مذاق دوستوں کی خاطر تواضع میں یہ الائچیاں اور چھالیاں وغیرہ ان کے سامنے پیش کیا کرتے تھے جسے کھاتے ہی وہ تھوک دیتے تھے۔

امروہہ کے ہی ایک مستری اعجاز رسول نے سب سے پہلے روئی دھننے کی مشین بنائی تھی اس سے قبل روئی کی دھنائی کا کام دھنکی سے ہوا کرتا تھا۔ مستری اعجاز رسول نے یہ مشین لکڑی کی بنائی تھی جو بعد میں لوہے میں تبدیل ہو گئی لیکن اس کا رولا آج بھی لکڑی کا ہے جو ان کا ایجاد کردہ ہے اس کے علاوہ امروہہ میں اور دیگر صنعتیں

بھی ہیں جن سے یہاں کے لوگوں کو روزگار مل رہا ہے لیکن یہاں کی ایجاد شدہ نہیں ہیں۔ پھر بھی روحانی، ادبی، تہذیبی اور رواداری کی امین، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی سرزمین امروہہ آج بھی ملک کے دوسرے اضلاع سے بہتر ہے جہاں بات بات پر فساد کا خطرہ ہو، یہاں کا امن اور آشتی کا ماحول اپنی مثال آپ ہے۔

-☆☆☆-

# طرز تعمیر اور پلاننگ

امروہہ کی قدیم مساجد اور اولیاء اکرم کے مقبروں کے خوبصورت گنبد اور مسجدوں کے بلند مینار دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہاں کے لوگ فن تعمیر سے بھی بخوبی واقف تھے۔اشرف المساجد، جامع مسجد محلہ ملانا، صدو کی مسجد کیقبادی اور دوسری بہت سی مسجدیں **Islamic Architecture** کا بہترین نمونہ ہیں۔اسی طرح روضہ شاہ گھاسی چشتیؒ، قطب شاہ، اور کتنے ہی اور مقبروں کے گنبد انتہائی خوبصورت ہیں۔درویش علی خاں، شیخ عبدالمجید علویؒ، شیخ عبدالحکیمؒ کے مقبروں کی تعمیر بھی بہت خوبصورت اور منفرد نظر آتی ہے جو رومن آرکیٹیکچر سے قدرے ملتی جلتی ہے۔ان تاریخی عمارتوں میں اب کئی عمارتیں تو بہت ہی مخدوش ہو چکی ہیں۔اگر اس وقت توجہ نہ دی گئی تو یہ کسی وقت بھی گر سکتی ہیں۔ان میں قطب شاہ کا مزار جو محلہ کٹکوئی کے جنگل میں واقع ہے بڑی مخدوش حالت میں ہے۔اگر یہ عمارتیں باقی نہ رہیں تو امروہہ اپنے قدیم فن تعمیر کے ورثوں سے محروم ہو جائے گا۔

**رہائشی تعمیرات:** پرانے وقتوں میں رہائشی گھروں کی دیواروں کی چنائی بھٹے کی اینٹوں سے کی جاتی تھی۔اس کے بعد چوکوں (بڑی اینٹ) سے کی جانے لگی۔چوکے آج بھی دیواروں کی چنائی اور فرش بنانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔دیواروں کی تعمیر میں اب عموماً سیمنٹ اور دریائی ریت کو مسالہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن زمانہ گذشتہ میں چونا، سرخی جو بھٹے کی اینٹ کو کوٹ کر بنائی جاتی تھی کا مسالہ استعمال ہوتا تھا۔اسی مسالے کو دیواروں پر پلستر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔چھتوں میں لکڑی کی کڑیاں اور تختے استعمال کیے جاتے تھے جس کے اوپر سرخی اور چونے کا فرش پھر چکنی مٹی بچھادی جاتی تھی۔لیکن اب سیمنٹ کانکریٹ کی چھتیں بھی بنائی جاتی ہیں اور دیواروں پر سیمنٹ کا پلستر کیا جاتا ہے۔گرمی سے بچنے کے لیے گھروں کی چھتیں عموماً اونچی رکھی جاتی تھیں۔چھت سے ایک دو فٹ نیچے روشن دان بنائے جاتے تھے تاکہ گرم اور مضر ہوا کمروں سے باہر نکل جائے۔

دیواروں کی موٹائی بھی عموماً ایک فٹ سے زیادہ ہوتی تھی تاکہ گھر ٹھنڈے اور گرم موسم کے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

دو گھروں کی پچھیت میں ایک مشترکہ گلیارہ (چھوٹی گلی) چھوڑا جاتا تھا تاکہ بارش کا پانی سڑک یا آنگن میں نہ گرنے پائے۔ چھتوں کا ڈھال گلیاروں کی طرف رکھا جاتا تھا تاکہ برسات کا پانی گلیاروں سے ہوتا ہوا نالوں میں چلا جائے۔ گھروں کے فرش بھی سرخی چونے سے بنائے جاتے تھے۔ لیکن اکثر لوگ خاص طور پر اہل ہنود اپنے گھر کے کچے فرش پر چونا اور سرخی کے بجائے گوبری کراتے تھے۔ گوبری گائے بھینس کے گوبر، بھوسہ اور مٹی کو ملا کر بنائی جاتی ہے۔ دیواروں پر رنگ روغن کرنے کے لیے چونا استعمال ہوتا تھا اور کہیں کہیں چونے کی جگہ پنڈول بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ پڑوسیوں سے بات چیت کرنے اور ان کی خبر گیری کے لیے عموماً دو گھروں کے درمیان کی دیوار میں ایک چھوٹی کھڑکی یا مکالہ بنایا جاتا تھا۔ یہاں پر عموماً تعمیرات راجوں mason کے مشورے پر بغیر کسی نقشے کے کرلی جاتی ہے۔ اس طرح زمین کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میونسپل بورڈ امروہہ میں کوئی تعمیرات کا محکمہ موجود ہے یا نہیں جو مکانوں کے نقشوں کی منظوری دیتا ہو اور تعمیرات کی نگرانی کرتا ہو۔ تعمیراتی کام کے لیے امروہہ کے ایک معمار مستری اصغر کو بہت شہرت حاصل تھی جنہیں ماہر تعمیرات کا مرتبہ حاصل تھا اور ان کا کہا حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔

یہاں پر گھروں کے عموماً چار حصے ہوتے تھے بلکہ اب بھی ہوتے ہیں جو کوٹھری، سہہ دری، دالان اور آنگن کہلاتے ہیں۔ ان چاروں حصوں کو موسم کے لحاظ سے استعمال کیا جاتا ہے۔ بہر حال گھروں کے ان چاروں حصوں کا استعمال اور ان کی بناوٹ کچھ اس طرح کی ہوتی تھی کہ سردیوں میں سونے کے لیے گھر کے پچھلے حصہ میں سہ دری بنائی جاتی تھی جس کے دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ دالان کے محراب نمادر، جن پر پلاسٹر سے پھول پتیاں بنائی جاتی تھیں، آنگن کی طرف بنائے جاتے تھے۔ ان دروں پر بارش سے بچنے کے لیے چھت کا کچھ حصہ (چھجہ) آنگن کی طرف بڑھادیا جاتا تھا۔ دالان کا استعمال عموماً موسم بہار میں، جب زیادہ نہ گرمی نہ سردی ہوتی تھی، یا پھر موسم برسات میں ہوتا تھا۔ یہاں بھادوں کا مہینہ لوگوں کو بڑی پریڈ کراتا ہے۔ اس مہینہ میں اکثر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بارش ہوتی ہے۔ گرمی کی وجہ سے لوگ کبھی آنگن میں لیٹتے ہیں تو کبھی بارش کی وجہ سے چارپائی گھسیٹ کر دالان میں لے جاتے ہیں۔ سہہ دری کے ایک جانب کوٹھری ہوتی تھی جس میں گھر کا قیمتی سامان وغیرہ رکھا جاتا تھا، اور گلی یا سڑک کی جانب دوست احباب کو بٹھانے کے لیے "بیٹھک" (ڈرائنگ روم) بنائی جاتی ہے۔

یہاں بیٹھک کے نام سے مجھے کراچی کا ایک واقعہ یاد آگیا جسے پڑھ کر شاید قارئین بھی لطف اندوز ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ کراچی میں ایک بزرگ خاتون ہندوستان سے اپنے بیٹے کے پاس پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ایک دن انہوں نے اپنی چھوٹی پوتی سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا، بٹیا تمہارے ابا کہاں گئے ہیں؟ پوتی نے جواب دیا، دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ بزرگ خاتون ڈرائنگ روم کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور بار بار بچی سے پوچھتی رہیں۔کچھ دیر کے بعد بچی کی ماں نے بتایا کہ بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔جب بچی نے ڈرائنگ روم کا نام بیٹھک سنا تو بڑے معصوم انداز میں دادی سے کہا کہ جب آپ کے یہاں ڈرائنگ روم کو بیٹھک کہتے ہیں تو پھر بیڈ روم کو "لیٹک" کہتے ہوں گے۔

گرمیوں کے موسم میں شام ہی سے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے بانوں کے پلنگ بچھا دیے جاتے تھے۔زیادہ گرمی ہونے کے سبب کھوڑے پلنگوں پر ہی اکثر سو جاتے تھے۔گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لیے ان پر بھی چھڑکاؤ کر دیتے تھے جو گرمی میں ایئر کنڈیشن کا مزا دیتے تھے۔صبح بیدار ہوتے تو جسم پر خاص طور سے پیٹھ پر پلنگ کی بُناوٹ چھپی ہوئی ہوتی تھی۔اوپر کی منزل میں عموماً ایک دو کمرے بنائے جاتے تھے جن کے آگے ٹین یا کھپریل کی چھت کا دالان اور اس کے آگے کھلا صحن ہوتا تھا۔اوپر کی منزل کے ان کمروں کی چھت کو "اٹریا" کہا جاتا تھا۔ گھروں کی موٹی دیواروں میں جگہ جگہ الماریاں، طاق اور گولے بنائے جاتے تھے۔طاقوں کا استعمال عموماً قرآن مجید، کتابیں، آئینہ، سرمے دانی، عطر، پوڈر، شیونگ کا سامان اور چراغ رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا اور کچھ طاقوں میں زیبائش کے لیے گلدستے وغیرہ بھی رکھے جاتے تھے۔

عموماً بڑے گھروں میں کشادہ باورچی خانہ تعمیر ہوتا تھا جس میں مٹی کے چولھے اور ان پر دھواں نکلنے کے لیے چمنی بھی بنائی جاتی تھی۔لیکن اب گیس کے چولھے آجانے سے مٹی کے چولہوں کا استعمال تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ باورچی خانے میں بھی الماریاں اور طاق ہوتے تھے۔ایک ڈولی (جالی سے کور الماری) بنائی جاتی تھی جس میں دودھ، سالن کی ہانڈی، سبزی اور پھل وغیرہ رکھے جاتے تھے۔تقریباً سب ہی گھروں میں سالن کی ہانڈی اور دیگچی وغیرہ رکھنے کے لیے "چھینکے" لٹکائے جاتے تھے۔باورچی خانے کے ایک حصے میں چٹائی بچھائی جاتی تھی جس پر بیٹھ کر گھر کے سب افراد کھانا کھاتے تھے۔سردی کی راتوں میں یہاں کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا تھا۔واہ واہ کیا دور تھا کیا لطف تھا! آج بھی یاد کر کے بس مزہ آجاتا ہے۔اس زمانے میں کھانا پکانے کے لیے عام طور پر لکڑی ٹکر کلا (لکڑی کی چھلن) اور اُپلے استعمال کیے جاتے تھے۔اس ایندھن کے رکھنے کے لیے باورچی خانے کے کسی حصہ پر

"ٹانڈ" بنایا جاتا تھا تاکہ ایندھن بارش اور سیلن (نمی) وغیرہ سے محفوظ رہے- صفائی ستھرائی کا اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ غسلخانہ، بیت الخلا وغیرہ رہائشی حصے سے دور بنائے جاتے تھے-

امروہہ میں چونکہ Sewer line نہیں تھی لہذا یہاں Flush system بھی نہیں تھا اور مہتر ہی صفائی کرتے تھے- لیکن اب تقریباً ہر گھر میں "سوک پٹس" کھود کر Flush System لگالیا گیا ہے- یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ سوک پٹس کھودنے سے زمین کا پانی Polluted ہو جاتا ہے- جن گھروں میں سوک پٹس بنائے گئے ہیں اور وہاں ہینڈ پمپ / الیکٹرک پمپ بھی لگے ہیں وہاں زمین کا پانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے-

**آب رسانی:** امروہہ میں لاتعداد کنویں تھے- بہت سے کنوؤں کے نام سے تو محلوں کے نام بھی پکارے جاتے ہیں- ان میں محلہ چاہ شور جس کا پانی کھاری ہوتا تھا، چاہ ملا امان، چاہ غوری، کالا کنواں، خونی کنواں اور لال کنواں بہت مشہور تھے- ان ہی کنوؤں سے سقے مشکوں میں پانی بھر کر گھروں میں پہنچاتے تھے- ہر گھر میں لکڑی کی گھڑونچیاں ہوتی تھیں- ان گھڑونچیوں پر مٹی کے کورے گھڑوں میں پانی بھر کر رکھا جاتا تھا- گھڑوں کے علاوہ مٹی کی خوبصورت صراحیاں بھی ہوتی تھیں- کورے گھڑے یا صراحی میں پانی خاصا ٹھنڈا ہو جاتا ہے لہذا گرمی کی آمد پر صراحی یا ایک دو نئے گھڑے خریدے جاتے تھے-

پانی کی سپلائی کے لیے اب میونسپلٹی نے پائپ لائن بچھادی ہے جس سے گھروں میں پانی سپلائی ہوتا ہے- اس کے علاوہ تقریباً ہر گھر میں ہینڈ پمپ (نل) لگے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں بورنگ کروا کر الیکٹرک پمپ بھی لگا لیے گئے ہیں-

**بجلی کی سپلائی:** گھروں میں روشنی کے لیے اب بجلی سپلائی کی جاتی ہے- اگرچہ بجلی کی سپلائی میں بڑا خلل رہتا ہے تاہم اب ہر گھر میں بجلی کا کنکشن موجود ہے- سڑکوں پر الیکٹرک پول تو لگے ہوئے ہیں لیکن بجلی کی کمی ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر عموماً رات میں اندھیرا رہتا ہے- گذشتہ زمانے میں گھروں کو روشن کرنے کے لیے لالٹین، مٹی کے تیل کے لیمپ، ڈبیہ اور میٹھے تیل کے دیے جلائے جاتے تھے جن سے گھر نیم روشن ہو جاتے تھے- ان ہی چراغوں کی روشنی میں بیٹھ کر طالب علم پڑھا بھی کرتے تھے- کسی تقریب کے موقع پر گیس ہنڈوں (پیٹرومکس) سے روشنی کی جاتی تھی- غالباً اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے شادی بیاہ کی اکثر تقریبات عموماً دن میں ہوا کرتی تھیں- بجلی کی قلت کی وجہ سے بازار سر شام بند ہو جاتے ہیں-

**برساتی اور گندے پانی کی نکاسی:** پہلے امروہہ کے چاروں طرف بہت سے تالاب تھے۔ برسات اور گھروں کا گندہ پانی نالوں کے ذریعہ ان تالابوں میں چلا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تالاب مٹی سے بھر گئے ہیں۔ پہلے تو ان تالابوں کی صفائی یا ان کے باقی رہنے کا جواز یہ تھا کہ موسم برسات سے پہلے کمہار یہاں سے مٹی کھود کر بیچا کرتے تھے جس کی وجہ سے تالابوں کی زمین نیچی ہو جایا کرتی تھی۔ لوگ اس مٹی کو خرید کر اپنے گھروں کی چھتوں پر بچھا دیا کرتے تھے تاکہ برسات میں چھتیں ٹپکنے نہ پائیں۔ جب برسات شروع ہوتی تو یہی مٹی آہستہ آہستہ گھل کر چھت پر پھیلتی اور بہہ بہہ کر نالوں کے ذریعہ پھر تالابوں میں چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ لیکن اب گھروں کی چھتیں پکی ہو جانے سے مٹی کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا۔ لہذا تالابوں سے مٹی کھودنا بھی بند ہو گیا۔ اب یہ تالاب رفتہ رفتہ مٹی سے بھرتے جا رہے ہیں جس سے نکاسیٔ آب کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ تھوڑی سی بارش ہوتی ہے تو سڑکوں اور گلیوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔

**ٹرانسپورٹ:** امروہہ ایک زمانے سے آباد ہے جس کی کبھی کوئی پلاننگ تو ہوئی نہیں تھی لہذا یہاں کی سڑکیں اور گلیاں بہت تنگ اور پتلی ہیں جہاں موٹر کار وغیرہ چلانا مشکل ہے۔ ویسے بھی چھوٹا شہر ہونے کے سبب یہاں ٹرانسپورٹ کی ضرورتیں بہت محدود ہیں، لوگ اپنے کام پر یا عزیزوں اور دوستوں سے ملنے پیدل ہی چلے جاتے ہیں۔ یہاں پر عام سواری سائیکل رکشہ ہیں جو بار برداری کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں کے پاس اپنی سواری کے لیے پرائیویٹ کار، جیپیں بھی ہیں جو شہر کے اندر تو شاذ و نادر ہی استعمال ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس اسکوٹر' موٹر سائیکل اور سائیکلیں بھی ہیں۔ اندرون شہر کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں ملتی۔ البتہ کہیں دور بیرون شہر جانے کے لیے عموماً اسٹیشن کے پاس، فور سیٹر یا کرائے پر ٹیکسیاں مل جاتی ہیں۔

گذشتہ زمانے میں امروہہ کی عام سواری تانگہ ،ہاتھ سے کھینچنے والے رکشے ہوا کرتے تھے۔ رؤسا کی سواری دو یا ایک گھوڑے والی بگھی ہوتی تھی۔ مسلمان عورتوں کے لیے خاص سواری ڈولی تھی جسے کہار اٹھاتے تھے۔ یہ کہار بھی اتنے بھروسے اور اطمنان کے ہوتے تھے کہ لوگ ان کی ڈولیوں میں اپنی خواتین کو تنہا بٹھا کر اپنے عزیزوں کے گھر، جن کو کہار بھی اچھی طرح جانتے تھے، بھیجدیا کرتے تھے۔ لیکن اب نہ وہ ڈولیاں ہیں نہ وہ کہار۔

-☆☆-

## قدیم عمارتیں:

**مراد آبادی دروازہ:** امروہہ کے مشرق میں ایک محلّہ بڑادربار کے نام سے موسوم ہے- یہاں سادات امروہہ کے جلیل القدر اور نامی امراء، رؤسا اور منصب داران نے عہدِ اسلامی میں امروہہ میں مختلف حصار، محلے 'پختہ سرائیں اور شاندار قلعہ نما عمارتیں اور دو عالی شان دروازے تعمیر کرائے گئے تھے جو آج بھی مراد آبادی دروازہ اور چھنگا دروازہ کے نام سے موجود ہیں- قلعہ نما عمارتیں یا سرائے تو اب موجود نہیں لیکن یہ دونوں دروازے ابھی موجود ہیں-یہاں سے ایک کچا راستہ مراد آباد کو جاتا ہے-اسی وجہ سے یہ مراد آبادی دروازہ کے نام سے مشہور ہے-دروازے پر بنی ہوئی بیشتر محرابیں اور کنگورے اب ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں-اس کے اطراف میں کچی پکی دکانیں 'سبزی اور پھل کے ٹھیلوں اور دروازے پر بڑے بڑے چسپاں اشتہارات نے اس کی رہی سہی خوبصورتی کو بھی ختم کردیا ہے-یہ دروازہ امروہہ کا ایک تاریخی لینڈ مارک ہے-کاش کہ یہاں کی میونسپلٹی یا اہل امروہہ اس کی بقا اور خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لیے کچھ اقدام کرتے-اگر یہی حالت رہی تو مستقبل قریب میں فن تعمیر کا یہ نادر ورثہ بھی باقی نہ رہے گا-(کشور اولیا کی تصنیف کے دوران یہ اطلاع ملی کہ اس سال موسم برسات میں یہ دروازہ بھی زمین بوس ہوگیا)

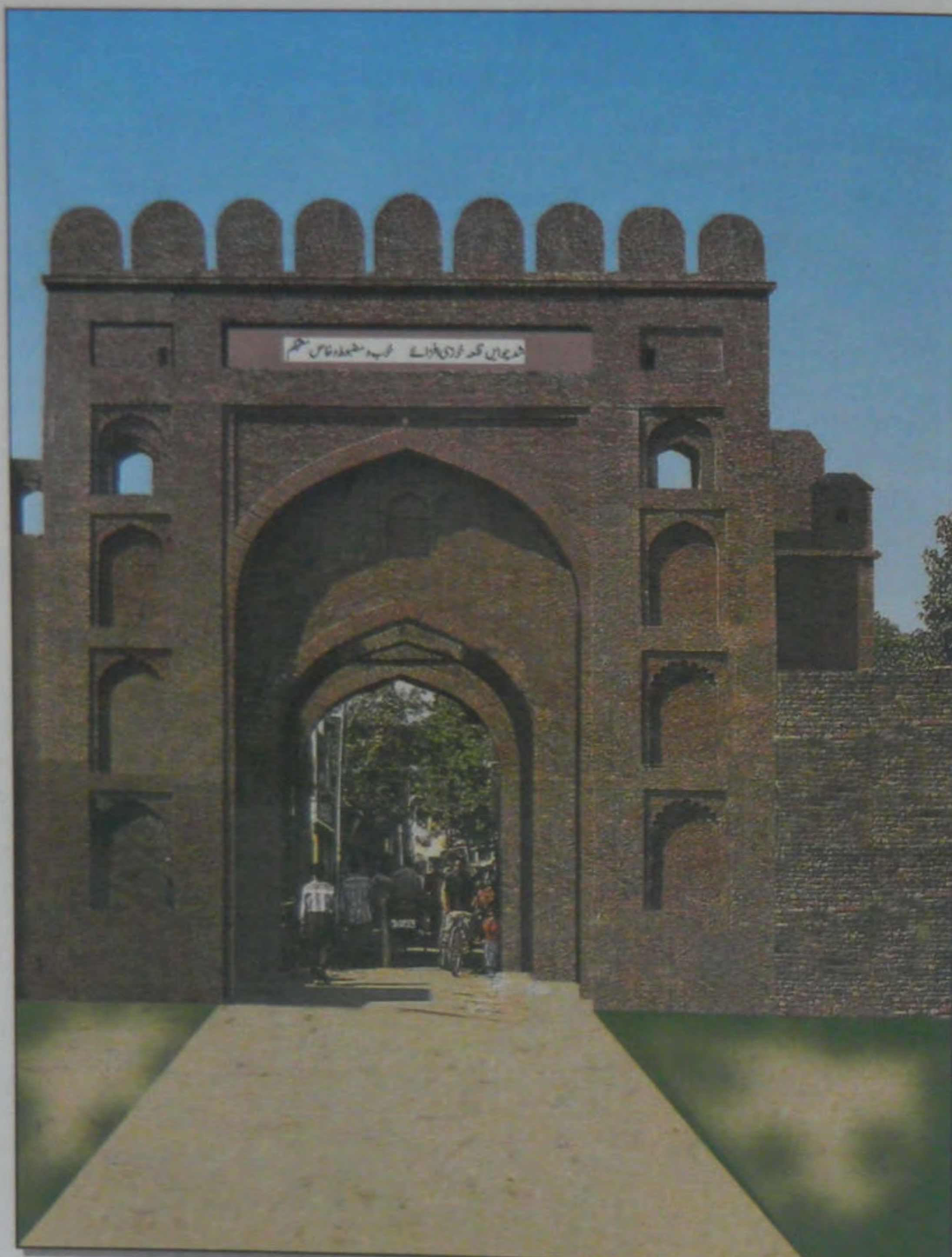
مولانا محمود احمد عباسی کی تالیف "تاریخ امروہہ"میں اس دروازے کے متعلق تحریر ہے:"یہ سید عبدالماجد بن سید عبدالخالق بن سید شاہ ابوالحسن بن سید محمد میر عدلؔ کے قلعہ کا شرقی دروازہ ہے- یہاں سے کچا راستہ مراد آباد کو جاتا ہے اس لیے عوام میں 'مراد آبادی دروازہ'مشہور ہوگیا ہے- قلعہ کے مکانات منہدم ہوکر بے نشاں ہوگئے-کہیں کہیں اس کی فصیل کے آثار اب تک باقی ہیں-" دروازہ کے شمالی پایہ پر ایک پتھر لگا ہوا ہے،جس پر یہ عبارت اور قطعہ تاریخ کندہ ہے:-

الله اکبر

'در عہد سلطان عالی شان صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی خلد الله 'ملکہ سیادت مآب میران سید عبدالماجد این قلعہ بنا نمود-

'شد چو ایں قلعہ خورمی افزائے خوب و مضبوط و خاص مستحکم'

'خواستم سالش از دبیر خرد گفت بشمار قلعہ خرّم'



مراد آبادی دروازہ.........امروہہ



امروہہ کا اسٹیشن



امروہہ میونسپل بورڈ..........(ٹاؤن ہال)

بہ اہتمام بندۂ کمال خاں خانہ زاد- شہر رمضان المبارک ۱۰۵۴ھ (معماران)

قلعہ کی فصیل کے ساتھ کشک تالاب تھا- میر سید عبدالماجد کے انتقال کے بعد باقی ماندہ تعمیرات ان کے فرزند دیوان سید محمود نے مکمل کرائی تھیں- چھنگا دروازہ بھی اسی قلعہ کی فصیل کا دروازہ تھا- ۱۰۶۷ھ میں میراں سید عبدالماجد کے فرزند دیوان سید محمود نے اس قلعہ کے اندر، بہ اہتمام کمال خان ایک فراخ و کشادہ بازار بنوایا تھا جو اب 'بڑا بازار' کے نام سے موسوم ہے'-

**ریلوے اسٹیشن:** امروہہ کا ریلوے اسٹیشن جنوب مشرق میں واقع ہے- مراد آباد سے دہلی، میرٹھ اور چاندپور جانے والی گاڑیاں امروہہ اسٹیشن سے گزرتی ہیں- آزادی سے قبل ایک ہی پلیٹ فارم تھا لیکن اب دوسری طرف بھی ایک پلیٹ فارم ہے- یہ تو تحقیق نہ ہو سکا کہ یہاں پر ریلوے لائن کس سنہ میں ڈالی گئی تھی البتہ بزرگ بتاتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں ریلوے لائن بچھائی گئی تھی- یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ریلوے لائن کو جوئیا سے نکالنے کا پروگرام تھا لیکن مشتاق حسین وقار الملک کی کاوشوں سے ریلوے لائن امروہہ سے گزاری گئی-

**میونسپلٹی:** میونسپلٹی کی عمارت کو یہاں کے لوگ عموماً ٹاؤن ہال کہتے ہیں- یہ عمارت محلہ بنگلہ اور دانشمندان سے ملحق ہے- عمارت خوبصورت ہے، اس کا طرز تعمیر مغل آرکیٹیکچر سے ملتا جلتا ہے- عمارت کے ایک جانب ایک میدان ہے جسے سیاسی جلسوں یا کھیل کود کے لیے استعمال کیا جاتا ہے- اس ادارے کا سربراہ چیئرمین ہوتا ہے جو چناؤ سے منتخب کیا جاتا ہے-

**ڈاکخانہ:** میونسپلٹی کے قریب ڈاکخانہ ہے- پرانی عمارت کو منہدم کر کے نئی عمارت تعمیر ہو گئی ہے-

**مکٹ لائبریری:** امروہہ شہر کی ایک زمانے تک یہ پبلک لائبریری تھی- یہاں دہلی اور لکھنو سے شائع ہونے والے تقریباً تمام اخبارات آتے تھے- کتابوں کا بھی اچھا ذخیرہ تھا مگر اپنے حالیہ دورے میں میں نے یہ دیکھا کہ اب یہ عمارت کتابوں سے خالی ہے- باوجود میری شدید خواہش کے اس لائبریری سے مجھے ایک کتاب بھی ایسی نہ مل سکی جو میری اس تصنیف کے لیے مفید ہو سکتی-

**عدالت:** ڈاکخانہ کے سامنے منصفی واقع ہے- یہ عمارت گورنمنٹ اسکول کے لیے تعمیر ہوئی تھی جو بعد کو اپنی دوسری عمارت میں منتقل ہو گیا- یہ ایک پرانی عمارت ہے جس میں اب تک کوئی توسیع نہیں ہوئی-

**مڈل اسکول:** ٹاؤن ہال سے متصل امروہے کا واحد مڈل اسکول تھا۔ اچھی عمارت، کھیل کا میدان اور بڑے کلاس روم تھے۔ اب یہ عمارت ہسپتال کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ مڈل اسکول کہاں منتقل ہوا معلوم نہ ہو سکا۔

**جوبلی سینما ہال:** یہ امروہہ کا واحد سینما ہال تھا جو امام المدارس کے بالکل سامنے ٹھنڈی سڑک پر واقع تھا۔ بعد میں اسکا نام پرکاش ٹاکیز ہو گیا تھا اور اپنی نئی عمارت ٹھنڈی سڑک پر منتقل ہو گیا۔

**بجلی گھر:** لپٹن روڈ پر امروہہ کا بجلی گھر واقع ہے۔ یہ بجلی گھر آج بھی اسی حالت میں ہے جیسا راقم الحروف نے بچپن میں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اب کچھ اور بڑے ٹرانسفارمر وغیرہ لگ گئے ہوں۔ مگر امروہہ کی بجلی کی سپلائی پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر نہیں ہے۔

**دروازہ گھیر مناف:** یہ ایک بڑے احاطہ کا صدر دروازہ ہے جو اصل تعمیر کو منہدم کر کے بعد میں بنایا گیا ہے۔ ۹۸۵ھ میں شیخ ابوالمناف بن داؤد مورث شیوخ صدیقی الملقب بہ مناف پوتہ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ امروہہ کی مصروف ترین سڑک پر واقع ہے۔ یہ علاقہ امروہہ کا انتہائی گنجان تجارتی مرکز ہے۔

شیخ ابوالمناف بادشاہی منصب دار تھے اور اعظم پور باسٹہ میں، جو امروہہ سے بجانب غرب ۳۰ کلو میٹر پر واقع ہے، ان کی سکونت اور ریاست تھی۔ عہد اکبری میں کسی وقت اعظم پور باسٹہ میں مسلسل کئی روز تک زلزلوں کے بعد ایسی بیماری پھیلی کہ ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن گئے۔ باقی بچنے والوں نے اعظم پور باسٹہ چھوڑ کر اطراف کے گاؤں اور شہروں میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں شیخ ابوالمناف بھی امروہہ میں آئے اور ایک احاطہ بنوا کر اپنے مکانات تعمیر کرائے۔ اعظم پور باسٹہ میں، جس کا مختصر ذکر آگے رتن سین کے باب میں کیا ہے، عہد اکبری کی کئی مساجد اور مقبرے مخدوش حالت میں آج بھی موجود ہیں۔ مغلیہ طرزِ تعمیر کی ان عمارتوں کے اطراف میں گھنے جنگل اور باغات ہیں۔

**پولیس اسٹیشن:** پولیس اسٹیشن کی قدیم عمارت بڑے بازار سے پہلے محلّہ مچھرہٹہ میں واقع ہے۔

**چھنگا دروازہ:** چھنگا دروازے کے نام سے ایک محلّہ آباد ہے۔ مخدوش حالت میں یہ دروازہ ابھی موجود ہے۔ یہاں زیادہ تر کوٹہ برادری کے لوگ آباد ہیں۔

**مقبرہ قطب الدین قناق خاں:** امروہہ کے شمال و مشرق میں آموں کے گھنے باغات، خودرو جنگل،

لہلہاتے ہرے بھرے کھیت اور کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جوہڑ اور برساتی تالاب صبح وشام بڑے دلفریب منظر پیش کرتے ہیں- یہاں خاموش فضا کا یہ عالم ہے کہ کانوں میں سن سن کی آوازیں یا پرندوں کی سریلی بولیاں دل پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہیں- اسی ویران جنگل میں قطب الدین قاق خان (قطب شاہ) کا عالی شان مقبرہ ہے جس کی دیکھ بھال کرنے والا اب کوئی نہیں- قطب شاہ جو ابتدائی عہد اکبری میں امروہہ کے حاکم تھے- ان کے دور حکمرانی میں کئی اچھے کام ہوئے جن میں سدو کی مسجد کی مرمت کا کام بھی شامل ہے-

قطب الدین قاق خاں کا مقبرہ، جو مغلیہ آرکیٹیکچر کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے، امروہہ میں فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے- مقبرے کے اوپر ایک گول گنبد اور چار مینار تعمیر کیئے گئے تھے- گنبد کی چھت میں پلاسٹر کے خوشنما بیل بوٹے بنے ہوئے تھے جس کے چند حصے باقی رہ گئے ہیں- اب اس مقبرہ پر گنبد اور صرف ایک مینار باقی رہ گیا ہے جو چند روز اور اپنی خستہ حالی کا مظاہرہ کر سکے گا-

**عید گاہ:** حضرت شاہ سید شرف الدین شاہ ولایتؒ کے مزار سے جانب غرب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے- عید گاہ کے پلیٹ فارم کی اونچائی تقریباً دس فٹ ہے اور اس کا رقبہ تقریباً پندرہ ہزار اسکوائر فٹ سے بھی زیادہ ہوگا- پلیٹ فارم پر مغربی سمت دس بارہ فٹ اونچی دیوار ہے جس پر پلستر سے محرابیں بنی ہوئی ہیں- درمیان میں امام کے لیے تقریباً دس فٹ چوڑی محراب بنی ہے- اس محراب پر یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے-

ساخت بہر خدا غلام احمد ایں مبارک اساس نیک بنا
بہر تاریخ ایں سروش زغیب عید گاہ خجستہ داد ندا

پلیٹ فارم پر جانے کے لیے اتنی کشادہ سیڑھیاں ہیں کہ جن پر نماز کے لیے صفیں کھڑی ہو جاتی ہیں- عید گاہ کے آگے بھی بہت بڑا میدان ہے جس میں جگہ جگہ تکبیر کہنے کے لیے مکبر بنے ہوئے ہیں- حال ہی میں عید گاہ کی مزید توسیع کی گئی ہے- عید گاہ کے پلیٹ فارم کے بیچ میں ایک قدیم ترین، قد آور برگد کا درخت ہے جو عید گاہ کے خاصے بڑے حصے پر سایہ کیے ہوئے ہے- عید گاہ اور اس کے اطراف کا تمام علاقہ بڑا پر فضا ہے- حال ہی میں عید گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک محراب نما خوبصورت دروازہ اور ایک مینار تعمیر کیا گیا ہے-

عید گاہ کے متعلق محمود احمد عباسی اپنی تالیف " تاریخ امروہہ " میں تحریر کرتے ہیں "ابتدا میں عید گاہ مختصر تھی- شیخ غلام احمد 'شاہی گماشتہ و وقائع نگار دہر کارۂ بادشاہی' نے ۱۰۷۸ھ میں اس کو از سر نو تعمیر کرایا تھا-"

متذکرہ نو تعمیر محراب اور مینار سے پہلے دائیں جانب ایک بہت بڑے احاطہ میں شاہ عبدالمجید علویؒ اور آپ

کے خلیفہ شیخ عبدالحکیم" کے مقبرے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں یہ احاطہ "اللہ ہو کا باڑہ) نام سے مشہور تھا۔ تقریباً پچاس سال پہلے اس احاطہ میں اسقدر خودرو جھاڑیاں اور قد آور درخت تھے کہ دن میں بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا رہتا تھا اور اندر جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ اس احاطہ کے جنوب میں مولانا محمود احمد عباسی کا آم اور امرود کا باغ تھا۔

**گھڑیال منزل:** (بساون گنج) گھڑیال منزل محلہ بساون گنج میں واقع ہے۔ گھڑیال منزل سید علی اعظم خاں جو شاہی منصبدار تھے، نے تعمیر کرائی تھی۔ عمارت کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سید علی اعظم خاں کو سات دھاتوں سے بنا ہوا ایک گھڑیال اور دو بڑے نقارے عطا ہوئے تھے۔ اس عمارت کا قلعہ نما پھاٹک امروہہ کی مصروف ترین سڑک پر ہے۔ پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد ایک خوبصورت دیوان خانہ تھا۔ جہاں رات دن سیاسی و ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لیکن امروہہ کی یہ مشہور و معروف عمارت بھی اب آثار قدیمہ کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ دیوان خانہ وغیرہ منہدم ہو چکا ہے اور ہر طرف ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے۔ اب یہاں نہ سیاسی جلسے ہوتے ہیں، نہ وہ ادبی محفلیں جمتی ہیں، بس ہر طرف ایک ویرانی سی نظر آتی ہے۔

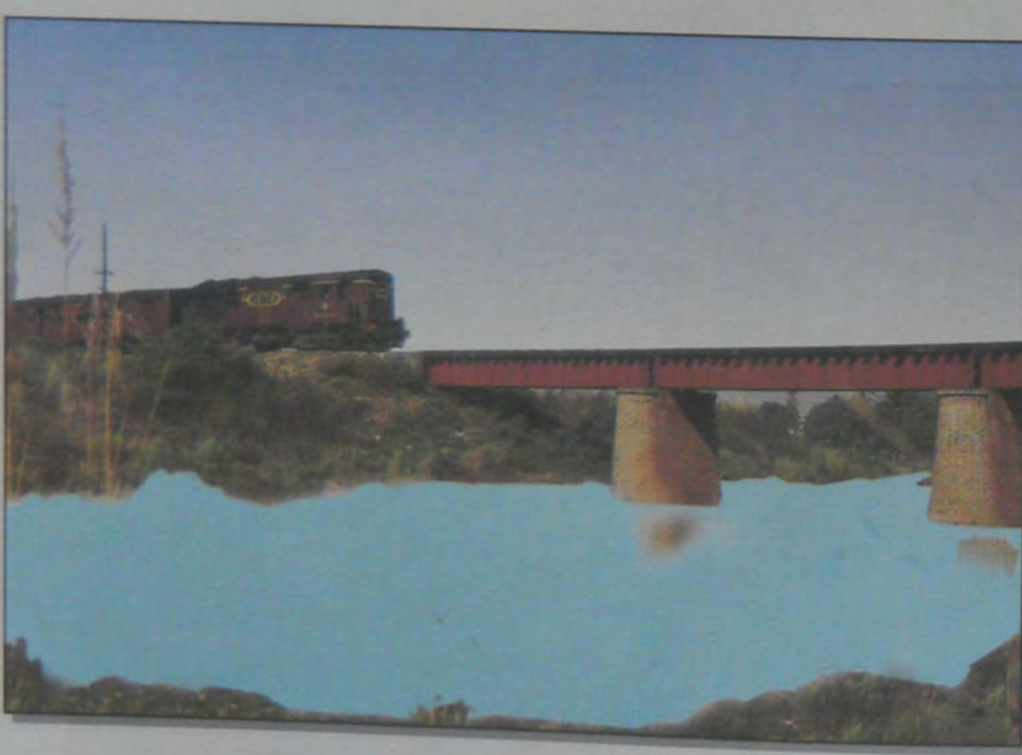
**علی جان منزل** (محلہ قریشی): علی جان منزل امروہہ کی بہت قدیم قلعہ نما عمارت ہے جو تقریباً ۴۵ بیگھے پر واقع ہے۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں اس قطعہ آراضی پر ایک عالی شان دیوان خانہ، ایک فراخ اور کشادہ محل سرا اور باقی آراضی میں ایک بڑا پائیں باغ اور خوبصورت بنگلہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد جناب سید کمال الدین (بن پیر سید عزیز اللہ رضوی) نے رکھا تھا۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں نواب رام پور کے ولی عہد نواب کلب علی خاں بھی کچھ دن یہاں مع اپنے خادمین کے مقیم رہے تھے۔ جنگ آزادی کے وقت ناظر گور سہائے بھی مقیم رہا جسے امروہہ کا ناظم بنایا گیا تھا۔ یہاں اور بھی متعدد عمارتیں ہیں جنھیں سید کمال الدین کے پوتے سید نظیر الدین عرف علی جان مرحوم نے اپنی اولاد اور عزیزوں کے لیے از سر نو تعمیر کرائی تھیں۔

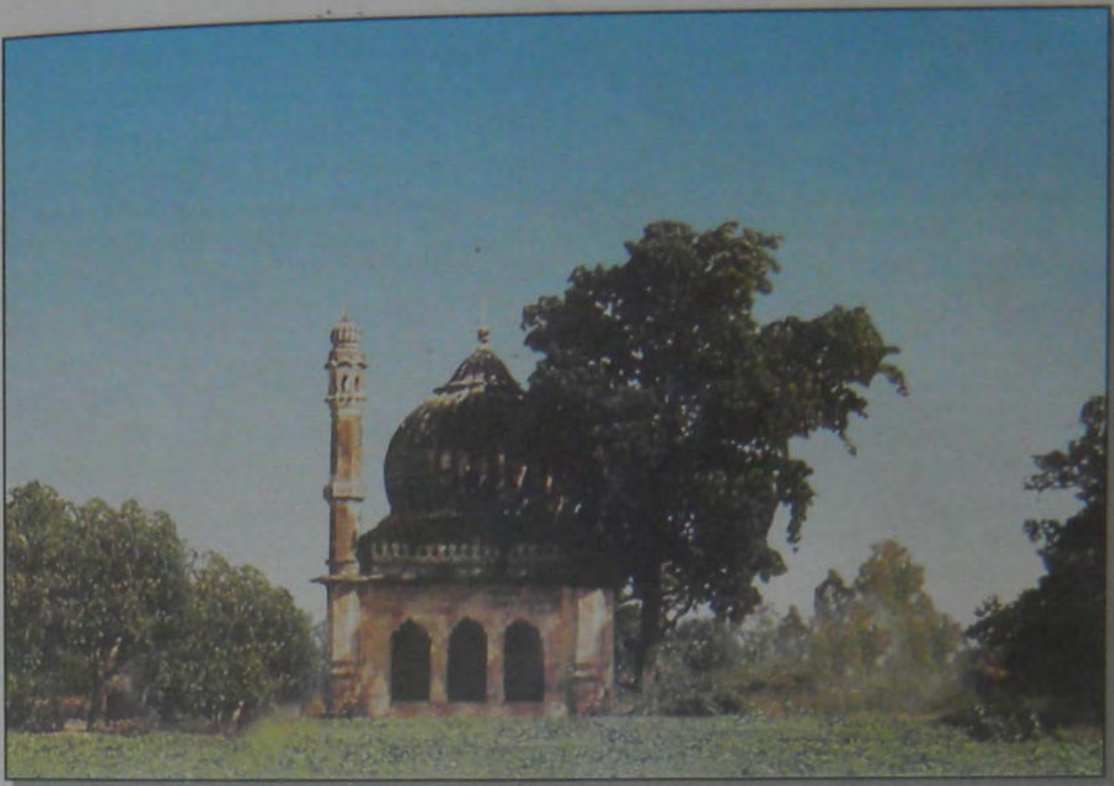
حال ہی میں راقم الحروف امروہہ گیا تو علی جان منزل میں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس مشہور و معروف عمارت کا کچھ عجب حال دیکھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ چند رہائشی مکان تو آج بھی موجود ہیں لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اب یہاں کوئی نہیں بستا۔ علی جان منزل میں داخل ہوتے ہی سامنے ایک خوبصورت دیوان خانہ تھا جسے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے زمین دوز کر دیا۔ یہ دردانگیز منظر دیکھ کر خیال آیا کہ نہ جانے کب تک یہ درد



عید گاہ..........امروہہ



سوت ندی..........دہلی سے ٹرین آتے ہوئے



حاکم امروہہ قطب الدین قناق خان کا مقبرہ



بائیں کا کنواں............ہندو دور کا ایک قدیم کنواں

دیوار کھنڈر بنے رہیں گے اور اب کون انہیں پھر سے بنائے گا۔

**پھول باغ:** علی جان منزل سے کچھ فاصلے پر بانس دیو پارک کے سامنے ایک پر فضا مقام پر خوبصورت باغ، جو پھول باغ کے نام سے مشہور ہے، لگ بھگ سنہ ۱۹۰۶ء میں سید محمد علی جان کے بیٹے سید غیاث الدین رضوی نے بنوایا تھا جیسا کہ اس باغ کے صدر دروازے پر کتبہ لگا ہوا تھا جو اب نہیں ہے۔ انہوں نے اس باغ میں ایک خوشنما کوٹھی، خوبصورت حوض اور چاروں طرف چہار دیواری بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس کے علاوہ اس باغ میں ایک پریس بھی قائم کیا گیا تھا۔ یو پی کا گورنر مسٹن جب ۱۹۱۳ء میں امروہہ آیا تو اس باغ میں بھی گیا اور دیکھ کر اس نے بڑی حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔ یہاں ساون کے مہینہ میں "پھول باغ کی چھڑیاں" نام سے میلہ بھی لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک کوٹھی اور باغ کا دروازہ موجود تھا لیکن اب کوئی چیز باقی نہیں۔

**ندیاں:**

**سوت ندی:** سوت ندی، جس کو "یارِ وفادار" بھی کہتے ہیں، ماضی میں خوب بہتی تھی لیکن اب تقریباً خشک ہو چکی ہے۔ یہ ندی امروہہ کے جنوب و مغرب میں تھی۔ اس ندی میں جب پانی تھا تو امروہہ کے لوگ یہاں تفریح کرنے آتے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اس ندی پر ایک ریلوے پل بنا ہوا ہے۔ مراد آباد سے دہلی آنے جانے والی ٹرین جب اس پل سے گزرتی ہے تو ٹرین کی آواز سے امروہہ کے لوگوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ فلاں ٹرین اس وقت سوت کے پل سے گزر رہی ہے۔ اس ندی کو ایک تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک دن صبح سخت بارش کے بعد امروہہ سے دہلی جانے والی ٹرین جب اس پل پر پہنچی تو یہ پل ٹوٹ گیا اور ٹرین اس ندی میں جا گری۔ صرف دو ڈبے گرنے سے بچ گئے جس میں حکیم اجمل خاں بھی سفر کر رہے تھے۔ پل ٹوٹنے کے بعد تمام علاقہ زیر آب آ گیا اور بہت سے لوگ اس حادثہ کا شکار ہوئے تھے۔ ٹرین کا انجن اس ندی کی تہہ میں ایسا دھنسا کہ آج تک نہیں نکل سکا۔ اس حادثہ کے بعد امروہہ کے ایک شاعر جناب شبیر حسن خاں (شبیر امروہوی) نے ایک نظم بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سوت ندی پہ محشر بپا ہو گیا    جس کی آئی قضا وہ فنا ہو گیا

**رام گنگا:** یہ ندی امروہہ سے مراد آباد جاتے ہوئے تقریباً سولہ سترہ میل پر بہتی ہے جو کوہ ہمالیہ سے نکلتی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم اندلسی مورخ و سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں امروہہ کا ذکر

کرتے ہوئے ایک ندی کا ذکر کیا ہے - وہ کہتا ہے ~

"اس دریا کی خاصیت عجیب ہے - برسات کے موسم میں کوئی شخص اس کا پانی نہیں پیتا اور نہ کسی جانور کو پلاتا ہے، ہم تین دن اس کے کنارے ٹھہرے - ہم نے اس کا پانی بالکل نہ پیا اور نہ قریب گئے -"

کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ کا غالباً اسی ندی کی طرف اشارہ ہے - اب یہ ندی بھی تقریباً خشک رہتی ہے البتہ موسم برسات میں خوب بہتی ہے -

**بان ندی:** امروہہ سے عمری اور عثمان پور جاتے ہوئے تقریباً چار پانچ میل پر بان ندی ہے - یہ بھی موسم برسات کے علاوہ تقریباً سارا سال خشک رہتی ہے - اس پر ٹریفک گزرنے کے لیے بہت بڑا پل بنا ہوا ہے - اس ندی کے اطراف میں بیشمار آموں کے باغات اور کھیت ہیں -

**کرولہ ندی:** بان ندی سے عمری کی طرف اور آگے جائیں تو کرولہ ندی ہے - یہ بھی ندی اور ندیوں کی طرح خشک رہتی ہے - البتہ موسم برسات میں پانی ہوتا ہے -

**گاگن:** یہ ندی بھی امروہہ اور عمری کے درمیان واقع ہے لیکن خشک رہتی ہے -

## تالاب:

امروہہ شہر کے چاروں طرف بڑے خوبصورت دلفریب تالاب تھے - برسات کے موسم میں ان تالابوں میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا تھا - امروہہ کے نوجوان لڑکے ان تالابوں میں نہاتے اور مچھلیاں پکڑا کرتے تھے - یہ تالاب کپڑے دھونے کا بہترین ذریعہ تھے - شہر کے دھوبی بیل گاڑیوں پر کپڑے رکھ کر یہاں لا کر دھوتے تھے - یہ کپڑے دھوتے ہوئے کچھ گاتے اور مستی میں "چھوا چھو' چھوا چھو" کہتے جاتے تھے - ان تالابوں میں سنگھاڑوں کی بیلیں ڈال کر بڑی مقدار میں سنگھاڑے پیدا کیئے جاتے تھے -

**پنواڑی / پانواڑی تالاب:** یہ تالاب جسے پنواڑی یا پانواڑی بھی کہا جاتا ہے بجانب غرب شہر سے ملحق واقع ہے - تالاب کے مشرقی کنارے پر امروہہ کی جامع مسجد اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ واقع ہے - مغربی کنارے پر بجنور جانے والی سڑک (ہائی وے) گزر رہی ہے - جبکہ شمال و جنوب میں کچے پکے مکانات اور باغات ہیں - گزشتہ چند برس پہلے یہ نہایت خوبصورت تالاب تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ امروہہ کا بہترین پکنک

پوائنٹ تھا- لیکن اب یہ تالاب یہاں کے لوگوں کی عدم توجہی اور لاپرواہی سے خشک ہوتا جارہا ہے- الحاج سید اصغر حسین کی کتاب "تاریخ اصغری" سے پتہ چلتا ہے کہ اس تالاب کا اصل نام پان باڑی تھا جس کے کنارے پانوں کی کاشت ہوتی تھی- لیکن گزشتہ برسوں میں یہاں پان کی کوئی کاشت ہوتے نہیں دیکھی گئی واللہ عالم- البتہ اس تالاب میں سنگھاڑے پیدا ہوتے دیکھے گئے ہیں- سیر و تفریح کے یہ خوبصورت مقامات جو باشندگانِ امروہہ کی آئندہ نسلوں کے لیے اثاثہ تھے ایک ایک کر کے ختم ہوتے جارہے ہیں-

**چوڑوں والی:** چوڑوں والی ایک چھوٹا تالاب تھا جو پانواڑی تالاب کے جنوب میں واقع تھا- موسم برسات میں پانواڑی اور چوڑوں والی دونوں تالاب آپس میں مل جاتے تھے- لیکن اب خشک ہو چکا ہے-

**بھوڑوں والی:** یہ تالاب نتھے خاں کے مسجد کے عقب میں واقع تھا- یہ بھی اب پاٹ دیا گیا ہے-

**حوض کٹورا:** یہ تالاب جو اب خشک ہو چکا ہے پیر شاہ اَبّن صاحب کے روضے سے متصل واقع تھا-

**رام تلاؤ:** یہ تالاب تقریباً خشک ہے- کچھ تھوڑا بہت پانی ہے جس میں سنگھاڑے پیدا کیئے جاتے ہیں-

**پیلاڈِگی:** یہ چھوٹا سا تالاب اسٹیشن روڈ پر واقع تھا- گزشتہ برسوں میں پاٹ کر کوٹھی تعمیر کر لی گئی ہے-

**کوشک رکشک تالاب:** لفظ کوشک جس کے معنی 'محل' ہیں بگڑ کر کشک کہا جانے لگا- یہ تالاب جس کا اب کوئی وجود نہیں بجانب شرق مراد آبادی دروازے سے ملحق واقع تھا- امروہہ کی مختلف تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ تالاب کے کنارے پر قلعہ تھا جو سید عبدالماجد بن سید عبدالخالق بن شاہ ابوالحسن بن سید محمد میر عدل نے تعمیر کرایا تھا- قلعہ کی کھدائی سے یہاں ایک بہت بڑا گڑھا بن گیا جسے برساتی پانی نے تالاب کی شکل دے دی- اب اس تالاب کا بھی کوئی نام و نشان باقی نہیں-

**امروہہ کے کنویں:** امروہہ میں بہت سے مشہور کنویں ہیں اور کئی محلوں کے نام تو ان کنوؤں کے نام پر رکھے گئے تھے جیسے ملا امان کا کنواں' کھاری کنواں' بھوری کنواں' کالا کنواں' بائس کا کنواں وغیرہ- ہر چند کہ ان کنوؤں کی اپنی کوئی نہ کوئی تاریخ ضرور ہو گی مگر اس بارے میں کوئی تحریری بات نظر نہیں آئی-

-☆☆☆-

# محلوں کے نام اور وجہ تسمیہ

**احمد نگر:** سید عبدالماجد ولد سید عبدالخالق کے چار بیٹوں میں ایک سید احمد تھے جن کے نام سے یہ محلّہ مشہور ہوا

**ارزانی پوتہ (بگلہ):** سید یٰسین ولد سید راجہ کے بیٹے سید ارزانی کی اولاد اس محلّہ میں بود و باش رکھتی ہے-لہذا بتدامیں یہ محلّہ ارزانی پوتہ کہلایا- لیکن بعد میں اس محلے کا نام بگلہ ہو گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس محلے کے درختوں پر بکثرت بگلے بیٹھتے تھے-

**بارہ پوتوں:** ملا شیخ معین الدین اس جگہ آکر ساکن ہوئے ان کے بارہ بیٹے تھے لہذا اس محلّہ کا نام بارہ پوتوں کا محلّہ مشہور ہوا-

**بادشاہی چبوترہ:** سلاطین دہلی کے زمانے میں ایک تھانہ تھا جو بادشاہی چبوترہ کہلاتا تھا-

**بٹوال:** بٹوال کے معنی راہ کا محافظ کے ہیں 'بٹ (راہ) وال (محافظ)-روایت ہے کسی سرکار نے کسی خاندان کو محافظ راہ مقرر کیا تھا- جب ہی سے اس محلے کا نام بٹوال مشہور ہوا-

**بختاور سنگھ کا کٹرہ** روایت ہے کہ ساڑے تین سو سال پہلے صورت سنگھ کے بیٹے دولت رائے دفتر شاہی میں افسر تھے-حسن کارکردگی کے صلے میں راؤ سرفراز ملا-ان کے بیٹے رائے بختاور سنگھ تھے جنکے نام سے یہ محلّہ بختاور سنگھ کا کٹرہ مشہور ہے

**بڑادربار** اس محلے کی وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی-

**بھوکوں** کسی بزرگوار نے بادشاہ دہلی کے حضور مین عرض کیا تھا کہ میں بھوکا ہوں لہذا بادشاہ وقت نے ایک گاؤں عطا کیا-اس کے بعد وہ بزرگوار اسی مقام پر مقیم ہوئے اس سبب سے اس محلے کا نام بھوکا ہوا-

**بیگم سرا** اس محلے کو سید غلام اسداللہ خان عرف میر کلو کی زوجہ نے 'جو بیگم صاحب کہلاتی تھیں' بسایا تھا-

اس سبب سے بیگم سرائے مشہور ہوا۔

**پچدرہ** اس جگہ شیخ عبدالقادر نے پانچ دروں والا ایک مکان بنوایا تھا جو کسی مسجد کی اراضی پر بن گیا تھا۔ بعد میں اس مکان کو قاضی سید یار محمد کے حکم سے منہدم کرادیا گیا تھا۔ اسی مکان کے پانچ دروں پر اس محلے کا نام پچدرہ مشہور ہو گیا۔

**پنواڑی:** یہ محلہ پنواڑی تالاب کے نام سے موسوم ہے۔

**پرانی سرائے:** اس مقام پر سید عبدالماجد رہائش گاہ تھی۔ بعد میں وہ یہاں سے بڑا دربار منتقل ہو گئے ان کی پرانی رہائش گاہ پرانی سرائے کے نام سے مشہور ہو گئی۔

**پیرزادہ:** اس محلہ میں بیشتر لوگ حضرت پیر شاہ امنؒ کی اولاد ہیں۔ اسی سبب سے محلہ پیرزادہ مشہور ہوا۔

**جاٹ بازار:** اس بازار میں قوم جاٹ کے لوگوں کی دکانیں تھیں۔

**جھنڈا شہید:** یہاں پر کسی شہید بزرگ کا مزار ہے۔ اسی سبب سے اس محلے کا نام جھنڈا شہید مشہور ہوا۔

**چاہ شور:** یہ محلہ ایک کنویں کے نام سے مشہور ہے جس کا پانی کھاری ہوتا تھا۔

**چاہ غوری:** عہدِ بلبنی میں کچھ عرصہ 'خواجگی امروہہ' پر ملک اعزالدین غوری مامور رہا۔ اسی کے نام سے منسوب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی گوری نام کی عورت نے بنوایا تھا اور اسی کے نام سے گوری کنواں مشہور ہوا۔

**چکلی:** ابتدا میں یہاں کچھ گھر طوائفون کے تھے جس کے سبب سے اس محلہ کا نام چکلی ہوا۔

**چوک:** وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے کئی سمتوں کو جانے والے راستوں کی وجہ سے اسے چوک کہا جانے لگا ہو۔

**چھیوڑہ:** چھیوڑہ تالاب جو اب نہیں ہے اس کے کنارے واقع ہونے کے سبب سے اس محلے کا نام اسی تالاب کے نام سے مشہور ہو گیا۔

**حقانی:** سید لطف علی شاہی منصب دار، جنہیں شاہی خطاب حقانی دیا گیا تھا، اس جگہ رہائش پذیر تھے۔ اسی سبب سے اس محلّہ کا نام حقانی مشہور ہوا۔

**دانشمندان:** سید اشرف بن سید سعید خان، جو نہٹور سے امروہہ آئے تھے، ان کا لقب دانشمند تھا۔ ان کے لقب سے اس محلے کا نام دانشمندان کا محلّہ مشہور ہوا۔

راجہ سرائے: روایت ہے کہ اس محلے کو مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت کے پوتے سید راجح عرف سید راجا ولد سید عبدالعزیز نے آباد کیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سرائے کسی راجہ کے وقت کی تھی۔

**رزاق کا بازار** یہاں سید عبدالرزاق ولد سید عبدالباری، جو سید ابوالحسن ولد سید محمد میر عدل کے پوتے تھے، سکونت پذیر تھے۔ انہیں کے نام سے یہ محلّہ مشہور ہوا۔

سٹی: روایت ہے کہ یہاں کے بازار میں سوت بکا کرتا تھا لہذا اسی سبب سے مخفف ہو کر سٹی مشہور ہوا۔

سدو: سدو کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔

**شاہ علی سرائے:** سید شاہ علی برادر شاہ گدا کے نام سے مشہور ہوا۔

**شفاعت پوتوتہ:** سید عبدالوالی کے بیٹے دیوان سید محمد شفاعت کے نام سے مشہور ہوا۔

صابن گردں: یہاں کے لوگوں کا پیشہ صابن بنانا تھا۔

کٹرہ غلام علی: یہ محلّہ سید غلام علی نے آباد کیا تھا۔

قاضی زادہ: میر علی بزرگ، جو قاضی القضات ہند تھے، ان کی اولاد یہاں رہائش پذیر ہوئی۔ اسی نسبت سے قاضی زادہ مشہور ہوا۔

کالا کنوین: یہ کنواں کسی کالے شخص نے بنوایا تھا جس کے نام سے کالا کنواں مشہور ہوا۔

کالی پگڑی: سید امانت علی کے اجداد میں شاہ شکر اللہ شیرازی اپنے سر پر سیاہ پگڑی باندھتے تھے۔ لہذا محلے کا نام کالی پگڑی مشہور ہوا۔

**قریشی:** وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی۔

**کٹکوئی:** روایت ہے کہ یہاں کسی وقت میں کوئی کاٹ کا کنواں تھا۔کاٹ کنواں سے بگڑ کر کٹکوئی ہو گیا۔

**گذری:** یہ محلّہ امروہہ کے بڑے بازار جانے کی گزر گاہ تھا۔اس گزر گاہ میں بھی دکانیں بننے کے سبب سے یہ محلّہ گذری کہلانے لگا۔

**لکڑوں:** سید سعید خان جو بہت طاقتور تھے۔ایک مرتبہ انہوں نے ایک بہت بڑا لکڑ کنویں میں ڈال کر نکال لیا تھا۔اسی سبب سے اس محلے کا نام محلّہ لکڑا پڑ گیا۔

**مجاپوتوں:** ڈاکٹر عظیم حیدر امروہوی (مرثیہ نگار) کے اجداد میں سید عبدالمجید عرف مجا کے نام سے اس محلے کا نام مجاپوتہ مشہور ہوا۔

**مچھر ہٹہ:** اس محلے کے بازار مین مچھلیاں فروخت ہوتی تھیں۔لہذا نام اسکا مچھر ہٹہ مشہور ہوا۔

**ملّا امان کا کنواں:** یہ کنواں ملا امان نامی کسی شخص نے بنوایا تھا۔اسی کے نام سے مشہور ہے۔

**ملّانا:** اس محلے کے اکثر لوگ مولوی ہیں۔اسی لیے اسے محلّہ ملّانا کہتے ہیں۔

**مناف کا گھیر:** شیخ عبدالمناف بادشاہی منصبدار کے نام سے موسوم ہے۔

**نوگمیاں:** وجہ تسمیہ اس محلے کی تحقیق نہو سکی

**نوگزہ:** ایک نوگز کی قبر کے نام موسوم ہے۔لیکن یہاں کوئی نوگز کی قبر واقع نہیں ہے۔

**نوبت خانہ:** روایت ہے کہ امبارانی کا نوبت خانہ تھا۔جہاں بعد کے راجاؤں کے دور میں بھی نوبت خانے کے طور پر رہا۔اس سبب سے نوبت خانہ مشہور ہوا۔

-☆☆☆-

# حاجی بابا رتن سین

امروہہ کے اطراف میں بھی اولیاء کرام کے بہت سے مزارات ہیں- حال ہی میں ایک دن امروہہ میں کچھ دوستوں کے ساتھ اولیاء کرام سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی- اس وقت مجھے کراچی سے نکلنے والے سائنس ڈائجسٹ کا خیال آیا جس میں چاند سے متعلق ایک مضمون تھا- اس مضمون میں شق القمر کا بھی واقعہ کچھ اسطرح تحریر تھا: "وسط ہند کے مغربی حصے میں سطح مرتفع مالوہ پر دریائے چمبل کے کنارے ریاست دھر کا والی راجہ بھوج اپنے محل کے باغ میں رات کے درمیانی حصے کے پرسکون لمحات میں چاندنی رات سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس نے چاند کو دو حصوں میں اس طرح منقسم ہوتے ہوئے دیکھا کہ اس کے دونوں حصے ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے تھے- یہ سمجھ کر کہ شاید دنیا کا آخری وقت آن پہنچا ہے اس نے شور مچادیا- وسط ہند کے لاکھوں باشندوں نے یہ حیران کن منظر دیکھا-

پنڈتوں نے مختلف قدیم ویدوں کو کھنگالنے کے بعد اس بات کی نشاندہی کی کہ بھیشیہ پوران کے سترہویں باب میں یہ پیشن گوئی ملتی ہے کہ عرب میں ایک عظیم شخصیت پیدا ہوگی جن کا نام محمدؐ ہوگا اور جن کی تعلیمات کا اثر پوری دنیا میں پہنچے گا- ان کے معجزوں میں سے ایک معجزہ چاند کا شق ہونا ہے- اور یہ کہ جو لوگ اس رسول کامل کی تعلیمات کی پیروی نہ کریں گے وہ دونوں جہان میں نقصان اٹھائیں گے- یہ سن کر راجہ بھوج نے فوراً اپنے مہامنتری کو عرب روانہ کیا- اس نے مکہ پہنچ کر رسولؐ اللہ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا- آپ نے راجہ بھوج کے لیے اسلامی نام عبداللہ تجویز کیا- مہامنتری کے واپس پہنچنے پر راجہ بھوج نے بھی خوشی خوشی اسلام قبول کیا اور عبداللہ کا نام اپنایا- اسی راجہ بھوج عرف عبداللہ کی قبر آج بھی قصبہ دھر کے نزدیک واقع ہے- (صفحہ ۱۰ اسرار تصوف، شائع شدہ لاہور ایڈیشن مئی ۱۹۲۵ء-)"

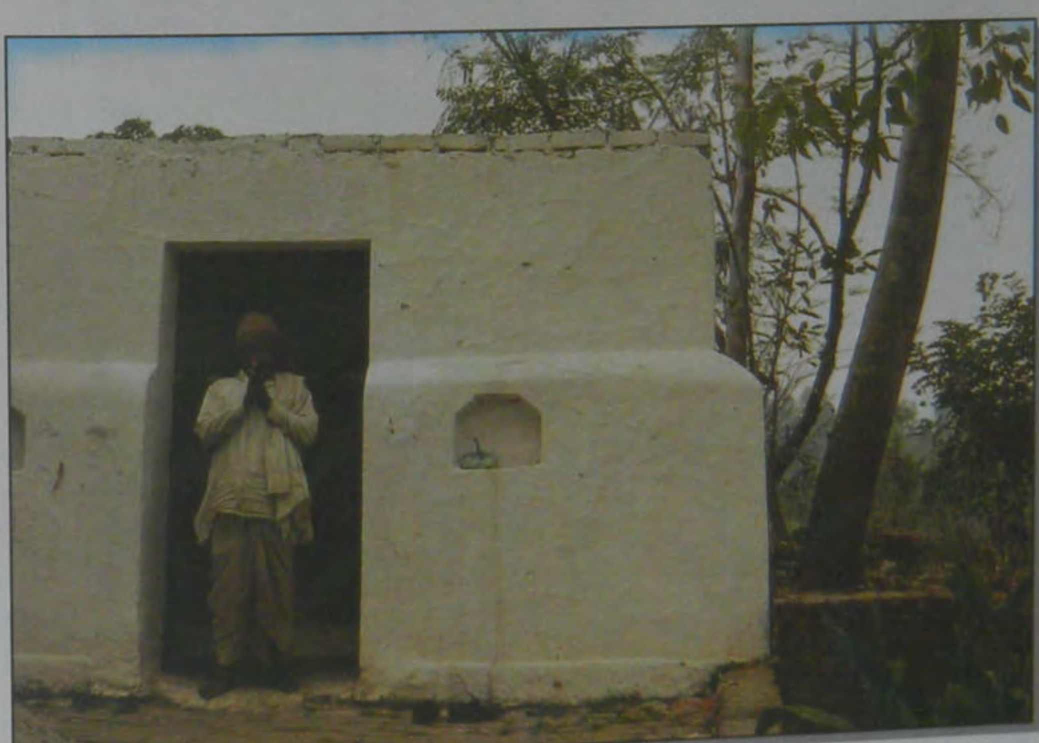
سائنس ڈائجسٹ کے اس مضمون کا ذکر کیا تو ایک صاحب نے بتایا ایک ایسا مزار یہاں پر بھی ہے جو امروہہ سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر گھاوڑی میں واقع ہے، ان کا نام حاجی پنڈت رتن سین ہے- ان کے متعلق بھی یہ روایت ہے کہ وہ شق القمر دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے- رتن سین کی بابت سن کر ان کا مزار دیکھنے کی مجھے بڑی خواہش ہوئی- چنانچہ اگلے دن پنڈت رام ناتھ، بھونیش شرما اور میں گھاوڑی روانہ ہوئے جو امروہہ سے ۲۶ میل کے فاصلے پر بجانب غرب واقع ہے- تقریباً دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہم گھاوڑی پہنچ گئے-



امروہہ کے قریب اعظم پور باشٹہ میں حضرت عبد القدوس سبحانیؒ کے مرید شاہ عبد الغفورؒ کا مقبرہ



شہنشاہ اکبر کے دور کے صوبہ دار طالب خاں کا مزار



امروہہ کے قریب گھاوڑی میں حاجی رتن سین کا مزار

یہ بڑا سرسبز علاقہ تھا- جس طرف نظر جاتی تھی سوائے ہرے بھرے کھیت اور باغات ہی نظر آتے تھے- چاروں طرف خاموشی اور سناٹا تھا- وہاں پہنچ کر اب ہم کسی سے مزار کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے- لیکن کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، کچھ دور آگے گئے تو ہمیں ایک چھوٹا لڑکا ملا جو گائے ڈھور چرا رہا تھا- ہم نے اس بچے سے پوچھا کہ حاجی رتن سین کا مزار کہاں ہے؟ لڑکے نے ایک گھنے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہے- ہم اس کے بتائے ہوئے راستہ پر گئے تو تھوڑی دور پر ایک کچا کمرہ بنا ہوا نظر آیا جس کے قریب ایک پلیٹ فارم (شاید نماز کے لیے) بنا ہوا تھا- پلیٹ فارم کے قریب زمین سے پانی نکالنے کے لئے ایک ہینڈ پمپ بھی لگا ہوا تھا- یہاں پر ایک کھلا میدان بھی تھا جس کے چاروں طرف گھنے درخت آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آرہے تھے- ایک طرف ایک اسکول کی عمارت بھی تھی جو شاید چھٹی ہونے کی وجہ سے بند تھی-

کمرے کے پاس جاکر میں نے اس کمرے کے دروازے کھولے تو وہاں ایک قبر دیکھی جس کے سرہانے دیوے رکھے ہوئے تھے- میں نے پہلے تو فاتحہ پڑھی پھر باہر آکر مزار کا فوٹو لیا- رام ناتھ صاحب اور شرما صاحب قریب میں ایک گنے کے کھیت میں ایک ہندو جاٹ کے پاس مزار کی بابت معلومات کرنے چلے گئے- یہ ہندو جاٹ اپنے کھیت میں کچھ آدمیوں کے ساتھ گنے کاٹ رہا تھا- میں بھی فوٹو لے کر وہاں پہنچ گیا اور میں نے بھی اس جاٹ سے چند سوال کیے- اس کا نام میوا رام تھا جو انتہائی بااخلاق شخص تھا- اس جاٹ نے بتایا، مجھے زیادہ معلومات تو نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ راجہ کے رتن (وزیر) تھے- کسی زمانے میں انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور حج کرکے آئے تھے- پھر اس نے مزید کہا کہ ان ہی کی وجہ سے ہمارے گاؤں میں بڑی برکت ہے اور ہم تو ان ہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں- میوا رام کی اس مزار سے ایسی عقیدت اور اتنا بااخلاق دیکھ کر میں بڑا متاثر ہوا-

اس کے بعد میوا رام نے ہمیں بتایا کہ یہاں اور بھی قدیم مزار، مسجد اور مقبرے ہیں- ہم نے اس سے ان کو بھی دیکھنے کی خواہش کی تو وہ ہمیں لیکر گھنے جنگلوں میں لے گیا جہاں ہم نے شہنشاہ اکبر کے دور کی مسجدیں اور کچھ بہت ہی خوبصورت مقبرے دیکھے- وہاں پر ایک صاحب (مسلمان) نے بتایا کہ ان مقبروں میں ایک مقبرہ شاہ عبدالغفور صاحب کا ہے جو حضرت عبدالقدوس سبحانی (جن کا مزار گنگوہ میں ہے) کے مرید تھے- انہوں نے ہی شاہ عبدالقدوس کو خلافت دی تھی (صفحہ ۳۷ رود کوثر)- ان صاحب نے مزید بتایا کہا ابوالفضل اور فیضی بھی یہاں کے رہنے والے تھے- شہنشاہ اکبر دور کے صوبہ دار طالب خاں کا مزار بھی ہے-

-☆☆☆-

# توصیف امروہہ

(اثر خامہ: مولوی سید حبیب احمد صاحب افق امروہوی)

اگر چہ ایک شہر مختصر ہے، شہر امروہہ — بہت آباد و خوش منظر نگر ہے شہر امروہہ
ہے یہ سادات کا مسکن یہ ہے اشرف کا مخزن — اصالت کا نجابت کا تو گھر ہے شہر امروہہ
یہ معدن عالموں کا ہے، یہ مخزن ہے حکیموں کا — مقامِ اولیائے نامور ہے شہر امروہہ
امیروں کا یہ ملجا ہے وزیروں کا یہ ماوا ہے — رئیسوں، حاکموں کا مستقر ہے شہر امروہہ
بسے نامی گرامی خانداں سادات کے اتنے — بجا ہے گر کہوں سید نگر ہے شہر امروہہ
گہر ہائے گرانمایہ کا ہے اک بحر بے پایاں — نمائش گاہ صد عالی گہر ہے شہر امروہہ
یہاں جھنڈا گڑا ہے سید سالار غازی کا — حسام ابن حیدر کی سپر ہے شہر امروہہ

## شہداء

یہاں مرقد براہیم شہید و شہ سلیماں کے — جہاد و فتح مسلم در نظر ہے شہر امروہہ
مزارات شہیداں سے یہ اک گنج شہیداں ہے — مسلمانوں کا میدان ظفر ہے شہر امروہہ

## مشائخ

اقامتِ گاہ سید احمد گنج رواںؒ یعنی — امام الصوفیہ کا مستقر ہے شہر امروہہ
ولایت گاہ سید شرف الدین حسن یہ ہے — اسی سے تو شرف میں نامور ہے شہر امروہہ
ادھر سید اعزالدینؒ ادھر شاہ نصیر الدین — انہیں سے عزت و نصرت کا گھر ہے شہر امروہہ
ادھر ہیں قاضی عبداللطیف شہ معین الدین — مقام سید ابدالؒ ادھر ہے شہر امروہہ
شہ اشرف جہانگیر و شہ چاند و فاروقی — یہاں آسودہ ہیں ان کا مقر ہے شہر امروہہ
شہ ابنؒ شہ عبد المجید و شاہ گھاسیؒ کا — اقامت گاہ، مولد اور گھر ہے شہر امروہہ
شہ عبد الحکیم نامور آں گوہر یکتا — کہ یکتائی سے جن کی باخبر ہے شہر امروہہ
جناب شہ گدائے قادری و شاہ شکر اللہ — بزرگ ایسے ہیں جن سے مشتہر ہے شہر امروہہ
جناب شاہ عضد الدینؒ و عبد الہادی چشتی — وہ نامی ہیں کہ جن سے نامور ہے شہر امروہہ

امام الا تقیا مولانا سید شاہ ضیف اللہ ۔۔۔ کہ نازاں جن کے علم و فقر پر ہے شہر امروہہ
وہ مولانا امانت اور شاہ قیام الدین ۔۔۔ کہ جن سے فیضیاب و بہرہ ور ہے شہر امروہہ

## علماء

وہ ملائے نظام الدین قریشی صاحب فطنت ۔۔۔ کہ جن کے علم و فن سے بہرہ ور ہے شہر امروہہ
وہ قاضی میر علی، قاضی کبیر و قاضی سالار ۔۔۔ کہ جن کا مظہر علم و اثر ہے شہر امروہہ
گرامی مرتبت مولانا رکن الدین عباسی ۔۔۔ وہ عالم تھے کہ جن سے مفتخر ہے شہر امروہہ
وہ میر عدل وہ سید محمد عالم و حاکم ۔۔۔ کہ جن کے عدل سے عادل نگر ہے شہر امروہہ
وہ ملائے الہداد وحید العصر عباسی ۔۔۔ کہ جن کے علم سے بغداد فر ہے شہر امروہہ
اگر مسکن ہے یہ مولانا فتح اللہ غازی کا ۔۔۔ تو ملائے امان اللہ کا گھر ہے شہر امروہہ
وہ دانشمند یکتا یعنی سید اشرف نامی ۔۔۔ کہ دانشمندیوں کا جن سے گہر ہے شہر امروہہ
شہ عبد العزیز آں شیخ وقت و عالم یکتا ۔۔۔ کہ جن کے علم سے مشہور تر ہے شہر امروہہ
حکیم و عالم یکتا محمد با حسن فاضل ۔۔۔ کہ نازاں آپ کی تفسیر پر ہے شہر امروہہ
محدث بے بدل علامہ احمد حسن صاحب ۔۔۔ کہ جن سے علم دیں میں نامور ہے شہر امروہہ
وہ اہل علم و دانش مولوی اولاد حسن صاحب ۔۔۔ کہ جن کے علم و فن سے باخبر ہے شہر امروہہ
فرید العصر نجم الملت آں نجم الحسن صاحب ۔۔۔ کہ جن کی ذات سے مشہور تر ہے شہر امروہہ

## امراء

امیر ابو المعالی و ابو الفضل و ابو القاسم ۔۔۔ وہ ہیں تیغ آزماں جن کی سپر ہے شہر امروہہ
وہ صدر صوبہ سنبھل جناب شاہ نور الدین ۔۔۔ کہ جن کی ذات سے نور نظر ہے شہر امروہہ
وہ سید عبد وارث فوجدار عہد مغلیہ ۔۔۔ کہ فاخراب بھی جن کے نام پر ہے شہر امروہہ
وہ دیوان سید محمود عبد الماجد ذیشاں ۔۔۔ کہ جن سے مایہ دار زیب و فر ہے شہر امروہہ
جناب میر کلو اور وہ سید علی اعظم ۔۔۔ کہ جن کی عظمتوں سے باخبر ہے شہر امروہہ
وہ درویش علی خاں ذی وجاہت صاحب منصب ۔۔۔ کہ جن کی منزلت سے باخبر ہے شہر امروہہ

زعیم الہند نواب وقار الملک لاثانی / وہ لیڈر تھے کہ جن پر مفتخر ہے شہر امروہہ

## اطباء

حکیم برکت اللہ وہ معالج شاہ غازی کے / دکن میں جن سے اب تک نامور ہے شہر امروہہ
مصنف وہ قرابادین کے یعنی جلال الدین / کہ فن طب میں جن سے ذی اثر ہے شہر امروہہ
حکیم عسکری امجد علی خاں و کفایت خاں / جہان طب میں جن سے مشتہر ہے شہر امروہہ
حکیم احمد سعید اپنے زمانہ کے ارسطو تھے / ثناخواں جن کا اب تک سر بسر ہے شہر امروہہ
حکیم عبد السلام و عبد قیوم قریشی سے / اطباء اور طب کا مستقر ہے شہر امروہہ
حکیم نامور حامد حسن افسر اطباء کے / دکن میں جن کے دم سے مشتہر ہے امروہہ

## شعراء

سعادت، مصحفی، عارف، عطا، احسن صفی، ساکت / وہ شاعر ہیں کہ جن سے نامور ہے شہر امروہہ
سلیم و حامد و داؤد شاعر اور نسیم اختر / کہ نازاں جن کے حسنِ شعر پر ہے شہر امروہہ
کہاں تک میں بزرگان وطن کا تذکرہ لکھوں / ہزاروں نامیوں کا مستقر ہے شہر امروہہ
یہاں صوفی، یہاں واعظ، یہاں ناظم، یہاں ناثر / غرض ہر فن کے استادوں کا گھر ہے امروہہ
یہ معدن خوش نویسوں کا، یہ مخزن باکمالوں کا / سراپا مرکز اہل ہنر ہے شہر امروہہ
یہاں آب و ہوا خرم بہت دلکش یہاں موسم / مناظر میں عجب فرحت اثر ہے شہر امروہہ
یہاں ابن بطوطہ اور بہت سیاح آئے ہیں / تماشا گاہ صد اہل سفر ہے شہر امروہہ
ہمیشہ سے یہ ہے اہل صلاح و خیر کا حامی / ہمیشہ سے عدوئے اہل شر ہے شہر امروہہ
زمانہ بھر سے کیوں اچھا نہ سمجھوں اے افق اس کو / مرا پیارا وطن ہے میرا گھر ہے شہر امروہہ

☆☆☆

## تصویر کا دوسرا رخ

یہ تم نے سن لیا خوش ہو کے اب کچھ اور بھی سن لو / کہ ان اوصاف سے اب دور تر ہے شہر امروہہ
یہ تھے اسلاف کے جوہر مگر اخلاف ہیں بد تر اب / بس اب تو جہل و نادانی کا گھر ہے شہر امروہہ

نہ فقر و زہد و عرفاں ہے نہ علم و فضل و تقویٰ ہے    طریق و شرع سے اب بے خبر ہے شہر امروہہ
نہ وہ شانیں نہ وہ آنیں نہ وہ عظمت نہ وہ شوکت    کہ اب بیگانۂ علم و ہنر ہے شہر امروہہ
تنزل ہو رہا ہے رات دن ہر ایک شعبے میں    ترقی سے نہایت بے خبر ہے شہر امروہہ
یہاں کی شان ہے اب غفلت و سستی و بیکاری    تماشا گاہ جہل و شور و شر ہے شہر امروہہ
نفاق و کینہ و بغض و حسد ہے خاندانوں میں    تعصب اور کج خلقی کا گھر ہے شہر امروہہ
ہوا افسوس مفقود آج ہم سے جوہر آباء    اسی باعث تو ہم پر چشم تر ہے شہر امروہہ
مکیں زیر زمیں ہیں اور یہ نقشہ ہے مکانوں کا    کہ گویا کوئی بابل کا کھنڈر ہے شہر امروہہ
ہماری شامت اعمال ایسا رنگ لائی ہے    کہ ہمکو آج اک بعث المقر ہے شہر امروہہ
خدارا اٹھو اے اہل وطن! تم خواب سے چونکو    ذرا دیکھو تو اب کس ڈھنگ پر ہے شہر امروہہ
ذرا سر در گریباں ہو کے اپنے دل میں سوچو تو    کہ تم پر کس لیے اب نوحہ گر ہے شہر امروہہ
زمانہ ہو گیا بیدار، دنیا ہوش میں آئی    مگر افسوس اب تک بے خبر ہے شہر امروہہ
چلو اسلافِ امروہہ کے آثار نمایاں پر    تمہیں محبوب اور پیارا اگر ہے شہر امروہہ
افق اس نظم سے اہل وطن اچھا سبق لیجیے    کہ آخر شہر اربابِ نظر ہے شہر امروہہ

-☆☆☆-

## امروہہ میں لکھی گئیں چند تاریخی کتابیں و شجرے

| | کتاب کا نام | مصنف / مولف / ناشر |
|---|---|---|
| ۱ | مقاصد العارفین: | حضرت شاہ عضد الدین محمد جعفری نے سنہ ۱۰۷۷ھ مطابق سنہ ۱۶۶۷ء میں تحریر کی۔ |
| ۲ | تاریخ اسراریہ: | سید کمال محمد ولد سید لال محمد نے ۱۱۰۰ھ مطابق ۱۶۸۹ء میں تحریر کی۔ |
| ۳ | جام جہان نما: | جام جہان نما (قلمی) غیر مطبوعہ قدرت اللہ صدیقی نے تحریر کی۔ |
| ۴ | خلاصۃ الانساب: | سید راشد علی راقم نے سنہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں تحریر کی۔ |
| ۵ | آئینہ عباسی: | محب علی عباسی نے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں تحریر کی۔ |
| ۶ | نخبۃ التواریخ: | سید آل حسن نخشبی نے سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں تحریر کی۔ |
| ۷ | تاریخ اصغری: | سید اصغر حسین نقوی نے سنہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں تحریر کی۔ |
| ۸ | تواریخ واسطیہ: | سید رحیم بخش نقوی نے سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں تحریر کی۔ |
| ۹ | شمس التواریخ: | حکیم نواب علی کنبوہ نے سنہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۰ | منزالمعرفت: | حکیم امجد علی کنبوہ نے سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۱ | تلخیص التواریخ: | سبط نبی کنبوہ نے سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۲ | شجرہ مبارکہ: | حکیم سید محمد حسن بڑپگے نے سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۵ | مراۃ الانساب: | ضیاء الدین احمد نقشبندی نے سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۶ | تاریخ امروہہ جلد اول: | مولانا محمود احمد عباسی نے ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۷ | تاریخ امروہہ جلد ثانی: | محمود احمد عباسی نے تحقیق الانساب کے نام سے ۱۹۳۰ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۸ | تذکرۃ الکرام: | مولانا محمود احمد عباسی نے ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں تحریر کی۔ |
| ۱۹ | تاریخ سادات امروہہ: | سید جمال احمد عرف خصال احمد نقوی نے سنہ ۱۳۵۱ھ مطابق سنہ ۱۹۳۲ء میں تحریر کی۔ |
| ۲۰ | تذکرۂ بدر چشت: | خورشید مصطفیٰ رضوی نے سنہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء میں تحریر کی۔ |

## ''کشورِ اولیا'' کی تصنیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے


| | | |
|---|---|---|
| ۱ | ''تواریخ واسطیہ'' | سید رحیم بخش نقوی |
| ۲ | ''مراۃ الانساب'' | ضیاء الدین احمد نقشبندی |
| ۳ | ''تاریخ اصغری'' | سید اصغر حسین نقوی |
| ۴ | ''تاریخ امروہہ جلد اول'' | مولانا محمود احمد عباسی |
| ۵ | ''تذکرۃ الکرام'' | مولانا محمود احمد عباسی |
| ۶ | ''تاریخ سادات امروہہ'' | جمال احمد عرف خصال احمد نقوی |
| ۷ | ''تذکرۂ بدرِ چشت'' | خورشید مصطفیٰ رضوی |
| ۸ | ''خلاصۃُ التواریخ'' | سبحان رائے بٹالوی مصنف ڈاکٹر ناظر حسین زیدی مترجم |
| ۹ | ''دربارِ آصف'' | غلام دستگیر |
| ۱۰ | ''آثار الصنادید'' | سر سید احمد خاں |
| ۱۱ | ''تاریخ فرشتہ'' | محمد قاسم فرشتہ |
| ۱۲ | ''تاریخ فیروز شاہی'' | ضیاء الدین برنی |
| ۱۳ | ''تحقیق الانساب'' | مولانا محمود احمد عباسی |
| ۱۴ | ''وقار حیات'' | مولوی محمد اکرام اللہ خاں |
| ۱۵ | ''رود کوثر'' | شیخ محمد اکرام |
| ۱۶ | گلدستہ ''نسیم چمن'' امروہہ | ۱۸۹۶ء |
| ۱۷ | گلدستہ ''اعجاز'' امروہہ | ۱۹۲۱ء |
| ۱۸ | گلدستہ ''بزم سخن'' امروہہ | سنہ ۱۹۱۶ء |
| ۱۹ | ''گلدستۂ ساداتِ امروہہ'' | امان علی نقوی، مستجاب احمد نقوی گھڑیال والے |
| ۲۰ | ''تریاقِ مشرق'' | سید حبیب احمد افق کاظمی امروہوی |

۲۱ ''ح خ'' خاکوں کا مجموعہ غیور حسن امروہہ

۲۲ ''علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں'' الطاف حسین بریلوی

۲۳ ''مرثیہ نگاران امروہہ'' ڈاکٹر عظیم حیدر امروہوی

۲۴ ''ارمغان نسیم'' ناشر انجمن سادات امروہہ پاکستان

۲۵ ''فیضانِ نسیم'' مولانا محب الحق فاضل جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ

۲۶ ''شجرہ مبارکہ'' حکیم سید محمد حسن بڑیکے

۲۸ ہفت روزہ ''سہارا'' نئی دہلی ۳۰/جون تا ۶/جولائی ۱۹۹۷ء

۲۹ روزنامہ ''جنگ'' کراچی

۳۰ مختلف رسائل، دیوان اور قلمی نسخے وغیرہ


-☆☆☆-

# امروہہ میں "کشورِ اولیا" کی تقریب اجراء

"کشورِاولیا" کی تقریب اجراء ۱۵/اپریل ۱۹۹۹ء کو امام المدارس انٹر کالج امروہہ میں منعقد ہوئی۔ تقریب میں شرکت کے لیے دہلی سے 'پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد صاحب فاروقی' آل انڈیا انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور جناب متین صدیقی جو روزنامہ "عوام" دہلی سے منسلک ہیں اور اس میں ہر روز ایک قطعہ لکھتے ہیں' تشریف لائے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد صاحب فاروقی نے کی۔ جناب قمر رضی صاحب نے مہمانِ خصوصی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عظیم حیدر صاحب نے انجام دیئے۔ کتاب کی رسمِ اجراء ڈاکٹر خلیق انجم کے دست مبارک سے ادا کی گئی۔ صدر اور مہمانِ خصوصی کے ساتھ اسٹیج پر ڈاکٹر محمد سیادت صاحب' ڈاکٹر منظر عباس' ابھینندن کمار جین' رام ناتھ شرما' بھونیش کمار' مشہور ہندی ادیب پروفیسر رام اودھ شاستری' ضلع کے ڈیولپمنٹ آفیسر کرشن چندر اور محمد ایوب صدیقی بھی رونق افروز تھے۔ سامعین میں امروہہ کی دانشور، ادیب' شعرا اور ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ یہ تقریب رات کے دو بجے تک جاری رہی۔

تقریب کے چوتھے دن محترم جناب حکیم کلبِ علی صاحب نے "کشورِاولیا" پر تبصرہ لکھ کر عنایت فرمایا۔ اُس وقت میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ تبصرہ اور امروہہ کی ایک عالم دین اور ممتاز شخصیت ڈاکٹر مولانا سید محمد سیادت نقوی کا ذکر بھی' جو حاصل نہ ہونے کے سبب "کشورِاولیا" میں نہیں کیا جاسکا تھا' شامل ہو جاتا! امروہہ جانے سے قبل پانچ سو کتابوں میں سے صرف پچاس کتابیں تیار ہوئی تھیں۔ جب میں واپس پاکستان آیا تو میری باقی کتابوں کی جلد سازی کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ جلد سازی کی تاخیر سے حکیم صاحب کا تبصرہ اور ڈاکٹر محمد سیادت صاحب کا ذکر بھی "کشورِاولیا" کی زینت بن گیا۔

-☆☆-

**ڈاکٹر محمد سیادت** ڈاکٹر محمد سیادت کے خانوادے کو علم و فضل کے اعتبار سے امروہہ میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے۔ آپ کے جد امجد اور دادا مولانا اولاد حسین سلیم اور والد محترم مولانا سید محمد عبادت اشرف المساجد امروہہ کے امام جمعہ والجماعت تھے اور ساتھ ساتھ اردو فارسی شعر و ادب میں انہیں بلند مقام حاصل تھا۔ ڈاکٹر مولانا سید محمد سیادت ہندو ڈگری کالج امروہہ میں شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف

ومولف ہیں اور تحقیق کی دنیا میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ سید علی نظر امروہوی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر آپ نے Ph.D. کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا سیادت صاحب اپنے جلیل القدر خاندان کی اعلیٰ روایتوں کے وارث ہیں اور جامع مسجد اشرف المساجد میں امام جمعہ والجماعت کے مقدس فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔ ادیان پر آپ کا مطالعہ نہایت عمیق ہے۔ اردو شعروادب پر ہندوستان میں آپ کی رائے کو صرف معتبر ہی نہیں بلکہ نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔

-☆☆-

## ''کشورِ اولیا'' ایک پاکیزہ تصور

محترم جناب حکیم کلبِ علی شاہدؔ

اخی العزیز احمد حسین صاحب صدیقی امروہوی ثم کراچی ماہ وسال کے اعتبار سے آپ میرے خورد کہے جاسکتے ہیں لیکن بزرگی بعقل است نہ کہ بہ سال صدیقی باعتبارات چند مجھ سے افضل وممتاز ہیں۔ میں صرف فنِ طب کا ادنیٰ طالب علم ہوں اور شعروادب سے فطری لگاؤ ضرور رکھتا ہوں۔ لیکن ان مراحل ومشاغل میں بھی کوئی امتیازی وخصوصی حیثیت مجھے حاصل نہیں اور صدیقی اربابِ سلطنت اور مشاغل حکومت کے اہم ترین شعبوں پر فائز والمرام رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فنون لطیفہ پر آپ کی دسترس فنکارانہ اور قادرانہ انداز کی ہے۔ جس جس کہنہ عمارت کو آپ نے اپنی کتاب میں مقام بلند عطا کیا ہے ان کی خستگی، کہنگی اور شکستگی کو چھپانے کے لیے آپ تمام وہ ذرائع کام میں لائے ہیں جنہوں نے اس یادگار کو مقبولِ نظر بنادیا ہے۔ فوٹو گرافر یا مصور تو ان کی ویرانگی کو جوں کا توں پیش کردیتا ہے مگر صدیقی صاحب نے اپنے ذوقِ نظر سے ان پژمردہ وکہنہ عمارتوں کو اس طرح سنوارا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اُس وقت حیرت زدہ ہونا پڑتا ہے جو اصل کو دیکھنے کے بعد صدیقی کی مصلحانہ مجددانہ کاوش دیکھ کر نقل کو اصل شکستگی سے کہیں زیادہ صحت پذیر اور حُسن وخوبی عطا فرمادی ہے۔ بعض عمارتوں کو دیکھنے کے بعد یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ اس شکستہ عمارت کو صدیقی صاحب حُسن وزیبائش کا لباس ہرگز نہیں پہنا سکے لیکن ان کی تصنیف کی آغوش میں یہ گُلِ سرسبد دیکھ کر ناظر کو صدیقی صاحب کی فنی جدت طرازی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ ''کشور اولیا'' کی آغوش میں بیشتر وہ شکستہ، خوردہ مقبرے، روضے، درگاہیں ایسی ملیں گی جنہیں دیکھ کر کہنگی وشکستگی کا تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس نادرہ کاری نے ان کی پیش کردہ تصویروں کو اور مرجعوں کو

اپنے خون جگر سے گلِ رنگ لالہ کار بنادیا ہے -یہی وہ مقام بلند و مقدس ہے جس کا اظہار اقبالؔ نے یوں کیا ہے -

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش

ہے رگ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

کشورِ اولیاایک پاکیزہ تصور، ایک مقدس تخیل اور ایک تحقیقی مقالہ ہے -اس کا مصنف بشری جلال و جمال کا آئنہ دار، انسانی اقدار کا سرمدی سرچشمہ ہے -کسی مقام پر اس کا قلم کج مج، زیاں اور الکن نہیں ہوا ہے -جس فرد کو اس نے رفتہ زبان میں اپنا شاہکار بنایا ہے اس کے فنی محاسن، علمی برتری اور ادبی و شعری ریاض کو اس کشادہ دلی سے پیش کیا ہے کہ اس کی پیش کردہ شخصیت کے تمام ارکان و عناصر کو متشکل و مصور کر دیا ہے کہ قاری کے سامنے یہ سب آجاتے ہیں -بیان میں وہ سادگی ہے جو ذکر میر کا طرۂ امتیاز 'شمس العلما محمد حسین آزاد کی نادرہ گفتاری اور فرحت اللہ بیگ کی سادہ و پرکاری سیرت نگاری کے چوکھٹے میں ڈپٹی نذیر احمد کی عظیم شخصیت کو فٹ کیا گیا ہے -لیکن اس اہتمام کے ساتھ صدیقی نے باطنی و ظاہری خوبیوں کو پیش کیا ہے کہ تصنع کی آمیزش ان کی تحریر میں بالکل نہیں ہے -فطری انداز میں روزمرہ کی زبان' لہجے کے ہر ہر نہج کو گفتار کی حلاوت کو' ہر جملے اور ہر لفظ کے حسن ادا کو ایسا مانوس و مقبول لباس پہنایا ہے کہ قاری ادنیٰ توجہ سے بلاغت و فصاحت کے اس ترقی رفتہ مقام تک پہنچ جاتا ہے جس تک احمد حسین پہنچانا چاہتے ہیں -جس طرح ان کا کیسرہ شگفتگی کو درستگی اوہ کہنگی کو جدت کی خلعت پہناتا ہے بالکل اسی طرز اظہار کو ان کی زبانِ قلم ہر شخص کے پرت در پرت کھول کر رکھ دیتے ہیں -یہ وہ مقام بیان و زبان ہے جس پر ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے -صدیقی کی تحریر پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور قاری یکجان اور دو قالب ہیں -جس طرح غالبؔ کے خطوط میں مکتوب الیہ غالبؔ کے پیش نظر نظر آتا ہے بالکل اسی نہج و طریق سے ''کشورِ اولیا' کا مصنف قاری کے پیش نظر رہتا ہے -مصنف کو آمنے سامنے بٹھانا انشا پردازی کی معراج ہے -اس بلند مرتبہ پر ہمارے صدیقی سو فیصدی کامیاب ہیں -اس کی بنا پر ان کے یہاں آورد نام کا سقم کہیں اور کسی مقام پر راہ نہیں پا سکا ہے -

احمد حسین صدیقی تاریخ جیسے موضوع کو تر دماغی سے تر و تازہ لالہ و گل کی قبا پہناتے چلے گئے -کاوش و تحقیق کی زنجیروں میں جکڑ کر خود کو واقعات و حالات کی ترازو میں اس طرح تولا ہے کہ العدل فی الصحت کا حق ادا ہوتا چلا گیا -ایک شے کو میں نے بہت دقت نظر سے تلاش کیا کہ آپ نے جن مقام پر اپنے اشہب خیال کو گوشہ گیر کیا ہے اس مقام کو جب دوبارا پیرایہ تخلیق پہنانا شروع کیا ہے تو سیاق و سباق میں کہیں کوئی ہلکی سی بے ربطی یا بیان کی

طراوت کو تو گزند نہیں پہنچا- مجھے بعد تلاش بسیاری کے یہ ناہمواری میسر نہیں آسکی-

''کشورِ اولیا'' صدیقی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس کی رسم اجراء امروہہ میں بڑے عظم و جمال کے ساتھ ادا کی گئی ہے- میں نے اس تصنیف کو دو راتوں میں جستہ جستہ پڑھا ہے- میں اس مقام پر پہنچا کہ احمد حسین صدیقی امروہوی کم تم کراچی زائد ہیں مگر ان عنقریت نے تلاش و تحسین اور تحقیق و محققین کی وہ راہیں اختیار کی ہیں جس سے آگاہ ہو کر بڑی حیرت ہوتی ہے- اس دبلے پتلے اور کم عمر شخص نے اتنا بڑا امور کیسے سر کر لیا- ایسا کہو جیسے ایک دو جگہ صدیقی صاحب نے عباسی صاحب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے- استنباط میں عباسی صاحب ساکت نظر آتے ہیں مگر صدیقی صاحب نے گوئے سبقت اٹھالی ہے جیسے مطالعہ آپ کو خود بتادے گا- ہندو مسلم اتحاد واشتراک جو امروہہ کا امتیاز رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا- اس ریت کو بھی صدیقی نے بالحسن وخوبی انجام دیا ہے- کتنے ہی مراحل اس تصنیف میں ایسے ہیں جہاں سے کدورت کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں لیکن صدیقی صاحب کی اخلاقی متانت اور تصنیفی تحمل نے انہیں اتحاد وانصاف سے باہر نہیں جانے دیا- یہ وہ مقام ہے جس پر بہت قدم ڈگمگا جاتے اور پاؤں پھسل جاتے ہیں- لیکن صدیقی اپنے متعین کردہ راہ سے کہیں اور کسی جگہ بھی سر مو نہیں ہوئے ہیں- احترام انسانیت کے زریں اصول کو انہوں نے ہر ہر مقام پر سینے سے لگا رکھا ہے-

احمد حسین اخلاص وعمل مالک نیاگان کہن سے اس درجہ متاثر ہیں کہ انہوں نے امروہہ کو اولیا کا قطعہ قرار دیا ہے اور نظریہ کی تہہ میں اعتدال 'اخلاص اور ذہن وضمیر کی بیداریاں آج کے انسان میں بیدار کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں- شرافت واخلاق کے یہ سانچے ٹوٹ رہے ہیں مگر صدیقی جیسے ولی بالحمد اللہ ابھی ہم میں موجود ہیں جو معاشرے کو مفشوش ہونے سے بچا رہے ہیں اور آئندہ بھی یہ جہاد احمد حسین ضرور کرتے رہیں گے- ان کا کمال یہ ہے کہ یہ قاری کو اس ماحول میں منظر تک کھلی آنکھوں تک پہنچادیتے ہیں جس کے اندرون اور بیرون کے تمام راز ورموز اس طرح سامنے آجاتے ہیں کہ قاری کو تحمل کا شائبہ تک نہیں ہوتا- ان عناصر اور ارکان کے ساتھ یہ میر انیس کے متبع ہیں

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم<br>
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مصنف ''تاریخ امروہہ'' ''تذکرۃ الکرام'' کی تحقیقی کاوش سراہنے کے قابل ہے مگر ان کا انداز سوداکا شعر اور ادبی انداز رکھتا ہے-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس تلخی کے باوجود مولانا محمود احمد عباسی کی کھوج، کاوش، تلاش بہت سے مقامات پر قابل صد داد ہے۔ اپنی اس جگر کاوی میں انہوں نے ہندو مسلمان دونوں کے تعلق کو اپنے پیش نظر رکھا اور استخراج اور استنباط میں چند مقام چھوڑ کر بے لاگ مورخ نظر آتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ تاریخیں جو دارالسلطنت اور شہروں میں لکھی گئی ہیں ان میں دباؤ، دھونس، تعریفِ حکومت، حصول مزد تحقیق کا جذبہ غالب ہوتا ہے لیکن جو تاریخیں گاؤں اور قصبوں میں لکھی جاتی ہیں اس میں تصنع نہیں ہوتا اس لیے انہیں مغشوش نہیں کہا جا سکتا۔ احمد حسین کا غائبانہ تیسرا صنفی شاہکار ہے اور ان تینوں تصانیف میں یہ اپنے دامن کو ہر داغ سے بہت دور رکھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اپنے اپنے موضوع پر انہیں معیاری وو قاری درجہ اہل علم و نظر اور دانشوروں کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

**صورت گری و تاریخ نویسی:** احمد حسین صدیقی نے اپنی سوانح عمری کی تحریر کی مشق و مزاولت کے دوران ایسا محسوس کیا کہ اگر میں اس سوانحی اور وارداتی مواد کو سہل ممتنع اور روزمرہ کی زبان میں پیش کروں تو زیادہ قریب الفہم اور زیادہ کار آمد ہوگا۔ "سیاحت ماضی" کی ترتیب و تحریر نے انہیں وہ حوصلہ عطا کیا جس کی مدد سے یہ اپنی اس پنہاں ادبی شخصیت سے روشناس ہوئے جو ادبی شخصیت ابھی معرض اظہار میں نہیں آئی تھی اور ذہن و ضمیر کے نہاں خانے میں محصور تھی۔ اس تجربہ نے صدیقی صاحب کو صاحب طرز مورخ کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور یہ اپنی اس تو دریافت مملکت نگارش کے شہریار بن گئے اور خود کو آگے بڑھاتے ہوئے کراچی کی تاریخ کی چھان پھٹک شروع کر دی۔ اس تلاش و تجسس نے انہیں کراچی کی تخلیق ترقی اور موجودہ دور کے ارتقا پذیر فتہ نقش ہائے رنگ رنگ میں حکومت کے منظر نامہ کی تبویب و تخلیق کے عالمی نقشے میں کراچی کو فٹ کرنا شروع کر دیا۔ ان کی اس جگر کاوی سے حکومت پاکستان اور کراچی کے دانشور سبھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ احمد حسین ثم کراچی بعد میں ہوئے پہلے امروہوی تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے وطن مالوف پر "کشور اولیا" کے نام سے مبسوط و مفصل تاریخ مرتب کی ہے جس میں انصاف و اعتدال اور تحقیق و تلاش کی پگڈنڈیوں سے گذرتے ہوئے تاریخ کے روشن شاہراہ پر پہنچ گئے۔ ان کی تصنیف جنبہ داری، قصیدہ گری اور ہجو کی تلخی سے کوسوں دور ہے۔ ہر طبقہ کے علاوہ فضلا اور دانشور "کشور اولیا" کو قدر و منزلت کی نگاہ سے

دیکھ رہے ہیں-امروہہ جو قدیم ترین بستی ہے اور اس کی خانقاہیں، درگاہیں اور حضیرے سالخوردہ اور شکستہ ہو چکے ہیں مگر احمد حسین نے اپنی خداداد صورت گری سے وقتی طور پر شباب کی منزل میں انہیں پہنچادیا ہے-ان کی کتاب میں ان کہنہ عمارتوں کو دیکھ کر ناظر حیرت زدہ ہو جاتا ہے-یہ اچھے نثر نگار، بے لاگ مورخ اور اعلی پائے کے صورت گر ہیں-ہندوپاک کی ادبی شخصیتیں اور تاریخی شعور رکھنے والی معتبر اور مشہور شخصیتیں صدیقی کو ہدیہ تحسین و تبریک پیش کر رہی ہیں اور چاروں طرف سے لبیک لبیک کی آواز آ رہی ہے-یہ صاف ستھری تصنیف اس صدی کی اعلیٰ ترین تصنیف قرار دی جا رہی ہے-ساکنان امروہہ اور اہل ہند صدیقی اور پاکستان کو اس عظیم تاریخ کی تصنیف پر داد دے رہے ہیں-

میرے وطن کے احمد حسین صدیقی تالفہ ہیں اور ان کی اس صلاحیت نے ''کشورِ اولیا'' کو زر سارا بنادیا ہے-مجھے قوی امید ہے کہ اب مستقبل میں کسی جدید تصنیف سے انشاءاللہ نوازیں گے-

آج ۱۸راپریل ۹۹ء کو باتوں باتوں میں ان کے برادر معظم محمد حسین صدیقی کی بابت جب معلوم ہوا کہ مرحوم ان کے بڑے بھائی تھے تو احمد حسین میرے دل کے ہر گوشے میں آباد ہو گئے-ساٹھ سال سے میری بزم ہر مکتبہ خیال کے فضلاء، ادبا اور شعراء کا مجموعہ رہی ہے-یہ وہ بزم ہے جس میں پختہ عمر کے صاحبان علم اپنے خورد سال شرکاء محفل کو بہت کچھ عطا کرتے رہے ہیں اور بزرگ رفقاء ان نونہالوں کے جدید مطالعے اور سائنس کی نت نئی تحقیق سے آشنا ہو کر خود ان کے حلقے تلمذ اور حلقہ قلمدان میں شامل ہو جاتے ہیں--یہ وہ محفل ہے کہ اس میں میں نے جتنے بزرگوں، ہم عمروں اور خوردہ سالوں سے وہ وہ علمی وفنی جہات حاصل کیں جن کی ضرورت آجکل ہمارے معاشرے کو درکار تھی-یہاں استاد بھی ہیں اور شاگرد بھی-یہ محفل شبانہ ایسی تربیت گاہ رہی ہے جس میں کوئی کسی کا شاگرد یا استاد نہیں ہے-اس تربیت گاہ کے ایک عنصر غالب محمد حسین بھی تھے-اگر دن میں شریک محفل نہ ہو سکے تو محفل شبینہ میں ضرور آتے تھے-اپنا کلام مجھے تنہائی میں سنانے کے عادی تھے-ایسے جوہر قابل تھے کہ شاید ہی کبھی کسی شعر پر توجہ دلانے کی ضرورت پیش آتی تھی-فکر خداداد سے گتھیوں کو سلجھانے کے عادی تھے-کسی شعر پر ذرا سی کنایۃً کوئی بات کہی تو انہوں نے بڑی سلیقہ مندی سے خود ہی اصلاح کرلی-قاضی عزیز احمد مرحوم اور شعیب احمد حزیں مرحوم سے دلی ربط و تعلق تھا-افکار و اعتقاد کے معاملے میں کشادہ فکر اور کشادہ ذہن رکھتے تھے ان کے ہمراہ عزیزی احمد حسین سیفی کے برادر معظم بھی اپنی پوری سنجیدگی کے ساتھ بزم شاہد میں شرکت کرتے تھے-یہ دونوں سعید الفطرت نوجوان

اکثر یاد آتے رہتے ہیں۔ محمد حسین صدیقی کے واسطے سے ان کی پہلی تصنیف "سیاحت ماضی" سے آشنا نہ ہو سکا اس کا مجھے بڑا ملال ہے۔

"سیاحت ماضی" کا صدیقی اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل جاتا۔ اس پر غم تازہ اور ہر فاقہ تازہ تھا لیکن واردات کی گوناگونی نے اس کے ماضی کو حال کا مرقع بنا دیا۔ بقول روش صدیقی :

چہرۂ دشت کو افسردہ و حیراں پا کر
دل مرا بھول گیا درد غریب الوطنی

اپنی غریب الوطنی میں دشت کی افسردگی شامل کر کے صدیقی صاحب نے خود کو مانوس غم بنا لیا۔ غموں کی اس قربت نے احمد حسین کو وہ دل درد آشنا عطا کر دیا جس میں فرد اپنی ذات سے نکل کر اجتماعی و انسانی اقدار کی کسوٹی پر ہر غم کو کس کر دیکھنے اور سہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اولیا کے مرز بوم میں قلم کی انگلی پکڑ کر صدیقی نے چلنے کی مشق شروع کر دی اور کوچہ و بازار میں اس سلامت روی کے ساتھ چلنا شروع کر دیا جس میں کسی اشکال و ابہام کو دخل نہ تھا۔ صفات و ذات کے ہفت خواں "کشور اولیا" میں سلیقہ مندی اور فکری اعتدال سے از اول تا آخر بے محابا وہ سب اپنے قلم کی گرفت میں لے لیا جس میں جان جوکھوں میں پڑ جانے کا امکان بہت زائد تھا۔ موجودہ امروہہ وہ حساس مقام بن گیا ہے کہ یہاں پست و بلند اور پیشہ ور و غیر پیشہ ور کے بہت سخت مقام آتے ہیں۔ ان مقامات سے دامن کو خارزاروں سے بچا کر سلامت روی کے ساتھ گذر جانا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ اسی کے ساتھ ایک عنصر ہے شیعہ سنی کا دوسرا ہے خاندانی نجابت و شرافت کا تیسرا ہے اقتصادی نابرابری کا۔ مگر ہمارے احمد حسین ان سب سے بقول شاد عظیم آبادی اس طرح گذر گئے

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

یہ منزل بھی صاحب "کشور اولیا" نے صبر ایوب سے کام لیکر اور صبر حسین کو اپنا رہبر بنا کر اسطرح ادا کر لی کہ ان عناصر کے تضادات سے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اپنے دامن کو ہر داغ سے محفوظ و مامون رکھا ہے ورنہ آج کے امروہہ میں اس موضوع کی کتاب کو معرض تنقید میں نہ لانا اور کسی جرگہ کا شکوہ بہ لب نہ ہونا معجزے سے کم نہیں ہے۔ اس اعتبار سے صدیقی لائق صد داد ہیں کہ امروہہ کی موجودہ ہیئت نے انہیں کیسے

معاف کر دیا اور بحث و تکرار اور مناظرے مجادلے کا بازار ''کشورِ اولیا'' کے کسی گوشے سے سر نہیں اٹھا سکا اسے صدیقی کی ولایت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ورنہ امروہہ کی اس کج بحثی و کم نظری نے اب تک کسی کو معاف نہیں کیا ہے۔ یہ پہلے ولی التصنیف ہیں اور غالبًا آخری مورخ ہیں جو اپنی پگڑی صحیح سلامت لے کر اپنے دار المقام میں آگئے۔ جزاک اللہ۔ دراصل احمد حسین نے اپنے قلم اور اپنی طرز نگارش کو کسی نہج، کسی نظریہ کی وردی نہیں پہنائی ہے۔ تاریخ کو تاریخ ہی رکھا ہے۔ تنقید تبصرہ اور قصیدہ بازی سے گریز و پرہیز کے حصار میں محصور کر کے کسی کی جنبہ داری کو اپنا شعار نہیں بنایا۔

**رمز ارکاسب حبیب اللہ شنو:** یہ مصرعہ حضرت مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کا ہے۔ اس کو مصرعہ نہ کہیے۔ یہ حدیث شریف ہے جس میں اسلامی معاشرے تہذیب اور اقتصادی نظم کو پیش کیا گیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ جو کسب کرتا ہے یعنی پیشہ اختیار کرتا ہے وہ پیشہ ور اللہ کا محبوب ہے۔ یعنی کسب کرنے والے سے اللہ محبت کرتا ہے اور کسب کی وجہ سے وہ عام انسانوں سے برتر و ارفع ہے۔ اب پیشے مختلف انداز کے ہوتے ہیں جیسے بڑھئی کا پیشہ، کپڑا بننے والے کا پیشہ، عمارت بنانے والے کا پیشہ، کھیتی باڑی کا پیشہ اور بزازی کا پیشہ جو ہمارے امام ابو حنیفہ کا پیشہ تھا۔ لہذا پیشہ ور اللہ کا حبیب اور دوست ہے۔ اس لیے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی محبوب ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں جو لوگ کسب نہیں کرتے اور باپ دادا کی جاگیر اور ملکیت پر قبضہ کر کے بغیر ہاتھ پاؤں ہلا کر بے عملی اور زندگی ناشناسی سے عیش و آرام اور غلط مشاغل میں غرق رہتے ہیں اور اپنے آبا و اجداد کی ہڈیاں یا ان کی املاک و جائداد کو بیچ کر دنیاوی زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس طبقہ کو زندگی کے ارتقا اور پاکیزگی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ زندگی ناشناس طبقہ معاشرے کا ناسور ہے جو معاشرے میں چھوٹے بڑے کی تمیز پیدا کرنے اور انسانیت کی فراغ و فروغ کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتا بلکہ آپس میں تفریق اور غیریت پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور نہ اس طبقہ کو زندگی کے ارتقا اور پاکیزگی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ زندگی ناشناس اور اسلام دشمن طبقے امت میں اونچ نیچ، چھوٹے بڑے، کمین و شریف کی کیچڑ اچھال کر ملت بیضا میں اختلاف پیدا کرنے میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ اپنے ان اعمال زبوں کے باعث افراد کے اتحاد اور اخوت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ بات بات پر جھگڑا، اختلاف اور باہمی رواداری کو پاش پاش کر رہے ہیں۔ اس برگشتگی سے اجتماعیت لہولہان ہوتی جا رہی ہے۔ حسن کردار، حسنِ عمل اور پاکیزگیٔ نفس کے عناصر افراد کی حیات سے غائب ہو رہے ہیں۔ انسانیت کو مختلف خاندانوں، خانوادوں اور دودمانوں میں تقسیم کر کے اجتماعیت

کے تصور کو گزند پہنچی-اس تناقص و تضادات ملت اسلامیہ ہند میں اخلاص واخوت کو برباد کر کے رکھدیا ہے-
آج بھی ہم میں وہ طبقہ موجود ہے جو اسلامی اخوت اور اپنایت کے بالعمل کو کوسوں دور کر کے جنگ وجدال کا میدان بنائے ہوئے ہے-ہر قوم اپنی قوم کے افراد میں تعلیم و ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں ہے مگر مسلمان اپنے اندر ہر وہ برائی پیدا کرتا چلا جارہا ہے جس سے افراد میں بغاوت و خصومت کے جراثیم پرورش پارہے ہیں-اندیشہ ہے کہ وہ بچے جو اس بگڑے ماحول میں پرورش پائیں گے وہ اپنے بچوں کی اصلاح کیسے کرسکیں گے اور حسنِ عمل کے ان نقشوں میں صداقت و عدالت کے رنگ کیسے بھر سکیں گے جو نقشے ان کے پاس بے رنگ و بے آبرو حالت میں ہیں-

صدیقی کو اللہ نے نفس مطمئنہ عطا کیا ہے اور یہ وہ نعمت مترقبہ ہے جو کسی کی کمزوری، افلاسِ علم سے دوری اور دوسری معاشرتی خامیوں سے محرومی کو لائق گرفت نہیں گردانتی-یہ اس لیے کہ یہ خامیاں کسی فرد کی اپنی فرد گزاشت کا نتیجہ نہیں ہیں یہ تو معاشرے کی اجتماعی نابرابری کی پیداوار ہیں-یہ نابرابری ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کے اندرون کو کھوکلا کر کے اور اس کے ذہن و ضمیر کو مضمحل و ضعیف اور نحیف و نزار بنا کر خود کو ناشناس اور نامراد بناڈالا ہے-آج کی عالمی علمی بیداری نے خستہ و خراب اور خفتہ و صور طبقہ کو علم کی دولت سے روشناس کیا تو اس نا ترقی یافتہ طبقہ کی انا جاگ اٹھی اور علم کی روشنی نے انہیں جگا کر خود شناس بنایا تو یہ طبقہ اپنے فطری تقاضوں کو بیدار کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اور خود آگاہ بننے میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے گوئے سبقت حاصل کر رہا ہے تو اس طبقہ کے افراد جس نے انہیں پامال کرڈالا تھا ان کی بیداری سے چڑتا ہے اور ارتقاپذیر رفتہ پوزیشن میں دیکھ کر اب تک معرض کم نظری کا شکار کرنا چاہتا ہے-جبکہ وقت نے اس پست طبقہ کو بلندی سے آشنا کر دیا ہے اور اب یہ افراد جاگ اٹھے ہیں اور آئندہ وقت کی زمام کارانہی کے دست مشکل کشا میں ہوگی اور اس کیمپ کا ہر ذرہ اپنے جوش عمل سے ذرہ ذرہ کو مقام شمس و قمر عطا کرنے والا ہے-ہمارا ''کشورِ اولیا'' کا مورّخ ہر طبقہ کو پنپنے، بڑھنے اور ترقی کی بلند سطح تک پہنچانا اپنا فریضہ منصبی تصور کرتا ہے-

**طرحی مشاعرے لکھنؤ رفاہ عام لائبریری:** لکھنؤ رفاہ عام لائبریری میں آل انڈیا مشاعرہ تھا-اس کی صدارت نواب حافظ احمد سعید آف چھتاری کرنے والے تھے جو صوبہ یوپی کے گورنر بھی تھے انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں گذشتہ سال کی اس بدمزگی کا ذکر فرمایا جو شعرا کو شکوہ بہ لب کر رہی تھی کہ مجھے پہلے کیوں پڑھوادیا اور فلاں کو جس کا فنی قد مجھ سے چھوٹا ہے بعد میں کیوں پڑھوایا گیا یہ کہتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میں

آج ابجد کے اعتبار سے شعرا کو دعوت سخن دینے کا مشورہ دونگا- کشتیٔ گل ہال کے بیچ میں تھی- شمع ہر شاعر تک پہنچائی جاتی تھی- یہ بات سنہ ۱۹۳۳ء کی ہے- اس دور میں مشاعرے طرحی ہوتے تھے- غیر طرحی مشاعروں کا رواج سنہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہوا ہے- مصرعہ طرح تھا جلال لکھنوی کا: (رفتار نبض بگڑی آیا عرق جبیں پر) ہیں کے قافیہ پر امتیازی شعر کہنے پر لائبریری کے بورڈ نے ڈھائی سو روپیہ کا انعام دینے کا اعلان کیا تھا- یہ اعلان مجھے اس شعر پر عطا کیا گیا- لکھنؤ کے سبز رنگ کے اخبار ''ہندوستان'' میں اس کی روداد چھپی تھی- شعر سنئے:

چکرا رہی ہے کشتی ٹکرا رہی ہیں موجیں
ہوگا ضرور ہوگا ساحل یہیں کہیں پر

اس بزم میں بڑے بڑے جغادری اور اساتذہ ابجد کی قید و بند میں طفلانہ صفوں میں بڑھ کر روبسور کر بیٹھ گئے- سب سے پہلے حضرت آرزو کو اس اصول کی بھینٹ چڑھایا گیا-

ہمارے صدیقی صاحب نے نواب احمد سعید خاں کے نسخہ سے کام لیکر دشنام طرازیوں سے خود کو محفوظ فرمالیا- یہ ان کی چھٹی حس کا کارنامہ ہے ورنہ شعرا اپنا ترکش خالی کر کے صدیقی کو چھلنی کر دیتے- اسی راس الاصول کی بناء پر ان کی یہ تصنیف گردِ ملال اور غبار تنقید سے محفوظ رہے گی ورنہ اسے میخانہ کہتے ہیں یہاں پگڑی اچھلتی ہے- احمد حسین نے اپنے دونوں ہاتوں سے اپنی دستار تھام رکھی تھی-

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتوں سے تھامئے دستار

انتخاب کلام کے باب میں بھی صدیقی نے اس اصول کو اپنا رہنما بنالیا کہ قدیم شعرا کا کلام مشاعروں کے مطبوعہ گلدستوں میں جس طرح انہیں میسر آیا اسی کو نقل کے مطابق اصل قرار دیدیا- اس باب میں صدیقی صاحب سے کچھ فروگذاشتیں ضرور ہوئی ہیں- ان فروگذاشتوں کی ذمہ داری احمد حسین پر نہیں ہوتی، ہم لوگوں کی کوتاہی سے ایسا ہوا ہے- مثلاً مولانا ساکت امروہوی کی یہ غزل:

بال بکھرائے ہوئے حال پریشاں ساکت
ہم تماشا سر بازار بنے بیٹھے ہیں

یہ غزل اس مشاعرے کی روداد میں چھپی تھی جو مصرعہ طرح اگلے مشاعرے کے لیے دیدیا جاتا تھا اور جب طرحی غزلیں آجاتی تھیں تو گلشن داغ دہلی کے سبز رنگ کا گلدستہ تھا اس میں شایع ہو جاتی تھیں- یہ پوری غزل

اس گلدستے میں چھپی تھی اور مفتی نسیم احمد صاحب نے ساکتؔ پر جو مضمون لکھا اور انجمن ترقی اردو کی محفل میں پڑھا گیا اس میں مولانا کا بھی اشعار ساکتؔ صاحب کے کلام میں جمع کر دیے تھے۔ اس مضمون کی نشاندہی نہ کرنا بھی ہم لوگوں کی غلطی ہے۔ صدیقی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔

احمد حسین کا فنون لطیفہ سے لگاؤ ان کے چند در چند کارناموں اور معلومات سے ثابت ہوتا ہے۔ پتہ چلا کہ آپ لکھتے نہیں ہیں۔ کمپیوٹر سے حسب منشا کمپوز کرتے چلے جاتے ہیں۔ جتنے مرقع اور تصاویر "کشور اولیا" میں پیش کی ہیں یہ سب صدیقی صاحب کے موقلم اور نوک پلک کی مرہون ہیں۔ یہ سال خوردہ عمارتیں اپنی طبعی عمر سے متجاوز ہو چکی ہیں۔ ان بوڑھی عمارتوں کو قابل پذیرائی بنادینا صدیقی کی خلاقانہ صلاحیت کا اظہار وابلاغ ہے۔ اس اصلاح کی خصوصیت انہیں نظر نواز وصحت مند روپ عطا کرنا ہے۔ ان خوردہ عمارتوں میں صدیقی نے اپنے نفسِ گرم اور خون دل و جگر شامل کر کے انہیں مانوس، محبوب بنادیا ہے۔ فنکار تفریق کی دلدل سے نکال کر افراد ملت میں یگانگت اور خصومت کے عناصر سے پاک وپاکیزہ کر سکتا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے صدیقی کا جس نے غیروں کو بھی اپنالیا اس پہنا کر اپنالیا ہے اور اپنے حُسنِ اخلاق اور حُسنِ کردار کے ذریعے معراج انسانیت اور بشری تقدس کی وردی پہنادی ہے اور اس فوج کا لشکری بنادیا ہے جس کے لیے اقبال نے کہا تھا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس مادی اور خالص غیر اخلاقی ماحول میں بشریت کے سرچشمے کو سیرت طیبہ کے انوار سے منور کر دینا اقبال ہی کا کام تھا۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

صدیقی کو زندگی نے ان جراحتوں اور زخم کاریوں میں محصور و مقید رکھا جن سے ہر نفس کا پیپ اور خون بہتا رہتا تھا اور ان پر بیٹھنے اور لپٹے رہنے والی مکھیاں اڑانے کے لیے پنکھا بھی نہ تھا۔ اس لیے ان زخموں اور مکھیوں کو ہی اپنی زندگی کا شریک قرار دیدیا۔ یہ اشتراک واتحاد ان کی افتاد طبع اور فطرت ثانی بن گئے۔ اسی لیے انہیں اس ماحول نے پسماندہ طبقہ کے لیے دلسوزی وہمدردی بشر مطالعہ نمودار ہو گیا جو "سیاحت ماضی" میں قدم قدم پر جھلکتا ہے اور انہیں اپنی اس موجودہ تصنیف میں ہر زخم خوردہ اور بیکس ماحول کے پروردہ کو سینے سے لگا کر اپنی

شخصیت اپنی زندگی اور اپنے ماحول میں شامل کرتے چلے جاتے ہیں۔احمد حسین اب اس مقام پر متمکن ہیں جہاں لغزشِ نظر یا تصورِ معصیت یا تخیل اخلاق سوزی کی اس منزل میں آگئے ہیں جیسے یہ اعمال زبوں کے مرتکب ہو گئے ہیں اور اس ارتکاب کے احساس نے تربیتِ نفس وحُسن ذات کی سرزنش نمودار کردی ہے۔شریعت اور ظاہری قانون فرد کو مستوجب سزا جب قرار دیتے ہیں جب ان کا وقوع بالعلم ہو جائے لیکن صدیقی کا معیارِ بشریت انہیں معصیت کا مرتکب صرف تصور کرنے 'خیال کرنے اور اس گھناؤنے عمل کے سوچنے سے ہی تعزیری حکم نامہ کی ترتیب وتدوین کر دیتا ہے۔احمد حسین کا وہ مقام مقدس ہے جو کسی دوسرے انسان کو اس وصف سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔اس کی مثال یہ ہے کہ ایک فرد نے دوسرے فرد کی جیب کاٹنے کا خیال کیا اور صدیقی کے یہاں یہ شخص اس معصیت کا مرتکب ہو چکا جس کی سزا اور سرزنش کا آغاز ہو چکا۔اس ارتکاب میں عمل کو دخل نہیں ہے۔صرف خیال کی کارستانی ہے اور خیال کی حد تک معصیت بروئے کار آچکی۔اس لیے ذہن اور ضمیر کو اس تخیل پر مستوجب سزا قرار دیا جائے گا۔میرا خیال ہے کہ صدیقی صاحب مادی بازی گری سے گذر کر روحانی انجام کار تک پہنچ چکے ہیں۔اس تطہیر وتزکیہ نفس کی منزل میں احمد حسین یکتا و تنہا نظر آتے ہیں۔اسی محتاط وممتاز احساس نے انہیں تاریخ کی عام خامیوں اور فروگذاشتوں سے محفوظ رکھا ہے۔یہ تصنیف اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے نہ آج لائق تنقید وتبصرہ ہے اور نہ آئندہ کسی نقاد کی حرف گیری کا نشانہ بن سکے گی۔

احمد حسین نے اپنی اس تصنیف کا نام ''کشورِ اولیا'' رکھ کر اپنے مولد کو معرفتِ ذات کا ذریعہ قرار دیا ہے اور معرفتِ ذات ہی کے تار وپود سے صفات وذات کے سرچشموں تک رسائی ممکن ہے۔اس لیے یہ تصنیف دلوں میں بیداری 'شعور میں شگفتگی' تحت الشعور میں جمال وجلال کا جراغاں اور حیات انسانی میں سروری ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔انشااللہ۔

اخلاصِ عمل 'صدیقی کا ممتاز ومفتخر مقام ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ''کشورِ اولیا'' کا قاری فکر خداداد سے کام لے کر اپنی ذات وصفات سے آگہی حاصل نہ کر سکے۔یہ آگہی بشری رموز ورمز کی معرفت کا دوسرا نام ہے۔

میں بھنیش شرما جی کا ممنون ومتشکر ہوں اور اپنے دل کی گہرائیوں سے داد دیتا ہوں کہ آپ نے صدیقی صاحب کی پہلی تصنیف ''سیاحت ماضی'' کا منظوم ترجمہ بڑی گہرائی' گیرائی اور جگر کاوی سے فرمایا۔کاش ''کشورِ اولیا'' کی طرف بھی توجہ فرمائیں

-☆☆☆-

میں برادر بہ جاں برابر احمد حسین کی تالیف ""کشورِ اولیا"" کو امروہے کی صرف تاریخ نہیں بلکہ "تخلیق" قرار دیتا ہوں۔ مجھے اب تک وہ پہلا اور آخری مصنف دکھائی دیتا ہے جو اپنی پہلی ہی تصنیف "سیاحت ماضی" میں ایک نام بُردہ اور صاحب اسلوب، صاحب اسلوب یگانہ مصنف کے طور پر شہود میں آیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی ادیب اور عالم نے اپنے چھوٹے سے شہر پر ایسی کتاب قلم بند کی ہوگی جو یکسر زائیدۂ تحقیق بھی ہو اور ایک "بیش از تخلیق" بھی۔

جونؔ ایلیا کراچی

اہل امروہہ کی خواہش پر احمد حسین صدیقی نے ایک ایسے مشکل، دشوار، صبر آزما اور مشقت طلب کام کی ذمہ داری قبول کی جس کو عام حالات میں قبول کرنا آسان نہ تھا۔ ""کشورِ اولیا"" احمد حسین صدیقی کی نہایت مخلصانہ کوششوں کی آئینہ دار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب امروہے کے ہر باشندے اور وطن مالوف سے محبت کرنے والے ہر قاری کے لیے معلومات اور دلچسپی کا مواد رکھتی ہے۔ قمر رضی کراچی

ان کی پہلی تصنیف "سیاحت ماضی" اور موجودہ تیسری تصنیف ""کشورِ اولیاء"" ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ احمد حسین امروہہ سے ناتہ توڑنے میں کبھی کامیاب نہ ہو پائے۔ ""کشورِ اولیاء"" پڑھ کر آپ میری رائے کی صحت کو تسلیم کرنے پر یقیناً مجبور ہو جائینگے۔ اس لیے احمد حسین صدیقی نے امروہہ کی تہذیبی، ادبی، ثقافتی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کو انہوں نے پیش کرنے سے چھوڑ دیا ہو۔ سرفراز عثمانی امروہہ

یہ کتاب قدیم اور موجودہ امروہہ کی ایک ایسی خوبصورت دستاویز ہے جو یقیناً قابلِ قدر ہے۔ بھونیش شرما امروہہ

ان کی شخصیت اس ناتے قابل تحسین و تعریف ہے کہ انہوں نے اپنے جائے ولادت امروہہ کو ""کشورِ اولیاء"" جیسا بہترین نام دیا اور اسی نام سے یہ کتاب لکھ کر اس شہر کو ایک نئے چراغ سے روشن کیا ہے۔ آنے والی نسلیں ان کے علمی شوق و ذوق سے فائدہ حاصل کرتی رہیں گی۔ رام ناتھ شرما امروہہ

یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے کہ جس کی انفرادیت، اہمیت، افادیت اور عظمت کا اعتراف ہر علم دوست منصف مزاج تاریخ داں کو کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر عظیم حیدر امروہہ

